تیری الفت میں صنم

اقراء صغیر احمد

تیری اُلفت میں صنم.........اقراء صغیر احمد

''سمجھتا کیا ہے وہ ایڈیٹ خود کو..... بہت اسمارٹ اینڈ ہینڈسم؟ اتنا مغرور اور بد دماغ۔''

آج تک ایسا نہیں ہوا تھا کہ مشعل حسن جس راہ سے گزری ہو وہاں نگاہیں اُٹھی کی اُٹھی نہ رہ گئی ہوں، پلکیں جھکنا بھول جاتی تھیں، دل دھڑک اٹھتے تھے۔

''اس اسٹوپڈ نے اُٹھی ہوئی پلکیں جھکا دیں اور نگاہیں نیچی کر کے چلا گیا اور..... اور اس کے چہرے پر تاثر کیسا تھا۔ ایسا جیسے میں کوئی بہت گری پڑی واہیات سی لڑکی ہوں۔'' اس نے قریب رکھے کشن کو غصے سے اچھالا تھا۔ پچھلے دو گھنٹے سے اس کی یہی حالت تھی۔ اپنے حسن کے زعم میں مبتلا، اپنی خوب صورتی کی شیدائی تو وہ شروع سے رہی تھی کیونکہ وہ حسین تھی، طرحدار تھی، دولت مند و معزز گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ اکلوتی اولاد ہونے کے باعث تمام دولت و جائیداد کی تنہا مالک تھی۔ اس کے حُسن کے پروانوں، روپ کے شیدائی، حُسن کے دیوانوں کی تعداد کا کوئی شمار نہ تھا۔ اپنی خوبصورتی پر ناز تو اسے ہمیشہ سے رہا تھا، ہاتھوں میں دل لئے پھرنے والے عاشقوں نے اسے بالکل ہی آسمان کی وسعتوں میں پہنچا دیا تھا۔ اب دنیا کے تمام نوجوانوں کو وہ اپنے حُسن پر فریفتہ دیکھنا چاہتی تھی۔

ہر نظر کی وہ منظورِ نظر ہو۔

ہر لب پر صرف اس کا نام ہو۔

ہر آنکھ میں صرف اسی کا عکس ہو۔

ایسا ہی ہوتا آیا تھا، لیکن آج..... آج اس شخص نے اس کے حُسن کی توہین کی تھی۔ اس کی خوب صورتی کو نظر انداز کر کے دنیا کا سب سے بڑا اور نا قابل معافی جرم کیا تھا۔

''نہیں چھوڑوں گی..... نہیں چھوڑوں گی میں اس ایڈیٹ کو، اس وقت تک جب تک وہ میرے قدموں میں سر رکھ کر میرے حُسن کا اقرار نہیں کر لیتا، میری خوب صورتی کو مان نہیں جاتا۔'' اس فیصلے نے گھنٹوں سے بھڑکتے اس کے ذہنی الاؤ میں کچھ ٹھنڈک سی ڈالی تھی۔ مگر آگ پوری طرح سرد نہیں ہوئی تھی۔

''پاپا..... پاپا! وہ اسٹوپڈ کون تھا؟'' وہ ان کے روم میں چلی آئی۔

''اسٹوپڈ..... کون؟'' انہوں نے سامنے رکھی فائل بند کر کے حیرانی سے دریافت کیا۔

''وہی جو شام کو آپ سے مل کر گیا تھا، بلیک جینز اور گرے ٹی شرٹ میں۔''

''وہ، اچھا..... اچھا، شاہ ویز کی بات کر رہی ہیں آپ.....'' انہوں نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''کیوں..... کیا، کیا ہے اُس نے؟''

بہت بڑا جرم.....'' وہ دھپ سے صوفے پر بیٹھی۔

''جرم؟ نہیں..... نہیں، بہت نائس لڑکا ہے وہ۔ ازحد محنتی و جینئس، ایک ماہ قبل ہی تو وہ اپائنٹ ہوا ہے اور بہت جلد اپنی قابلیت و لیاقت کی دھاک بٹھا دی ہے سب پر۔ بہت ہونہار و شریف نوجوان ہے۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی بیٹا جان۔''

''اوہ..... ہمارا ایک ملازم ہے وہ۔ اور بے نیازی کا یہ عالم گویا پوری دنیا جناب کی مٹھی میں ہے۔'' اسے شدید حیرانی کا جھٹکا لگا۔ ''ایسے ٹکے ٹکے کے گھٹیا لوگ اب یہاں آیا کریں گے؟'' ناگواری اس کے لہجے میں در آئی۔

''اوں ہوں، ایسے نہیں کہتے بیٹا۔ غریب ہونا گھٹیا بات نہیں ہوتی۔ امیری، غریبی تقدیر کے کھیل ہوتے ہیں۔ یہ کسی کی جھولی ہیروں سے بھر دیتی ہے تو کسی کے آنچل میں پتھر ڈال دیتی ہے اور اگر مہربان ہو جائے تو پتھروں کو موتی بنانے میں دیر نہیں کرتی۔ اگر سفاک ہو جائے تو بڑے بڑے شہنشاہ لمحے بھر میں ہاتھوں میں کشکول لئے بھیک مانگتے نظر آتے ہیں۔''

ناصحانہ انداز میں انہوں نے بیٹی کو سمجھایا تھا مگر اس کا بگڑتا موڈ دیکھ کر مسکرا کر گویا ہوئے۔

''کیا جرم ہو گیا شاہ ویز سے؟ میرے خیال میں اس نے آپ کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھا بھی نہیں ہے۔''

''یہ کیا چھوٹا جرم ہے؟'' ان کی بات سے اس کے اندر دوبارہ تذلیل کا احساس بیدار ہوا تو وہ پھنکارتے ہوئے لہجے میں بولی۔

''اوہ ہو..... تو یہ بات ہے..... محسوس نہ کرو، وہ بہت شریف لڑکا ہے۔''

''وہاٹ؟ اس سے کیا مراد ہے پاپا، کیا میں شریف نہیں؟'' وہ بری طرح بپھری۔

''نو..... نو..... نہیں، میرا یہ مقصد نہیں ہے۔'' انہیں اپنی بات کا خود ہی احساس ہوا۔ وہ بوکھلا کر بولے اور پھر اسے منانے کے لئے انہیں خاصے جتن کرنے پڑے تھے۔

□●□

''ارے آپا! آج کل کی لڑکیاں، اُف اللہ بچائے اُن کی چالاکیوں اور چلتر بازیوں سے۔ گھر میں قدم رکھتے ہی میاں کو الو بنا ڈالتی ہیں۔ نہ معلوم کون سا سحر جانتی ہیں جو بیٹے ماں، باپ، بہنوں، بھائیوں کی برسوں کی محبت و خلوص کو بھول کر بیوی کے گن گانے لگتے ہیں۔ نہ ماں کا لحاظ اور نہ بہنوں کا خیال، توبہ توبہ۔ بہت ہی بُرا وقت آ گیا ہے۔ ادب و لحاظ، شرم و حیا سب اُٹھ گئی ہے۔'' خالہ زرینہ نے کانوں کو ہاتھ لگا کر دہائی دی۔

''سب قربِ قیامت ہے زرینہ، کیوں جی جلاتی ہو، کئی بار کہہ چکی ہوں یہاں آ جاؤ، رات دن کی چخ چخ سے جان چھوٹ جائے گی۔ اس گھر میں ہم دو ہی تو بندے ہیں، دو کا پکاتی ہوں، تین کا پک جاتا ہے اب تو خیر سے شاہ ویز بیٹے کی پکی نوکری لگ گئی ہے۔ انشاء اللہ ساری پریشانیاں دور ہو جائیں گی۔''

''ہاں، اس مسٹنڈی کو اکیلے گھر پر راج کرنے کے لئے چھوڑ دوں۔ وہ تو چاہتی یہی ہے کہ میں کل کی دفع ہوتی آج دفع ہو جاؤں، مگر آپا، میں مر کر بھی اس کی یہ خواہش پوری نہیں ہونے دوں گی۔ اس کو مار کر ہی مروں گی۔ مگر موت پر کس کا بس چلا ہے، اس سے پہلے مر بھی گئی تو بد روح بن کر گھر میں گھسی رہوں گی۔''

''ارے..... توبہ کرو زرینہ! جو منہ میں آتا ہے، بکے جاتی ہو۔''

''تو کیا کروں آپا؟ کس کو جا کر دکھاؤں اپنا جلا ہوا دل۔ کتنے بے وقوف ہوتے ہیں ہم لوگ بھی جو بیٹیوں کے پیدا ہونے پر سوگ مناتے ہیں اور بیٹوں کی پیدائش پر مٹھائیاں بانٹتے ہیں، جشن مناتے ہیں اور جب ہماری ساری عمر کی ریاضت و پرورش کا صلہ ملنے کا وقت آتا ہے تو بیٹے طوطے کی طرح آنکھیں بدل لیتے ہیں۔ ماں باپ کی خدمت گزاری کی بجائے بیوی کی ناز برداری میں لگ جاتے ہیں۔ بہن بھائیوں سے زیادہ انہیں سالے سالیاں عزیز ہو جاتے ہیں۔ کیا اس لئے ہم بیٹوں کے پیدا ہونے کی دعائیں کرتے ہیں؟'' وہ دوپٹے میں منہ چھپا کر رونے لگیں۔

''اللہ ہدایت دے ایسی اولادوں کو۔ چلو چھوڑو، خاموش ہو جاؤ، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ شکر کرو، چاروں بیٹیاں اپنی سسرالوں میں سُکھ سے رہ رہی ہیں۔ اگر وہ وقت پر اپنے گھروں کی نہ ہوتیں تو آج بھاوج کے سلوک سے اُن کے دل بھی بدظن ہوتے۔'' بے جی انہیں پانی کا گلاس پکڑاتے ہوئے تشکرانہ لہجے میں بولیں۔

''یہی تو دکھ مجھے بے سکون رکھتا ہے کہ ایک بیٹے کی خاطر میں نے چاروں بیٹیوں کی قدر نہیں کی۔ کیسی صابر و نیک تھیں میری بیٹیاں، مجھ سے زیادہ اپنے بھائی کو چاہنے والی، میں پہلے بھنا گوشت اصغر کو کھلاتی پھر شوربہ بچیوں کو دیتی کہ اچھی صحت، اچھی غذا سے ہی بنتی ہے۔ دودھ، دہی، انڈے، میوے جات، گوشت، پراٹھے کبھی میری بچیوں کو نصیب ہوئے تو اصغر کا جھوٹا یا بچا کھچا، مگر میری صابر بیٹیوں نے کبھی شکوہ نہیں کیا۔ آج وہی حلوے مانڈے کھانے والا بیٹا ماں کو ایک سوکھی روٹی کھلانے کا روادار نہیں ہے۔ بیوی کے لئے روز تھیلے بھر بھر کر لاتا ہے۔'' انہوں نے گلاس خالی کرتے ہوئے سرد آہ بھری۔

''ارے زرینہ خالہ آئی ہیں۔ السلام علیکم خالہ جان.....'' شاہ ویز نے ہاتھ میں پکڑے پھل کے لفافے ان کے ہاتھ میں دیتے ہوئے خوش دلی سے سلام کیا۔

''جگ جگ جیو میرے لال۔ تمہارا یہی پیار تو نہال کر ڈالتا ہے مجھے۔'' انہوں نے جھٹ پٹ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بلائیں لیتے ہوئے کہا۔

''کل کے پھل ڈھیر رکھے ہوئے ہیں، آج کیوں لے آئے بیٹا؟'' بے جی نے لفافوں سے جھانکتے انار، سیب اور آلوچے دیکھ کر کہا۔

''آپ کے کھانے کے لئے لے کر آتا ہوں بے جی، آپ کھاتی کیوں نہیں ہیں؟''

''کھاتی ہوں مگر تم تو بے حساب لے کر آتے ہو۔ یہ اچھی بات نہیں ہے، ملازمت ملے ایک مہینہ ہوا ہے اور تم نے حد درجہ فضول خرچی شروع کر دی ہے جو مجھے قطعی پسند نہیں۔''

''یہ فضول خرچی نہیں ہے بے جی۔ کل تک ہم ایک ایک روپیہ سوچ سوچ کر خرچ کرتے تھے۔ اکثر دن میں صرف ایک وقت کھاتے تھے، وہ بھی آدھا پیٹ۔ اب اللہ نے اپنی رحمت کر دی ہے تو ہماری حد درجہ کفایت شعاری کنجوسی کہلائے گی جو مجھے گوارا نہیں ہے۔ میری خاطر آپ نے خود کو مار ڈالا ہے۔ اپنی عمر، اپنی صحت سب تباہ کر لی۔ اب میرا فرض ہے آپ کا خیال رکھنا، آپ کی خدمت کرنا۔ اس کے باوجود میں آپ کی عظمت کو نہیں پہنچ سکتا۔'' اس کے گمبھیر لہجے میں ستائش و محبت تھی جس کے احساس نے بے جی کی آنکھوں میں مسرت کے جگنو چمکا دیئے تھے۔

''ماشاء اللہ..... ماشاء اللہ..... کیسا سعادت مند، ہونہار بچہ ہے۔ کس قدر چاہتا ہے تمہیں۔ ایک میں بدنصیب ہوں، جس بیٹے کو بچپن سے پالا پوسا.....''

''بیٹا! تم فافٹ نہا کر آ جاؤ، نرگسی کوفتے بنائے ہیں آج میں نے، کھانا لگا رہی ہوں۔ زرینہ تم ذرا کھانا لگانے میں میری مدد کرو۔ سارے دن کا تھکا ہارا آتا ہے۔ میری کوشش یہی ہوتی ہے کہ وقت پر اسے ہر چیز ملے۔''

بے جی کو معلوم تھا زرینہ شروع ہو گئی تو کسی قیمت پر داستان مکمل کئے بغیر پیچھا نہیں چھوڑے گی اور رات کا کھانا، صبح کے ناشتے میں تبدیل ہوتے دیر نہ لگتی کیونکہ وہ اپنی بات سننے والے کی توجہ اِدھر اُدھر بھٹکنا پسند نہیں کرتی تھی اور مخاطب کو ان کی طرف معمولی سی بے توجہی کی سزا کے طور پر پوری داستان ازسرِنو سننی پڑتی تھی جس کا متحمل شاید ہی کوئی ہو۔ سو وہ اسی سزا سے بچنے کے لئے بہت تحمل سے انہیں ساتھ لے گئی تھیں۔

''یہ لو دودھ پیو اور سو جاؤ۔ سارے دن کے تھکے ہوئے ہوتے ہو۔ آرام کرنے کی بجائے یہ کتابیں لے کر بیٹھ جاتے ہو۔'' بے جی نے دودھ کا گلاس اسے پکڑاتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے ابن انشاء کا سفرنامہ نگری نگری پھرا مسافر لے کر پیار بھری سرزنش کی تھی۔

''سادگی و خوب صورتی سے لکھی گئی کتاب سارے دن کی تھکن اتار دیتی ہے بے جی۔ اور ابن انشاء کا طرزِ تحریر اس قدر برجستہ ہے کہ میں کہتا ہوں ساری زندگی کی ہی

تھکن اتر جائے۔ بہت عظیم رائٹر تھے وہ۔''

''میں تو پڑھی لکھی ہوں نہیں، تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو گے۔ اب پڑھنے کی اجازت نہیں ملے گی، باقی کل پڑھنا۔ وہ سفر نامہ ٹیبل پر رکھتے ہوئے بولیں۔ ''ہاں، وہ شام کو تمہارے مالک نے کیوں تمہیں اپنے گھر پر بلایا تھا؟'' جاتے جاتے معاً انہیں یاد آیا تو وہ چوکھٹ پر کھڑے کھڑے بولیں۔

''ایک فائل پر ان کے سائن لینے تھے۔'' اس نے دودھ کا گلاس خالی کر کے رکھتے ہوئے کہا۔

''میں تو ڈر ہی گئی تھی کہ خدانخواستہ نوکری سے جواب دینے کے لئے تو نہیں بلایا۔ اسی وقت سے میں خیریت کی دعائیں مانگ رہی تھی، پھر تمہیں سکون سے آتے دیکھ کر میری جان میں جان آئی ہے۔ سو جاؤ، شب بخیر۔'' وہ گلاس لے کر چلی گئیں۔

اس کی نگاہوں میں شام کا منظر گھوم گیا جب وہ حسن بیگ صاحب سے ایک اہم فائل پر سائن کرا کر پلٹ رہا تھا کہ اچانک لان میں بجلی سی کوندی تھی۔

ریڈ منی اسکرٹ اور بلیک باریک اسٹریپ والے بلاؤز میں اس کی عریاں سڈول ٹانگیں اور بازو چاندی کی کرنوں کی طرح چم چما رہے تھے۔ وہ ہاتھ میں پکڑا ریکٹ گھماتی اس طرف ہی آ رہی تھی۔

حسن بے نقاب ہو تو بے کشش ہو جاتا ہے۔

بے حجاب ہو تو بے اعتبار ہو جاتا ہے۔ وہ تو ویسے بھی ایسی خواتین سے دور بھاگتا تھا جو آدھا لباس پہن کر حسن کی نمائش کر کے داد وصول کرنا چاہتی ہیں۔ اس وقت اسے بھی اس سے ازحد کراہیت محسوس ہوئی اور سر کو خدا حافظ کہتا ہوا آنکھیں جھکا کر اس کے سامنے سے گزر گیا۔

''لاحول ولاقوۃ.....'' بے ساختہ اٹھنے والی نگاہ کا ایک منظر اس کی نگاہ میں آیا تو بے اختیار اس کی زبان سے نکلا تھا۔

□●□

''مشی میری جان! کیسی ہو؟'' رائعہ بیگم نے اس کے رخسار پر بوسہ دیتے ہوئے کہا۔

''آئی ایم فائن آنٹی! جوجو کہاں ہے؟''

''گھوم کر دیکھو، وہ کھڑا ہے۔'' انہوں نے لپ اسٹک کو آخری ٹچ دیتے ہوئے پیچھے کی طرف اشارہ کیا۔

''ہیلو مشی!'' جوجو نے اسے اپنی طرف متوجہ دیکھ کر دھیرے سے کہا۔

''اوہ..... تم ابھی تک تیار بھی نہیں ہوئے، حالانکہ میں نے آنے سے قبل تم سے کال کر کے کہا بھی تھا کہ تیار ہو جاؤ، میں آ رہی ہوں، مووی دیکھنے چلنا ہے۔'' وہ چیخ کر بولی۔

''انہیں اپنی فضول ضدوں سے فرصت ملے تو تیار ہوں۔''

''فضول ضد نہیں ہے مام، مجھے بیس لاکھ کی اشد ضرورت ہے، جو آپ کو مجھے دینا ہوں گے۔''

''کہاں سے؟ چوری کروں یا ڈاکے ڈالوں..... جب کہہ رہی ہوں احمد کو بزنس میں لوس ہو رہا ہے، آدھے سے زیادہ روپیہ مختلف شیئرز میں ڈوبا ہوا ہے، بینک سے جو لون لیا تھا، اس کی بھی ٹائمنگ پوری ہونے والی ہے، ایسے میں تو ہمیں خود کروڑوں کی ضرورت ہے، حالات کو سمجھنے کی بجائے تم بے جا ضد کرتے ہو۔'' اسکائی بلو سلک کی ساڑھی پر میچنگ سینڈل پہنتے ہوئے انہوں نے خاصے غصے سے کہا تھا۔

''ہونہہ..... یہ بھی ویری انٹرسٹنگ جوک ہے مام! میری ضرورت پر آپ نے قرضوں کی لمبی چوڑی لسٹ دکھا دی ہے اور چند روز پہلے جو آپ نے تیس لاکھ کا ڈائمنڈ کا نیکلس سیٹ خریدا تھا، جب کوئی لسٹ آپ کو یاد نہیں آئی تھی۔'' اس نے ترکی بہ ترکی کہا۔

''مجھے بتاؤ تو سہی، کیا بات ہوئی ہے؟'' مشعل جوجو کے شانے پر ہاتھ رکھ کر پوچھنے لگی۔

''کچھ نہیں یار، مام نے تمام موڈ ہی چوپٹ کر دیا ہے۔'' اس نے مشعل کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبا کر کہا۔ اس کے چہرے پر ایک دم ہی مایوسی و اداسی کی دبیز تہہ چڑھ گئی تھی۔

''رقم کی پرابلم ہے؟''

جوجو نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اوکے چائلڈز! میں جا رہی ہوں۔ مسز نبیل کے ہاں پارٹی ہے، وہاں ویٹ ہو رہا ہو گا میرا۔'' وہ شوفر کو آواز دیتی انہیں بائے کہتی وہاں سے چلی گئیں۔

''یہ کوئی پرابلم نہیں ہے۔ چلو پاپا سے لیں گے ہم رقم۔''

''نو مائی سویٹ ہارٹ! بار بار انکل سے رقم لے کر میں بہت شیم فیل کرتا ہوں۔''

''کیوں، میں اور تم کیا الگ الگ ہیں؟ تمہاری پرابلم میں سولو نہیں کر سکتی؟''

''اوہ کم آن ڈیئر! مائنڈ نہیں کرو، خوب جانتا ہوں تمہاری ہارٹ فیلنگز کو۔ مگر انکل کیا سوچیں گے؟'' اس نے اس کے بال بکھیرتے ہوئے کہا۔

''وہ میرے پاپا ہی نہیں تمہارے بھی رئیل انکل ہیں۔ تمہیں بھلا کچھ کہہ سکتے ہیں؟''

''ہاں، یہ تو ہے اور جانتی ہو مشی! میں یہ سب تمہارے فیوچر کے لئے ہی کر رہا ہوں۔ آج جو کچھ میں لے رہا ہوں کل اس کے بدلے ہم خوب دل کھول کر انجوائے کریں گے، پھریں گے، دنیا دیکھیں گے، لائف کے ایک ایک لمحے سے لطف کشید کریں گے۔''

''اوکے، چلو فاسٹ پہلے پاپا کے آفس چلتے ہیں۔'' اس نے اس کے بازوؤں سے نکلتے ہوئے کہا۔

حسن بیگ کے شاندار آفس کی عمارت میں داخل ہو کر وہ ان کے آفس روم کی طرف جوجو کو ساتھ لئے بڑھ گئی تھی۔ دروازے کے باہر بیٹھے پیون کے سیلوٹ کا جواب بھی اس نے نہ دیا تھا۔

''پاپا! مجھے ٹوئنٹی لاکھ روپیہ ابھی فوری چاہئے۔'' اس نے اندر داخل ہو کر اطمینان سے کہا۔ جوجو ساتھ خاموش کھڑا تھا۔

اس کی اچانک آمد اور کثیر رقم کے مطالبے پر حسن بیگ نے چونک کر ان کی طرف دیکھا تھا مگر ان کے مقابل شاہ ویز جو فائلز کھولے بیٹھا تھا نے نگاہیں پیپرز پر جما دی تھیں۔

''بیس لاکھ..... کیوں کیا کرنا ہے؟ چند دن قبل تم نے اس سے ڈبل رقم لی تھی۔''

''پاپا! اب مجھے حساب دینا ہو گا؟'' سامنے ٹیبل پر بکھری فائلز پر جھکے شخص کو دیکھ کر اسے کل کی توہین یاد آ گئی تھی۔ وہ اب بھی نگاہیں جھکائے لاتعلق و بے نیازی سے بیٹھا تھا۔ گویا وہاں اس کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں تھا۔ مستزاد اس پر، پاپا کے استفسار نے اسے کھولا ڈالا تھا۔

''میں حساب نہیں مانگ رہا، صرف معلوم کر رہا ہوں۔'' انہوں نے نرمی سے کہا۔

''بالآخر یہ سب میرا ہے پاپا! اسے میں کیوں اور کیسے خرچ کروں، یہ میرا ہیڈک ہے۔ آپ کو فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔'' اس نے خاصی بدتمیزی سے کہا۔

''یہ سب آپ کا کل ہو گا، آج میرا ابھی ہیڈک ہے۔''

''جب سب دولت و جائیداد پر میرا ہی حق ہے تو آج اور کل کیوں پاپا؟''

''سر! میں کچھ دیر بعد حاضر ہو جاتا ہوں۔'' شاہ ویز کو ان کے ذاتی معاملے میں اپنی موجودگی بے معنی لگی۔ وہ اٹھتے ہوئے مودبانہ انداز میں گویا ہوا۔

''نو، پلیز سٹ ڈاؤن..... آپ یہیں رہیں۔'' انہوں نے اپنائیت سے کہا۔

''یعنی اب ہمارے پرسنل افیئرز معمولی ورکرز کے سامنے ڈسکس کئے جائیں گے۔ امپاسبل، اے مسٹر! گیٹ لاسٹ فرام ہیئر۔'' وہ غصے سے چیخ کر ازحد تضحیک آمیز لہجے میں بولی۔

''مشی! اپنا لہجہ درست کرو۔ آپ وزیٹنگ روم میں بیٹھیں، میں آ رہا ہوں وہاں۔'' شاہ ویز کے تیزی سے سرخ ہوتے چہرے اور کشادہ پیشانی پر ابھرتی شکنوں کے جال دیکھ کر انہوں نے مشعل اور جوجو کو وہاں سے بھیجا تھا۔

''آئی ایم سو سوری شاہ ویز! ریئلی سوری۔ دراصل مشی بچپن سے ماں کے سائے و آغوش سے دور رہی ہے۔ شاید اسی لئے یا پھر مختلف گورنس سے پرورش پانے کے باعث وہ بہت منہ پھٹ اور گستاخ ہو گئی ہے آئی مین، اسے بات کرنے کا سینس نہیں ہے۔ ازحد جذباتی اور تھوڑی بے وقوف بھی ہے۔ بلا سوچے سمجھے ہر بات کہہ دیتی ہے، جیسے ابھی.....''

''اٹس او کے سر! آپ ان فائلز پر سائن کر دیں۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''کیوں نہ ہم کل ایک مرتبہ پھر ان فائلز کو اسٹڈی کر کے نیو پلاننگ کے بعد سائن کریں؟'' چند لمحے اس کی جانب بغور دیکھنے کے بعد وہ دوستانہ لہجے میں استفسار کرنے لگے۔

''جو آپ بہتر سمجھیں سر!'' وہ وہاں سے اٹھ کر اپنے کیبن میں آ گیا۔

اس بدتمیز و جاہل لڑکی نے اس کے اندر شعلے بھڑکا دیے تھے۔ تذلیل و توہین کے احساس نے اسے متوحش کر ڈالا تھا۔ گو کہ حسن بیگ نے بار بار اپنی بیٹی کی بدتمیزی کی معذرت کی تھی مگر اس کی انا و خودداری اور عزت نفس پر کاری ضربیں لگی تھیں۔ دل چاہ رہا تھا اس مغرور و بدتمیز لڑکی کو کوئی ایسا سبق سکھائے کہ اسے ساری زندگی ازبر ہو جائے کہ انسان، انسان ہوتا ہے۔ عزت و وقار، احترام و معتبر ہر شخص کی چاہ ہوتی ہے۔ کبھی بھول کر بھی وہ کسی کو کمتر اور برتر کی کیٹگری میں نہیں رکھ سکے۔

□●□

''اوئے..... یہ کس گدھے کے بچے نے پارک کی ہے؟'' جوجو پارکنگ لاٹ میں آ کر چیخا تھا۔

''سر! یہ کچھ دیر پہلے آپ ہی کھڑی کر کے گئے تھے۔'' واچ مین نے گھبرا کر کہا۔

''میں اس کچرے کی بات کر رہا ہوں۔'' اس نے گیٹ کے قریب کھڑی بائیک کی طرف اشارہ کر کے حقارت سے کہا۔

''وہ تو صاحب! شاہ ویز صاحب کی ہے۔''

''بلا کر لاؤ اس نان سینس کو۔'' جوجو کی دھاڑ پر چوکیدار ہوا کی طرح لپکا تھا۔

''شاہ ویز صاحب ...... واہ، صاحب۔'' مشعل کھلکھلا کر ہنسی تھی۔

''ان چھوٹے لوگوں کا کیا ہے۔ ان سے ایک روپیہ زیادہ کمانے والا ان کے لئے صاحب ہو جاتا ہے۔'' جوجو نے بھی قہقہوں میں ساتھ دیتے ہوئے کہا۔

''فرمایئے؟'' شاہ ویز نے ان کے قہقہوں کو نظر انداز کر کے سنجیدگی سے کہا۔

''اوہ...... تو آپ ہیں صاحب جی۔'' جوجو نے اس کی طرف دیکھ کر تمسخرانہ لہجے میں کہا۔

''یو اسٹوپڈ! تمہارے باپ نے تمہیں یہ تمیز نہیں سکھائی کہ گاڑی کس طرح پارک کی جاتی ہے یا تم نے اس پارکنگ لاٹ کو اپنے باپ کی اسٹیٹ سمجھ رکھا ہے؟'' مشعل نے آگے بڑھ کر استہزائیہ لہجے میں کہا۔

اس کا لہجہ، اس کا انداز، اس کے الفاظ شاہ ویز جیسے جذباتی، خوددار اور اکھڑ مزاج شخص کو تھے سے اکھاڑنے کے لئے کافی تھے۔

''یہ میرے باپ کی سکھائی گئی تمیز کا اعزاز ہے کہ اتنا کچھ کہنے کے باوجود آپ اپنا یہ گندا سا منہ سلامت لئے کھڑی ہیں۔ آپ کی جگہ اس کارٹون نے یہ بکواس کی ہوتی تو ابھی زندہ نہیں اسے دفن کر چکا ہوتا۔'' شدید اشتعال کو ضبط کرنے کی سعی میں وہ انگاروں کی طرح سرخ ہو رہا تھا۔ مگر شاہ ویز کے لہجے اور انداز نے لمحے بھر کو ان دونوں کو گنگ کر دیا تھا۔

''مشی! اس نے مجھے کارٹون کہا اور تمہارے ساتھ بھی اس طرح بات کی جیسے تمہارا سرونٹ نہیں باس ہو۔'' جوجو کے لہجے میں حیرت وغصہ پنہاں تھا۔

''چھوڑو شاہ ویز بیٹا! معافی مانگ لو، یہ ہمارے مالک کی بیٹی ہیں۔'' چوکیدار نے بات آگے بڑھتے دیکھ کر پریشان وخوف زدہ لہجے میں کہا۔

''نہیں بابا! میں جس کو اپنا مالک مانتا ہوں، وہ وحدہٗ لاشریک ہے اور اس واحد ذات کے سوا میں کسی کے آگے جھک نہیں سکتا، مجھے کسی کے باپ کی پرواہ نہیں ہے۔''

''معافی تو تمہارا باپ بھی مانگے گا مسٹر! اتم ہو کیا چیز؟'' اس کے لئے وہ شخص اول روز سے ہی چیلنج ثابت ہوا تھا، اب تو اس کی انا کا مسئلہ بن گیا تھا۔

''یہ خواہش تمہارے باپ کا باپ بھی پوری نہیں کروا سکتا میڈم! میں تمہاری ناقص عقل میں سمجھ آنے والی چیز نہیں ہوں۔'' بات بلاوجہ اس کے مرحوم باپ تک پہنچ گئی تھی اور یہ اسے قطعی منظور نہیں تھا۔ اب نوکری رہے یا جائے، اسے پرواہ نہیں تھی۔ اس گھمنڈی اور بدتہذیب لڑکی کو کوئی رعایت دینے کو تیار نہیں کہ اپنی عزتِ نفس وخودداری اسے عزیز ترین تھی۔

''کیوں اس کے منہ لگتی ہو ڈارلنگ! جس جاہل شخص کو عورت کی عزت نہ کرنا آتی ہو اس سے بات کرنا توہین ہے تمہاری۔'' جوجو نے نفرت بھرے لہجے میں شاہ ویز کی طرف دیکھ کر کہا اور ساتھ مشعل کا بازو تھام کر آگے بڑھنے لگا مگر مشعل آگے نہیں بڑھی۔

''ہونہہ...... عورت اور عزت، سب سے پہلے ان لفظوں کے معنی تو سمجھو۔ عورت وہ ہوتی ہے جسے دیکھ کر ماں، بہن، بیٹی جیسے پُرتقدس وپُروقار احساسات خود بخود دل میں جنم لیتے ہیں۔ جن کی طرف اٹھنے والی نگاہوں میں عزت واحترام ہوتا ہے۔ جن کی حیا کی شفق سورج کی کرنوں میں چمکتی ہے، جن کی معصومیت پھولوں کے حسن میں نظر آتی ہے، جنہیں یہ کہنے کی ضرورت نہیں پڑتی کہ ان کی عزت کی جائے۔''

نوکری کو تو وہ خدا حافظ کہہ ہی چکا تھا، پھر اب اسے کوئی فکر نہ تھی۔

''مم...... میں تمہیں دیکھ لوں گی باسٹرڈ۔'' اس قدر بے عزتی، اتنی توہین، ایسی رسوائی وذلت؟ اس نے کبھی خواب میں بھی ایسا نہ سوچا تھا۔ جوشِ غضب سے وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ خوب صورت آنکھیں شعلے برسانے لگی تھیں۔ حسین چہرے کی رنگت متغیر تھی۔

''مشی! پلیز کول ڈاؤن، کول ڈاؤن ناؤ......'' جوجو نے اس کی حالت پر گھبرا کر کہا۔

''جوجو! اس گھٹیا بائیک کے اتنے ٹکڑے کر دو کہ جنہیں یہ سمیٹ نہ سکے۔'' اس نے قریب کھڑی بائیک کی طرف اشارہ کیا جو ترچھی ہو کر ان کی کار کا راستہ روکے ہوئے تھی، جس کی وجہ سے یہ ہنگامہ ہوا تھا۔

جوجو بھی غصے سے فوں فوں کرتا آگے بڑھا اور بائیک کو دور اچھالا تھا۔

''کان کھول کر سن لے، کبھی آئندہ ہمارے راستے میں آیا تو اس بائیک کے ساتھ ساتھ تیرے بھی اتنے ٹکڑے کروں گا جو کبھی سمیٹے نہ جا سکیں۔'' وہ شاہ ویز کی طرف انگلی اٹھا کر غرایا۔

''اگر زندہ رہنا چاہتا ہے تو ابھی میری بائیک نہایت عزت واحترام کے ساتھ کھڑی کر۔ ورنہ تیرے اس مچھر جیسے جسم کے ٹکڑے کرنے کی زحمت بھی نہ کرنی پڑے گی مجھے...... صرف چٹکی کافی ہوگی، تجھے مسلنے کے لئے۔'' اس کے لبوں پر لمحے بھر کو مسکراہٹ ابھر کر معدوم ہوئی۔

''آپ کو اللہ کا واسطہ ہے صاحب! بات کو اتنا آگے نہیں بڑھاؤ، اسکوٹر ہم اٹھا کر دے گا۔'' چوکیدار مسلسل بات بڑھتے دیکھ کر بری طرح خوف زدہ ہو چکا تھا۔ مشعل کے مزاج سے وہ اچھی طرح واقف تھا کہ اپنے ایک اشارے پر وہ تمام ملازمین کی ہمیشہ کے لئے چھٹی کروا سکتی ہے۔ پھر شاہ ویز تو کچھ عرصہ قبل ہی آیا تھا مگر اپنی خوش اخلاقی وہمدردانہ طبیعت کے باعث سب میں مقبول ہو گیا تھا۔ اسے کھونے کے خیال سے وہ جلدی سے بولا تھا۔

''نہیں بابا! آپ نہ بولیں تو بہتر ہوگا۔'' شاہ ویز تیزی سے بولا۔

''میں نے سب سے بڑے مالک کا واسطہ دیا ہے۔ کیا اب بھی بات نہیں مانو گے؟ بے شک ہم سب کا مالک اوپر والا ہے اور اسی مالک نے ہمیں حلال روزی کمانے کا حکم بھی دیا ہے، ان زمین پر موجود مالکوں کے وسیلے سے ہمیں روزی ملتی ہے۔ جس طرح ہم ''اوپر'' والے مالک کو ناراض کر کے خوش نہیں رہ سکتے، اسی طرح ان زمینی مالکوں کی دشمنی بھی ہمیں سکون سے نہیں جینے دیتی۔'' اسے سمجھاتے ہوئے چوکیدار بری طرح رو پڑا تھا۔

''خاموش ہو جائیں بابا! بے شک آپ نے دنیا کا سب سے بڑا واسطہ دیا ہے مجھے جسے میں ماننے پر مجبور ہوں ورنہ مجھے اپنے ارادوں سے موت بھی نہیں باز رکھ سکتی۔'' وہ جھٹکے سے آگے بڑھا تھا۔ چوکیدار کے چہرے پر طمانیت دوڑ گئی تھی۔

''ون منٹ پلیز......'' مشعل ہاتھ کے اشارے سے اسے روکتے ہوئے گویا ہوئی اور اس کے مقابل جا کر کھڑی ہو گئی۔ ''تم نے میرے فیانسی کو مچھر کہا، کارٹون کہا۔ بہت ناز ہے تمہیں اپنے آپ پر؟ از حد غرور ہے اپنی باڈی پر؟'' ہاف آستین کی ٹی شرٹ میں اس کے بازوؤں کے مسلز خوب نمایاں تھے۔ چوڑا مضبوط سینہ اس کی طاقت کا مظہر تھا۔ جوجو مرعوب ہو گیا تھا مگر مشعل کو اس کی مرعوبیت ایک آنکھ نہ بھائی۔ وہ کڑوے لہجے میں پوچھ بیٹھی۔

''میں غیر ضروری سوالوں کے جواب نہیں دیا کرتا۔'' اس نے منہ بنا کر لاپروائی سے کہا۔

''مجھے یقین ہے میں ایسا وقت ضرور لاؤں گی، جب تمہارا یہ فخر وغرور سے تنا ہوا سر میرے قدموں میں جھکا ہوا ہوگا اور اس دن تمہیں معلوم ہوگا مشعل حسن کیا شے ہے۔'' وہ اس کی طرف گھورتے ہوئے ایک ایک لفظ چبا چبا کر بولی۔ ''تمہارے نزدیک مجھ جیسی لڑکیاں، لڑکیاں نہیں غلاظت کا ڈھیر ہوتی ہیں۔ اور میرے نزدیک مجھ جیسی لڑکیوں سے نگاہیں جھکا کر بات کرنے والے مرد، مرد نہیں ہوتے۔''

اس نے ہاتھوں کو جوڑ کر اس کے چہرے کے آگے دونوں ہتھیلیاں بجائی تھیں اور ہنستی ہوئی جوجو کے ساتھ کار کی طرف بڑھ گئی۔

''چھوڑو بیٹا! یہ اونچے گھرانوں کے بچے ایسے ہی بگڑے ہوئے ہوتے ہیں۔'' چوکیدار نے اسے غصے سے کھولتے دیکھ کر نرمی سے سمجھایا۔

''میری شرافت کو نامردی کا طعنہ دے گئی ہے۔'' وہ تیزی سے جاتی ہوئی کار کو گھور کر بولا۔

''اپنے اور ان کے ذہنوں میں یہی فرق ہے بیٹا! جو باتیں ہمارے لئے باعث افتخار ہیں وہی باتیں ان کو معیوب وبوسیدہ لگتی ہیں۔ ان پر غیر مذہبوں کا اثر زیادہ ہے۔''

خراب موڈ کے ساتھ اس نے بائیک اٹھائی تھی جس کا ٹھیک ٹھاک نقصان ہو گیا تھا۔ پچھلے ہفتے ہی تو اس نے سیکنڈ ہینڈ خریدی تھی جس سے آمد ورفت میں بہت آسانی ہو گئی تھی۔ اب دو تین دن اسے پھر بسوں کے چکروں میں خوار ہونا تھا۔

چوکیدار اسے اپنی سائیکل کی پیشکش کر رہا تھا لیکن وہ بے چارا خود دور سے آتا تھا اس لئے شکریہ کے ساتھ اسے سائیکل واپس کر دی۔

اوپر آفس کی کھڑکی سے پردے کی اوٹ میں کھڑے سب کچھ دیکھتے اور سنتے حسن بیگ صاحب کی آنکھوں میں کوئی خاص چمک تھی۔

☐●☐

دوسرے دن حسن بیگ صاحب نے ایک گھنٹے اس کا انتظار کرنے کے بعد گاڑی بھیج کر بلو الیا تھا۔

''ینگ مین! کل ہم نے کچھ ڈسکس کیا تھا، نئے پراجیکٹ کے بارے میں۔ آج فائنل کے دن آپ غائب ہو گئے۔'' وہ اسے بیٹھنے کا اشارہ کر کے مسکرا کر خوش دلی سے بولے۔

وہ سوچ رہا تھا کہ اس کی ملازمت کل کے واقعے کے بعد رخصت ہو گئی ہوگی اور یہی سوچ کر وہ آفس نہ آیا تھا مگر ان کا کار بھیج کر اسے بلوانا اور اب اس نارمل طریقے سے ملنا یہ ظاہر کرتا تھا کہ ابھی ان کی لاڈلی نے انہیں کچھ بتایا نہیں ہے لیکن اس کے مزاج کو دیکھ کر تو نہیں لگتا تھا کہ وہ سب برداشت کر گئی ہو۔

''کیا سوچ رہے ہو...... کیا آج آفس آنے کا ارادہ نہیں تھا؟'' وہ ایک مرتبہ پھر گویا ہوئے۔

''نو سر! دراصل کل......''

''مجھے معلوم ہے۔ کل جو کچھ بھی ہوا، میں اسے دہرانا نہیں چاہوں گا کیونکہ تکلیف دہ باتیں دہرانے سے تکلیف ازسرِنو جاگ اٹھتی ہے۔ مگر مشی کے رویے پر تہِ دل سے معذرت چاہتا ہوں۔ یہ میرے ہی بے جا لاڈ پیار کا رزلٹ ہے۔ شروع سے میں نے اسے کسی بات پر نہیں ٹوکا، اس نے جو کچھ کہا اس کا انجام سوچے بنا مانتا چلا گیا۔ اب وہ ہر جگہ خود کو صحیح اور دوسروں کو غلط سمجھتی ہے۔ دوسروں کو شکست دینے کے لئے وہ ہر حربے کو جائز تصور کرتی ہے۔ کل ہی آپ نے دیکھا، گاڑی انہوں نے غلط جگہ پر پارک کی تھی اور الٹا الزام آپ ہی پر لگایا تھا۔'' وہ معذرت کرتے ہوئے بولے۔

''سوری سر! کل غلطی مجھ سے بھی سرزد ہوئی تھی۔ اکثر ایسا ہو جاتا ہے مجھ سے، اپنے غصے پر قابو نہیں رہتا۔'' حسن صاحب کے اخلاق اور صاف گوئی نے اسے اس لمحے از حد متاثر کیا تھا۔ وہ شرمندگی سے گویا ہوا۔

□●□

''مشی! کم آن ڈارلنگ۔ کیوں بور کر رہی ہو؟'' جوجو نے اکتا کر کہا۔

''تم میرے سامنے سے چلے جاؤ تو بہتر ہوگا۔''

''کیوں..... میں نے کیا، کیا ہے جو ایک ہفتے سے تم نہ مجھ سے بات کر رہی ہو اور نہ ہی باہر چل رہی ہو۔ آخر کیوں ٹینشن دے رہی ہو مجھے؟''

''اس دن اس کمینے شاہ ویز نے کس قدر میری انسلٹ کی تھی اور ساتھ میں تمہاری بھی، جواب میں تم اس کا منہ توڑنے کی بجائے بائیک گرا کر واپس آ گئے اور پاپا سے میں نے اس کی شکایت کی تو انہوں نے کوئی نوٹس ہی نہیں لیا، بلکہ کہنے لگے کہ وہ بہت لائق لڑکا ہے، غلطی میری بھی ہوگی اور یہ کہ وہ شاہ ویز کو کسی قیمت پر نوکری سے نہیں نکالیں گے۔'' وہ غصے سے بولتی چلی گئی۔

''انکل تو کچھ زیادہ ہی اس پر فدا لگتے ہیں۔ دیکھا تھا کس طرح انہوں نے اس کو کمرے سے نہیں جانے دیا تھا اور ہمیں ویٹنگ روم میں بھیج دیا تھا، جب انکل ہی کسی قسم کا ایکشن لینے کے خلاف ہیں تو میں کیا کر سکتا ہوں۔'' کوک کے سپ لیتے ہوئے اس نے کندھے اچکا کر بے چارگی سے کہا۔

''شٹ اپ، بے وقوف، شرم کرو۔'' اس نے چڑ کر کہا۔

''بھئی مجھ پر کیوں غصہ ہو رہی ہو۔ انکل کو تمہارا خیال رکھنا تھا نا۔''

''پاپا کا اور میرا کتنا ساتھ ہے۔ آئندہ لائف تو ہمیں ساتھ گزارنی ہے اور تمہیں ہی میرا خیال بھی رکھنا ہے، پاپا کی انگلی پکڑ کر میں ساری زندگی نہیں چل سکتی۔''

''یو آر رائٹ..... میں بھی اب یہی چاہتا ہوں کہ تم انکل کی انگلی چھوڑ کر میرا بازو تھام لو۔ پھر میں اور تم ہوں گے اور زندگی کے سارے رنگ ہمارے سنگ ہوں گے۔ دنیا کی ساری خوشیاں تمہارے آنچل میں ڈال دوں گا۔ مگر ڈیئر تم دوپٹہ تو کبھی اوڑھتی نہیں ہو، پھر خوشیاں کہاں سیف کروں گا؟'' اسے جینز اور شرٹ میں ملبوس دیکھ کر وہ شوخی سے بولا تو مشعل بے ساختہ ہنس پڑی۔

''میرے بینک اکاؤنٹ میں۔'' جواباً اس نے بھی شوخی سے کہا۔

''شکر ہے، تمہارا یہ مسکراتا چہرہ دیکھ کر دل کو قرار آیا۔''

''کیا بات ہے، آج کل خوب اُردو بول رہے ہو؟''

''البم کے تمام سونگز اُردو میں ہیں تو آج کل اُردو پر زیادہ توجہ ہے۔''

''تم نے شوٹنگ کی ڈیٹس فکس کر لی ہیں؟'' وہ اس کے قریب بیٹھ کر اشتیاق سے بولی۔

''نہیں یار! ایک پرابلم ہو گئی ہے۔''

''کیا پرابلم ہے؟''

وہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد پریشانی سے گویا ہوا۔ ''ایڈوانس لے کر ماڈل ایک معروف ایڈورٹائزنگ فرم کی جانب سے کولمبو چلی گئی ہے، اب وہاں انہیں طویل عرصہ لگ جائے گا اور جب تک اس کی واپسی ہوگی تب تک میرے سونگز البم کی ویلیو مارکیٹ ڈاؤن ہو چکی ہوگی۔ اس ماڈل کو لمبی رقم دی ہے، میرے پاس اب کسی دوسری ماڈل کو بک کرنے کے لئے پیسہ نہیں ہے۔''

''لیکن اس سے ایڈوانس واپس لینا تھا، اس طرح کیوں جانے دیا؟''

''یار! تم نہیں جانتیں اس فیلڈ کے لوگوں کو۔ جتنی گلیمرائز ان لوگوں کی پرسنالٹیز ہوتی ہیں اس قدر ہی فراڈ اور کرپٹ حرکتیں ہوتی ہیں۔ گیا تھا میں ایڈوانس واپس لینے مگر.....'' اس نے کانوں کو ہاتھ لگا کر برے برے منہ بنا کر کہا۔ ''اس چالاک کے ماما نے ایسی میری خاطر مدارت کی کہ بس چھٹی کا دودھ یاد آ گیا۔''

''اوہ شٹ! تمہیں عادت ہو گئی ہے ہر کسی سے مار کھا کر واپس آنے کی۔ ہونہہ، نہ معلوم وہ کون سا منحوس لمحہ تھا جو میں نے تم جیسے بزدل و کمزور مرد کو پسند کیا۔ جو اپنی حفاظت کے لئے ہاتھ نہیں اٹھا سکتا، وہ میرا تحفظ کیسے کر سکتا ہے؟'' وہ ایسے سلگتے لہجے میں گویا ہوئی کہ جوجو مارے طیش کے تڑپ اٹھا۔

''شٹ اپ..... تم میری انسلٹ کر رہی ہو۔'' وہ کھڑا ہو کر غصے سے بولا۔

''انسلٹ..... ہونہہ..... تمہیں تو انسلٹ کے ہجے بھی نہ آتے ہوں گے۔ تمہیں کیا معلوم کہ ان احساسات سے دوچار ہو کر بندہ کیسے ذلت و خواری کے احساسات سے زخمی ہوتا ہے۔ اسپورٹس، ہاسمنگ، رائڈنگ، سنگنگ ہی لائف نہیں ہوتی۔ کہیں کہیں ہمیں فائٹ بھی کرنی پڑتی ہے، اپنے ہونے کا اظہار دوسری طرح سے کرنا پڑتا ہے۔''

''میں محسوس کر رہا ہوں جب سے اس ''مرکھنے بیل'' سے ہمارا ٹکراؤ ہوا ہے، اس دن سے تم بدل گئی ہو، نہ مجھ سے ڈھنگ سے بات کر رہی ہو، نہ آؤٹنگ پر جا رہی ہو۔ کیا رئیلی تم اس حد تک ہرٹ ہوئی ہو اُس دن؟'' اس نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر سنجیدگی سے کہا۔

''یس..... آف کورس.....'' اس نے بھی سنجیدگی سے کہا تھا۔

''او کے..... او کے، اب تم دیکھنا، تمہارا یہ خادم کیا کرتا ہے۔''

''اوہو..... کیا کرو گے.....؟'' مشعل شوخی سے کھلکھلائی تھی۔

''بہت جلد معلوم ہو جائے گا تمہیں کہ میرے ان بازوؤں میں کتنا دم ہے۔'' اس نے کمزور بازوؤں کو پھلاتے ہوئے اکڑ سے کہا۔

''ہوں..... میں ابھی سے انتظار میں ہوں..... اچھا پھر ماڈل کا کیا کرو گے۔ کیونکہ اس کے بغیر شوٹنگ نہیں ہوگی۔ چھ ماہ گزر چکے ہیں انہی پرابلمز میں، روپیہ ختم ہو جاتا ہے مگر پرابلمز سولو نہیں ہوتیں۔'' اس نے کشن گود میں رکھ کر اطمینان سے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ جوجو سامنے صوفے پر نیم دراز تھا۔

''کل میرے ذہن میں ایک ونڈرفل آئیڈیا آیا ہے اور مما نے بھی اسے بہت پسند کیا ہے۔'' اس نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے سسپنس زدہ لہجے میں کہا۔

''کیسا آئیڈیا؟''

''تم ماڈلنگ کرو گی۔''

''میں.....؟ پاگل ہو گئے ہو کیا؟''

''وہ تو تم نے بہت عرصہ پہلے کر دیا تھا۔'' اس کی جانب گہری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے رومانٹک لہجے میں کہا۔ جواباً اس نے مسکرا کر کشن کھینچ مارا تھا۔

''میں جھوٹ نہیں کہہ رہا، رئیلی تمہاری آنکھیں اس قدر بیوٹی فل آئی ہیں کہ تمہارا فیس، کیمرہ فیس ہے۔ پھر تم اس قدر حسین، دلربا، شاداب ہو کہ تمہاری بیوٹی میری البم کو ٹاپ پوائنٹ تک پہنچا دے گی اور تمہیں بھی ٹاپ کی ماڈل بنا دے گی۔ شہر میں، ملک میں بلکہ ملکوں میں تمہارے حُسن کو سراہا جائے گا۔ تمہارے روپ کی دنیا میں دھوم ہو گی، تمہاری نیچرل بیوٹی کے آگے تمام حسینائیں منہ چھپائے روتی نظر آئیں گی، سپر اسٹار بن جاؤ گی تم..... تہلکہ مچ جائے گا تہلکہ.....''

''تمہیں اچھا لگے گا تمہارے علاوہ سب میرے حُسن کی تعریف کریں گے؟''

''اوہ، کم آن مشی! یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ تمہاری سوچ اتنی بیک ورڈ کب سے ہو گئی؟''

''اس قدر آنکھیں نہیں پھاڑو، میں نے ایسے ہی بات کر دی ہے۔'' وہ مسکرائی۔

''میں بہت روشن خیال اور کھلے دل کا آدمی ہوں اور حُسن کو پردوں میں چھپا کر رکھنے کا قائل ہرگز نہیں ہوں۔ میرے خیال میں جو ایسا کرتے ہیں وہ فطرت سے بغاوت کرتے ہیں۔ دیکھو، قدرت نے اپنے حسین نظاروں کو کبھی ماسک نہیں پہنایا۔ پھولوں کی خوب صورتی، چاند کی چاندنی، ستاروں کی دلکشی، کلیوں کی نوخیزی، سبزے کی طمانیت، جھرنوں کی دلربائی اور بارش کی سرمستی، سب ہمارے لئے اوپن ہے، کہیں بھی کوئی پردہ، کوئی اوٹ، کوئی نقاب موجود نہیں ہے۔'' وہ پُرجوش کہتا ہوا لمحے بھر توقف کے بعد بولا۔

''تمہاری تعریف، میری تعریف ہے، تمہاری ستائش میں، میں بھی شامل ہوں گا اور پھر سب سے انٹرسٹنگ بات یہ ہے کہ گھر کا سنگر اور گھر کی ماڈل ہو گی تو ہمیں لاکھوں روپوں کی بچت ہو گی۔'' آخری الفاظ اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہے۔

''سوچوں گی۔'' اس کے انداز میں نیم رضامندی تھی۔

''سوچنا کیا ہے، جب میں نے طے کر لیا ہے۔'' وہ کھڑا ہو کر بولا۔

''نہیں، تم پہلے اپنا وعدہ پورا کرو پھر.....'' وہ مضبوط لہجے میں بولی۔

□●□

عصر، مغرب اور اب عشاء کا وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ شاہ ویز ابھی تک گھر نہیں لوٹا تھا۔ عصر کے وقت گھر لوٹ آنے کا اس کا روزانہ کا معمول تھا۔ اپنی اس روٹین پر پابندی سے عمل پیرا تھا لیکن آج نہ معلوم کیا ہوا تھا کہ عشاء کے بعد بھی وہ نہ آیا تھا۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا، بے جی کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ اُن کی آنکھیں دروازے پر تھیں تو سماعت باہر گلی میں گزرنے والے کسی کے بھی قدموں کی چاپ پر چونک اٹھتی تھی۔ ہر آہٹ انہیں بے چین کر ڈالتی تھی۔ دل گویا پنکھے کی رفتار سے چل رہا تھا، بے چینی و اضطراب انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ وہ اس طرح بغیر بتائے کہیں چلا گیا ہو۔ کیونکہ وہ از حد ذمے دار اور حساس تھا۔ آفس میں اگر کام زیادہ ہوتا تو بتا کر جایا کرتا کہ واپسی دیر سے ہو گی اور بتائے گئے مقررہ وقت پر گھر آ جایا کرتا تھا۔

جب گھڑی کی سوئیاں گیارہ پر پہنچ گئیں تو خوف و گھبراہٹ سے اُن کا بُرا حال ہو گیا۔ وہ پلنگ پر دل پکڑ کر بیٹھ گئیں۔ کہیں کوئی حادثہ نہ ہو گیا ہو، کسی مصیبت میں میرا بچہ

گرفتار نہ ہو گیا ہو۔ یا اللہ! رحم کرنا، میرے بچے کی حفاظت کرنا میرے مالک! میرے بچے کو صحیح سلامت گھر بھیج دے، مولا! تیرا کرم ہوگا، تیرا احسان ہوگا، میرے بڑھاپے کی لاٹھی ہے وہ یا پروردگار! میرے شاہ ویز کی حفاظت کرنا، اسے جلد از جلد گھر پہنچا دے۔''

وسوسوں نے ان کے دل کو اپنی مٹھی میں جکڑا تو وہ اندیشوں سے ڈر کر گڑ گڑا کر دعائیں مانگنے لگیں۔

اسی وقت دروازہ دھیرے سے کھلا تھا۔ شاہ ویز اندر داخل ہوا تھا۔

''شاہ ویز! یہ ...... خو...... ن ......؟'' اس کی وائٹ شرٹ پر جا بجا لگے خون کے سرخ دھبے اور زرد چہرہ دیکھ کر ان کے اوسان خطا ہو گئے تھے۔

''بے جی ...... بے جی! مجھے کچھ نہیں ہوا، میں ٹھیک ہوں، یہ خون میرا نہیں ہے۔'' اس نے آگے بڑھ کر ان کے چکراتے وجود کو تھام کر اطمینان سے کہا۔

''نہیں ...... تجھے کیا ہوا؟ اتنی دیر کیوں ہوئی؟ اور خون کس کا ہے؟'' اس کے چہرے اور جسم پر ہاتھ پھیر کر، کوئی زخم نہ پا کر اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر کر گویا ہوئیں۔

''بڑی بھوک لگی ہے بے جی! پہلے کھانا کھاتے ہیں، پھر تفصیل سے آپ کو بتاتا ہوں۔''

''ہاں، ہاں ...... پہلے نہا کر کپڑے بدل لو۔ یہ خون دیکھ کر تو میرا کلیجہ ابھی تک کانپ رہا ہے۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولیں۔ وہ باتھ روم کی طرف بڑھ گیا۔

جلد از جلد اصل بات جان لینے کی بے چینی میں ان سے کھانا بھی ڈھنگ سے نہیں کھایا گیا تھا۔ شاہ ویز ان کی پریشانی و بے چینی سے پوری طرح آگاہ تھا۔ کھانے کے بعد اس نے بتایا کہ آفس سے واپسی پر سڑک کے کنارے ایک نوجوان بے ہوش پڑا ملا۔ کوئی گاڑی والا مار کر چلا گیا تھا۔ کیونکہ وہ علاقہ زیادہ آباد نہیں ہے اس لئے کسی نے ایکسیڈنٹ کرنے والے کو نہیں دیکھا۔ وہ بڑی مشکل سے اسے ہاسپٹل لے کر پہنچا تھا جہاں ایکسیڈنٹ کیس ہونے کے باعث پولیس کارروائی کے بعد اسے میڈیکل ٹریٹمنٹ دی گئی تھی۔ اس دوران اس نوجوان کا بہت زیادہ خون ضائع ہو جانے کے باعث حالت نازک ہو گئی تھی۔ بلڈ بینک سے دو بوتل خون کی ملی تھیں۔ بلڈ گروپ مل جانے کے باعث مزید دو بوتل خون کی دے کر آیا تھا۔ خون دینے کے بعد اس پر غنودگی سی طاری ہو گئی تھی، طبیعت بحال ہوتے ہی وہ گھر چلا آیا تھا۔

''کیسی طبیعت ہے اس بچے کی؟ ارے کیسے ظالم لوگ ہیں، دل میں خوفِ خدا ہی نہیں ہے۔ ایک تو گاڑیاں لوگوں پر چلا دیتے ہیں پھر اپنی غفلت چھپانے کے لئے زخمیوں کو مرنے کے لئے چھوڑ جاتے ہیں۔ ایسے بے ضمیر و بے ایمان لوگوں کی وجہ سے نہ معلوم کتنے گھر ویران ہو جاتے ہیں۔ اچھا کیا میرے بچے! جو تم نے نیکی کا کام کیا، اللہ تعالیٰ اس کا اجر تمہیں ضرور دیں گے۔ جس طرح تم نے اس بچے کی جان بچائی ہے، اوپر والا بھی تمہیں ہر ناگہانی آفت و مصیبت سے بچائے گا۔'' بے جی کے لہجے میں سکون در آیا تھا۔

''ہوش آ گیا تھا بے جی اس کو۔ مگر گہرے زخموں کی وجہ سے بہت درد ہو رہا تھا۔''

''چلو اللہ نے زندگی بچائی۔ یہ بہت مہربانی ہے اس کی۔ زخم کتنے ہی گہرے ہوں ایک دن بھر جائیں گے، پروردگار سب کی ماتا سلامت رکھے۔ چلو اب تم بھی آرام کرو۔ دو بوتل خون جسم سے نکل جانا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ میں دودھ میں پستے، بادام پکا کر لا رہی ہوں۔ صورت دیکھ کیسی سرسوں جیسی ہو رہی ہے۔''

□●□

''بھائی جان! آج تو میں آپ سے ہاں کروا کر ہی جاؤں گی۔'' ڈنر کے بعد رافعہ حسن بیگ کے اسٹڈی روم میں چلی آئیں۔

''ہاں تو میں بہت عرصہ قبل کہہ چکا ہوں۔'' وہ شفقت سے مسکرائے۔

''آپ نے کہا تھا مشعل اسٹڈی کمپلیٹ کر لے پھر آپ اس کی شادی کریں گے۔ اب کے سال وہ اسٹڈی سے فارغ ہو گئی ہے، اب تو آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ احمد اگلے ہفتے بحرین سے آ رہے ہیں، ان کے آنے کے کچھ دن بعد ہم شادی کی تاریخ مقرر کر دیں گے۔ جوجو بھی کئی بار مجھ سے کہہ چکا ہے کہ آپ سے بات کروں۔ دراصل آپ سے بات کرتے ہوئے جھجک آتی ہے اسے۔ بہت خوش نصیب ہیں آپ بھائی جان جو اس دور میں آپ کو اتنا شرمیلا و سعادت مند داماد مل رہا ہے۔'' وہ دھیرے سے ہنس کر گویا ہوئیں۔

''جنید نے اپنے مستقبل کی کیا پلاننگ کی ہے؟ اسپورٹس، سنگنگ وغیرہ مجھے پسند نہیں ہیں اور نہ ہی ان سے ایک شاندار مستقبل بنتا ہے۔ یہ ایکٹیویٹیز بیچلر لائف میں سوٹ ایبل ہوتی ہیں۔ میرڈ لائف میں ان ہابیز کی قطعی گنجائش نہیں ہوتی۔ اسے اب یہ تمام فضول مشاغل ترک کر کے عملی دنیا میں قدم رکھنا چاہئے۔'' اس بار وہ سنجیدگی سے گویا ہوئے تھے۔

''بھائی جان! اس کے پیچھے کوئی لمبا چوڑا کنبہ نہیں ہے جو وہ سب کے پیٹ پالنے، تن ڈھانپنے کے لئے خود کو بھلا کر محنت و مشقت میں لگ جائے۔ اکلوتا بیٹا ہے ہمارا اور آپ کا بھی اکلوتا داماد ہے۔ ہماری اور آپ کی تمام جائیداد جوجو کی بھی تو ہے اور ...... میرا مطلب ہے جوجو اور مشی کی ہے۔ پھر ہمارے بچوں کو عام لوگوں کی طرح محنت کرنے کی کیا ضرورت ہے۔'' بھائی کو از حد سنجیدہ و فکر مند دیکھ کر وہ خاصی سنبھل سنبھل کر کہہ رہی تھیں۔

''عام لوگ، میرے خیال میں جو مشقت و محنت سے کام کر کے اپنے گھروں کو سپورٹ کر رہے ہیں وہ بہت خاص اور قابلِ قدر لوگ ہیں۔ تمہارے نظریئے سے مجھے اختلاف ہے رافعہ......'' وہ کچھ لمحے توقف کے بعد گویا ہوئے۔ ''ہم کیا تھے ...... یہ تم نہیں بھولی ہو گی؟''

''ہم کیا تھے، اب ہمیں صرف یہ یاد رکھنا چاہئے بھائی جان! ہمارے بچوں کو کبھی بھی ہمارے ماضی کے بارے میں معلوم نہیں ہونا چاہئے، ان کی شخصیت ایک بار ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گئی تو تا حیات جڑ نہ پائے گی۔'' انہوں نے جز بز ہو کر کہا۔

''ماضی ہی تو انسان کی بنیاد ہوتا ہے۔ اس سے فرار پانے والے کامیاب زندگی نہیں گزار سکتے۔ بلندیوں کو چھونے سے پہلے اور بعد، پستیوں کو فراموش نہیں کرنا چاہئے۔ نہ معلوم کون سا غلط قدم ہمیں کسی وقت ہمارے اصل کی طرف لوٹا دے۔''

''خدا کے لئے بھائی جان، ایسی بات نہ کیجئے۔ پستیوں سے بلندیوں کا سفر بہت جاں فزا ہوتا ہے مگر واپسی موت ہوتی ہے تقریباً۔ آپ ایسی خوفناک بات نہ کریں تو بہت بہتر ہے۔ بس آپ جلدی سے مجھے ہاں کہہ دیں۔''

''ابھی نہیں رافعہ! مشی میری اکلوتی بیٹی ہے، میری روح، میرے دل کا ٹکڑا ہے۔ اتنی جلد میں اس کی جدائی برداشت نہیں کر پاؤں گا۔ کچھ وقت میں اس کے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں، پھر اس کی شادی کر دوں گا۔'' وہ دوٹوک لہجے میں بولے۔

''آپ فکر کیوں کرتے ہیں، شادی کے بعد مشی اور جوجو آپ کے پاس ہی رہیں گے۔ آپ کو تو معلوم ہی ہے احمد بزنس کے باعث اکثر غیر ملکی ٹورز پر ہی رہتے ہیں اور اکثر مجھے بھی ان کے ساتھ جانا پڑتا ہے۔ جوجو کی شادی کے بعد مجھے اس کی فکر سے آزادی مل جائے گی تو بہت کم میرا یہاں رہنا ہوگا۔ تھوڑا عرصہ ہم دونوں میاں بیوی یہاں گزار لیا کریں گے، اس طرح مشی کے ساتھ جوجو بھی آپ کے پاس ہی رہے گا، یا یوں کہہ لیں کہ میں جوجو کو وداع کر دوں گی۔'' وہ شگفتہ موڈ میں مسکرا کر بولیں۔

''ٹھیک ہے، پھر احمد آ جائیں تو ڈیٹ فکس کر لیں گے۔''

''اوہ ...... شکریہ بھائی جان، سچ خوشیوں سے آپ نے میرا دامن بھر دیا ہے۔''

''شکریئے کی کوئی بات نہیں ہے۔ آپس میں رشتے داریاں اس لئے کی جاتی ہیں کہ محبت کی ڈور اور مضبوط ہو اور خلوص و اپنائیت کی شیرینی بڑھ جائے۔''

''بے شک بھائی جان، بے شک ...... ہماری محبت و اپنائیت کوئی ختم نہیں کر سکتا۔ میں مشی کو جوجو سے بڑھ کر چاہوں گی۔ آپ کو کبھی شکایت کا موقع نہیں مل سکتا بھائی جان! ایک ضرورت آن پڑی ہے بلکہ سخت پریشانی ہے۔''

ان کے ہنستے مسکراتے چہرے پر یکدم ہی پژمردگی چھا گئی۔

''ہوں ...... کیا ہوا؟'' انہوں نے چونک کر عینک درست کر کے استفسار کیا۔

''صرف ڈیڑھ کروڑ روپے کی اشد ضرورت ہے۔ اگر نہ ملے تو ہم سوسائٹی میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں گے اور بھائی جان! آپ کی پرسٹیج الگ خراب ہو گی۔ احمد اور میں آپ کے حوالے سے ہی جانے جاتے ہیں۔'' وہ آزردگی سے بولیں۔

''ڈیڑھ کروڑ ......؟''

''پلیز بھائی جان! انکار مت کیجئے گا آپ۔ بڑی آس لگا کر آئی ہوں۔'' ان کی بات قطع کر کے وہ تیزی سے بولیں۔

''پہلے کبھی انکار کیا ہے جو اب کروں گا، مگر اتنی بڑی رقم، کچھ وقت لگے گا......'' وہ دھیمے لہجے میں گویا ہوئے تو رافعہ خوشی خوشی اٹھ گئی تھیں۔

□●□

حسن بیگ صاحب کی طبیعت گزشتہ دو روز سے خراب تھی، اس وجہ سے وہ آفس بھی نہیں آ رہے تھے۔ وہ آفس آیا تو منیجر صاحب نے اسے کہا کہ سر اسے گھر پر بلا رہے ہیں۔ بزنس سے متعلق انہیں کچھ باتیں کرنی ہیں۔

پیغام سن کر کچھ لمحے کی بورڈ پر تیزی سے چلتی ہوئی اس کی انگلیاں ساکت ہو گئی تھیں۔ نگاہوں میں اس بدتمیز و از حد مغرور لڑکی کا سراپا لہرایا تھا اور ناگواری و ناپسندیدگی اس کے نقوش سے ہویدا ہو رہی تھی۔ مگر حکمِ حاکم تھا، اسے ویسے بھی حسن صاحب کی سادہ و پُر وقار شخصیت نے اپنا اسیر کر لیا تھا۔

حسن بیگ صاحب، بہت گرم جوشی سے ملے۔ اس نے بھی خلوص سے ان کی خیریت دریافت کی تو وہ مسکرا کر بولے۔

''بیٹا! بڑھاپا خود سو بیماریوں کی ایک بیماری ہے، کس کس سے جان بچائیں بھلا؟''

''میں سوچتا ہوں سر! انسان کو آخری سانس تک ہر دکھ، ہر تکلیف، ہر پریشانی سے مقابلہ کرنا چاہئے۔ ہمت گنوا دینے سے، حوصلہ چھوڑ دینے سے معمولی سی چیز بھی ہم پر حاوی ہو کر بڑی سے بڑی تکلیف میں مبتلا کر دیتی ہے۔'' اس کے گمبھیر لہجے میں سچائی، عزم و حوصلے کی چمک تھی۔

اس کی اسی جدوجہد، عزم و حوصلہ، محنت و دیانت داری نے حسن بیگ کو اس کا گرویدہ بنا یا تھا۔ سب سے زیادہ انہیں اس کے بلند ارادے، از حد دیانت نے متاثر کیا تھا اور وہ بہت کم عرصے میں ان کے لئے بہت اہم ہو گیا تھا۔ خیریت دریافت کرنے کے بعد وہ ضروری فائلز کھول کر ہی بیٹھے تھے کہ یکدم اوپر سے آوازیں آنا شروع ہوئی

تھیں۔ حسن صاحب کے چہرے پر پریشانی اس نے شدت سے نوٹ کی۔

''گل بانو...... گل بانو! کہاں مرگئی منحوس......؟'' آواز جتنی خوبصورت تھی، انداز اتنا ہی بدصورت۔ اس نے توجہ دیے بغیر کام جاری رکھا۔

''جی بی بی جی......'' ملازمہ کی آواز میں خوف تھا۔

''اُلو کی پٹھی، کہاں مرگئی تھی؟ تیرے باپ کی نوکر ہوں جو آوازیں لگاؤں؟'' زبان کے ساتھ ساتھ وہ شاید ہاتھوں کا استعمال بھی کر رہی تھی۔ چٹاخ، چٹاخ کی آوازیں ابھریں۔ حسن بیگ کے چہرے پر شرمندگی وندامت کے گہرے سائے پھیل گئے۔

''کمینی...... نمک حرام! تجھے ہمت کیسے ہوئی میرے بیڈ پر اپنے گندے پلے کو سلانے کی؟ میرا سارا بیڈ خراب کر دیا اس جاہل کی اولاد نے......'' آواز تھی یا شعلے۔

''معاف کر دیں بی بی صاحب! مجھے معلوم نہیں ہوا کہ کب منا یہاں آ کر سو گیا۔'' ملازمہ کی کانپتی، لرزتی آواز میں آنسوؤں کی نمی بھی تھی، ملازمت جانے کا خوف بھی۔

پیپرز پر سائن کرتے حسن صاحب کے ہاتھوں میں واضح لرزش تھی۔

''چپ کر ایڈیٹ! زبان چلاتی ہے۔'' ایک بار پھر چٹاخ کی زوردار آواز آئی تھی۔ اس بار حسن صاحب گھبرا کر اٹھ گئے تھے۔ اسے اطمینان سے بیٹھنے کا کہہ کر عجلت میں اوپر گئے تھے۔ شاہ ویز تیزی سے باقی کام کرنے لگا تھا۔ موڈ اس کا پوری طرح بگڑ گیا تھا۔ انسان وغربت کی تذلیل اسے کسی صورت گوارا نہ تھی۔

''دفع ہو جاؤ یہاں سے اپنی منحوس صورت لے کر اور کبھی یہاں کا رخ نہ کرنا۔'' لہجہ تھا یا دہکتا ہوا الاؤ، زبان تھی یا شرارہ؟ بلاواسطہ شاہ ویز کا رواں رواں جل اٹھا۔

''مشی! کیا ہو رہا ہے بیٹا؟'' حسن صاحب کی آواز میں بوکھلاہٹ واضح تھی۔

''دیکھیں نا پاپا! اس جاہل کی اولاد نے میرا بیڈ خراب کر دیا ہے۔''

''کوئی بات نہیں مشی! بچے کبھی کبھار ایسی حرکت کر دیتے ہیں۔ اس میں اس قدر غصے ہونے کی کیا بات ہے؟''

''اونو پاپا! یہ سب آپ کی ڈھیل ونرم دلی سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں مگر میں آپ کی طرح نہیں ہوں جو خاموشی سے سب کچھ برداشت کر لوں گی، ہوش ٹھکانے لگا دوں گی ان حقیر لوگوں کے جو مالکوں کی چیزوں پر قبضہ کرنے کے خواب دیکھتے ہیں۔''

''گل بانو! آئندہ احتیاط کرنا۔'' وہ اسے جانے کا اشارہ کر کے بولے۔

''آئندہ یہ ہو گی تو احتیاط کرے گی، منیجر سے ابھی تنخواہ لو اور ہمیشہ کے لئے دفع ہو جاؤ۔'' اس کی گھن گرج اور اشتعال ہنوز برقرار تھا۔

''ایسا ظلم نہ کریں بی بی جی! میرے بچے بھوک سے مر جائیں گے۔'' ملازمہ کی آواز میں بے بسی وبے چارگی کے آنسوؤں کی نمی تھی۔

''ہونہہ...... مرتے ہیں تو مر جائیں۔'' اس کے لہجے میں فطری سنگدلی وبے حسی تھی۔

''صاحب! شوگر کتنی لیں گے آپ؟'' اسی دم ملازم ٹرالی پر چائے کے لوازمات لے آیا۔

''تھینکس، مجھے چائے کی ضرورت نہیں ہے۔'' اس نے آہستگی سے کہا۔

''بڑے صاحب ناراض ہوں گے صاحب!''

''کیوں؟'' اس نے استعجابیہ انداز میں استفسار کیا تھا۔

''ان کا حکم ہے کہ کسی بھی مہمان کو خاطر ومدارت کے بغیر نہ جانے دیا جائے۔''

''میں مہمان نہیں ہوں، تمہاری طرح ہی ایک تنخواہ دار ملازم ہوں، اس وقت میرا موڈ قطعی نہیں ہے چائے پینے کا، پلیز یہ ٹرالی لے جاؤ۔'' اس کے لہجے میں قطعیت وبے زاری تھی۔ ملازم خاموشی سے ٹرالی لے کر چلا گیا۔

اس دوران اوپر سے آوازیں آنی بند ہو گئی تھیں۔ نہ معلوم کس طرح حسن صاحب نے معاملہ رفع دفع کیا تھا اور اس کے پاس چلے آئے تھے۔

''میں جاؤں سر؟'' انہیں بیٹھتے دیکھ کر اس نے اجازت طلب کی۔

''بیٹھو ینگ مین! ڈنر کر کے جانا۔'' ان کا لہجہ بہت تھکا تھکا تھا، خاصے مضمحل ودل گرفتہ نظر آ رہے تھے مگر شاید اس کی خاطر موڈ کو خوشگوار بنانے کی کوشش کی تھی۔

''تھینک یو سر! میں رک نہیں سکوں گا۔ دراصل بے جی کے بغیر میں رات کا کھانا نہیں کھاتا اور وہ بھی میرا انتظار کر رہی ہوں گی۔''

''بہت محبت کرتے ہو اپنی مدر سے۔ اوکے، کبھی ان کے ساتھ آپ کو انوائٹ کریں گے، پھر آپ کا کوئی عذر قابل قبول نہیں ہو گا۔'' وہ خوش دلی سے اس سے مخاطب ہوئے تھے اور گیٹ تک چھوڑنے اسے خود آئے تھے۔

□●□

وہ ذہین تھا، ذمے دار اور از حد محنتی ہونے کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ کمپیوٹر انجینئرنگ میں اسی سال اس نے ڈگری لی تھی۔ کافی تگ ودو کے بعد اسے مشعل انڈسٹریز میں جاب ملی تھی جہاں حسن صاحب کی جوہر شناس نگاہوں نے بہت جلد اس کی صلاحیتوں وذہانت کو پرکھ لیا تھا۔ اب وہ ان کے بہت قریب تھا۔ وہ اس پر بہت زیادہ اعتماد وبھروسہ کرتے تھے۔ اس نے بھی کبھی انہیں مایوس نہیں کیا تھا۔ ہر طرح سے ان کے اعتماد وتوقع پر پورا اترا تھا۔

حسن صاحب کی طبیعت اکثر خراب رہنے لگی تھی۔ بظاہر تو انہیں ایسی کوئی بڑی بیماری نہیں تھی جو خطرناک ثابت ہوتی مگر بہت زیادہ سوچنے وفکر مند رہنے کی وجہ سے انہیں ڈپریشن رہنے لگا جس کے باعث بی پی ہائی لیول تک بڑھ جاتا تھا جس سے انہیں کوئی خطرناک عارضہ کبھی بھی لاحق ہو سکتا تھا۔

ڈاکٹر نے سختی سے انہیں ٹینشن لینے سے منع کیا تھا۔ شاہ ویز نے اکثر محسوس کیا تھا کہ وہ کوئی بات اس سے کہنا چاہتے ہیں، کوئی پرابلم شیئر کرنا چاہتے ہیں مگر شاید جھجک یا الجھن آگے بڑھنے نہ دیتی تھی۔ وہ صرف سوچتی نگاہوں سے اسے دیکھتے رہ جاتے۔

آج دو دن بعد وہ آفس آئے تھے۔ طبیعت ان کی بہت بہتر تھی۔

''شاہ ویز! آج آپ کے پاس کام ہو گا؟ پراجیکٹ کے سلسلے میں کچھ لوز پوائنٹ ہیں، ان پر ڈسکس کر کے کوئی حل نکالتے ہیں۔'' انٹرکام پر ان کی آواز ابھری تھی۔

''یس سر! میں حاضر ہوتا ہوں۔'' اس نے مؤدبانہ لہجے میں کہہ کر ریسیور رکھا تھا۔ کچھ ڈاکومنٹس اور اہم فائلز تھیں جنہیں کمپیوٹر میں سیف کرنے میں اسے زیادہ وقت نہ لگا تھا۔ حسن صاحب کے پاس بیٹھ کر مسائل کا حل نکالنے میں خاصا وقت صرف ہو گیا تھا۔

جب وہ آفس سے نکلا تو شفق رنگ آسمان نے سیاہ عبا اوڑھ لی تھی۔ موسم خوشگوار تھا، ٹھنڈی ہوا جسم وجاں میں سرشاری پیدا کر رہی تھی۔ وہ اطمینان سے بائیک دوڑاتا ہوا جا رہا تھا کہ معاً اس کی نگاہ سائیڈ سے نکل کر سامنے آنے والی لینڈ کروزر پر پڑی۔ اس کی رفتار فاسٹ تھی۔ اگر وہ بروقت بائیک کی اسپیڈ کم کر کے اسے روک نہ لیتا تو خوفناک تصادم لازمی تھا، جس میں اس ہیوی گاڑی کو معمولی سے ڈینٹ پڑتے لیکن اس کے بائیک سمیت پرخچے اُڑ چکے ہوتے۔ ابھی وہ بائیک اسٹینڈ کر کے پلٹا ہی تھا کہ لینڈ کروزر میں سے چھ نوجوان اترے تھے، خوفناک تیور لئے، کانوں میں بالیاں، گلوں میں رنگ برنگے چینز، لاکٹ ڈالے، ہاتھوں میں بریسلٹس پہنے، جینز و جیکٹس میں ملبوس وہ لوگ چہروں سے ہی اوباش غنڈے لگ رہے تھے۔ تیزی سے انہوں نے اس کے گرد گھیرا ڈالا تھا اور اس دوران ان کے ہاتھوں میں ڈنڈا، چاقو، زنجیر کے علاوہ خطرناک ہتھیار بھی آ گئے تھے۔

''کون ہیں آپ لوگ......؟ اور میرا راستہ کیوں بلاک کیا ہے آپ نے؟'' وہ حیرانی سے اُن سے مخاطب ہوا تھا۔

اسی لمحے نہ معلوم کہاں سے جوجو نکل کر سامنے آیا تھا۔

''کیوں بے، نکل گئی ساری ہوا؟ آج بول، اس دن لڑکی کو ساتھ دیکھ کر بہت بڑھکیں مار رہا تھا۔ کیا کہا تھا اس دن تُو نے مجھے، کارٹون، مچھر، بہت طاقت ہے نا تیرے بازوؤں میں۔ تُو مجھے مچھر کی طرح مسل کر پھینک سکتا ہے...... ہوں...... آج دیکھتا ہوں تیری ہمت اور بازوؤں کی طاقت...... اُس دن مشعل کو امپریس کرنے کے لئے لمبی لمبی چھوڑ رہا تھا۔''

''اس دن بات تم نے شروع کی تھی اور آج بھی تم ہی پہل کر رہے ہو، بہتر یہی ہو گا کہ میرا راستہ چھوڑ دو۔'' اس نے بے خوف لہجے میں کہا۔

''نہیں چھوڑیں گے راستہ، کیا کرے گا؟'' اُن بدمعاشوں میں سے ایک بولا۔

''یار! راستہ تو ہم چھوڑ دیں گے، مگر یہاں کا نہیں، سیدھا ''اوپر'' جانے کا۔'' دوسرا قہقہہ لگاتے ہوئے بولا تو باقی سب نے بھی ساتھ دیا۔

''ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے جوزف! قبل اس کے کہ یہاں کوئی آ جائے کام تمام کر دو اس کا۔ مشی کے سامنے بہت بے عزتی کی ہے اس نے میری۔ بالکل ہی ویلیو ڈاؤن کر دی ہے۔ وہ خفا ہے مجھ سے...... میں نے وعدہ کیا ہے اس سے جب تک اس شخص سے حساب برابر کر کے اسے مزا نہ چکھا دوں، تب تک اس کو اپنی شکل نہیں دکھاؤں گا۔ دو دن سے اس کی تلاش میں تھا۔ آج موقع ملا ہے، اب دیر مناسب نہیں۔''

خاصے جذباتی انداز میں اس نے تقریر کی تھی۔ اس کا اشارہ پاتے ہی وہ سب بھوکے بھیڑیوں کی طرح شاہ ویز پر جھپٹے تھے۔ خود کو بچانے کے لئے اس نے خاصی جدوجہد کی تھی مگر بے سود...... وہاں کوئی فلمی شوٹنگ نہیں ہو رہی تھی کہ جہاں تمام نقلی غنڈے مصنوعی ہتھیاروں سے لیس ہو کر تنہا ہیرو سے خوب مار کھا کر دم دبا کر بھاگ جاتے ہیں اور ہیرو صاحب کی دلیری وبہادری اور رائٹ فائٹنگ پر لوگ عش عش کر اٹھتے ہیں اور کچھ دیر قبل ناراض وبے نیاز نظر آنے والی ہیروئن جھٹ ہیرو کے بازوؤں میں گاتا گاتی نظر آتی ہے۔ یہاں صورت حال مختلف تھی۔ اصلی غنڈوں کے پاس ہتھیار بھی اصلی ہی تھے، ولن بھی اصلی تھا، نہ ہی تالیاں بجا بجا کر حوصلہ دینے والی ہیروئن تھی۔ وہ تنہا تھا اور باوجود کوشش کے زیادہ دیر ان سے مزاحمت نہ کر سکا۔ معاً پیچھے کی جانب اس کے سر پر زوردار ڈنڈا پڑا تھا اور ساتھ جسم پر بھرپور طریقے سے پڑنے والی کانٹے دار زنجیر اس کا گوشت ادھیڑنے کے ساتھ انگارے سے بھر گئی تھی۔ سر سے خون کا فوارہ سا نکلا تھا۔ وہ آواز نکالے بغیر اپنے خون میں نہایا زمین پر گرا تھا...... اس نے تاریک ہوتے ذہن کو سنبھالنے کی بہت کوشش کی مگر ہر سُو تاریکی ہی تاریکی تھی...... پھر ایک نوکیلی شے اس کے پہلو میں اترتی چلی گئی اور بے ساختہ درد وکرب کے احساس سے اس کے ہونٹوں سے آہ نکل کر دور تک پھیل گئی تھی۔ ساتھ ہی درد وتکلیف کے طوفانوں نے اس کی ہستی کو اپنی لپیٹ میں لیا تھا...... تاریکی اور گہری ہوتی چلی گئی تھی۔

اس نے خود کو سنبھالنے کی بہت کوشش کی مگر سانس جیسے سینے میں اٹک کر رہ گیا تھا۔ دوسرے لمحے اس کی آنکھیں بند ہوتی چلی گئیں۔

''بس یار! جلدی چلو، خود ہی مر جائے گا۔'' جوجو نے دور سڑک پر نمودار ہونے والے جگنوؤں کو دیکھ کر بہ عجلت کہا تھا۔

''ابھی تو مزا آنے لگا تھا اور تُو کہہ رہا ہے چلو۔'' جوزف نے جو ایک مرتبہ چاقو شاہ ویز کے پہلو میں اتارنے کے بعد دوسرا وار کرنے کے لئے ہاتھ بلند کیا ہی تھا کہ اس کی گھبرائی ہوئی آواز و انداز نے اس کا موڈ بگاڑ دیا تھا۔ وہ شاید جنونی اذیت پسند تھا اور ایسے لوگوں کو خون بہا کر، اذیت دے کر اور تڑپا تڑپا کر مارنے میں دلی راحت و سکون محسوس ہوتا ہے۔

''مجھے لگ رہا ہے کوئی آ رہا ہے...... فٹافٹ چلو۔ اگر کسی نے دیکھ لیا تو......''

''ٹھیک کہتی ہے مشی تم کو، بزدل اور ڈرپوک۔ جب تم میں اتنا حوصلہ نہیں تھا تو صرف ہمیں بتا دیا ہوتا، خود کیوں ساتھ آئے؟ اس طرح شکار کو چھوڑنا ہماری بہادری گوارا نہیں کر رہی۔'' دوسرا لڑکا جس نے شاہ ویز کو زنجیر ماری تھی بڑے خراب لہجے میں مخاطب ہوا تھا۔ کانٹے دار خون آلود زنجیر ابھی بھی اس نے تھام رکھی تھی۔

شاہ ویز نیچے زمین پر پڑا ہوا تھا بے سدھ، بے خبر۔ اپنے خون میں ڈوبا ہوا۔

ان میں خوب بحث جاری تھی۔ جوجو انہیں لے کر فوراً نکل جانا چاہتا تھا کیونکہ دور سے جگنو کی طرح نظر آنے والی لائٹس اب قریب آتی جا رہی تھیں جو یقیناً کسی کار کی ہیڈ لائٹس تھیں مگر ابھی بھی کار کافی فاصلے پر تھی۔

''او کے، او کے، میں بزدل ہوں، ڈرپوک ہوں مگر بے وقوف اور جذباتی نہیں ہوں۔ جو تم لوگ ہو۔ جب میں کہہ رہا ہوں اس کا اتنا خون بہہ چکا ہے اور بہہ رہا ہے تو اس کا بچنا ناممکن ہے۔ اسے مرنا ہے تو سسک سسک کر ہی مرنے دو۔ کیوں ایک دم مار کر اسے تکلیف سے نجات دلانا چاہتے ہو۔'' جوجو نے بحث سے تنگ آ کر چیخ کر کہا۔

''ویل ڈن میری جان! شاید پہلی مرتبہ تم نے عقلمندی کی کوئی بات کی ہے۔ چلو، چلو مر جائے گا خود ہی۔ اگر زندہ بھی رہا تو ہمیشہ یاد رکھے گا کہ کس کے فرینڈز سے ٹکرلی تھی۔ ڈر کے مارے آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔'' جوزف کے ساتھ ان سب نے قہقہے لگائے تھے۔

''ایک منٹ......'' جوجو گاڑی سے چھلانگ مار کر نیچے اترا اور بھاگتا ہوا سامنے گری ہوئی بائیک کے پٹرول ٹینک سے پٹرول لیک کر کے لائٹر جلا کر اس طرف اچھالا تھا اور بھاگتا ہوا واپس گاڑی میں آ کر بیٹھ گیا تھا۔ اس دوران اس کی جیب سے نکل کر کچھ نیچے گرا تھا جسے وہ جلدی اور گھبراہٹ میں محسوس نہ کر سکا تھا کیونکہ کار خاصی قریب آ گئی تھی اور بہت جلد ان تک پہنچنے والی تھی۔

''اس بائیک کی وجہ سے یہ سب ہوا ہے۔ ویسے بھی جب بائیک والا ہی نہ رہے گا تو بائیک بے کار ہو جائے گی۔'' جوجو نے مسکرا کر کہا تھا اور تیزی سے گاڑی آگے بھگا کر لے گیا تھا۔ لمحوں میں لینڈ کروزر ہواؤں سے شرط لگاتی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تھی۔

□●□

''سر، آگے اسکوٹر جل رہی ہے...... اور اس طرف لاش پڑی ہے۔''

''روکو...... کار روکو......'' وہ گھبرا کر ڈرائیور سے پہلے کار سے نکلے تھے اور کچھ دور پڑے اس خون میں نہائے وجود کی طرف بڑھے تھے۔

''اوہ، اوہ آصف! یہ...... یہ شاہ ویز ہے! اوہ یہ کیا ہو گیا ہے، کس نے کیا ہے؟ مائی گاڈ! بہت خون بہہ گیا ہے۔'' حسن بیگ نے جیسے ہی اس کا چہرہ دیکھا تھا ان کی عجیب حالت ہو گئی تھی۔

''سر! سامنے بائیک پورا جل گیا ہے اور بائیک کے پاس سے یہ والٹ ملا ہے۔''

''شاہ ویز کا ہی ہو گا یہ۔ تم جلدی سے شاہ ویز کو اٹھوا کر میرے ساتھ کار میں لٹاؤ۔'' انہوں نے والٹ کوٹ کی جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔

''کار میں؟...... سر ایمبولینس بلوا لیتے ہیں۔''

''نہیں...... ٹائم نہیں ہے۔ شاہ ویز کی حالت بہت سیریس ہے۔ لمحہ لمحہ قیمتی ہے، بلیڈنگ بہت ہو چکی ہے اور ہو رہی ہے۔'' بہت احتیاط سے انہوں نے شاہ ویز کو اٹھوا کر کار کی پچھلی سیٹ پر لٹایا تھا۔ اس کے لمبے چوڑے گھائل وجود کو اس پر سیٹ کرنے میں بھی خاصی دقت و احتیاط کا سامنا کرنا پڑا تھا اور خود حسن بیگ سیٹ کی درمیانی جگہ پر بیٹھ گئے تھے۔ دونوں ہاتھ اس پر رکھے ہوئے تاکہ ڈرائیونگ کے دوران کسی جھٹکے سے وہ نیچے نہ گر جائے۔

آصف فل اسپیڈ میں کار دوڑا رہا تھا۔ حسن بیگ کے لبوں سے اس کے لئے دعائیں نکل رہی تھیں، جس کے چہرے پر موت کی زردی کھنڈی ہوئی تھی، سانسوں کی رفتار سست پڑ رہی تھی۔ کی بورڈ پر بجلی کی سی پھرتی سے چلنے والے ہاتھ بے جان پڑے تھے۔

□●□

''الٰہی خیر!'' یکدم ہی موسم نے پلٹا کھایا۔ سارے دن آسمان پر آوارہ گردی کرنے والے چھوٹے چھوٹے سرمئی ٹکڑے یکلخت ہی متحد ہو کر گہری سرمئی چادر میں تبدیل ہو کر آسمان پر چھا گئے تھے اور لمحوں میں موٹے موٹے شفاف پانی کے قطرے ہر سُو بکھرنے لگے تھے اور یک دم ہی ہوا منہ زور گھوڑے کی مانند سرپٹ دوڑنے لگی۔ آن واحد میں طوفانی ہواؤں سے گرد و غبار کے ساتھ عجیب زرد زرد سی فضا ماحول پر چھا گئی تھی۔ ہوائیں کھڑکیوں، دروازوں کے پٹ بری طرح جھنجھوڑ رہی تھیں۔

صحن کے بیچوں بیچ لگا نیم کا درخت لگ رہا تھا کسی بھی لمحے اپنی جڑوں سمیت زمیں بوس ہو جائے گا۔ موٹی موٹی بوندیں موسلا دھار بارش میں تبدیل ہو گئیں اور بادلوں کی گرج، بجلی کی چمک رہے سہے اوسان بھی خطا کئے ڈال رہی تھی۔

بے جی دل پہ ہاتھ رکھے الٰہی خیر...... الٰہی خیر کا ورد کرتی ہوئی اِدھر اُدھر متوحش انداز میں ٹہل رہی تھیں۔ جب کہ زرینہ اطمینان سے پلنگ پر بیٹھی چائے پی رہی تھیں۔

''سچ آپا، بچپن سے نکل کر پچپن کے لپیٹے میں آ گئی ہو مگر یہ بارش، گرج و چمک سے ڈر تمہارا ابھی تک نہیں گیا۔ اللہ قسم تمہیں ابھی بھی اس طرح خوفزدہ و پریشان دیکھ کر مجھے بچپن کے وہ دن یاد آ رہے ہیں جب تم اسی طرح ڈر کر اماں کی گود میں چھپ جایا کرتی تھیں اور اماں ساری رات تمہیں سینے سے لگائے رکھتے تھے۔ ماں، مال پوے، میٹھی ٹکیاں، گلگلے کتنی محبت سے بناتی تھیں اور تمہارے لئے دال بھرے پراٹھے تو خصوصی طور پر بناتی تھیں مگر تم ایک نمبر کی ڈرپوک، تمہارا پیٹ تو خوف کھانے سے ہی ہر وقت بھرا رہتا تھا تو بھلا وہ چیزیں کیوں کھاتیں۔ کیا دن تھے وہ بھی آپا! کیسی اچھی اور سکھی زندگی تھی، ہر طرف پیار ہی پیار، محبت ہی محبت، خلوص ہی خلوص، نفسا نفسی اور عداوتیں نام کو نہ تھیں۔ جب کہیں بھی ملاوٹ نہیں تھی نہ رشتوں میں نہ خلوص و پیار میں اور نہ ہی چیزوں میں۔ اب تو گویا ہر شے میں ہی ملاوٹ ہو گئی ہے۔ اس ملاوٹ سے اشیاء خورد و نوش ہی نہیں محفوظ رہیں بلکہ یہ وبا اتنی تیزی سے پھیلی ہے کہ اس کی لپیٹ میں انسان، رشتے، ناتے، محبت، خلوص، پیار، عزت و احترام سب کچھ ہی آ گیا۔ شاید جبھی حُسن بھی زندگی کا مسخ ہو گیا ہے۔''

وہ بولتے بولتے ایک دم ہی رنجیدہ ہو گئی تھیں۔

''زرینہ! میں گھر جاؤں گی، میرا دل بہت گھبرا رہا ہے۔'' ان کے اندر عجب سی کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ ایک اذیت کا احساس تھا جیسے کوئی ان کے دل کو دبوچ رہا ہو، ایک بے نام سی وحشت و ویرانی انہیں محسوس ہو رہی تھی۔ دماغ کی رگیں تنی ہوئی تھیں۔ وہ زرینہ کے ہلتے ہونٹ محسوس کر رہی تھیں مگر سماعت بیدار نہ تھی۔

''میں نے کہا زرینہ! میں گھر جا رہی ہوں۔''

''کیا ہوا آپا! میں کہہ تو رہی ہوں باہر موسم بہت خراب ہے۔ گھر کیسے......''

''میرے اندر کے موسم سے زیادہ خراب نہیں ہے۔ میرا بچہ میرا انتظار کر رہا ہو گا۔'' انہوں نے سائیڈ کی دیوار پر لگی کھونٹی سے اپنا برقع اتارتے ہوئے کہا۔

''غضب خدا کا، گھر میں ہی بیٹھی ہو آپا! پھر کیوں اس قدر بے چین ہو رہی ہو۔ اور اللہ بھلا کرے شاہ ویز کوئی دودھ پیتا بچہ نہیں ہے جو گھر میں ڈر جائے گا۔'' وہ ان کے ہاتھ سے برقع لیتی ہوئی خفگی سے بولیں۔

''مجھے مت روک زرینہ، میرا دل گھبرا رہا ہے۔ نہ معلوم کیا ہوا ہے؟ کیا ہونے والا ہے؟ مجھے لگ رہا ہے جیسے...... جیسے میرے شاہ ویز کو کوئی مجھ سے چھین رہا ہو۔'' ان کے لہجے میں لرزش، آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک تھی۔ لمحے بھر کو زرینہ کا دل بھی کانپ اٹھا تھا مگر وہ فطرتاً لاپرواہ و بے فکری طبیعت کی مالک تھیں۔ دوسرے لمحے خود کو سنبھال کر بولیں۔

''کون چھینے گا شاہ ویز کو تم سے بھلا۔ بے شک اس کو جنم تم نے نہیں دیا مگر آنکھ کھولی اس نے تمہاری آغوش میں، چھبیس سال کے ہر لمحے میں تم اور تمہارا عکس اس کے ساتھ رہا ہے۔ تم نے اس کے لئے ہر وہ تکلیف و پریشانی اٹھائی جو صرف اور صرف سگی ماں ہی اولاد کی خاطر جھیل سکتی ہے۔ کل کے ننھے سے بوٹے کو آج تناور درخت تمہاری محبت نے بنایا ہے۔ پھر تم سے کون چھین سکتا ہے اسے؟''

''اللہ میرے بچے کو اپنی امان میں رکھے، ہر بلا و تکلیف سے بچائے۔'' دعا مانگتے مانگتے وہ بے اختیار رونے لگی تھیں۔

''خالہ جان! کیا ہوا؟'' اندر کمرے سے اصغر نکلا۔ انہیں روتا دیکھ کر پریشانی سے پوچھنے لگا۔

''کچھ نہیں، بس آپا کا دل تو شروع سے ہی کمزور ہے۔ آج ایک طویل عرصے کے بعد یہاں آئی ہیں تو شاہ ویز کی طرف سے پریشان ہو رہی ہیں۔'' بیٹے سے بات کرتے وقت ان کی تیوریوں میں بل پڑ گئے تھے، لہجہ سخت ہو گیا تھا۔

''خالہ جان! فکرمند ہونے کی کوئی بات نہیں ہے۔ تھوڑا بارش کا زور کم ہو جائے میں جا کر شاہ ویز کو لے آؤں گا یا میرا خیال ہے وہ خود ہی آ جائے گا۔''

''بیٹا! نہ معلوم کیوں مجھے عجیب سے وسوسے آ رہے ہیں۔ کیا...... کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ مجھے ابھی گھر لے چلو۔'' وہ اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر ملتجی لہجے میں بولیں۔ اصغر نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔ اسی لمحے لائٹ فیل ہو گئی۔

''لو...... یہ لائٹ بھی چلی گئی۔ اب میں کہاں موم بتی ڈھونڈتی پھروں، بہو بیگم کو سیر سپاٹوں سے فرصت نہیں، گھر گیا بھاڑ میں۔ ایک ہفتے سے ماں کے ہاں گئی ہوئی ہے، واپسی کی فکر ہی نہیں ہے اور فکر ہونے بھی کیوں لگی۔ مجنوں میاں تو صبح و شام حاضری دے کر آ رہے ہوں گے۔ ماں کی انہیں کہاں پرواہ ہے، کل کی مرتی آج مر جاؤں،

ان کے دلوں کی مراد بر آئے گی۔" وہ حسب عادت شروع ہو گئی تھیں۔ اصغر خاموشی سے موم بتیاں لینے چلا گیا تھا۔ باہر بارش ٹوٹ کر برس رہی تھی۔ ہوا کے جھکڑ بند ہو گئے تھے مگر گرج چمک اسی طرح ہو رہی تھی۔

"خاموش ہو جاؤ زرینہ، کبھی کبھی ایسی باتیں درگزر بھی کر دیا کرو۔"

"کیسے خاموش ہو جاؤں آپا، میرے ہی گھر میں میری کوئی عزت نہیں ہے۔"

"اس کی ذمے دار بھی تم خود ہی ہو۔"

"آں، یہ تم کہہ رہی ہو آپا...... تم؟ آئے ہائے، میرے نصیب کہ......"

"خاموش رہو، بالکل خاموش۔ عزت کروانے کے لئے ایثار، درگزر، ضبط وتحمل کی ضرورت ہوتی ہے۔ اپنی "میں" کو مارنا پڑتا ہے۔ لیکن تم بچوں کے ساتھ بچی بنی ہوئی ہو۔ سیدھی اور کھری بات یہ ہے کہ عزت کروانے کے لئے عزت کرنی چاہئے۔ چاہے چھوٹا ہو یا بڑا۔" انہوں نے رسانیت سے انہیں سمجھایا۔

"اچھا، اب چھوٹوں کی عزت کریں گے تب ہماری عزت ہوگی۔"

"ہاں...... وقت ہی ایسا ہے اور سیانا وہی ہے جو وقت کے ساتھ چلے۔"

"خالہ جان! باہر گلیوں میں پانی بھرا ہوا ہے۔ بارش کم نہیں ہو رہی اور لائٹ بھی نہیں ہے۔ ایسے میں گھر سے نکلنا خطرے سے خالی نہیں۔ آپ صبح تک انتظار کر لیں۔" اصغر نے باہر کی صورت حال بتانے کے ساتھ ساتھ موم بتیاں بھی روشن کر دی تھیں۔

"اچھا ٹھیک ہے، جو اللہ کی مرضی۔" انہوں نے پژمردگی سے کہا اور وضو کرنے آگے بڑھ گئیں۔ اصغر ماں سے مخاطب ہوا۔

"امی جان! کھانا ہوٹل سے لے آؤں گا۔"

"گلیوں میں پانی بھرا ہے کیا تیر کر لاؤ گے؟" انہوں نے جواب میں پتھر سا مارا۔

"اسٹاپ والا علاقہ زیادہ خراب ہو رہا ہے۔ ہوٹل تک راستہ ذرا بہتر ہے۔"

"ہاں بھئی، بیوی نے عادتیں بگاڑ دی ہیں۔ ہوٹلوں کا کھانا کھلا کھلا کر اب گھر کا کھانا کہاں پسند آئے گا؟" وہ بیٹے کی ہمدردی کو غلط رنگ دیتی، بڑبڑاتی ہوئی چلی گئیں۔

□●□

شہر کے معروف و مہنگے ترین ہسپتال میں اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا تھا۔ ایک وجہ تو خود حسن بیگ کی موجودگی تھی کہ وہ مشہور انڈسٹریلسٹ تھے۔ ان کی شناخت خاصی جگہوں پر تھی، دوسرے اس ہسپتال کے مالک سے ان کی دوستی تھی جو یہاں کڈنی اسپیشلسٹ کے طور پر بھی بیٹھتے تھے اور انہوں نے ہی یہ کیس اپنے ذمے لیا تھا۔ شاہ ویز آپریشن روم میں تھا۔ اس کی حالت ابھی تسلی بخش نہیں تھی۔

بیگ صاحب آصف کے ہمراہ آپریشن تھیٹر کے باہر گیلری میں بچھے صوفے پر بیٹھے تھے۔ مضطرب و پریشان اور آصف دل ہی دل میں ان کے خلوص و محبت کو داد دے رہا تھا۔ ایک ملازم کے لئے مالک کا اتنا فکر مند و پریشان ہونا اس دور میں ناقابل یقین تھا مگر یہ سب اس کے سامنے ہو رہا تھا اس کے لئے وہ حیران تھا۔

"سر! شاہ ویز صاحب بچ جائیں گے نا؟"

"دعا کرو آصف! دعاؤں میں بہت طاقت ہوتی ہے۔" انہوں نے آہستگی سے کہا۔

"شاہ ویز صاحب کے لئے تو دل سے دعائیں نکلتی ہیں سر۔ بہت نیک اور ہمدرد طبیعت پائی ہے انہوں نے۔ سمجھ میں نہیں آتا اتنے اچھے انسان کا کون دشمن ہو سکتا ہے۔"

"دشمن اچھے انسانوں کے ہی ہوتے ہیں۔ موسم بہت خراب ہے۔ مجھے یہاں نہ معلوم کتنا وقت لگ جائے۔ تم گھر چلے جاؤ۔ تمہارے گھر والے پریشان ہو رہے ہوں گے۔" حسن بیگ نے رسٹ واچ میں ٹائم دیکھتے ہوئے ڈرائیور سے کہا۔

"نہیں سر! میں تنہا ایسے موقع پر آپ کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا بلکہ آپ کو گھر چھوڑ کر آ جاؤں پھر یہاں رک جاؤں گا، آپ سارے دن کے تھکے ہوئے ہیں۔"

"نہیں، میں گھر نہیں جاؤں گا۔ جس طرح شاہ ویز تمہیں عزیز ہے، اسی طرح وہ مجھے عزیز تر ہو گیا ہے۔ بہت کم لوگوں میں یہ خاصیت ہوتی ہے کہ وہ جس کو دیکھتے ہیں وہ ان کے ہو جاتے ہیں۔ بہت کم عرصے میں اس نوجوان نے ہمیں اپنا اسیر کر لیا ہے۔ اس جیسی ذہانت، قابلیت اور خود اعتمادی کسی کسی کو نصیب ہوتی ہے۔" حسن صاحب کی آواز بہت دھیمی تھی جیسے وہ خود سے محو گفتگو ہوں۔

"نہ معلوم کچھ انسانوں میں حیوانیت کیوں اس قدر سرایت کر چکی ہے کہ ان کی گھناؤنی و بے رحمانہ حرکات انسانیت کو منہ چھپانے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ کیسے بے ضمیر و درندہ صفت لوگ تھے جنہوں نے نہ صرف اپنے وحشیانہ سلوک سے زندہ و صحت مند شخص کو زخم زخم کر کے موت کی دہلیز کی طرف دھکیل دیا ہے بلکہ بے حسی و بدلحاظی کی بدترین مثال وہ بائیک جلا کر پیش کی ہے۔ یہ کیسا اندھا انتقام ہے جو انسانوں کو ہی نہیں بلکہ ان سے وابستہ ہر شے کو خاکستر کر ڈالتے ہیں۔"

"یہ کچھ لوگوں کا مزاج بن گیا ہے۔ مگر سر! آپ ان لوگوں کو ضرور سزا دلوائیے گا جو اتنے سفاک و ظالم ہیں۔" آصف نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

"ہاں ضرور...... شاہ ویز ہوش میں آ کر نشاندہی کر دیں گے۔"

"سر! اگر آپ اجازت دیں تو کاؤنٹر سے گھر فون کر کے اطلاع کر دوں ورنہ گھر والے پریشان ہو رہے ہوں گے۔" کچھ دیر بعد آصف نے اجازت چاہی۔

"ہاں، ہاں...... ضرور۔ بلکہ میں کہہ رہا ہوں گھر چلے جاؤ۔ اگر نہیں جانا چاہ رہے تو گھر اطلاع لازمی کر دو۔" انہوں نے فوراً اجازت دی تھی۔ آصف چلا گیا تھا۔ انہوں نے تھک کر صوفے کی بیک سے ٹیک لگالی۔ معاً انہیں یاد آیا کہ شاہ ویز کے گھر والے بھی اس کا انتظار کر رہے ہوں گے اور ایک تو موسم کی خرابی دوسرے اس کی اتنی دیر کی غیر حاضری پر وہ پریشان ہوں گے۔ یہ انہیں معلوم نہ تھا کہ اس کے گھر میں کتنے افراد ہیں مگر اکثر شاہ ویز سے کسی بے جی کا ذکر سنتے رہے تھے۔ اس کے لہجے کے والہانہ پن سے انہیں اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ بے جی کو دل و جان سے بڑھ کر چاہتا ہے اور یقیناً وہ بھی اسے اسی طرح عزیز رکھتی ہوں گی۔

اس خیال نے بری طرح چونکایا تھا۔ وہ سیدھے ہو بیٹھے اور تیزی سے کوٹ کی جیب سے آصف کو ملنے والا والٹ نکالا، اس میں شاہ ویز کا ایڈریس اور فون نمبر وغیرہ ضرور ہوگا۔ والٹ کی چھوٹی سی زپ کھولنے کے بعد وہ اندر لگے فوٹو کو دیکھ کر شاکڈ رہ گئے تھے۔

"اوہ نو، یہ جوجو کا والٹ وہاں کیسے گرا؟"

اندر مشعل اور جوجو کی فوٹو لگی ہوئی تھی اور چیک کرنے پر انہیں معلوم ہو گیا کہ وہ والٹ جواد کا ہی تھا۔ کیوں کہ اندر سے اس کے آئیڈینٹی کارڈ کے علاوہ اور بھی کارڈز ملے تھے جو اسی کے تھے۔ حسن صاحب کے اندر دھماکے ہو رہے تھے۔ بہت تیزی سے ان کے اندر مختلف مناظر ابھر رہے تھے اور جو صورت حال ان کے ذہن میں ابھری اس نے سچ مچ ان کے حواس گم کر دیئے تھے۔

ایسے ٹھنڈے موسم میں بھی ان کے مساموں سے پسینہ بہہ نکلا تھا۔ غم و غصے سے کنپٹیاں سلگنے لگی تھیں۔ دل کی دھڑکنیں تیز تر ہو گئی تھیں۔

"مبارک ہو حسن، مسٹر شاہ ویز اب خطرے سے باہر ہیں۔" اسی دم سرجن سعید خان نے گرم جوش لہجے میں اطلاع دی تھی مگر ان کے چہرے پر نگاہ پڑتے ہی گھبرا کر آگے بڑھ کر انہیں سنبھالا تھا جو آنکھیں بند کئے لڑکھڑا رہے تھے۔

"ارے، کیوں اس قدر پریشان ہو رہے ہو...... اب خطرے کی کوئی بات نہیں ہے۔ چند گھنٹے بعد ہوش آ جائے گا انہیں۔" سعید خان انہیں سہارا دے کر اپنے روم میں لے آئے جہاں پانی پینے اور کچھ دیر آنکھیں بند کر کے بیٹھنے کے بعد ان کی حالت قدرے سنبھلی تھی اور شاہ ویز کی زندگی بچ جانے کی خوش خبری نے ان کے اندر کی وحشتوں اور غم و غصے کو قدرے اطمینان بخشا تھا۔ مگر جواد کی طرف سے ان کے دل میں غبار پھیل گیا تھا۔

"شکر ہے پروردگار کا...... بہت بہت احسان ہے تیرا، ورنہ جس طرح اس کی بلیڈنگ ہوئی تھی میں بہت خوف زدہ ہو گیا تھا۔" انہوں نے مسکرا کر تشکرانہ لہجے میں کہا۔

"یہ اس کی خوش نصیبی تھی جو بلڈ کا بندوبست ہسپتال کے بلڈ بینک سے ہو گیا تھا۔"

"اس کے زخموں کی کیا پوزیشن ہے؟"

"زخم خاصے گہرے ہیں۔ ایک ماہ کا آرام ضروری ہے اور ساتھ میڈیکل ٹریٹمنٹ بھی۔"

"ٹھیک ہے...... میں اس کی زندگی کی نوید پا کر بہت خوش ہوں سعید۔"

"ہوں، میرا خیال درست ثابت ہوا۔" وہ انٹر کام پر کافی اور سینڈوچز کا آرڈر دینے کے بعد معنی خیز مسکراہٹ لبوں پر سجا کر ان سے مخاطب ہوئے۔

"کیسا خیال؟" جواباً وہ بھی مسکرائے۔

"شاہ ویز، شاید مشی کے فیانسی ہیں۔ یعنی ہمارے ہونے والے داماد، کیوں درست ہے میرا خیال؟ مسلسل تمہاری یہاں موجودگی، پریشانی، فکر...... یہ سب کسی اجنبی کے لئے تو نہیں ہو سکتیں۔" وہ اطمینان سے کہہ رہے تھے۔

"شاہ ویز میرے......"

"سر! پیشنٹ کو ہوش آ گیا ہے اور وہ گھر جانے کی ضد کر رہے ہیں۔" قبل اس کے کہ وہ ان کی غلط فہمی دور کرتے ایک نرس پریشانی سے آ کر گویا ہوئی۔

"اتنی جلدی ہوش آ گیا ہے......" وہ حسن صاحب کے ہمراہ وہاں چلے آئے تھے۔

"کیسا فیل کر رہے ہیں بیٹے آپ؟" حسن صاحب اس سے شفقت سے مخاطب ہوئے تھے۔

"میں گھر جانا چاہتا ہوں، بے جی پریشان ہو رہی ہوں گی۔" وہ نیم غنودگی میں تھا اور بے جی کی پریشانی کے خیال و فکر مندی نے اسے وقت سے پہلے بیدار کر دیا تھا۔ مگر کیفیت اس کی نیم بے ہوشی کی تھی۔ آنکھیں بند تھیں، ہونٹ ہل رہے تھے۔

"بیٹا! ابھی آپ کی حالت چلنے پھرنے کی نہیں ہے۔ آپ کے پیٹ کا آپریشن کیا گیا ہے۔ سر کے زخم میں بھی ٹانکے لگے ہیں، پشت کے زخموں پر ڈریسنگ ہے۔ ابھی

ایک ہفتے تک آپ کو مکمل بیڈ ریسٹ کرنا ہوگا۔“ ڈاکٹر سعید نرمی سے سمجھا رہے تھے۔

”مجھے بے جی کے پاس جانا ہے۔ وہ پریشان ہو رہی ہوں گی، مجھے گھر جانا ہے۔“ وہ نیم بے ہوشی میں مسلسل بڑبڑا رہا تھا۔

ڈاکٹر کے کہنے پر نرس نے اسے سکون آور انجکشن لگا دیا تھا۔ چند لمحوں میں وہ دوبارہ غافل ہو گیا اور حسن صاحب نے باہر آ کر آصف سے اس کے گھر کا ایڈریس لیا۔

□●□

کاؤنٹر بار پر بے شمار کھلی ادھ کھلی بوتلیں رکھی تھیں، کچھ لڑکے، لڑکیاں چیئرز پر بیٹھے پی رہے تھے۔ کسی کے ہاتھ میں کوک تھا، کسی کے ہاتھ میں پیپسی، کوئی سگریٹ کا دھواں اڑا رہا تھا۔ ہر سمت قہقہوں کا طوفان اٹھ رہا تھا۔

پرپل ٹراؤزر اور بلاؤز میں وہ ان لوگوں کے ساتھ بیٹھی پیپسی پی رہی تھی۔ جوجو کے اشارے پر ویٹر مشروبات سے سجی ٹرالی لے کر ان کے قریب آ گیا تھا۔ سب نے اپنے اپنے پسندیدہ ڈرنکس اٹھا لئے تھے۔ مشعل نے پیپسی اٹھائی تھی۔

”بچپن پھلانگ آئی ہو تو یہ فیڈر بھی لینا چھوڑ دو۔“ جوجو نے اپنا فیورٹ ڈرنک اٹھاتے ہوئے شوخی سے کہا۔

”توبا با! میرے لئے یہ فیڈر ہی مناسب ہے۔“ مشی نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

”آج تو ہم خوشی سلیبریٹ کر رہے ہیں۔ تمہاری اور جوجو کی انسلٹ کرنے والے بندے سے ہم نے کل رات کو انتقام لے لیا تھا۔“ جوزف نے اکڑ کر کہا۔

”اور انتقام بھی ایسا اگر زندہ رہ گیا تو ساری زندگی اس راہ سے گزرنا چھوڑ دے گا جس سے تم اور جوجو گزرو گے۔“ پیٹرک کی بات پر قہقہے بلند ہوئے تھے۔

”ہوں، مجھے خوشی اس وقت زیادہ ہوتی جب صرف تنہا جوجو اسے اس حال تک پہنچاتا۔ تم سب نے مل کر جو کارنامہ انجام دیا ہے وہ کوئی بہادری نہیں ہے۔“

”وہاٹ...... یہ کیا کہہ رہی ہو؟“ وہ سب ہی متعجب ہوئے تھے۔

”جو تم لوگوں نے سنا ہے۔ تنہا شخص کو مارنا کہاں کی بہادری ہے؟ میں خوش تو تب ہوتی اگر جوجو تنہا اس کمینے کو موت کا مزا چکھاتا۔

”کیا مطلب ہو تمہاری اس بات کا؟ کیا ہم تمہارے فرینڈز نہیں ہیں؟ کیا ہمیں تمہاری انسلٹ کا بدلہ لینے کا حق نہیں ہے؟“ جوزف بری طرح ہرٹ ہو کر بولا۔

”ایموشنل مت ہو جوزف! تم جانتے ہو میں ہر بات منہ در منہ کرنے کی عادی ہوں۔ کسی کی اچھائی، برائی سب میں سامنے کہتی ہوں اور مجھے ہمیشہ سے بہادر اور دلیر مرد پسند رہے ہیں۔ مرد خوب صورت ہو نہ ہو مگر فائٹر لازمی ہو۔“ وہ صاف گوئی سے بولی۔

”یعنی اب مجھے اپنی تمام ہابیز چھوڑ کر فائٹنگ سیکھنی ہوگی؟“ جوجو نے اس کی سنجیدگی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”آف کورس...... اگر ہسبینڈ بننا ہے تو۔“ راشد نے ہنس کر کہا۔

”اوکے فرینڈز! ویری ویری تھینکس سو مچ۔ اب میں جاؤں گی۔“ وہ بوتل خالی کر کے ٹیبل سے پرس اٹھا کر کھڑی ہوتے ہوئے گویا ہوئی۔

”اتنی جلدی کہاں جا رہی ہو، ابھی بیٹھو۔ زیادہ وقت کہاں ہوا ہے؟“

”نہیں جوزف! میں ابھی جا رہی ہوں۔ ایکچوئیلی میں کل سے جوجو کے ساتھ اس کے گھر آئی ہوئی تھی۔ اب ڈیڈی سے ملوں گی جا کر کل سے ان سے ملی نہیں۔“

”اوکے، میں بھی چلتا ہوں تمہارے ساتھ۔“ جوجو اٹھتے ہوئے کہنے لگا۔

”ٹریٹ دینے کے بعد بلز پے کرنے کی بجائے دم دبا کر کہاں بھاگ رہے ہو؟“

”دے رہا ہوں، بھاگنے والوں میں سے نہیں ہوں۔“ اس نے جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا لیکن والٹ کہیں موجود نہیں تھا۔

”ہاں، ہاں...... اب کہو والٹ کہیں گر گیا ہے یا گھر رہ گیا ہے۔ روپیہ بچانے کے تمہیں آئیڈیاز کس قدر آتے ہیں۔“

”میں نے کل والٹ اسی پاکٹ میں رکھا تھا۔“ جوجو پریشانی سے ان سے بولا تھا جو ایک سے ایک ریمارکس دے رہے تھے۔

”ڈونٹ وری، میں پے منٹ کر دیتی ہوں۔“ مشعل نے پرس کھولتے ہوئے اس کی مشکل حل کی۔

”اوہ گاڈ! کس قدر پور فیانسی ملا ہے یار تمہیں۔ مجھے لگتا ہے ساری لائف تمہیں اس کے بلز پے کرتے گزر جائے گی، میں تو کہتا ہوں ابھی وقت ہے، سوچ لو میرے بارے میں، چینج کر لو اپنا فیصلہ۔“ جوزف نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

”یہ جو جیسا بھی ہے، مجھے قبول ہے۔“ ایک لمحے جھک کر اس نے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا تھا اور جوجو کے بازو میں بازو ڈال کر وہاں سے نکل گئی تھی۔

گھر پر پاپا کو دیکھ کر وہ لپٹ گئی تھی ان سے۔

”پاپا! میں نے بہت مس کیا آپ کو۔“

”جوجو! یہ والٹ کس کا ہے؟“ اس پر نظر پڑتے ہی وہ خود پر قابو نہ رکھ پائے تھے۔ کل شام کا خونی منظر اور رات بھر کی پریشانی از سر نو جاگ اٹھی تھی۔

”میرا ہے انکل! آپ کو کہاں سے ملا؟“ اس نے ان کے ہاتھ سے بلیک لیدر کا والٹ لیتے ہوئے کچھ حیرانی و پریشانی سے استفسار کیا تھا۔

”وہاں سے جہاں تم کل یہ خونی ڈرامہ کھیلتے وقت چھوڑ آئے تھے۔“ ان کا آگ برساتا لہجہ اتنا سرد و پراسرار تھا کہ وہ دونوں بری طرح چونک اٹھے تھے۔

”آ...... آپ کو...... کیسے معلوم ہوا؟“ جوجو کی بوکھلاہٹ اور خوف عروج پر تھا مشعل بھی حیرانی سے انہیں تک رہی تھی۔

”ہوں...... تو آپ اعتراف کر رہے ہیں کہ وہ انسانیت سوز کام آپ کا ہی تھا۔“

”نہ...... نہیں انکل! آپ میری بات......“

”شٹ اپ......“ ان کا بھرپور تھپڑ جوجو کے سفید چہرے کو سرخ کر گیا تھا۔

”پاپا...... یہ آپ نے کیا، کیا؟“

”مشی! جاؤ یہاں سے۔“

”بٹ پاپا......“

”جائیں آپ...... شاباش......“ پہلی بار وہ اس سے سختی سے پیش آئے تھے۔

چند ثانیے وہ بے یقینی اور تعجب سے ان کو دیکھتی رہی۔ ہمیشہ جس چہرے پر نرم چاندنی جیسی مسکراہٹ رہتی تھی اس وقت جاہ و جلال کی بجلیاں کوند رہی تھیں۔ لہجے سے کوڑے برس رہے تھے، آنکھوں میں قہر کے رنگ تھے۔ وہ خاموشی سے وہاں سے نکل آئی اور پردے کے پیچھے کھڑی ہو کر سننے لگی۔

”انکل، انکل! اس نے انسلٹ کی تھی میری۔“ ان کے ایک تھپڑ نے ہی اس جیسے کمزور اعصاب و بے حوصلہ شخص کو تھر تھر کانپنے پر مجبور کر دیا۔ وہ ان سے خوفزدہ ہو کر الٹے قدموں چلتے ہوئے منمنایا تھا۔

”تمہارے بگڑنے کا احساس تو مجھے بہت عرصہ قبل ہی ہو گیا تھا مگر تم انسانیت کی سطح سے اس قدر پستی میں گر چکے ہو اس کا احساس نہیں تھا مجھے۔ اتنی معمولی معمولی سی باتوں کو تم لوگ انا کا مسئلہ بنا لیتے ہو اور پھر ایسے بھیانک طریقے سے انتقام لیتے ہو کہ درندے بھی دیکھ کر دنگ رہ جائیں۔“ وہ غصے سے چیخ رہے تھے۔

”معاف کر دیں انکل! معاف کر دیں۔“ وہ بری طرح رو پڑا تھا۔

”میں کون ہوتا ہوں معاف کرنے والا؟“

”پلیز انکل...... پلیز!“ اس نے روتے روتے ہاتھ جوڑ دیئے تھے۔

”اب آنسو بہانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ یہ آنسو تمہیں اس وقت بہانے چاہیے تھے جب تم اس بے قصور نوجوان کو مار کر مرنے کے لئے چھوڑ آئے تھے۔ اور کان کھول کر سن لو۔ اس نے تمہارے خلاف بیان دیا تو میں روکوں گا نہیں اسے۔ خود تمہیں سزا دلواؤں گا کہ تم جیسے حیوانیت پسند لوگ مجھے بالکل پسند نہیں۔“ انہوں نے اٹل و بے لچک لہجے میں کہا۔

”نہیں...... نہیں انکل! پلیز ایسا مت کہیں...... مر جاؤں گا میں۔“

”اس بچے کی جان کی بھی اتنی ویلیو ہے، زندگی اسے بھی اتنی ہی عزیز ہے۔“

”مجھ سے غلطی ہو گئی انکل، بہت بڑی غلطی ہو گئی۔“

”میں کچھ نہیں کر سکتا۔ اگر شاہ ویز نے پولیس کیس کیا تو میں کچھ نہیں کروں گا۔“ وہ سختی سے کہہ کر وہاں سے چلے گئے تو مشعل پردے کے پیچھے سے نکل آئی۔

”مشی! انکل کے ارادے خطرناک ہیں...... مجھے پھانسی کا پھندا ابھی سے اپنے گلے میں پڑا ہوا نظر آ رہا ہے۔ ہائے، کیا ہوگا؟“ اس نے با آواز بلند رونا شروع کر دیا۔

”پلیز تم اپنی یہ بھیں بھیں بند کرو، الو گدھے لگ رہے ہو اس طرح روتے ہوئے۔ خاموش ہو جاؤ، کچھ سوچنے دو۔“ اس نے خاصی جھاڑ پلائی تھی اسے۔

”نہ معلوم تمہاری عقل کہاں ہر وقت گھاس چرتی رہتی ہے۔ اس کمینے پر حملہ کرنے سے قبل یہ تو سوچ لیتے کہ وہ راستہ فیکٹری سے ملحقہ ہے اور پاپا ہمیشہ اپنے تمام ورکرز کے جانے کے بعد وہاں سے نکلتے ہیں اور اسی راستے سے گزرتے ہیں۔“

”گڑبڑ ساری اس والٹ کی ہے۔“ جوجو نے زور سے والٹ کو فرش پر مارا تھا۔

”والٹ کی نہیں تمہارے دماغ کی گڑبڑ ہے۔“

”مشی! وہ شخص میرے اور تمہارے درمیان حائل ہونے لگا ہے اور انکل کا رویہ بھی چینج ہوتا جا رہا ہے۔“ وہ اس کے قریب بیٹھ کر پریشانی سے گویا ہوا۔

”مائی فٹ...... وہ دو کوڑی کا شخص کس طرح ہمارے درمیان آ سکتا ہے۔ اس فقیر کی اوقات ہی کیا ہے۔ اور پاپا کا تو اپنی نیچر ایسے لوگوں کے لئے بیسٹ ہی ہوتا ہے۔ نا معلوم پاپا کا کیا کامپلکس ہے۔“ اس نے منہ بنا کر کہا۔

''فی الحال ڈیئر! کوئی ایسی ترکیب سوچو جس سے لاٹھی بھی مرجائے اور سانپ بھی نہ ٹوٹے۔''
جواباً مشعل کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔
''یہاں میری جان پر بنی ہے اور تمہیں ہنسی سوجھ رہی ہے۔''
''اپنے محاورے پر غور کرو، الٹا بولا ہے۔''
''اوکے، سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔'' وہ خود بھی کھسیا کر ہنس پڑا۔

□●□

شاہ ویز تیسرے دن خاصا ٹھیک ٹھاک اور مکمل ہوش میں تھا۔
بے جی کو حسن صاحب آصف کے ساتھ جا کر ہسپتال لے آئے تھے۔ اپنے اندیشوں کے سچ ثابت ہونے پر انہیں بڑا افسوس تھا اور دوسرے اسے بے ہوش اور پٹیوں میں جکڑا دیکھ کر ان کی حالت بگڑنے لگی تھی۔ لیکن ڈاکٹر سعید اور حسن صاحب کی تسلی بخش باتوں نے انہیں کافی حوصلہ بخشا تھا اور اب اسے پہلے کی طرح باتیں کرتے، ہنستے مسکراتے دیکھ کر اطمینان ہوا تھا۔ شکرانے کے نفل وہ فوراً پڑھ چکی تھیں۔
''اب تو آپ خوش ہوں گی بہن جی! شاہ ویز ذہنی طور پر بالکل ٹھیک ہے۔'' اندر داخل ہوتے حسن صاحب انہیں شاہ ویز سے باتیں کرتے دیکھ کر اطمینان سے گویا ہوئے۔
''اللہ کا بہت بہت شکر ہے بھائی صاحب! جس نے میرے بچے کو نئی زندگی دی ہے اور آپ کی بھی بہت مہربانی ہے جس طرح آپ نے میرے بیٹے کا خیال رکھا، اس کے لئے میں آپ کا شکریہ ہی ادا کرسکتی ہوں مگر اس کا اجر آپ کو اللہ دے گا۔''
''یہ میرا فرض تھا، کوئی احسان نہیں ہے۔'' وہ مسکرا کر کہتے ہوئے شاہ ویز کے قریب بیٹھ گئے۔ ''کیسی طبیعت ہے ینگ مین؟''
''فائن سر! بہت بہتر محسوس کر رہا ہوں۔'' اس نے دھیمے سے مسکرا کر جواب دیا۔
''کیا ہوا تھا؟ کس طرح ہوا یہ سب؟ کون لوگ تھے وہ؟'' حسن صاحب اس موضوع کی طرف آگئے جس پر بات کرنے کے لئے بے چین تھے۔
''معلوم نہیں سر، شاید میرے نصیب میں اس حادثے کو اسی طرح ہونا لکھا تھا۔''
''رپورٹ کے مطابق آپ کو زخمی کرنے والے ایک سے زائد افراد تھے۔ ان میں سے کسی نہ کسی کا چہرہ آپ کو یاد ہوگا؟'' وہ بضد تھے۔
''چھوڑیں سر، کیا فائدہ ہوگا۔ ویسے بھی ذاتی طور پر کسی سے انتقام لینے کا قائل نہیں ہوں۔ میں بھول گیا۔ آپ بھی بھول جائیے۔'' وہ ان سے نگاہیں چرا کر گویا ہوا۔ اسے جوجو اور اس کے ساتھیوں کے چہرے یاد تھے اور یہ بھی یاد تھا جو جوجو نے کہا تھا۔ ''مشی مجھ سے دو دن سے ناراض ہے، میں نے اس سے وعدہ کیا ہے جب تک میں اس شخص سے حساب برابر کرکے مزا نہ چکھا دوں تب تک اس کو اپنی شکل نہیں دکھاؤں گا۔'' وہ انہیں کیا بتاتے کہ اس کو اس حال تک لانے والا ان کا ہونے والا داماد ہے، جس نے ان کی بیٹی کو ہی خوش کرنے کے لئے اس کی یہ حالت بنائی ہے۔
وہ بہت نرم اور حساس دل رکھنے والا تھا، جس طرح حسن صاحب نے اس کا خیال رکھا، اس کے علاج کے تمام اخراجات اٹھانے کے علاوہ اپنی مصروفیات میں سے اسے بھی ٹائم دیتے رہے تھے۔ انہوں نے تو اسے اپنے احسان تلے دبا لیا تھا اور نادانستگی میں اپنوں کے ہاتھوں لگائے گئے زخموں پر خود ہی مسیحائی کا مرہم رکھتے گئے تھے۔ اسے ان سے یا جوجو سے کوئی شکوہ یا شکایت نہیں رہی تھی۔
''یاد کریں بیٹا! ذہن پر زور ڈال کر سوچیں۔ یاد آجائیں گے آپ کو وہ ظالم لوگ جو محض اپنی انا کی خاطر حیوان بن جاتے ہیں۔ یقین مانو اگر ان لوگوں میں مجھ سے وابستہ کوئی رشتہ بھی ہوا تو میں حق وصداقت کا ساتھ دوں گا۔'' وہ گویا اس کی سوچیں پڑھ رہے تھے۔ لمحے بھر کو تو اس کو ایسا ہی محسوس ہوا کہ وہ حقیقت سے آگاہ ہیں مگر دوسرے پل ہی وہ اس سوچ کو جھٹک کر بولا۔
''نو سر! میں ان لوگوں کو نہیں پہچانتا۔''
''اچھا......'' انہوں نے گہری نگاہوں سے اس کے چہرے کا جائزہ لے کر آہستگی سے کہا۔
''ہمیں انتقام لے کر کیا کرنا ہے، اوپر والا لے گا ہمارا انتقام۔ ہم صبر کر چکے ہیں۔'' بے جی نے موضوع ختم کرتے ہوئے کہا۔
''اچھا بھئی...... اب میں چلتا ہوں، کل آؤں گا۔'' انہوں نے اٹھتے ہوئے کہا۔
''سر! میں ڈسچارج ہونا چاہتا ہوں...... بہت بور ہوگیا ہوں۔''
''ابھی کم از کم چار دن تمہیں اور یہاں ایڈمٹ رہنا پڑے گا، زخم ابھی مندمل نہیں ہوئے ہیں۔ کچھ دن کی تو بات ہے پھر آرام سے گھومتے پھریے گا۔'' انہوں نے پُرشفقت لہجے میں اسے سمجھایا اور بے جی کو خدا حافظ کہتے ہوئے چلے گئے۔
بے جی اسے سیب کاٹ کر کھلانے کے ساتھ باتیں بھی کرتی جارہی تھیں۔ یہ ان کی بے انتہا محبت تھی جو وہ بہت کم گو ہونے کے باوجود اس سے مسلسل باتیں کررہی تھیں۔ گزرے ہوئے وقت کی اچھی باتیں، اس کے بچپن کی شرارتیں، ضدیں اور کم عمری میں ذہانت وسمجھداری کے مظاہرے، ہر بات انہیں ازبر تھی۔
''اب نہ معلوم عمر کا تقاضا ہے یا وقت کا کہ پہلے کی ہر بات یاد ہے مگر کل کے بارے میں یاد نہیں رہتا۔'' انہوں نے چھری اور پلیٹ ٹرالی کی دراز میں رکھتے ہوئے یاسیت سے کہا۔ شاہ ویز مسکرا اٹھا تھا۔
اسی دم دروازہ جھٹکے سے کھلا تھا۔ خوشگوار سی مہک کمرے میں پھیل گئی تھی۔ بے جی کے ساتھ اس نے بھی چونک کر دیکھا تھا۔ نگاہ اٹھی رہ گئی تھی۔
''ایکسکیوز می، آپ جائیں کمرے سے۔'' وہ اندر آکر بے جی سے مخاطب ہوئی جو اس کے حسین مکھڑے اور جسم پر موجود لیدر کی جینز اور سلولیس شارٹ شرٹ کو دیکھ رہی تھیں۔ اسے خود کو حکم دیتا دیکھ کر بڑبڑا گئی تھیں۔
''کیوں......؟'' شاہ ویز کے تیور اس کے انداز تخاطب نے بگاڑ دیئے تھے۔
''کیوں کہ مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔''
''ہمارے درمیان کوئی ایسا رشتہ نہیں ہے کہ تم مجھ سے تنہائی میں بات کرو۔''
''ایسا رشتہ ہو بھی نہیں سکتا، منہ دھو رکھو۔'' اس نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ شاہ ویز نے ہونٹ بھینچ لئے۔ کیونکہ گفتگو انگلش میں ہورہی تھی اس لئے بے جی لاعلم تھیں مگر ان پڑھ تھیں، جاہل نہیں۔ کتابوں میں لکھے لفظوں سے ناآشنائی ضرور تھی لیکن چہروں، لہجوں کو پڑھنے میں ماہر تھیں۔ یہ مزاجوں اور اندازوں کو پرکھنے میں لاثانی تھیں۔ اس وقت بھی ان دونوں کے درمیان ہونے والی گٹ پٹ کو سمجھنے سے قاصر تھیں مگر اس لڑکی کا لہجہ وانداز دیکھ کر وہ سمجھ گئی تھیں کہ وہ تنہائی میں کوئی بات کرنا چاہتی ہے مگر شاہ ویز یہ کسی صورت نہیں مانے گا کہ وہ کمرے سے جائیں۔
''جو کہنا ہے کہو۔ بے جی کمرے سے نہیں جائیں گی کسی بھی صورت میں۔'' اس نے اٹل لہجے میں کہا۔
''یہ اگر نہیں جائیں گی تو میں دھکے دے کر نکال دوں گی۔'' اس نے غصے سے کہا۔
''شٹ اپ، گیٹ لاسٹ، اگر تم یہاں سے دفع نہ ہوئیں تو میں تمہیں یہاں سے نیچے پھینک دوں گا۔'' بے جی کے خیال سے اس نے خود کو کنٹرول کیا ہوا تھا۔
''بیٹا! عصر کا وقت ہونے والا ہے۔ میں وضو کر کے آتی ہوں۔'' بے جی کو یہی بہانہ سوجھا تھا ان کے درمیان سے جانے کا۔ وہ اس کے منع کرنے کے باوجود چلی گئی تھیں۔
''تم سے زیادہ سمجھ دار تو وہ اولڈ وومین ہے۔'' وہ کاٹ دار مسکراہٹ سے گویا ہوئی۔
''کیوں آئی ہو یہاں؟'' اس کے لہجے کی کرختگی نے لمحے بھر کو اسے بوکھلا دیا تھا۔ مگر فوراً ہی اس نے خود کو سنبھال لیا اور قریب آکر بولی۔
''ایک بار ہم سے ٹکرانے کا انجام دیکھ لیا ہے۔ اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو جوجو کے خلاف ایک لفظ بھی منہ سے نہیں نکالنا ورنہ اس بار زندہ نہ رہ پاؤ گے۔'' مشی نے جھک کر اس کی طرف دیکھ کر کرخت لہجے میں دھمکی دی تھی۔
''موت اور زندگی دینا تم جیسے گھٹیا لوگوں کے اختیار میں نہیں ہوتا۔ مجھے زندہ دیکھ کر یہ احساس تمہیں اچھی طرح ہوجانا چاہئے۔ موت کا خوف تم جیسے لوگوں کو کمزور کرتا ہے، مجھے نہیں۔'' اس نے دانستہ آنکھوں پر بازو رکھتے ہوئے اطمینان سے کہا اور اس کی اس اگنور کرنے والی حرکت نے حسب توقع اسے کھولا ڈالا تھا۔
''یعنی تم جوجو کے خلاف پولیس کو رپورٹ کرو گے؟''
''کاش میں اتنا خود غرض اور احسان فراموش ہوتا تو اب تک وہ بزدل آدمی جیل میں بند ہوچکا ہوتا۔ میرے احساسات پر حسن صاحب کے احسانات غالب آگئے ہیں۔ اس لئے جاؤ، خوشیاں مناؤ، میں نے اس کارٹون کی جان بخش دی ہے۔''
''وہاٹ رَبش...... لگتا ہے تمہاری عقل ابھی ٹھکانے پر نہیں آئی ہے۔ بار بار جوجو کی انسلٹ کر کے اپنے لک کو بیڈ لک مت کرو اسٹوپڈ مین۔''
''مجھے بچپن سے سچ بولنے کی عادت ہے۔'' اس کا انداز دل جلانے والا تھا اور ابھی تک اس نے آنکھوں سے بازو نہیں ہٹایا تھا جس کا مطلب تھا وہ اس کی طرف دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا۔ اس انداز کو وہ خوب سمجھ رہی تھی اور کھول رہی تھی۔
عجیب بے حس وکٹھور شخص تھا جو حسن سے لاپرواہ، رعنائی سے لاتعلق تھا۔
''اب...... آپ یہاں سے جانے کا کیا لیں گی؟''
''کمینہ، دیکھ رہا ہے اور بنتا کتنا ہے۔'' اس نے جل کر سوچا اور غصے سے گویا ہوئی۔
''جارہی ہوں، کوئی ساری زندگی تمہارے پاس ٹھہرنے نہیں آئی۔''

''اللہ نہ کرے جو ایسا برا وقت مجھ پر کبھی آئے۔'' جواباً وہ برجستہ بول اٹھا۔

''ہونہہ...... نان سینس! تمہارے منہ ہی نہ لگنا چاہئے، بات کرنے کی تمیز نہیں ہے تمہیں۔'' وہ جھنجلائی ہوئی کمرے سے نکلی اور زوردار طریقے سے دروازہ بند کرکے آگے بڑھ گئی۔

□●□

''بھائی جان! آپ فکر ہی نہ کریں تو بہتر ہے۔ جو جو میرا اکلوتا بیٹا ہے، اسے ہم نے آج تک ترچھی نگاہ سے نہیں دیکھا اور آپ نے اسے اتنی معمولی بات پر تھپڑ مار دیا مجھے بہت افسوس ہے۔ آپ کو جو جو پر ہاتھ نہیں اٹھانا چاہئے تھا۔'' دوسرے دن خراب موڈ اور بگڑے تیوروں کے ساتھ رافعہ، بھائی کے سامنے موجود تھیں۔

''افسوس تو مجھے تم پر ہو رہا ہے۔ کیسی ماں ہو تم جو خود بیٹے کو تباہی و بربادی کے راستے پر چلا رہی ہو۔ کسی انسان کی جان تمہارے نزدیک مکھی مچھر کی جان سے بھی زیادہ حقیر ہے؟'' حیرانی اور تاسف ان کی آواز اور چہرے سے ظاہر تھا۔

''میرے بچے کے مقابلے میں کسی کی جان کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔''

''تم جیسی ماؤں کے بیٹے ہی بڑے بڑے مجرم بنتے ہیں جو نہ صرف خاندان بلکہ ملک کے لئے بھی ناسور ثابت ہوتے ہیں۔ لاڈ پیار کی بھی ایک حد ہوتی ہے رافعہ! آج کل کا وقت تو بہت نازک گزر رہا ہے۔''

''دنیا بدل گئی، حالات بدل گئے مگر بھائی جان، آپ کے اندر رہنے والا وہ سالوں پرانا حسن بیگ نہیں بدلا جو ایک معمولی پرچون فروش کا بیٹا ہے۔''

''انسان کو کبھی اپنی اوقات نہیں بھولنی چاہئے رافعہ۔ ''معمولی'' سے ''خاص'' بننے میں لامحدود عرصہ لگتا ہے مگر ''خاص'' کو ''معمولی'' بننے میں مختصر مدت کافی ہے۔''

''میں تو ڈرتی ہوں اگر احمد کو جو جو نے یہ سب بتایا تو وہ تو کبھی بھی اس گھر میں رشتہ جوڑنے پر راضی نہیں ہوں گے جہاں ہونے والے داماد کی کوئی ویلیو، کوئی عزت نہیں ہے۔ کیا کروں گی بھائی صاحب میں؟ بہت برا ہوا ہے یہ اور احمد کا موڈ تو پہلے ہی آف ہے۔ آپ نے روپوں کا بندوبست ابھی تک نہیں کیا۔ وہاں انہیں بہت پرابلمز ہو رہی ہیں۔''

''میں بہت پریشان ہوں...... سمجھ میں نہیں آتا کس کو اپنی پریشانی بتاؤں۔'' انہوں نے دائیں ہاتھ سے پیشانی مسلتے ہوئے متفکر لہجے میں کہا۔

''ارے بھائی جان! پرابلمز تو ہم جیسے لوگوں کے لئے ہوتی ہیں۔ آپ کو بھلا کیا پرابلم ہوگئی؟'' ان کے انداز کی لاپروائی و بے یقینی نے حسن صاحب کو ملول کر ڈالا۔ کیسی بہن ہے یہ؟ کیا کچھ انہوں نے اس کے اور اس کے شوہر و بیٹے کے لئے نہیں کیا تھا۔ ان کا شاہانہ طرز زندگی، شان و شوکت، پھیلا ہوا کاروبار، اعلیٰ طبقوں میں پذیرائی۔ یہ سب ان کا ہی مرہونِ منت تھا۔ کیا تھا اگر وہ ہمدردی اور بہنوں والے مان سے ان کی پریشانی سن لیتی۔ مگر شاید محبت و خیال کا جذبہ صرف ان کی فیملی کے لئے تھا ان سے رشتہ صرف خواہشیں اور ضروریات پوری کرنے کے لئے یاد کیا جاتا تھا ورنہ اور کوئی ان کی وہاں اہم حیثیت نہ تھی۔ ان کے دل میں سخت کبیدگی و بدظنی پھیلتی چلی گئی۔

''کیا سوچ رہے ہیں؟ پھر آپ روپے کب دے رہے ہیں؟''

''سچ تو یہ ہے رافعہ، اس وقت میں خود بہت پریشان ہو چکا ہوں۔ فارن کمپنیز ویسے ہی تعصب کا شکار ہو کر بند ہو چکی ہیں اور ساتھ کروڑوں کا لوس دے گئی ہیں۔ یہاں پر میں ایک نیا پراجیکٹ شروع کرنا چاہ رہا تھا مگر سرمائے کی قلت کے باعث وہ منصوبہ بھی التوا میں پڑا ہے۔ اب چند فیکٹریز ہیں، وہ بھی ان حالات میں کب دھوکا دے جائیں کچھ بھروسہ نہیں ہے۔ ایسے میں، میں تمہاری کوئی بھی مدد کرنے سے معذرت خواہ ہوں۔'' انہوں نے آہستگی سے سمجھایا تھا۔

''بھائی جان! دینا نہیں ہے تو صاف انکار کردیں، کیوں جھوٹ بول رہے ہیں؟''

''میں جھوٹ کیوں بولوں گا...... اس سے قبل میں نے کبھی تمہیں منع کیا ہے؟''

''ہاتھی مرنے کے بعد بھی لاکھوں کا ہوتا ہے۔ آپ اتنی جلدی کنگلے نہیں ہو سکتے۔'' ان کی بے ثباتی و بے مروتی عروج پر تھی۔ حسن صاحب کے دل کو ان کا ایک ایک لفظ بھالے کی مانند گھائل کر رہا تھا۔ ازحد پیار جتاتی، ناز اٹھواتی بہن کا حقیقی روپ بڑا ظالم، بھیانک تھا۔ دل میں اٹھنے والی ٹیسوں نے آنکھوں کو نم کرنا شروع کر دیا تھا۔

''ہاتھی اور انسان میں یہی فرق ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد ہاتھی کی قیمت دوگنی ہو جاتی ہے اور انسان تو بالکل بے مول ہو جاتا ہے۔ بے وقعت، بے مصرف......''

''آپ نے مجھے ٹینشن دے دی ہے بھائی! اب بھلا میں احمد کو کیا منہ دکھاؤں گی؟ کتنے مان سے آئی تھی میں آپ کے پاس، کتنا اعتماد تھا میرا آپ کی زبان پر مگر آپ نے تو سب مٹی میں ملا دیا۔ احمد تو پہلے ہی جو جو کی میرج اپنی بھانجی سے کرنا چاہتے تھے، کروڑوں کی تنہا مالک ہے وہ لڑکی، مگر میں نے ضد کرکے مشعل کو بہو بنانے کا فیصلہ کروایا کہ آپ اس کی طرف سے مطمئن ہو جائیں گے مگر......''

''فکر مند مت ہو رافعہ۔ امید پر دنیا قائم ہے۔ اندھیرے اجالے، دھوپ چھاؤں، فائدے و نقصان کے سودے تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔ آج تنگ دستی آئی ہے تو کل خوشحالی بھی یقیناً آئے گی۔ امید کے چراغ کو اتنی جلدی گل مت کرو کہ گل سوائے پچھتاوؤں کی راکھ کے کچھ نہ بچے۔'' انہوں نے بردباری سے کہا۔

''نہیں بھائی جان! مجھے بعد میں کوئی الزام مت دیجئے گا۔ احمد پرسوں آرہے ہیں اور آپ کو ان کے آنے سے پہلے تمام روپوں کا انتظام کرنا ہوگا ورنہ کوئی امید مت رکھئے گا۔'' وہ بدلحاظی سے کہتی ہوئی وہاں سے چلی گئیں۔

□●□

ہائے، ہائے...... غضب خدا کا...... بچے کو اتنی چوٹ لگ گئی، اتنے زخم آگئے اور مجھے کسی نے اطلاع دینا ہی گوارہ نہیں کیا۔ آپا! کیا اتنا غیر سمجھتی ہو؟ میں تو تمہیں اور شاہ ویز کو ہی سب کچھ سمجھتی ہوں......'' زرینہ کو آج صبح اصغر سے معلوم ہوا تو وہ فوراً چلی آئی تھیں اور آتے ہی شکوے شروع کئے تھے۔

''ارے بیٹھو تو سہی، تم تو جانتی ہو کہ گھر میں ہم دونوں کے سوا اور کوئی تیسرا نہیں ہے۔ مجھے پریشانی میں یاد نہیں رہا کہ تمہیں اطلاع کردوں۔ وہ تو کل ہسپتال سے چھٹی کے بعد شاہ ویز نے اصغر کو فون کرکے بتایا۔ وہ تو اسی وقت آفس سے یہاں چلا آیا تھا۔ میں نے کہا تھا تمہیں صبح بتائے ورنہ تم رات میں ہی بے چین ہو جاتیں، جانتی ہوں تمہاری محبت کو، اب تو شاہ ویز بالکل بہتر ہے اور آج سے آفس جانے کی تیاری کر رہا ہے۔'' انہوں نے زرینہ کا ہاتھ پکڑ کر پلنگ پر بٹھاتے ہوئے تفصیل بتائی تو ان کے دماغ میں بات آ گئی ہوگی اور موڈ بہتر ہو گیا۔

''بہت شکر ہے اس مالک کا۔ اصغر بتا رہا تھا کہ اسکوٹر بالکل تباہ ہوگئی ایکسیڈنٹ میں۔ میں تو کہتی ہوں چلو بلا ٹلی۔ اللہ نے زندگی بچائی بچے کی، یہ بڑا احسان ہے۔ اسکوٹر کا کیا ہے، زندگی ہے تو بہت سی اسکوٹر اور کاریں مل جائیں گی۔''

''ہاں...... میں بھی یہی کہہ رہی تھی شاہ ویز سے۔'' شاہ ویز نے ہی کہا تھا کہ کسی کو بھی اصل بات نہ بتائی جائے، یہی کہا جائے کہ ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔ اس طرح سے وہ بے شمار سوالات سے بچ جائیں گے اور اس بات نے انہیں کافی مشکلات سے بچا لیا تھا۔

''السلام علیکم خالہ جان!'' اسی دم کمرے سے سٹرڈ جینز اور سیاہ ٹی شرٹ میں ملبوس مسکراتا ہوا شاہ ویز باہر آیا تھا۔ اسے دیکھتے ہی وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھی تھیں، دونوں ہاتھوں سے بلائیں لیتے ہوئے پیشانی چوم کر بولیں۔

''جیتے رہو بیٹا! لمبی عمر پاؤ، کیسا منہ نکل آیا ہے، کس قدر زرد چہرہ ہو گیا ہے میرے لال کا۔ ابھی کچھ دن آرام تو کرلیتے۔ کام کا کیا ہے، ساری زندگی ہی کرنا ہے۔''

''بہت آرام کرلیا خالہ جان! پورے چار ہفتے ہو گئے ہیں، یعنی ایک ماہ...... بالکل ٹھیک ہوں۔'' اس کے چہرے سے کمزوری ظاہر ہو رہی تھی۔ رنگ بھی کافی زرد زرد تھا۔ ہاسپٹل میں مکمل طور پر اسے ٹریٹمنٹ ملی تھی، خون بھی خاصی مقدار میں چڑھایا گیا تھا۔ مگر صحت مند ہونے میں بھی خاصی مدت لگتی ہے۔

''ان دنوں بھی مشکل سے ٹکا ہے۔ جو کام کرنے والے ہوتے ہیں انہیں آرام کہاں برداشت ہوتا ہے۔ اب تو ماشاءاللہ بہتر ہے تو ناممکن بات ہے کام کئے بنا رہنا۔'' بے جی نے ناشتہ لگاتے ہوئے کہا۔ پھر ناشتہ کرتے ہی وہ اللہ حافظ کہتا ہوا گھر سے نکل گیا۔ آفس میں کافی کام جمع ہو گیا تھا اس کی غیر موجودگی میں۔ وہ مکمل کرتے کرتے لنچ آور ہو گیا مگر کام کی زیادتی کے باعث اس نے لنچ گول کر دیا۔ لنچ آور کے ایک گھنٹے بعد حسن صاحب نے اسے اپنے روم میں بلایا تھا۔

''بیٹھیں شاہ ویز!'' وہ اسے کرسی کی جانب اشارہ کرکے بولے۔ وہ تھینکس کہہ کر بیٹھ گیا۔

''خوب کام ہو رہا ہے، لنچ بھی گول کر دیا آپ نے آج۔'' انہوں نے شفقت آمیز تبسم سے کہا۔

''جی سر! ایکچوئلی میری عادت ہے کہ اگر کام کی زیادتی ہو تو مجھے بھوک، پیاس و آرام کی طلب نہیں ہوتی اور صبح بے جی نے انڈوں، پراٹھوں کا ناشتہ کروایا تھا، سو بھوک کا احساس ہوا ابھی نہیں۔'' وہ حیران تھا ان کی باخبری پر۔

''اچھی بات ہے، ابھی آپ نے بہت دن تکلیف دہ گزارے ہیں، ازحد اذیت برداشت کی ہے۔ اب دوبارہ سے طاقت و ہمت لانے کے لئے بہترین غذا لینی ضروری ہے اور غذا کے متعلق معمولی سی غفلت بھی نہیں برتنی ہے۔ اچھی صحت سب سے بڑی نعمت ہے، اس کا اندازہ ہماری عمر میں آنے کے بعد ہوتا ہے۔ آج کافی عرصے بعد کار ڈرائیو کرکے آیا ہوں اور شولڈرز میں اتنا درد ہو رہا ہے کہ لگتا ہے ابھی الگ ہو جائیں گے۔''

''کوئی پین کلر لے لیں سر۔''

''ڈاکٹر باری کو فون کیا ہے، آ رہے ہوں گے وہ۔ دراصل بی پی ہائی رہنے لگا ہے۔ اس کی وجہ سے بغیر چیک اپ کے کوئی ٹیبلٹ نہیں لے سکتا۔''

اسی دم پی اے نے کھانا لگنے کی اطلاع دی تو انہوں نے اسے بھی کھانے کی دعوت دی تھی۔

''نو سر! مجھے بھوک نہیں ہے۔ آپ......''

''آجائیں۔ آپ کے ساتھ ہم بھی کھالیں گے ورنہ آج ہمارا بھی ارادہ نہیں تھا۔'' وہ خود اس کا ہاتھ پکڑ کر برابر والے کمرے میں لے گئے تھے جہاں ٹیبل پر انواع و اقسام کے کھانوں کی ڈشوں سے اشتہا انگیز خوشبوئیں اٹھ رہی تھیں۔ ساتھ باسکٹ میں فروٹ خوب صورتی سے سجے ہوئے تھے۔ منرل واٹر کی باٹلز اور پیپسی کے کین بھی موجود تھے۔ انہوں نے بڑے اصرار سے کھانا کھلایا۔ ایک ایک ڈش اپنے ہاتھوں سے پیش کی اور فروٹ بھی بڑی چاہ سے کھلائے تھے۔ کھانے سے فارغ ہوئے ہی تھے جب

ڈاکٹر باری آگئے اور چیک اپ سے معلوم ہوا کہ حسب معمول ان کا بی پی ہائی تھا۔

”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم کیا کرو گے اپنا؟ بی پی کی ہائی اسپیڈ ......“

”پلیز ...... پلیز باری! مت بتاؤ اسپیڈ، کیا کروں؟ اتنی احتیاط تو کرتا ہوں۔“

”کھانے پینے کی احتیاط سے زیادہ احتیاط کرو سوچنے سے۔ کہاں کی فکریں تم نے پال لی ہیں؟ کیا روگ ہے جس نے تمہیں اندر ہی اندر بکھیر دیا ہے؟ کیا سوچتے رہتے ہو؟ کس بات کی فکر ہے تمہیں؟ کس کی ٹینشن ہے جس نے تم جیسے کامیاب انسان کو کمزور کر دیا ہے؟“ ڈاکٹر باری کے لہجے میں مسیحائی کے علاوہ محبت و ہمدردی کے رنگ تھے۔

”ہماری کمزوریاں ہی کمزور کرتی ہیں باری۔“ چند لمحے ان کے چہرے پر اضطراب رہا، پھر خود کو سنبھال کر مسکرا کر گویا ہوئے۔

”عمر کا تقاضا ہے یار! بھلا بڑھاپے سے بڑی بھی کوئی بیماری ہو سکتی ہے؟“

”تم اتنے عمر رسیدہ نہیں ہوئے ہو حسن کہ بیماری اور بڑھاپے کی چکی میں پس جاؤ۔“

”تم تو عورتوں کی طرح ایموشنل ہو رہے ہو عمر کے معاملے میں۔“ وہ دھیمے سے ہنس کر گویا ہوئے تو ڈاکٹر باری نے زوردار قہقہہ لگایا تھا جبکہ شاہ ویز نے مسکرانے پر اکتفا کیا تھا۔ ڈاکٹر باری میڈیسن اور ہدایات دے کر جا چکے تھے۔

”شاہ ویز! میں نے آپ کی پروموشن کر دی ہے۔ کل سے آپ کمپیوٹر سیکشن کے انچارج ہیں، چاروں سیکشنز آپ کے انڈر کام کریں گے۔“ چھٹی سے قبل انہوں نے اطلاع دی۔

”پروموشن ...... سر؟“ حیرانی، مسرت، استعجاب سے اس کی آواز کپکپا کر رہ گئی جبکہ حسن صاحب اس کا یہ انداز دیکھ کر بہت محظوظ ہوئے۔

”ہوں ...... اگلے ہفتے آپ کو آپ کے بنگلے کی چابیاں اور کار مل جائے گی۔“

”سر! اتنا کچھ ......؟ کہیں آپ مجھ پر ترس تو نہیں کھا رہے؟“

”میں آپ پر ترس کیوں کھانے لگا؟ ماشاء اللہ بالکل پرفیکٹ ہو، کوئی ایسی خامی نہیں جو مجھے ترس کھانے پر مجبور کرے اور ترس کھا کر کچھ امداد کی جاتی ہے یا بھیک دی جاتی ہے۔ ایسی مراعات صرف ذہین لوگوں کو ملتی ہیں، اعزاز کے طور پر۔“

”تھینکس اے لوٹ سر ......“

جواباً حسن صاحب نے شفقت سے اس کا شانہ تھپتھپایا تھا۔

”سر! آصف کیا چھٹی پر ہیں آج؟“

”ہاں ...... ایک ہفتے کی چھٹی لے کر لاہور گیا ہے، اس لئے اب مجھے کار ڈرائیو کرنی ہے۔“

”لیکن سر، ڈاکٹر نے آپ کو سختی سے منع کیا ہے ڈرائیونگ سے ......“

”ہوں ...... نئے ڈرائیور میں رکھنا نہیں چاہتا۔ دو مرتبہ بہت نقصان اٹھا چکا ہوں۔ اور آصف شریف و ذمہ دار نوجوان ہے اور ضرورت مند بھی۔ کیا آپ کار ڈرائیو کرنا جانتے ہیں؟“ انہوں نے چونک کر پوچھا۔

”جی سر ...... جب نوکری نہیں ملی تھی، اس دوران اور اکثر تعلیم حاصل کرنے کے دوران میں نے کافی عرصے تک ٹیکسی چلائی ہے۔ آصف کی آمد تک میں آپ کو پک اینڈ ڈراپ کر دیا کروں گا، اگر چاہیں تو۔“

اخلاق کو اخلاق ہی زیر کرتا ہے۔ ان کی محبت وخلوص کا تو وہ دل سے معترف تھا۔ اب ایسے میں انہیں ڈاکٹر نے سختی سے ڈرائیونگ نہ کرنے کی تاکید کی تھی اور وہ خوشامدوں میں بے انتہا ورد کا بنا رہے تھے تو اس کے ضمیر نے خاموش رہنا گوارا نہیں کیا۔ ورنہ عام طور پر وہ اس ہمدردی کو چاپلوسی و خوشامد کا نام دے کر کبھی آگے نہ بڑھتا مگر یہاں معاملہ سچائی وخلوص کا تھا۔

”ویری گڈ شاہ ویز! آئی ایم ویری انسپائرڈ فار یو!“ انہوں نے کسی بے اختیاری جذبے کے تحت آگے بڑھ کر اسے گلے لگاتے ہوئے کہا۔ ”مجھے ایسے پُراعتماد اور باحمیت نوجوان پسند ہیں جو اپنا کل کسی سے نہیں چھپاتے، بلکہ ماضی پر فخر کرتے ہیں اور کرنا بھی چاہئے۔ اعتماد، ہمت اور عزم ہی انسان کو بلندی نصیب کرتے ہیں۔ بہت آگے جاؤ گے آپ۔ بہت آگے۔“

”شکریہ سر! آیئے میں آپ کو ڈراپ کر دوں۔“ ان کی تعریف و توصیف نے خواہ مخواہ اسے جھینپنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ اس سے اتنے متاثر تھے کہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھ کر سارے راستے باتیں کرتے آئے تھے۔

”بہت شکریہ شاہ ویز! آؤ، چائے پی کر جانا۔“ انہوں نے اترتے ہوئے کہا۔

”نہیں، تھینکس سر! مجھے اجازت دیں۔“ اس نے چابی ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”چابی اپنے پاس ہی رکھیں، جب تک آصف نہیں آجاتا۔“ انہوں نے بصد اصرار چابی تھما دی۔ اسی لمحے اندر سے ملازمہ آئی تھی۔

”صاحب! بی بی کا دو مرتبہ فون آچکا ہے، وہ ڈرائیور کو بلوا رہی ہیں۔“

”اوہ ...... مجھے یاد ہی نہیں رہا مشی کو بتانا کہ آصف چھٹیوں پر چلا گیا ہے۔ اب وہ انتظار کر رہی ہوگی، کیا کروں؟“ وہ گویا خود سے مخاطب تھے۔ شاہ ویز نے سن لیا تھا، اس بدتمیز و جاہل لڑکی کا ڈرائیور بننا اسے پسند نہیں تھا مگر حسن صاحب کی ناگفتہ بہ حالت اور چہرے پر پھیلی پریشانی و تفکرات بھی اس سے مخفی نہ تھے۔

”وہ کار لے جاتی، میں نے منع کر دیا تھا۔ دراصل اس کی فرینڈ کی برتھ ڈے پارٹی تھی۔ ان کی رہائش بھی مضافاتی علاقے میں ہے، وہاں سے رات کو تنہا آنا ٹھیک نہیں ہے اور اپنے مزاج کے مطابق وہ اپنی فرینڈ کے ڈرائیور کے ہمراہ آئے گی نہیں کہ اس طرح کسی کا احسان لینا اسے پسند نہیں ہے، کتنی ہی مجبوری کیوں نہ ہو ...... آپ جاؤ بیٹا، میں دوسری کار میں اسے لے آؤں گا۔“ وہ بادل نخواستہ تیار ہوئے۔

”آپ مجھے ایڈریس دیں سر، میں پک کر لیتا ہوں۔ طویل ڈرائیونگ آپ سے نہیں ہو سکتی۔“ اس نے گہرا سانس لے کر کہا۔

”میں بھی یہی چاہ رہا تھا۔ مگر آپ کو دیر تو نہیں ہوگی۔ آپ ایسا کریں پہلے گھر اطلاع کر کے جایئے گا تا کہ دیر ہو جائے تو آپ کی والدہ فکر مند نہ ہوں۔“ وہ اپنا بوجھ اس کے کاندھوں پر ڈالنے کو تیار تھے، سو بہت خوشی سے ایڈریس دیا تھا۔

❑●❑

”اُلو کا پٹھا ...... ایڈیٹ، ابھی تک نہیں آیا۔ آجائے ذرا، شوٹ کر دوں گی۔“ وہ کافی دیر سے انتظار کر رہی تھی۔ دو فون کالز کرنے کے باوجود آصف کا ابھی کوئی پتہ نہیں تھا۔ ریتا کی برتھ ڈے پارٹی ختم ہوئے بھی وقت گزر گیا تھا۔ تمام مہمان جا چکے تھے۔ کچھ فرینڈز نے اسے ڈراپ کرنے کی آفر بھی کی تھی مگر یہ بات اس کی شان کے خلاف تھی۔ وہ احسانات کرنے کے لئے پیدا ہوئی تھی، لینے کے لئے نہیں۔ سب ہی اس کی فطرت سے آگاہ تھے اس لئے کسی نے زیادہ اصرار نہیں کیا تھا۔

”اوہ ...... مائی گاڈ! کہاں مر گیا یہ آصف؟ پاپا نے بھی موبائل آف کر رکھا ہے۔ نہ معلوم آفس سے کب آئیں گے۔“ اس نے جھنجلا کر کہا تو ریتا ہنس کر گویا ہوئی۔

”بیٹھ جاؤ سلی گرل! کیوں کنفیوژ ہو رہی ہو؟ آجائے گا ابھی۔“

”تم نہیں جانتیں، پاپا نے نوکروں کو کتنی آزادی دے رکھی ہے۔ اگر انہیں ان کی اوقات پر نہ رکھوں تو ہم نوکر اور وہ مالک نظر آئیں۔“

ریتا کے ملازم نے اطلاع دی کہ اس کی کار آگئی ہے تو وہ اسے بائے کہتی ہوئی نیچے آگئی جہاں کار کھڑی تھی۔

”کہاں مر گئے تھے، کب سے انتظار کر رہی ہوں، تم اپنی منحوس صورت لے کر اب آرہے ہو۔ گھر جا کر بتاؤں گی، نان سینس، بہت چربی چڑھ گئی ہے حرام کھا کھا کر۔“ وہ کار میں بیٹھتے ہی غصے سے کہنے لگی مگر اس کی چیخ و پکار کے باوجود ڈرائیونگ سیٹ پر خاموشی تھی۔ شدید غصے اور اشتعال میں اس نے ڈرائیور پر توجہ نہیں دی تھی، جو آصف کی بہ نسبت بہت زیادہ فاسٹ ڈرائیونگ کر رہا تھا اور کوئی معذرت و معافی بھی نہیں مانگ رہا تھا۔

”کہاں مر گئے تھے؟ جواب کیوں نہیں دے رہے؟ کیا زبان بیچ کھائی ہے؟“

”آصف چھٹیوں پر ہے۔“ شاہ ویز نے تحمل سے جواب دیا۔

آواز سنتے ہی وہ چونکی۔ فوراً جھک کر اس کی شکل دیکھی۔ پھر استہزائیہ انداز میں بولی۔

”آصف کی ڈیوٹی بھی تم نے سنبھال لی، اچھا ...... اچھا، بہت غریب ہو ...... اب تو روپوں کی اور ضرورت ہوگی، کیونکہ تمہیں بائیک بھی خریدنی ہوگی اور ......“

”پلیز ...... خاموشی سے بیٹھی رہیں، مجھے دوران سفر گفتگو پسند نہیں۔“

”اچھا ...... تو میں کیا کروں؟ میں تمہاری نوکر نہیں ہوں جو تمہاری پسند و ناپسند کا احترام کروں بلکہ تم میرے نوکر ہو اور تمہیں وہی کرنا ہوگا جو میں چاہوں گی۔“

”میں نوکر ہوں، اپنی محنت کی تنخواہ لیتا ہوں، آپ کی فضول بکواس سننے کی نہیں۔“ وہ اس خود سر لڑکی سے قطعی شکست کھانے کو تیار نہ تھا، سو دوبدو جواب دیا۔

”ہونہہ تم دو ٹکے کے انسان، مگر نہ معلوم خود کو کہاں کا کنگ سمجھتے ہو۔ ارے شاہ نام رکھنے سے کوئی بادشاہ نہیں بن جاتا۔ تم جیسے چھوٹے لوگ اسی خوش فہمی میں زندہ رہتے ہیں کہ کبھی زندگی میں ان ناموں کا اثر بھی پڑے گا۔ ہاہاہا ...... بے چارے، بے وقوف لوگ، سمجھتے نہیں کہ غریب پیدا ہوئے ہیں اور غریب ہی مر جائیں گے۔“ وہ طنزاً ہنستی ہوئی گویا تھی۔

”خاموش رہو ......“ شاہ ویز سخت لہجے میں بولا۔

”شٹ اپ، تم مجھ سے کس لہجے میں بات کر رہے ہو؟ اوقات نہیں بھولو اپنی، نوکری سے نکال دیا تو ساری زندگی بھیک مانگتے گزرے گی تمہاری۔“

”جس طرح زندگی اور موت کا اختیار تمہارے ہاتھ میں نہیں ہے، اسی طرح ملازمت دینے اور چھیننے کی صلاحیت سے بھی محروم ہو۔“

”مسٹر! میرے منہ لگنے کی کوشش مت کرو ...... بہت بری ہوں میں۔“ غصے سے اس کا چہرہ سرخ پڑ گیا، آنکھیں چنگاریاں برسانے لگی تھیں۔

''اس اطلاع کا شکریہ۔'' اس کا لہجہ جلانے والا تھا۔ وہ سلگ اٹھی تھی۔

''ہونہہ...... یہ سب پاپا کی ڈھیل ہے جو تم مالک اور نوکر کا فرق بھول کر بکواس کیے جا رہے ہو۔ مگر بہت ہو گئی، گھر چلو تمہیں نوکری سے نکلوا کر سڑکوں پر بھیک نہ منگوائی تو میرا نام بدل دینا۔''

اس کی برداشت کی حد ختم ہو گئی۔ شاہ ویز نے کوئی جواب نہیں دیا، وہ اسے خاموش کروانا چاہ رہا تھا، وہ خاموش ہو گئی تھی۔ مگر اس کو خاموش رہنے کی عادت نہیں تھی، پھر بول اٹھی۔

''نہ معلوم پاپا کو تم فقیروں میں کیا خوبی نظر آتی ہے، جو گرویدہ ہو جاتے ہیں۔''

''محترمہ زبان سنبھال کر بات کیجیے، کیا فقیر فقیر کی رٹ لگا رکھی ہے؟''

''کیوں...... اصلیت سے چڑ ہوتی ہے؟ گھبراتے ہو پیدائشی فقیر!''

''میرا حوصلہ مت آزماؤ۔'' اس نے غصے سے کہا۔

''تم کر بھی کیا سکتے ہو دو ٹکے کے نوکر؟''

□●□

اچانک ہی کار جھٹکے سے رکی تھی۔ ساتھ ہی وہ بوکھلا کر چیخی تھی۔

''دل تو چاہ رہا ہے آپ کی سانس بھی روک دوں...... مگر اختیار سے محروم ہوں۔'' اس نے ایک ایک لفظ چبا چبا کر کہا اور ڈرائیونگ ڈور کھول کر باہر نکل گیا۔ کار کے جائزے کے بعد معلوم ہوا پچھلا ٹائر پنکچر ہو چکا ہے۔ وہ سر پکڑ کر رہ گیا۔

''اوہ...... اب کیا ہو گا؟ تمہیں پہلے ایکسٹرا ٹائر ڈگی میں رکھنا چاہیے تھا۔'' اس نے باہر نکل کر ٹائر پنکچر دیکھا تو چیخ پڑی۔

''یہ میرا کام نہیں ہے اور نہ ہی مجھے معلوم تھا کہ ایسا ہو جائے گا۔''

''اب کیا ہو گا...... کیا میں تمہارے سر پر بیٹھ کر جاؤں گی؟ ایک تو تھکن پہلے ہی اس قدر محسوس ہو رہی ہے اوپر سے ٹائر کو بھی ابھی پنکچر ہونا تھا۔''

''اگر آپ اتنی ہی تھکی ہوئی تھیں تو کسی فرینڈ سے لفٹ لے کر چلی جاتیں۔ کیوں اتنا ٹائم ویسٹ کیا۔ جانتی ہیں یہ ایریا بھی کراچی سے آؤٹ وے ہے۔ رش ڈرائیونگ کے باوجود دو ڈھائی گھنٹے لگیں گے کراچی پہنچنے میں اور گھر پہنچنے میں مزید وقت درکار ہو گا۔''

جھنجھلاہٹ اس پر بھی سوار تھی۔ مزید اس بدتمیز لڑکی کی بدمزاجی نے اسے کھولا کر رکھ دیا تھا۔

''اے مسٹر! حد میں رہو اپنی اور اپنے گھٹیا مشورے اپنے پاس رکھو اور نہ آئندہ مجھے سمجھانے کی کوشش کرنا۔'' اس نے ہواؤں سے چہرے پر آتی لٹ پیچھے کرتے ہوئے ڈپٹ کر کہا۔

''ہونہہ......'' اس نے قریب پڑے پتھر کو زوردار کک مارتے ہوئے غصے سے ہنکارا بھرا۔

وقت مٹھی میں بند ریت کی طرح پھسل رہا تھا۔ سڑک دور تک ویران تھی۔ جس کے ایک طرف جھاڑیوں کا جنگل سا تھا اور دوسری طرف میدانی علاقہ دور تک پھیلا ہوا تھا۔ سامنے بہت دور اسٹیل ملز کی روشنیاں جگنوؤں کی مانند نظر آ رہی تھیں۔ دن بھر خوب گرمی رہی تھی۔ رات کے اس سمے چلتی نرم و ٹھنڈی ہوا میں طمانیت و تازگی تھی۔

''ایسے کب تک یہاں کھڑے رہیں گے؟'' بڑھتی ہوئی تاریکی اسے پریشان کرنے لگی تھی۔ اِدھر اُدھر ٹہلتے شاہ ویز سے وہ اکتائے ہوئے لہجے میں بولی۔

''جب تک اللہ میاں کوئی نیکی کا فرشتہ نہیں بھیج دیتے۔''

''نہ معلوم پاپا کو کیا ہو گیا ہے۔ سارے دن سے ابھی تک موبائل آف کر رکھا ہے اور نہ ہی کوئی فون ریسیو کر رہا ہے۔'' اس نے ہاتھ میں پکڑے موبائل کو آف کرتے ہوئے جھنجلا کر کہا۔

''آپ اپنی دوست کو کال کر کے ان کی کار منگوا لیں، وقت پڑنے پر گدھے کو بھی باپ بنا لیا جاتا ہے۔ اس طرح ہم کب تک یہاں کھڑے رہیں گے؟ وقت کے ساتھ تاریکی بڑھتی جا رہی ہے۔'' کافی سوچ و بچار کے بعد اس نے کہا تھا۔

''اوہ شٹ! میں ایسا کبھی نہیں کروں گی۔''

''مجبوری ہے...... آپ بات سمجھنے کی کوشش کریں۔'' شاہ ویز نے نرمی سے سمجھایا۔

''نہیں یہ میری انسلٹ ہے۔ میں کسی کی ہیلپ ایکسپٹ نہیں کر سکتی۔''

''پھر مجھ سے کچھ مت کہیے گا۔'' اس نے ہنستا کر کہا۔

کافی دیر گزر گئی تھی۔ مشعل بونٹ پر بیٹھ گئی تھی جب کہ شاہ ویز وہیں ایک بڑے پتھر پر بیٹھتے ہوئے اس گھڑی کو کوس رہا تھا جب اس نے حسن بیگ صاحب کو کار ڈرائیو کرنے کی آفر کی تھی اور اس کی بدبختی اسے اس ویران جگہ پر بے یار و مددگار چھوڑ گئی تھی۔

''الوؤں کی طرح بیٹھے کیا سوچ رہے ہو؟ موبائل پر ٹرائی کرو شاید پاپا سے رابطہ ہو جائے۔'' اس نے کھڑکی سے سر نکال کر خاصے رعونت بھرے لہجے میں کہا۔

اس کے انداز تخاطب پر شاہ ویز کی حمیت تلملا اٹھی تھی مگر از حد سرعت سے اس نے اپنے اندر اٹھنے والے غصے و وحشت کے ابال کو کنٹرول کیا۔ یہ سوچ کر اشتعال کو تسلی دی کہ صورت حال کچھ بھی سہی بہرحال وہ اس کے محسن، اس کے باس کی بیٹی ہے اور ان کے حکم پر ہی وہ اس وقت اس کے ساتھ ہے اور اس کے احکامات کی تکمیل اس پر فرض ہے کہ وہ ملازم ہے۔

وہ آرام سے پچھلی سیٹ پر نیم دراز تھی اور بڑی مغرور نگاہوں سے ڈیش بورڈ سے موبائل اٹھا کر بٹن پش کرتے دیکھ رہی تھی۔ اس کے حسین چہرے پر اس وقت اپنی برتری اور حاکمیت کی سرخی چھائی ہوئی تھی۔ شاہ ویز وہ پہلا شخص تھا جو پہلی نظر سے ہی اس کے لیے چیلنج ثابت ہوا تھا اور وہ وقت کے ساتھ ساتھ غیر ارادی طور پر اسے شکست دینے پر کمربستہ ہو گئی تھی۔ شاہ ویز کی سنجیدگی، بے نیازی و بے رخی اس کی ضدی، خود پسند، خود پرست طبیعت کے لیے ناقابل برداشت تھی کہ وہ صنف مخالف کو اپنے حسن سے بھسم کرتی آئی تھی۔ بڑے بڑے امراء کی اولادیں اس کی رفاقت کی متمنی تھیں۔ وہ انہیں تڑپا کر، للچا کر، تشنہ رکھ کر خوب اپنی انا کو آسودہ کرتی تھی مگر شاہ ویز جو بے حد معمولی و عام انسان تھا، جس کا تعلق نہ تو کسی برگر فیملی سے تھا اور نہ ہی کسی صنعت کار و جاگیردار کی بگڑی اولاد سے تھا۔ وہ ایک عام انسان تھا۔ لمبے قد، ورزشی جسم، گندمی رنگت رکھنے والے شاہ ویز میں ایسی کوئی خاص اٹریکشن نہ تھی جو اس جیسی حسن پرست، دولت پرست و اسٹیٹس پرست لڑکی کو امپریس کرتیں۔ ماسوائے ان سیاہ کھوری بڑی، روشن روشن ذہانت سے چمکتی آنکھوں کے، جن میں اعتماد و طمانیت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ جس نے اس کی شخصیت کو بہت اسٹرونگ بنا دیا تھا۔

شاہ ویز کی یہی بے نیازی و اعتماد اس کے لیے انا کی چوٹ بن گئی تھی۔

''سوری میڈم! سر کا موبائل آف ہے۔'' کافی دیر ٹرائی کرنے کے بعد وہ مخاطب ہوا۔

''نہ معلوم پاپا کو کیا ہوتا جا رہا ہے۔ دن بدن اپ سیٹ ہوتے جا رہے ہیں۔'' وہ بڑبڑائی تھی۔

اس اثناء میں وہائٹ کرولا سڑک پر آتی نظر آئی تھی۔ مشعل جلدی سے کار سے نکلی تھی جب کہ شاہ ویز بھی خاصا مستعد کھڑا تھا۔ کار ان کے قریب آ کر رک گئی۔

''ایکسکیوزمی، لفٹ پلیز۔'' اس سے پہلے وہ ڈرائیونگ ڈور پر جھک کر نو وارد سے مخاطب ہوئی۔

''اوہ یس...... اٹس مائی پلیژر۔'' اس نوجوان نے اس کے گہرے گلے کا گہری نگاہوں سے جائزہ لیتے ہوئے پُرجوش لہجے میں کہا۔ ساتھ ہی اس کے ہمراہ تین اور نوجوان کار سے اتر آئے تھے۔ شاہانہ و بے باک انداز۔ وہ مشعل ہی کی کیٹگری کے لگ رہے تھے۔

''بیوٹی گرل! ہمارے پاس اونلی ون سیٹ ہے، آپ کے پارٹنر کو سیٹ نہیں ملے گی۔'' ان میں سے دوسرا مخاطب ہوا تھا۔ اس کی بھوکی نگاہوں کی ہوس شاہ ویز کی زیرک نگاہوں سے مخفی نہ رہ سکی۔ وہ خاموشی سے ان کے تاثرات کا جائزہ لے رہا تھا۔ وائٹ ٹراؤزر جس کے کھلے پائنچوں پر شیشوں اور ریشم کی کڑھائی تھی، ساتھ ہی ریڈ شارٹ شرٹ پر بھی شیشوں اور میچنگ ریشم کی کڑھائی تھی۔ اس سوٹ میں اس کی سرخ و سپید رنگت کھل رہی تھی۔ میچنگ جیولری تھی، سرخ لپ اسٹک سے رنگے ہونٹ گویا مہکتے ہوئے گلاب تھے۔ سلیولیس بازو، چاندی کے مانند چمچما رہے تھے۔ مستزاد اس کی غلافی آنکھوں سے نکلتی غرور و تفاخر کی بجلیاں اور الہڑ انداز کسی کو نگاہیں چرانے کی جسارت بھی نہ دیتا تھا۔

''ڈونٹ وری، میں آپ کے ساتھ چلتی ہوں۔'' اس نے شولڈر پرس شانے پر ڈالتے ہوئے بے فکری سے کہا پھر مڑ کر خاموش کھڑے شاہ ویز سے مخاطب ہوئی۔

''تم آ جانا، کوئی نہ کوئی لفٹ تمہیں بھی دے ہی دے گا۔'' انداز سو فیصد تمسخرانہ تھا۔

''مس مشعل حسن بیگ صاحبہ! آپ میرے ساتھ ہی جائیں گی۔ میں آپ کو......''

''وہاٹ! دماغ درست ہے تمہارا؟''

''جی ہاں...... بہت شکریہ آپ لوگوں کی مہربانی کا۔ آپ لوگ جائیں۔'' وہ سخت لہجے میں ان چاروں سے مخاطب ہوا تھا جو چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔

''ارے...... اوقات میں رہو اپنی دو کوڑی کے ملازم۔ تمہیں حق کس نے دیا مجھ پر اپنا فیصلہ صادر کرنے کا؟ مجھے حکم دینے کا؟'' اس کا اشتعال سے برا حال تھا۔ اس کے معاملے میں کبھی اس کے باپ نے مداخلت نہ کی تھی پھر اس ملازم کو کس نے اختیار دیا؟''

''مجھے اپنی اوقات ازبر ہے لیکن آپ اپنی اوقات بھول رہی ہیں۔ آپ لڑکی ہیں اور تنہا ان اجنبی لوگوں کے ساتھ جانا آپ کو سوٹ نہیں کرے گا۔'' اس کا لہجہ نرم مگر آنکھوں اور چہرے پر سرخیاں اتر آئی تھیں۔

''ہونہہ...... اجنبی تو تم بھی ہو اور تمہارے ساتھ بھی میں تنہا......''

''میں اجنبی نہیں ہوں، آپ کے فادر کی فرم میں ملازم ہوں اور انہوں نے ہی مجھے یہ ڈیوٹی سونپی ہے کہ باحفاظت آپ کو گھر پہنچاؤں اور آپ سن لیجئے کہ میں یہ ڈیوٹی نبھاؤں گا۔ پلیز برادرز! آپ لوگ بھی اب جائیں ورنہ مجبوراً مجھے یہ استعمال کرنا پڑے گا۔'' اس نے جیب سے پستول نکالتے ہوئے سنجیدگی سے کہا تو وہ چاروں جو شکار ہاتھ سے نکلتا دیکھ کر اس کی طرف جارحانہ انداز میں بڑھ رہے تھے، یکدم یکے بعد دیگرے کار میں بیٹھ کر رفو چکر ہو گئے۔ اس کے لبوں پر لمحہ بھر کو مسکراہٹ چمک کر معدوم ہو گئی۔

''تم ...... تم ......'' وہ شدت غضب سے کچھ نہ کہہ سکی۔

''زبان کو لگام دیجئے اپنی میڈم۔'' برداشت وضبط کی طنابیں اس سے چھوٹ گئیں۔

''شٹ اپ، ذلیل آدمی، نوکر ہو کر میرے منہ لگتے ہو۔ گھر جا کر تمہاری کھال میں بھس نہ بھروا دیا تو میرا نام نہیں۔'' وہ گویا انگاروں پر لوٹ رہی تھی۔

شاہ ویز کے لئے یہ لمحات زندگی کے بدترین لمحات تھے کہ کوئی بالکل بے قصور ہونے کے باوجود اسے گالیاں دے رہا تھا۔ وہ پتھر بنا سن رہا تھا۔

''کوئی آسمان سے اترے گا ہماری مدد کو اب؟ کیوں نہیں جانے دیا مجھے ...... کیا یہاں تنہائی میں ڈر لگ رہا تھا، بزدل۔ ویسے تو بڑے طرم خان بنتے ہو، تمہاری بہادری ایک لڑکی کے سہارے کی محتاج ہے؟'' اس نے استہزائیہ لہجے میں جھلا کر کہا۔

''میں اگر حسن صاحب کے لحاظ میں خاموش ہوں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ جو چاہیں گی بکواس کریں گی۔ ہنہ ...... لڑکی اور سہارا ...... آپ لڑکی نہیں ہیں بلکہ جیتی جاگتی، چلتی پھرتی بے حیائی و بے غیرتی کی مثال ہیں۔ بے راہ روی، بے ضمیری کی غلاظت میں بھٹکتے ہوئے آپ کو خود کسی سہارے کی ضرورت ہے۔ کھوکھلی دیواریں کبھی سہارا نہیں بن سکتیں، ان سے ہمیشہ خطرہ رہتا ہے۔'' اس کی رگوں میں شرارے دوڑ رہے تھے، لہجے میں ایسی کاٹ تھی کہ مشعل تلملا کر رہ گئی۔

قبل اس کے کہ ان میں مزید کوئی بات ہوتی، ایک سوزوکی والا وہاں آ گیا اور شاہ ویز نے اس سے لفٹ مانگی اور کسی نہ کسی طرح کار بھی اسی سے باندھ کر ورکشاپ تک لے آئے تھے۔ وہاں سے گھر تک کا فاصلہ مشعل نے خاموشی سے طے کیا تھا۔

شاہ ویز اسے گیٹ کے باہر چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ نیند، تھکن اور پھر سب سے زیادہ اس سر پھرے شخص کی تلخ باتوں نے اس کا دماغ گھما ڈالا تھا۔ بے قراری سے انتظار کرتے حسن صاحب سے وہ سرسری انداز میں مل کر اپنے بیڈ روم کی طرف بڑھ گئی تھی۔

دوسرے دن وہ خاصی دیر تک سوتی رہی تھی۔ حسن صاحب ناشتہ کر کے آفس چلے گئے تھے اور ان کی واپسی سے ایک گھنٹہ قبل وہ بیدار ہو کر فریش ہوئی تھی۔ رافعہ، جوجو کے ہمراہ آئی تھیں۔ جوجو اس کے پاس چلا آیا تھا۔ چائے اور اسنیکس کے دوران انہوں نے گپ شپ کی تھی لیکن اس دوران وہ محسوس کر رہی تھی کہ جوجو کچھ پریشان ہے۔ اس کے پوچھنے پر وہ ہنس کر ٹال گیا تھا۔ اسی لمحے وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اسے رافعہ پھپھو کے ملنے کے خیال کے ساتھ شاہ ویز کا بھی خیال آ گیا تھا کہ کل کس طرح اس نے اسے ہرٹ کیا تھا۔ اب تو اسے نوکری سے نکلوا کر ہی چین سے بیٹھے گی اور اسے کوئی ایسی سزا دے گی جو ساری زندگی اسے یاد دلاتی رہے گی۔ وہ دل میں تہیہ کرتی جوجو کا ہاتھ پکڑے سٹنگ روم کے دروازے کے باہر ہی ٹھٹھک کر رک گئی۔ اندر سے پھپھو کی خوب چیخ کر بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

''احمد بہت ناراض ہیں، بہت ناگوار گزرا ہے انہیں جوجو پر آپ کا ہاتھ اٹھانا۔ اسی وجہ سے وہ آپ سے ملنے بھی نہیں آئے اور میں کوشش کر رہی تھی کہ آپ روپوں کا انتظام کر دیں گے تو شاید میں انہیں راضی کر لوں مگر یہاں آپ نے ہری جھنڈی دکھا دی ہے۔''

''احمد اور تم میری بات کو سمجھنے کی کوشش کرو، میری پرابلم میری مجبوری کو سمجھنے کی سعی تو کرو۔ میں نے پہلے بھی کہا ہے اور اب بھی کہہ رہا ہوں کہ مجھے تم سے زیادہ دولت و جائیداد کبھی عزیز نہیں رہی۔ اس وقت ویسٹرن کنٹریز میں خصوصاً مسلم کمیونٹی کو بزنس کے معاملے میں جو پرابلمز درپیش ہیں، ان سے احمد بخوبی واقف ہوں گے۔''

''یہ تو وہ بھی جانتے ہیں کہ آپ کوئی چھوٹے یا ناتجربہ کار بزنس مین تھوڑی ہیں۔''

''پہلے میری بات مکمل سنو۔'' وہ تیزی سے اپنی بات قطع کرتے دیکھ کر سنجیدگی سے بولے۔ ''رشتوں کے مقابل سرمائے کوئی وقعت نہیں رکھتے۔ نہ وقت کا چلن کبھی یکساں رہا ہے۔ تھوڑا سا صبر و برداشت سے کام لو، میں کوشش کر رہا ہوں، انشاء اللہ جلد کوئی نہ کوئی سبیل نکل آئے گی۔ احمد سے میں معذرت کرنے کو تیار ہوں، جوجو پر ہاتھ اٹھانے کی۔ مگر شرمندہ ہرگز نہیں ہوں۔'' ان کے لہجے میں دکھ بھی تھا اور صاف گوئی و حق پرستی کا وقار بھی۔

مشعل جو شاکڈ سی پھپھو اور پاپا کی باتیں سن رہی تھی معاً پاپا کے معذرت کے لفظ پر اس کی حسیات شارپ ہو گئیں۔ پھپھو کس قدر بدتمیزی و بدلحاظی سے مخاطب تھیں جب کہ پاپا کے لہجے کی نرمی، لجاجت و مروت نے اس کے اندر آتش فشاں کھول ڈالا تھا۔

''پاپا! کوئی ضرورت نہیں ہے آپ کو کسی سے معافی مانگنے کی یا معذرت کرنے کی۔'' اس نے اندر آ کر بگڑے لہجے میں کہا۔ پیچھے جوجو بھی اندر داخل ہوا تھا۔

''بیٹا! آپ اپنے روم میں جائیں۔''

''نہیں پاپا! آنٹی آپ سے اتنے اونچے لہجے میں بات کر رہی ہیں۔ اتنی بدلحاظی و بے مروتی سے گویا جیسے آپ سے ان کا کوئی معتبر رشتہ نہ ہو۔''

''تمہیں کوئی ضرورت نہیں ہے ہم بہن بھائی کے معاملے میں بولنے کی۔'' رافعہ غرائیں۔

''بھائی ...... ہنہ ...... کیوں، کیا بھائی کو اختیار نہیں ہوتا کہ وہ کسی بنا پر بہن کے بیٹے کو ایک تھپڑ رسید کر سکے؟'' اس نے بھی دوبدو کہا۔

''جوجو کو کبھی اس کے باپ نے نہیں مارا۔''

''کوئی انہونی بات نہیں ہے یہ۔ اس کے باپ نے کبھی اس کے اخراجات بھی نہیں اٹھائے۔''

''اوہ ...... تو تیرے باپ نے اٹھائے ہیں؟'' وہ لمحے بھر میں آپے سے باہر ہو گئیں۔

''یس ...... آف کورس۔ نہ صرف اس کے بلکہ اس کے باپ کے بھی اور اس کی ماں کے بھی اور اس کے فرینڈز اور ہابیز کے بھی۔ آپ نے کیا، کیا ہے سوائے اسے پیدا کرنے کے؟''

''دیکھ رہے ہیں بھائی جان اس بدتمیز لڑکی کی زبان؟ کیسے طعنے دے رہی ہے؟'' وہ جلے پیر کی بلی کی طرح پورے کمرے میں ناچ اٹھیں۔

''جو سچ کہنے کا شوق رکھتے ہیں انہیں سچ سننے کا حوصلہ بھی رکھنا چاہئے۔''

''مشی! بری بات ہے بیٹا۔ کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ کس طرح بات کر رہی ہیں؟ یہ پھپھو ہیں، بڑی ہیں آپ سے۔ چلیں سوری کریں۔ کم آن چیئر اپ۔'' حسن صاحب جو ہکا بکا بیٹی کے خطرناک تیور دیکھ رہے تھے معاً سرزنش کرنے لگے۔

''یہ مجھ سے بڑی ہیں، میں ان کی عزت کروں اور آپ ان سے بڑے ہیں، انہیں آپ کو بے عزت کرنے کا حق حاصل ہے؟ نہیں پاپا! میں سب کچھ برداشت کر سکتی ہوں مگر آپ کی انسلٹ مجھے کبھی گوارہ نہیں ہے۔ آنٹی، احمد انکل کی ناراضگی کی بات کر رہی ہیں، انہیں اعتراض ہے کہ جوجو کو آپ نے تھپڑ کیوں رسید کیا مگر اس سے قبل انہوں نے کبھی اس امر پر اعتراض کیوں نہیں کیا کہ ان کی موجودگی کے باوجود جوجو کی ذمے داری آپ کیوں اٹھاتے ہیں؟ آج ایک تھپڑ پر انہوں نے اتنا ہنگامہ کھڑا کر دیا ہے۔'' وہ غصے سے پاگل ہو رہی تھی۔

''ہم نے جو بھی لیا اپنا حق لیا، تمہیں اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔''

ان کی کھری اور کڑوی باتوں نے انہیں لاجواب کر ڈالا تھا مگر اپنے تیز طرار مزاج کے باعث ہتھیار ڈالنے کو تیار نہیں تھیں۔ جوجو سر جھکائے خاموش بیٹھا تھا۔

''بھائی جان! میں ابھی اسی وقت یہ رشتہ توڑتی ہوں توبہ توبہ، اچھا ہوا وقت سے پہلے اس لڑکی کی زبان کا مجھے بھید مل گیا ورنہ بعد میں تو ہمیں سر چھپانے کی بھی کہیں جگہ دستیاب نہ ہوتی۔'' انہوں نے آخری وار کیا تھا۔

حسن صاحب پریشان سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ مشعل کے چہرے پر بے یقینی تھی جب کہ جوجو اسی طرح سر جھکائے بیٹھا تھا جیسے اس کو اس فیصلے کا پہلے سے علم ہو۔

''یہ کیا کہہ رہی ہو؟ کچھ احساس ہے تمہیں رافعہ!'' حسن صاحب صدمے کی کیفیت میں تھے۔

''سوری بھائی صاحب! لیکن میں مجبور ہوں۔ آپ تو جانتے ہیں عورت کتنی خود مختار کیوں نہ ہو مگر کچھ فیصلے اسے مرد کے تابع رکھتے ہیں، حکم ماننے پر مجبور کرتے ہیں، رشتہ استوار رکھنے کے لئے دل پر جبر کرنا ہی پڑتا ہے۔'' بھائی کی دگرگوں ہوتی حالت نے ان کے کرخت وچنگھاڑتے لہجے کو بہ مصلحت نرم و غمگین کر دیا تھا مگر ان کی آنکھوں کی طمانیت چہرے کی آسودگی ان کے ہر لفظ کی چغلی کھا رہی تھی۔ مشعل بغور جواد کو دیکھ رہی تھی جو خاموش بیٹھا تھا۔

''احمد نے رشتہ میری بیٹی سے جوڑا تھا یا میری دولت سے؟'' بیگ صاحب کے لہجے میں تنفر تھا۔

''آف کورس پاپا! میرے ذریعے ملنے والی دولت سے۔'' مشعل نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''تم چپ رہو لڑکی اور بھائی صاحب! آپ کیسی بات کر رہے ہیں؟ کیا احمد ......''

''پاپا بالکل درست کہہ رہے ہیں۔'' وہ تیز لہجے میں کہہ کر جواد کی طرف بڑھی۔ ''جوجو تم بتاؤ، کیا تم مجھ سے تعلق توڑنا چاہتے ہو؟ کیا تم میرے بنا رہ لو گے؟''

''نہ ...... نہ ...... نہیں مگر ...... مما!''

''اس سے کیا پوچھتی ہو ...... مجھ سے معلوم کرو۔ یہ ہے ہی احمق اعظم۔'' رافعہ آگے آ کر اس کے اور جوجو کے درمیان کھڑی ہو گئیں۔ جواد گھگھیا کر خاموش ہو گیا۔

''رافعہ! میرے خیال میں تم یہ بالکل غلط کر رہی ہو۔ تمہیں بچوں کی خواہشوں کے درمیان نہیں آنا چاہئے۔ میں کہہ رہا ہوں مجھے تھوڑا وقت دو۔''

''نو پاپا! اب کبھی بھی میں اس رشتے کو نہیں مانوں گی۔ میں ہزار بار تھوکتی ہوں اس رشتے پر۔ عمر گزارنے کے لئے کسی مضبوط، باہمت اور بہادر لائف پارٹنر کی ضرورت ہوتی ہے جو وقت کے گرم و سرد سے آپ کو محفوظ رکھ سکے۔ جو کسی کا پابند نہ ہو، اپنے فیصلے خود کرنے کا اختیار رکھتا ہو، جس کی ذہانت و لیاقت سامنے والے کو مرعوب رکھے۔ جوجو ایسا کبھی نہیں بن سکتا، اس میں یہ کوالٹی ہی نہیں ہے۔ کل میرے ساتھ تھا تو میری محبت کا دم بھرتا تھا۔ آج اپنی مما کے ساتھ ہے تو ان کے فیصلوں پر دم ہلا رہا ہے۔''

اس کا اشتعال نقطہ عروج پر تھا۔

جواد اس کی خونخوار نظروں کی تاب نہ لا کر وہاں سے چلا گیا۔

''مشی! پلیز کول ڈاؤن بیٹا! رافعہ پھوپھو ہیں آپ کی۔ اس قدر ایموشنل نہیں ہوتے چندا۔''

''میرا کوئی رشتہ نہیں ہے ان سے ...... میں کوئی تعلق رکھنا بھی نہیں چاہتی۔''

''ہاں ...... ہاں ٹھیک کہہ رہی ہو، میرا کوئی رشتہ نہیں ہے تم سے اور نہ ہی تعلق ہے ...... یہ سب تو بھائی صاحب کی ......''

''رافعہ! خاموش رہو۔'' حسن بیگ اتنی زور سے چیخے کہ کمرہ گونج اٹھا۔ مشعل نے ازحد حیرانی سے باپ کی طرف دیکھا جو زندگی میں پہلی بار لاڈلی، چہیتی بہن سے اس لہجے میں مخاطب ہوئے تھے۔

''مشی! آپ جائیں بیٹا اپنے روم میں فوراً......'' اس بار ان کے لہجے میں ملامت کے ساتھ واضح طور پر لرزش بھی تھی۔ اس نے ایک نگاہ باپ کے سفید پڑتے چہرے کو دیکھا پھر وہاں سے چلی گئی۔

''کہنے دیجیے مجھے بھائی صاحب! یہ آپ کی رحم دلی کا نتیجہ ہے جو ایک ایسی لڑکی ہمارے منہ لگ رہی ہے جس کی نہ ماں کا پتہ ہے نہ باپ کا ...... نہ معلوم کس گندے ونیچ گھٹیا خاندان سے تعلق ہوگا اس کا۔ جو بچے کچرے کے ڈھیر پر پڑے ملتے ہیں وہ خود بھی نجس ہوتے ہیں، کچرا ہوتے ہیں اور آپ اس کچرے کے ڈھیر سے بچی کو لا کر یہ بھول گئے کہ نہ معلوم اس کی رگوں میں کس بدچلن عورت، کس بدکردار مرد کا خون گردش کر رہا ہوگا۔ ایسا گندا خون اپنی گندگی ضرور دکھاتا ہے، نسلوں کی بنیاد ہمیشہ اعلیٰ اور صاف خون پر رکھی جاتی ہیں۔ ایک خاندانی ماں ہی بہترین خاندان تشکیل دے سکتی ہے اور مشعل میں یہ تمام خوبیاں نہیں ہیں۔'' وہ بے حسی و سنگدلی کی جیتی جاگتی تصویر بنی اس حقیقت کو بیان کر رہی تھیں جس کو وہ جان بوجھ کر برسوں سے ذہن سے کھرچتے آئے تھے اور آج اٹھارہ انیس سال بعد وہ اس حقیقت کو پوری طرح بھول چکے تھے کہ رافعہ نے بڑی بے رحمی سے اس حقیقت کو یاد دلا کر انہیں زخم زخم کر ڈالا تھا۔

''رافعہ! تمہیں بخوبی علم ہے کہ تمہارا ایک ایک لفظ میرے اندر گہرے گہرے زخم بنا رہا ہے۔ مشعل میری بیٹی نہیں ہے۔'' انہوں نے کرب سے ہونٹ بھینچے۔ ''مگر مجھے بیٹی کی طرح ہی عزیز ہے بلکہ اپنی جان سے بڑھ کر، اپنی روح سے بڑھ کر پیاری ہے۔ آج تو تم نے اسے غیر کہا ہے مگر آئندہ کبھی اسے کچھ کہا یا اسے اور جواد کو اصلیت بتانے کی کوشش کی تو یاد رکھنا میرا مرا منہ دیکھو گی۔'' ان کے لہجے میں بے کراں اذیت و کرب پنہاں تھا۔

''بھائی صاحب! اس کی محبت میں آپ اس قدر آگے نکل گئے ہیں کہ موت کی سرحد عبور کرنے کو تیار ہو گئے ہیں اور میں انہیں اصلیت بتانے ہی کیوں لگی؟'' وہ کچھ کھسیا کر بولیں۔

''غلط بیانی مت کرو رافعہ! اگر میں دخل نہ دیتا تو تم یہاں قیامت برپا کر چکی ہوتیں۔''

''اچھا بھائی صاحب! میں وعدہ کرتی ہوں، کبھی بھی یہ حقیقت نہیں بتاؤں گی۔ مگر سن لیں، مشی میری بہو نہیں بن سکتی۔'' وہ سرد مہری سے کہہ کر رکی نہیں وہاں سے چلی گئیں۔

حسن صاحب لڑکھڑاتے قدموں سے اپنے بیڈ روم میں آئے تھے۔ سر دونوں ہاتھوں میں تھام کر بیڈ پر ڈھے گئے۔ دانستہ طور پر ان کی بہن نے ان کے زخموں کے ٹانکے نوچ ڈالے تھے۔ تکلیف، کرب، اذیت سے ان کا چہرہ مسخ ہو رہا تھا۔ ماضی کے جھروکوں سے ان کی محبوب بیوی آنکھوں میں محبت و چاہت کے دیپ جلائے جھانک رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر دلفریب مسکان تھی۔

''رضوانہ! یہ کیا کہہ دیا رافعہ نے کہ مشعل میری بیٹی نہیں ہے، آہ کس قدر کٹھور ہو گئی ہے وہ، نہ اسے رشتوں کے تقدس کا خیال رہا ہے نہ اپنوں سے وابستگی کا احساس، کتنے اطمینان سے اس نے کہہ دیا کہ مشعل میری بیٹی نہیں ہے۔ وہ گندا خون اس کی بہو بننے کے قابل نہیں ہے۔ آج بہت مکروہ روپ دیکھا ہے میں نے اپنی ماں جائی کا، وہ مجھے برا کہتی، میری کردار کشی کرتی میں اسے معاف کر دیتا، کبھی شکوہ بھی زبان پر نہ لاتا۔ مگر رافعہ نے مشعل پر انگلی اٹھا کر مجھے کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے اور سمجھا دیا ہے کہ اب اپنوں پر بھی اعتبار و بھروسہ کرنے کا وقت نہیں رہا ہے، بدلتے وقت، بدلتے موسم ان خالص رشتوں میں بھی تغیر پیدا کر چکے ہیں۔ رضوانہ! تمہیں معلوم ہے نا؟ آج اگر میں زندہ ہوں تو مشعل کی وجہ سے ورنہ تمہارے پیچھے مشعل کے پیچھے میں بھی اس دنیا کو چھوڑ چکا ہوتا۔ لیکن میرے ساتھ میرے مولا نے ایک جگہ انصاف کیا، ایک مشعل تمہارے ساتھ بھیج دی تو دوسری مشعل کو دنیا میں میرے لئے بھیج دیا۔ وہی میرے جینے کا آسرا ہے۔ پھر رافعہ نے کیوں کہا کہ وہ میری بیٹی نہیں ہے، گندا خون ہے، اس کے خاندان کی بہو بننے کے قابل نہیں ہے۔ نہیں نہیں ...... مشعل میری بیٹی ہے، میری جان ہے، میری روح ہے، میرے زندہ رہنے کی وجہ ہے۔ مشی ...... مشعل ......''

''مشی!'' شدید صدمے نے انہیں حواس باختہ کر ڈالا تھا۔ پہلے تو وہ اس طرح محو گفتگو تھے جیسے کسی نادیدہ وجود سے مخاطب ہوں، پھر گھبراہٹ و درد کا احساس اتنی سرعت سے ہوا تھا کہ وہ قلب پر ہاتھ رکھے شدید تکلیف میں مشعل کو پکارنے لگے تھے۔

□●□

فرم کی جانب سے بہترین علاقے میں اسے بنگلہ مل چکا تھا جس کو اس نے بہت نفاست اور سادہ طریقے سے ڈیکوریٹ کروایا تھا۔ نئی آف وہائٹ چھماتی کار بھی اس کے تصرف میں تھی۔ بے جی اس روشن اور ہوادار گھر میں آ کر بہت خوش تھیں۔ خالہ زرینہ بھی ایک ہفتہ رہ کر بہت خوش واپس لوٹی تھیں۔ شاہ ویز نے بے جی کے علاوہ ان کے لئے بھی دل کھول کر شاپنگ کی۔

''اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے اپنی رحمت ہم پر دراز کر دی۔ میں کہتی تھی نا بیٹا! رات کتنی ہی طویل ہو بالآخر سحر کی سپیدی و اجالا ہر سو بکھر جاتا ہے، ہر شے منور اور روشن ہو جاتی ہے۔ اب تمہارے راستے بھی سیدھے اور روشن ہیں۔ میری دعا ہے اللہ نے جس طرح یہاں تمہیں سرفراز کیا ہے، آخرت میں بھی کامیاب و کامران کرے۔'' انہوں نے اس کی پیشانی چومتے ہوئے دل کی گہرائیوں سے دعا دی۔

''یہ سب آپ کی دعاؤں، کاوشوں کا انعام ہے ورنہ میری بساط ہی کیا ہے۔''

''نہیں بیٹا! میں نے کیا کیا ہے۔ یہ سب تمہاری محنتوں اور صبر کا ثمر ہے۔ میں نے تو ایک ماں کی ذمے داری نبھانے کی کوشش کی ہے، جو رب کے فضل سے رائیگاں نہیں ہوئی۔ میں نے جیتے جی تمہیں کامیاب و خوشحال دیکھ لیا۔ اب تو ایک ہی تمنا جاگ اٹھی ہے۔''

''کون سی تمنا؟'' اس نے سلائس پر جیم لگاتے ہوئے پُر اشتیاق انداز میں استفسار کیا۔

''اس گھر میں بہو لانے کی، تمہیں سہرا باندھے دیکھنے کی۔'' وہ مسرت سے چہک کر بولیں۔

''اوہ، ابھی نہیں بے جی۔ اس خواہش کو مزید کچھ عرصے کے لئے سلا دیں۔''

''کیوں؟''

''میں ابھی کچھ عرصہ آزاد رہنا چاہتا ہوں۔'' اس نے اطمینان سے کہا۔

''شادی کا کہہ رہی ہوں، کوئی بیڑیاں تھوڑی تمہارے پاؤں میں ڈال رہی ہوں؟''

''بیڑیاں ہی تو ڈال دی جاتی ہیں ...... نادیدہ بیڑیاں۔''

''اچھا ابھی پلک جھپکتے میں شادی تھوڑی ہو جائے گی، شادی کے لئے ایک عدد لڑکی کی ضرورت ہوتی ہے اور ایسے میں صرف لڑکی کو نہیں بلکہ اس کا خاندان، گھر کا ماحول، گفت و شنید، نشست و برخاست، طور و اطوار سب کچھ ہی دیکھنا و پرکھنا ہوتا ہے۔ لڑکی کا مزاج و سلیقہ گھر کے ماحول سے پتہ چل جاتا ہے۔'' چائے پیتے ہوئے وہ خاصی جذباتی تھیں۔

''بے جی! آپ لڑکی کیا خرید کر لائیں گی جو اس قدر خوبیاں دیکھیں گی۔'' وہ عادت کے برخلاف قہقہہ لگا کر گویا ہوا تھا۔ بے جی شفقت سے مسکرائیں۔

''ارے خریدنا کیا میرے بچے! دراصل میں صورت کی نہیں سیرت کی طلب گار ہوں۔ لڑکی بھلے خوب صورت نہ ہو مگر بااخلاق و بامروت اور سگھڑ، سلیقہ مند ہونی چاہئے جو سچ مچ گھر کو جنت بنا کر رکھ دے، خوب سوچ سمجھ کر کسی ایک گھر میں قدم رکھوں گی میں، جو میرے معیار کا ہوگا۔ گھر گھر گھس کر گائے، بکریوں کی طرح لڑکیاں دیکھ کر مسترد کر دینا اور پھر دوبارہ یہی مشغلہ جاری رکھنا مجھے سخت ناپسند ہے۔ خوامخواہ ماں باپ کی عزت اور لڑکیوں کی انا و عزت نفس کو مجروح کرنا کتنی دل آزاری کا کام ہے۔ پھر اللہ کو بھی یہ بات پسند نہیں کہ ہم اس کے بنائے بندوں میں نقائص نکالیں۔''

''مجھے تو آپ کے ارادے خطرناک اور عزائم خوفناک لگ رہے ہیں۔'' اس نے شوخی سے کہا۔

''اچھا ایک بات تو بتاؤ سچ سچ؟'' وہ اس کی جانب ٹٹولتی نگاہوں سے بولیں۔

''جی کہیے ...... پر اس سچ سچ کہوں گا۔'' وہ چائے کا کپ رکھ کر الرٹ ہو گیا۔

''تمہیں کوئی لڑکی پسند تو نہیں؟''

''نہیں ...... بالکل نہیں۔''

''سچ کہہ رہے ہو؟''

''بالکل سچ۔''

''پھر وہ لڑکی کون تھی؟'' انہوں نے کچھ توقف کے بعد کہا۔

''وہ لڑکی؟ کون سی لڑکی بے جی؟'' وہ ازحد متعجب ہوا۔

''وہ جو ہسپتال میں تم سے ملنے آئی تھی اور انگریزی گفتگو کر رہی تھی اور لباس بھی اس نے فرنگیوں والا پہن رکھا تھا۔'' بے جی کی نگاہیں ابھی بھی اس کے چہرے کے بدلتے رنگوں کو بغور دیکھ رہی تھیں، جانچ رہی تھیں، پرکھ رہی تھیں جیسے کوئی بھید پانا چاہ رہی ہوں اور ان کی وضاحت پر مشعل کا مغرور سراپا اس کے ذہن کے کینوس پر ابھرا اور ایک دم اس کا منہ اس طرح بن گیا جیسے میٹھے بادام کھاتے کھاتے اچانک کڑوا بادام منہ میں آ جانے سے بن جاتا ہے۔

''وہ حسن بیگ صاحب کی بیٹی ہے اور باپ کی دولت و جائیداد نے اس کا دماغ بالکل خراب کر دیا ہے۔ لیکن آپ کیوں پوچھ رہی ہیں اس بدتمیز و بد دماغ لڑکی کا؟''

''میں...... میں سمجھی شاید تم اسے پسند کرتے ہو۔''

''میں اور اس کڑوے کریلے کو پسند کروں گا...... لاول ولاقوۃ...... وہ لڑکی نہیں، بھڑوں کا چھتہ ہے۔ اس سے شادی کرنے سے بہتر ہے بندہ خودکشی کر لے۔'' اس نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا تو بے جی بولیں۔

''ہوں...... یہ تو قصہ ہی ختم۔ وہ تمہارے مالک کی بیٹی ہے۔ تمہارا اور اس کا جوڑ ممکن بھی نہیں، بہت بڑے لوگ ہیں وہ۔ خیر اب میرے ذہن سے ایک بوجھ ہٹ گیا۔ ایک ہفتے بعد زرینہ آنے کا کہہ گئی ہے۔ وہ آ جائے تو خاندان کی لڑکیوں کے متعلق وہی بتائے گی کہ کون کون بیاہی گئیں اور کون کنواری ہیں۔ مجھے تو شروع سے ہی تنہائی کی عادت ہے مگر وہ تو سب سے ہی ملتی جلتی رہتی ہے اس لئے حالات سے بھی سب کے باخبر ہے۔ لیکن تم تو مشورہ دو، لڑکی دیکھوں یا نہیں؟'' معاً انہوں نے چونک کر استفسار کیا۔

''آپ کا حکم میں کس طرح ٹال سکتا ہوں۔ آپ کی چوائس پر مکمل بھروسہ و اعتماد ہے مجھے۔ صرف ایک استدعا ہے، شادی ایک ڈیڑھ سال کے بعد کروں گا۔ اس سے قبل آپ جو رسمیں کرنا چاہیں بصد شوق کریں مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' اس نے اختیار کی ڈور انہیں تھما دی تھی۔ جواباً بے شمار دعاؤں سے نوازا گیا تھا۔ بے جی کو اس کی سعادت مندی پر ہمیشہ سے فخر رہا تھا۔ اب زندگی کے اتنے اہم فیصلے کی اجازت انہیں دے کر تا قیامت معتبر کر ڈالا تھا۔

□●□

فرم جا کر معلوم ہوا کہ رات حسن بیگ کو شدید ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ ان کی حالت تسلی بخش نہیں تھی۔ وہ آئی سی یو میں تھے۔

وہ سیدھا ہسپتال چلا آیا۔ وہاں کسی کو بھی حسن بیگ سے ملنے کی اجازت نہ تھی۔ کل سے اب تک ان کی حالت میں سرِ مو فرق نہیں آیا تھا۔ وہ مسلسل خطرے میں تھے۔

وہ ڈاکٹرز سے ملنے کے بعد آئی سی یو سے ملحقہ کوریڈور میں رکھی بینچ پر بیٹھ گیا تھا۔ اس کے اندر دکھ کا غبار پھیلتا چلا گیا۔ دل کی گہرائیوں سے وہ ان کی لمبی عمر اور صحت یابی کی دعائیں کرنے لگا۔ حسن بیگ سے ان کا کوئی خونی رشتہ نہیں تھا نہ ہی قریب یا دور کی رشتے داری تھی لیکن اس کے اندر دکھ و احساسات کی ایسی ہی لہریں بکھر رہی تھیں جیسے اپنے کسی سگے کی تکلیف یا دکھ پر، پریشانی و اضطراب لمحہ بہ لمحہ بڑھنے لگتا ہے۔ یہ سب بیگ صاحب کی مشفق طبیعت و با اخلاق مزاج کی کشش تھی جو صرف ایک ملازم ہونے کے باوجود اپنوں کی طرح پریشان، متفکر و دعاگو تھا۔

معاً ان کے کانوں میں گھٹی گھٹی سسکیاں گونجی تھیں۔ اس سے کافی فاصلے پر نیم اندھیرے حصے میں مشعل چہرہ جھکائے بیٹھی تھی۔ سرخی مائل اخروٹی رنگ کے بال اس کے شانوں تک بکھرے ہوئے تھے، کچھ چہرے کے اردگرد بھی پہرہ دیئے گئے تھے۔ کافی فاصلے سے بھی اس کے رخساروں پر پھیلتے شفاف موتی واضح نظر آ رہے تھے۔ سسکیوں کے سبب اس کا نازک وجود کسی پھولوں کی ڈال کی طرح لچک لچک جاتا تھا۔

ایک گوشے میں تنہا بیٹھی روتی ہوئی وہ مکمل بے بسی، بے کسی و بے وقعتی کی زندہ مثال تھی۔ یہ بے حد خاص لڑکی کا بے حد عام سا روپ تھا۔ بھلا پتھر بھی کبھی موم ہوتے ہیں؟ وہ دم بخود سا اس کی جانب بے ارادہ دیکھے جا رہا تھا اور پہلی بار اسے ادراک ہوا، مرد کتنا ہی سنگدل و کٹھور کیوں نہ ہو مگر عورت کے آنسو اسے پگھلانے کے لئے تیزاب سے بھی زیادہ طاقت کے حامل ہوتے ہیں، روتی ہوئی عورت مرد کی کمزوری ہے۔ بڑے بڑے پہلوانوں کو شکست دی جا سکتی ہے مگر عورت کے آنسوؤں کو نہیں۔ اس کی زندگی کا پہلا تجربہ تھا کسی صنف مخالف کو آنسوؤں کی برسات کرتے دیکھا۔ اس لمحے اس کے دل سے تمام نفرت، عداوت غائب تھی۔ اس کا دل شدت سے چاہ رہا تھا کہ اس کمزور و بے بس لڑکی کو تسلی و تشفی دے، حوصلہ و ہمت دے اس کٹھن وقت کو سہارنے کی ترغیب دے۔ اسے عام کمزور و بے سہارا لڑکی کی طرح آنسو بہاتے دیکھ کر اس کے اندر کا روایتی مرد جاگ اٹھا تھا جو عورت کی کمزوری و آنسوؤں کے سامنے خود کو طاقت ور اور با حوصلہ سمجھتا ہے۔ وہ اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اٹھنے ہی والا تھا کہ یکدم کوریڈور کا گلاس ڈور کھول کر ایک متناسب جسم کی فیشن ایبل خاتون اندر داخل ہوئیں اور بانہیں پھیلا کر روتے ہوئے مشعل کی جانب بڑھتے ہوئے کہنے لگیں۔

''بھائی صاحب کو کیا ہو گیا؟ رات کو تو ٹھیک ٹھاک چھوڑ کر گئی تھی۔''

''اس کا جواب خود ہی دیجئے۔ کیونکہ میں تو پاپا کو ٹھیک چھوڑ کر گئی تھی۔ پھر کچھ دیر بعد ملازم نے انہیں بے ہوش دیکھ کر مجھے اطلاع دی۔ ان کو اسی وقت ملازم کے ساتھ میں ہسپتال لے کر آئی تھی۔ ان کی حالت رات سے اب تک ایسی ہے۔ انکل باری کہہ رہے ہیں کہ وہ کسی گہرے اور ناقابل برداشت صدمے کے زیر اثر ہیں۔ ان کی ہارٹ بیٹس، بی پی لیول کنٹرول نہیں ہو رہا ہے اور اس کی وجہ آپ ہیں۔'' اس نے غصے سے اپنی طرف بڑھنے والے ان کے بازو جھٹک دیئے تھے اور بہت نفرت و درشتگی سے ان سے مخاطب ہوئی تھی۔

''کیا، میں......؟ دماغ درست ہے تمہارا؟'' وہ اسے گھور کر غصے سے بولیں۔

''نہیں...... اس وقت میرا دماغ درست نہیں ہے۔ میرے پاپا اندر زندگی و موت سے جنگ لڑ رہے ہیں اور یہاں میں...... لیکن آپ کان کھول کر سن لیں اگر میرے پاپا کو کچھ ہو گیا تو میں آپ کو اور آپ کے خاندان کو زندہ نہیں رہنے دوں گی۔''

کچھ دیر قبل نظر آنے والی معصوم و کمزور ہرنی کا یہ روپ زخمی شیرنی کا سا تھا۔

''اے لڑکی! زبان سنبھال کر بات کر۔ وہ میرے بھائی ہیں اور مجھے سب سے زیادہ عزیز ہیں۔''

''ہوں، بھائی نہیں دولت۔ ابھی بھی آپ کی آس، امید اور لالچ زندہ ہے۔ محبت تو کب کی مر چکی مگر اب سب ختم۔ میرے پاپا کو اس حالت تک پہنچانے والی عورت سے ہمیں کوئی رشتہ نہیں رکھنا۔ چلی جائیں آپ یہاں سے...... چلی جائیں۔'' اس وقت وہ سخت جنونی ہو رہی تھی۔ کوریڈور میں اسٹاف کے علاوہ دوسرے لوگ بھی جمع ہو گئے تھے۔ شاہ ویز کے دل میں پیدا ہونے والے ہمدردی کے جذبات فنا ہو گئے۔ وہ کھڑا تھا۔

''مجبور ہوں میں، بھائی جان کو دیئے وعدہ کا پاس نہ ہوتا تو تمہاری اصلیت ابھی بتاتی اور تم لوگوں سے چہرہ چھپاتی نظر آتیں۔'' رافعہ بیگم بھی شدید طیش میں تھیں۔

''میری اصلیت سے ایک دنیا واقف ہے، جس باپ کی میں بیٹی ہوں اس سے سب واقف ہیں۔ آپ کیا میری اصلیت بتائیں گی۔ بہتر یہی ہو گا کہ آپ یہاں سے چلی جائیں اور آئندہ ہمیں اپنی صورت دکھانے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''میں یہاں اپنے بھائی سے ملنے آئی ہوں اور آتی رہوں گی۔ کسی میں دم ہے تو روک کر دکھائے مجھے۔'' اتنے لوگوں میں اپنا تماشا بن جانے پر سخت خجالت محسوس کر رہی تھیں مگر مضبوط اعصاب کی مالک تھیں، مضبوطی سے مقابلے پر ڈٹی رہیں۔

''واچ مین، واچ مین! اس عورت کو دھکے دے کر نکالو یہاں سے...... اگر آئندہ یہ مجھے نظر آئی تو تمہیں ملازمت سے چھٹی مل جائے گی۔'' وہ بلیو یونیفارم میں ملبوس چوکیدار سے دھمکی آمیز لہجے میں بولی تو چوکیدار گھبرایا ہوا آگے بڑھا۔

''آیئے میڈم! پلیز میڈم!'' وہ رافعہ کی بارعب شخصیت سے بھی مرعوب تھا اور خونخوار بنی مشعل سے بھی متاثر تھا اور جانتا تھا یہاں کے بانی ڈاکٹر باری سے ان کے بہترین تعلقات ہیں۔ بڑے پریشان کن انداز میں وہ مخاطب ہوا تھا۔

''کیا ہو رہا ہے یہاں؟'' ڈاکٹر باری کی باٹ دار آواز سنتے ہی سب لوگ چلے گئے تھے جب کہ چوکیدار سراسیمگی کی حالت میں کھڑا رہا تھا۔

''باری صاحب! اس پاگل لڑکی نے سب ہنگامہ کھڑا کیا ہے۔ میرے بھائی کی حالت نے میری جان پر بنا رکھی ہے اور اس لڑکی کے دماغ ہی ٹھکانے پر نہیں ہیں۔'' رافعہ نے بھرائے لہجے میں ڈاکٹر باری سے شکایت کی تھی۔

''انکل! اس عورت کو لے جائیں یہاں سے...... پاپا کی حالت کی ذمے داری ان کی ہے۔''

''ریلیکس...... ریلیکس مائی ڈاٹر!''

''نہیں انکل! مجھے سکون نہیں ملے گا...... میرے پاپا وہاں تکلیف میں مبتلا ہیں۔ وہ سب کا خیال رکھتے ہیں، سب کی بہتری کے خواہاں رہتے ہیں۔ آج خود سے بے خبر ہیں، مجھ سے بے خبر ہیں اور یہ سب ان کی لالچ و خود غرضی کے سبب ہوا ہے۔ میرا دل چاہ رہا ہے انہیں شوٹ کر دوں۔'' اس کا جنون، اس کا اشتعال لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہا تھا۔ ڈاکٹر باری اس کی ذہنی کنڈیشن سے بخوبی واقف تھے۔ وہ رافعہ سے استدعا کرنے لگے کہ وہ یہاں سے چلی جائیں۔

''واہ...... یہ کیا بات ہوئی؟ میں کیوں جاؤں؟ میں اس بدتمیز اور زبان دراز لڑکی سے دبنے والی، ڈرنے والی اب نہیں ہوں۔ جائے گی تو یہ یہاں سے۔'' وہ مقابلے پر اتر آئیں۔

''پلیز میڈم! آپ خیال کریں...... یہ انتہائی نگہداشت روم ہے۔ اندر آواز چلی گئی تو ڈسٹربنس ہو سکتی ہے۔'' شاہ ویز سے برداشت نہ ہوا تو وہ چیختی، چنگھاڑتی رافعہ سے مخاطب ہوا۔ وہ حیرانی سے اس کی طرف دیکھنے لگی تھیں۔

''میں بھی آپ کو یہی سمجھانے آیا تھا۔ مشعل ابھی ناسمجھ، کم فہم ہے۔ آپ تو جانتی ہیں حسن کس قدر محبت کرتے ہیں ان سے۔ ایسے موقع پر اس طرح کی مس انڈرسٹینڈنگ ہو جاتی ہے۔ آپ مائنڈ نہ کریں، بعد میں وہ خود آپ سے ایکسکیوز کریں گی۔'' ڈاکٹر باری رافعہ کو سمجھا بجھا کر لے جانے میں وہاں سے کامیاب ہو گئے تھے۔

''نان سینس...... ایکٹرلیس وومن سمجھتی ہے سب کو اسٹوپڈ بنا لے گی۔'' وہ بڑبڑاتے ہوئے صوفے کی جانب بڑھی تھی۔ کوریڈور خالی تھا ماسوائے ان دونوں کے۔

''اے! پانی لا کر دو ایک گلاس۔'' وہ سخت تحکمانہ لہجے میں ایک طرف کھڑے شاہ ویز سے مخاطب ہوئی تھی۔ اس لمحے پوری طرح اس کے اندر کی گھمنڈی لڑکی بیدار تھی۔ وہ ایک طویل سانس لیتا ہوا، سر کو جھٹکتا باہر کینٹین کی طرف بڑھ گیا اور منرل واٹر بوتل اسے لا کر پکڑائی تھی۔ وہ جو شاید ساری رات کی جاگی ہوئی تھی اور از حد پریشانی و گریہ سے اس کے چہرے پر تھکن تھی، لمحے بھر کو بوتل اسے دیتے ہوئے اس کی نگاہیں اس سے ٹکرائی تھیں۔ سیاہ ٹراؤزر، سیاہ شرٹ میں اس کے سفید چہرے پر سرخ انگارہ آنکھیں عجب لگ رہی تھیں جن میں نمی ابھی بھی کنول کی طرح تیر رہی تھی۔

دوپہر میں حسن صاحب کی حالت کچھ سنبھلی اور رات کو انہیں آئی سی یو سے پرائیویٹ روم میں منتقل کر دیا گیا۔ مشعل کو انہوں نے ہوش میں آتے ہی پکارا تھا اور جب سے اب تک وہ اسے اپنی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دے رہے تھے۔ ازحد کمزور، آزردہ و مضطرب تھے۔ مشعل تو ان کے سینے سے لگ کر دل کا غبار آنسوؤں کی صورت میں نکال کر پُرسکون ہو گئی تھی مگر گاہے بگاہے ان کی آنکھوں سے آنسو نکل کر تکیے میں جذب ہو رہے تھے۔

شاہ ویز نے انہیں بہت تسلی دی، ازحد ہمت بندھائی، بیماری سے جدوجہد کرنے کا حوصلہ دیا۔ وہ دھیمے سے مسکرا کر اس کی تمام ہدایات سن رہے تھے۔

رات کو شاہ ویز چلا گیا تھا۔ مشعل وہیں ان کے پاس رکی رہی تھی۔ باری صاحب نے کہا بھی کہ وہ اور اسٹاف موجود ہیں حسن صاحب کی کیئر کرنے کے لئے مگر اس نے وہاں سے جانے کی ہامی نہ بھری اور نہ ہی حسن صاحب نے اسے گھر جانے کا کہا۔ وہ بھی اسے نظروں سے دور کرنا نہیں چاہتے تھے۔

دوسرے دن بھی ان کی طبیعت زیادہ بہتر نہیں ہوئی تھی۔ شاہ ویز کو انہوں نے فرمز کی اہم ذمے داریاں سونپ دی تھیں جنہیں وہ خوش اسلوبی سے نبھا رہا تھا۔ شام کو ہسپتال آ کر وہ انہیں تمام کاروبار کے متعلق بریف کرتا، اہم فائلز پر سائن لیتا تھا حسن کو اس کی کارکردگی و صلاحیتوں پر اعتماد تھا۔

بزنس کی جانب سے وہ مطمئن تھے مگر ان کی بڑی اور اہم پرابلم تھی مشعل کی ذات، اس کا خیال اور مستقبل کی فکر۔ رافعہ نے مکمل طور پر انہیں بدظن و دل گرفتگی کا شکار کر دیا تھا۔ اس سے قبل وہ صرف مشعل کی وجہ سے جواد کی تمام ایکٹیویٹیز نظر انداز کرتے آئے تھے۔ اس کی نااہلیت، نامعقولیت، کاہلیت کو کڑوے گھونٹ کی طرح بیٹی کی خاطر جبراً حلق سے اتار گئے تھے، یہ سوچ کر کہ ان کے پاس تمام دولت وجائیداد مشعل کے نام ہے جو شادی کے بعد ان دونوں کے لئے ہوتی اور شاید شادی کے بعد اس کے اندر ذمے داری و احساس پیدا ہو جائے تو وہ معقول انسان بن جائے۔ مگر رافعہ نے ان کے خوابوں و آرزوؤں کا گھڑا، امیدوں کا آئینہ منزل سے بہت پہلے ہی چکنا چور کر ڈالا تھا، بہن نہیں ناگن ثابت ہوئی تھیں۔ اب انہیں یہ خوف کھائے جا رہا تھا کہ اپنی کمینگی و بے اعتمادی عادت کی بدولت اس راز سے مشعل کو آگاہ نہ کر دیں...... اور اگر ایسا ہو بھی گیا تو؟ یہاں آ کر ان کے اضطراب و اضطرار کی طنابیں چھوٹ جاتی تھیں۔ ان کا بس چلتا تو مشعل کو لے کر یہاں سے ہمیشہ کے لئے بہت دور چلے جاتے جہاں ایسا کوئی خطرہ و بے بس کر دینے والا احساس نہ ہوتا۔ انہیں احساس تھا اگر خدانخواستہ مشعل اس انکشاف سے آگاہ ہو گئی تو وہ جذبات میں خود کو ختم کر سکتی ہے۔ اس کی جذباتیت و طبیعت سے وہ واقف تھے اور اسی سوچ نے انہیں فرسٹ ہارٹ اٹیک کا شکار کر دیا تھا اور طبیعت ابھی بھی ان کی تسلی بخش نہیں تھی۔ ایک ہفتہ گزر جانے کے باوجود انہیں ڈسچارج نہیں کیا گیا تھا۔

”میں پوچھ پوچھ کر تھک چکا ہوں حسن! اب بتاؤ بھی اصل پرابلم کیا ہیں؟ جن پرابلم نے تمہیں اس قدر ڈسٹرب کر رکھا ہے کہ تمہارا بی پی نارمل لیول تک نہیں آتا جس سے تمہاری ہارٹ اینڈ برین کنڈیشن پر بیشر انز ہیں۔ آئی تھنک ہارٹ ویری وِیلینس فیل کر رہا ہے اور تمہیں انفارم کر دوں کہ تمہاری یہی کیفیت رہی تو سیکنڈ ہارٹ اٹیک کو برداشت کرنے کا تم میں حوصلہ و طاقت نہیں ہے۔ بہتر یہی ہے جو بھی پرابلم ہیں وہ شیئر کرو۔“

اس دن شاہ ویز انہیں کاروباری معاملات کے متعلق آگاہ کر رہا تھا جب ڈاکٹر باری بہت ناراضگی و خفگی سے ان سے مخاطب ہوئے تھے۔

شاہ ویز خاموش ہو گیا جب کہ حسن صاحب مسکرا کر گویا ہوئے۔

”فکرمند مت ہو باری! اتنی جلدی مرنے والا نہیں ہوں۔“

”ہاں اگر تم اپنی پرابلم شیئر کرتے ہو تو۔“ وہ شاہ ویز کے برابر میں بیٹھ کر بولے۔

”پرابلم تو زندگی کا احساس پیدا کرتے ہیں۔ آگاہی بخشتے ہیں زندگی کی اہمیت کی۔“

”باتوں میں اڑانے کی کوشش مت کرو، بتاؤ مسئلہ کیا ہے؟ ورنہ تم جیسا بہادر و باحوصلہ آدمی اس طرح بیڈ پر اتنے دن نہیں گزار سکتا۔“ وہ بضد تھے۔

”سر! میں اجازت چاہتا ہوں۔“ ان کے پرسنل معاملات میں اسے اپنی موجودگی غیر مناسب سی لگی تھی۔ وہ فوراً بول اٹھا۔ ویسے بھی وہ مشعل کی غیر موجودگی میں آتا تھا۔ اب اس کی آمد کا ٹائم بھی ہو رہا تھا۔ وہ اس کی آمد سے قبل جانا چاہتا تھا۔

”نہیں بیٹھیں، چائے کا آرڈر دیا ہے۔ آپ ایسے موقعوں سے فوراً غیر حاضر ہونا چاہتے ہیں جب ہم کوئی پرسنل افیئرز ڈسکس کرنا چاہتے ہوں لیکن میں آپ کو بتا دوں کہ میں آپ کو اپنی فیملی کا ممبر سمجھتا ہوں اور یہ باری بھی سمجھ گئے ہیں اس لئے انہوں نے اتنی پرسنل بات آپ کے سامنے پوچھی ہے۔“ حسن صاحب نے اس کا ارادہ بھانپ کر فوراً نرمی سے کہا۔

”آف کورس ینگ مین! اس امپورٹنس کا اندازہ تو آپ کو فوراً ہو جانا چاہئے تھا۔ حسن نے کاروبار کی مکمل ذمے داری آپ کو دے رکھی ہے۔ اتنا اطمینان و اعتماد تو اپنوں پر ہوتا ہے ورنہ میں جانتا ہوں آپ سے بہت سینئرز فرم میں موجود ہیں۔“ انہوں نے فوراً تائید کی تو وہ نگاہیں جھکا کر رہ گیا کہ بعض اوقات تشکر کے لئے الفاظ بے معنی ہو جاتے ہیں۔

”زندگی باوفا، بااعتبار کبھی تھی اور کسی کی بھی نہیں ہوتی باری۔ موت زندگی کا تعاقب پیدائش کے وقت سے ہی شروع کر دیتی ہے۔ یہ ہماری عاقبت نااندیشی و غفلت ہوتی ہے کہ ہم زندگی کو سدا رہنے والی قوت سمجھتے ہیں اور سوچتے ہیں ابھی تھوڑی مریں گے اور اسی خوش فہمی میں ہم موت کی آغوش میں پہنچ جاتے ہیں۔ بے شک موت کے لئے عمر، وقت و تجربہ کوئی شرط نہیں ہے۔ یہ رب کریم کے حکم سے آتی ہے۔“

”یہ...... یہ کیا باتیں شروع کر دی ہیں حسن!“ وہ پریشانی سے کہنے لگے۔

”میں درست کہہ رہا ہوں، میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ موت کا کوئی بھروسہ نہیں کب اور کس عمر میں آ جائے مگر جب میری طرح دل کمزور پڑنے لگے تو سمجھو ہم صرف مہمان ہیں یہاں، ایک ایسے بنجارے جو کبھی اچانک ہی سب چھوڑ چھاڑ چل پڑیں گے آخرت کے سفر پر۔ یہاں کی تشنہ آرزوئیں، ناآسودہ خواہشیں، بلکتی امنگیں، بسورتی امیدیں ہم پر واویلا کرتی رہ جائیں گی اور مسافر منہ موڑ کر چل پڑے گا۔“ نہ معلوم کن احساسات و جذبات کے تحت ان کی آواز بھرا گئی تھی۔ آنکھوں کے گوشے نم ہو گئے تھے۔

”فکر ہے مجھے اپنی کائنات، اپنی بیٹی، اپنی مشعل کی۔ میرے بعد اس کا کیا ہوگا؟“

اسی وقت ڈاکٹر کو پیغام ملا، کسی ایمرجنسی کیس کے آ جانے پر انہیں فوری آپریشن روم میں بلایا گیا تھا۔ وہ معذرت کرتے ہوئے بعد میں بات کرنے کا کہہ کر تیز تیز قدموں سے چلے گئے۔

”مجھے یہی خوف ہے، یہی فکر ہے کہ میری مشی کا کیا ہوگا؟ یہاں کے تمام رشتے کھوٹ زدہ ہو گئے ہیں، دولت کی چمک دمک نے دلوں سے خالص رشتے اور اپنائیت کی چمک چھین لی ہے۔“

”ایسا نہیں ہے سر! ہر جگہ رشتوں کا تقدس پامال نہیں ہوا ہے، اپنائیت کی حرمت بھی محفوظ ہے، انسانیت کی معراج بھی معتبر ہے، خالص محبت بھی ناپید نہیں ہوئی ہے۔ صرف کہیں کہیں شگاف ضرور پیدا ہوئے ہیں اور یہ سب وقتی ہوتے ہیں۔“

”اچھا، کیا انسانیت کے ناتے خلوص کی بقا کے لئے یا ایک نیم زندہ شخص کے لئے آپ بڑی قربانی دینے کا حوصلہ رکھتے ہیں؟“ یکدم ہی اس کا ہاتھ اپنے ناتواں ہاتھوں میں لے کر انہوں نے ایک عجیب سا سوال کر ڈالا۔ شاہ ویز نے اس وقت ان کے پژمردہ چہرے پر عجیب سی چمک دیکھی، بجھی ہوئی اداس آنکھوں میں یکلخت ہی کئی چراغ روشن ہوئے تھے۔ اپنے ہاتھ پر ان کے ہاتھوں کی لرزش وہ پوری طرح محسوس کر رہا تھا۔

”کیسی قربانی سر؟“ وہ پوری طرح الرٹ ہوا تھا۔

”آپ مشی سے شادی کر لیں۔“ وہ اٹک اٹک کر آہستگی سے اس سے مخاطب ہوئے تھے۔ اس لمحے اس کے ہاتھ پر ان کی گرفت مضبوط ہو گئی۔ وہ پُرامید آنکھوں سے اسے دیکھنے لگے تھے جب کہ شاہ ویز کی نگاہوں میں بے یقینی، چہرے پر استعجاب کے رنگ بکھر گئے تھے۔

”سر! کیا کہہ رہے ہیں آپ...... آپ کو احساس ہے؟“ بہت جلد اس نے خود پر قابو پا لیا تھا اور خاصے سنجیدہ لہجے میں استفسار کیا تھا۔

”ہاں...... میں باہوش و حواس آپ سے مخاطب ہوں شاہ ویز! یہ میری خواہش ہی نہیں التجا بھی ہے۔ میں تہہ دل سے مشکور ہوں گا اگر آپ......“

”لیکن سر! یہ کس طرح ممکن ہے۔ میرا اسٹینڈرڈ، میرا اسٹیٹس بہت لو لیول ہے اور ایسے تعلقات کی ڈور برابری کی بنیاد پر باندھنا بہتر ہوتا ہے۔ پھر مس مشعل تو انگیجڈ ہیں، شاید آپ بہت زیادہ ڈسٹرب ہیں۔“

”اصل اسٹینڈرڈ انسان کا اعلیٰ کردار و خاندانی شرافت و سعادت مندی ہوتی ہے بیٹا! دھن دولت کو نہ میں نے کبھی پہلے کوئی اہمیت دی ہے اور نہ اب میرے آگے اس کی کوئی ویلیو ہے۔ ارادے مضبوط اور حوصلے بلند ہوں تو انسان ناممکن کو بھی ممکن بنا ڈالتا ہے اور کھری بات یہ ہے کہ آپ میری توقعات پر کھرے اترے ہو۔ اور رہا سوال مشعل کی انگیج منٹ کا تو جو رشتے دولت کے ڈھیر پر استوار ہوتے ہیں وہ کچے دھاگے سے بھی زیادہ ناپائیدار و کمزور ہوتے ہیں۔ سو یہ تعلق بھی کچھ ایسا ہی بے وقعت و کمزور تھا۔ آپ اپنا ارادہ بتائیں، یہ قربانی دینے کو تیار ہیں؟ دیکھیں بیٹا جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ میرے دل کی آواز ہے۔ میرے لاشعور میں مخفی ایک زوردار خواہش و آرزو جو بخدا نہ معلوم کب میرے اندر داخل ہو گئی اور ڈاکٹر باری نے جب یہ کہا تھا آپ کو ہسپتال میں دیکھ کر کہ آپ مشی کے فیانسی ہیں میرے ہونے والے داماد تو نہ معلوم کیوں میں اس کی تردید نہ کر سکا۔ شاید میرے تحت الشعور میں کہیں یہ خواہش دبی ہوئی تھی جو میں خاموش ہو گیا۔ بہرکیف فیصلہ کرنے کا اختیار مکمل طور پر آپ کو ہے۔ یہاں میں آپ کو پریشرائز نہیں کروں گا اور نہ ہی کسی قسم کی سوچ اپنی ملازمت کے بارے میں لائیے گا۔ آپ کی ہاں اور ناں دونوں صورت میں آپ کی ملازمت برقرار رہے گی۔ اور نہ ہی میری آرزو کو میرے خلوص کے پیمانے پر پرکھئے گا۔ کیونکہ زبردستی کے بندھن کبھی بھی پائیدار ثابت نہیں ہوتے۔“ انہوں نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔

”سر! آپ نے لفظ قربانی کیوں استعمال کیا ہے؟“ وہ ہچکچا کر گویا ہوا۔

”مشعل میری جان ہے اور مجھے اعتراف ہے کہ میرے بے جا لاڈ پیار اور آزادی نے اسے بے حد ضدی، ہٹ دھرم اور آزاد خیال بنا ڈالا ہے۔ اس کے ساتھ لائف گزارنا واقعی خود کو قربان کر دینے کے مترادف ہے۔ وہ ازحد خود پسند و خود پرست ہو گئی ہے اور مجھے ڈر ہے کہ اس کا یہی مزاج، ایسا ہی رویہ رہا تو اس کے لئے قطعی بہتر

نہیں ہوگا۔ آپ سے چند ملاقاتیں تو ہوئی ہیں اس کی اور یقیناً آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ وہ کس قدر منہ پھٹ و بے لگام ہوچکی ہے۔ میں اپنی بچی کی برائی نہیں کررہا بلکہ اللہ کو حاضر و ناظر جان کر آپ کو صاف گوئی و سچائی سے وہ سب بتا رہا ہوں جو میرے خیال میں آپ کے علم میں ہونا لازمی ہے تاکہ آپ خوب سوچ سمجھ کر اس رشتے سے وابستہ ہونا یا نہ ہونا چاہیں کیونکہ کسی بھی معاملے میں، میں نے کبھی کسی سے غلط بیانی نہیں کی۔''

وہ کچھ دیر کے لئے خاموش ہوگئے تھے۔ گفتگو نے انہیں نڈھال سا کر ڈالا تھا۔ شاہ ویز کے اندر سناٹے غول در غول اترتے جارہے تھے۔ وہ کسی مجسمے کی طرح ساکت تھا۔

''میں باپ ہوں اس کا اور میرے ساتھ رویہ اس کا جاں نثار بچی جیسا ہے۔ بہت چاہتی ہے مجھے۔ مگر میرے علاوہ وہ کسی رشتے کو کوئی اہمیت نہیں دے سکتی۔ لیکن شوہر و بیوی میں جو تعلق ہوتا ہے، وہ عزت و احترام، خلوص و محبت کے احساسات کا مظہر ہوتا ہے اور اس کا سارا کریڈٹ مرد کو جاتا ہے کہ وہ بیوی کو کس زاویے پر رکھتا ہے، میری بات سمجھ رہے ہیں نا آپ؟ یعنی مشعل کو ایک بہترین و اعلیٰ انسان کے روپ میں دیکھنا چاہتا ہوں میں۔ یہاں میں ایک باپ کے طور پر ناکام ہوگیا ہوں مگر شوہر ناکام نہیں ہوسکتا۔ مجھے یقین ہے مشعل ابھی اتنی دور نہیں گئی جو اس کی واپسی کی راہیں مسدود ہوجائیں۔''

''سوری سر! آپ کے جذبات کا میں احترام کرتا ہوں، آپ کی تہہ دل سے عزت کرتا ہوں مگر میرا اور آپ کا معاشی تضاد مجھے قدم اٹھانے نہیں دے گا۔ بصورت دیگر اگر میں کسی طرح یہ کام کرلوں تو بھی میری انا، میرا وقار، میری حمیت مجھے میری نگاہوں میں کبھی سرخرو نہیں ہونے دے گی اور ایک ٹوٹا بکھرا، شرمندہ و بے اختیار شخص کبھی بھی قابل احترام و معتبر نہیں ہوتا سر! اپنی جگہ پتھر بھی مضبوط ہوتا ہے اور اپنی جگہ سے ہٹ کر ٹھوکریں اور تذلیل ہی اس کا نصیب ہوتا ہے۔'' اس نے سنجیدگی سے اپنی رائے ظاہر کی تھی۔

''میں نے کہا نا دولت و جائیداد آپ کے درمیان نہیں آئے گی۔'' حسن صاحب نے تیزی سے کہا۔

''امپاسبل سر! یہ تو بہت پرانی کہانی ہے۔ ضرورت مند ملازم، دولت مند باس کی بیٹی سے شادی اور پھر ذلت بھری پُر اہانت زندگی، جہاں آدمی کی زندگی اس کتے سے بھی بدتر ہوجاتی ہے جو نہ گھر کا رہتا ہے نہ گھاٹ کا۔'' اس کے لہجے میں سخت ناگواری و ناپسندیدگی تھی۔ حسن صاحب بہت غور سے اس کا جائزہ لے رہے تھے۔

''کیا آپ کسی ایسی لڑکی سے شادی کریں گے جو اپنے جہیز میں مفلسی و غربت لائے؟''

''آف کورس..... میں ان فرسودہ جہالت بھری روایات کے خلاف ہوں۔ آپ خود سوچیں کسی باحمیت شخص کو یہ سوٹ کرتا ہے کہ اس کی زندگی میں شامل ہونے والی لڑکی وہ سب سامان لے کر آئے جو ضروریات زندگی ہوتا ہے۔ کیا یہ کسی باغیرت و باضمیر شخص کے لئے شرم سے ڈوب مرنے کا مقام نہیں ہے؟ میں ان فضول رسموں کے خلاف ہوں جو خودداری و خود انحصاری کو قتل کردیتی ہوں۔ فی الحال میری زندگی اور میرے حوالے سے میرے گھر میں آنے والی لڑکی کے پاس جو بھی کچھ ہوگا وہ میری کمائی کا ہوگا۔ چاہے وہ معمولی سا لباس ہو یا عام سا زیور، سب پر میرا نام ہوگا۔''

''ہاں..... مجھے ایسے ہی غیرت مند اور خوددار لڑکے کی تلاش تھی جو بیوی کے ساتھ آنے والی دولت کا خواہش مند نہ ہو بلکہ اپنے زور بازو اور محنت پر یقین رکھتا ہو۔ تم ہیرا ہو شاہ ویز! ایک نادر و نایاب ہیرا، میں تمہیں کسی طرح بھی کھونے نہیں دوں گا۔ میری مشعل کو راہ راست پر تم ہی لاسکتے ہو۔ تمہیں حاصل کرنے کے لئے مجھے اپنے وقار و حیثیت سے گرنا پڑے گا۔ مجھے منظور ہے۔ تمہیں پانے کے لئے میں تمہارے در پر بھیک مانگنے سے بھی نہ ہچکچاؤں گا لیکن تمہیں حاصل کرکے رہوں گا۔'' وہ خود سے مخاطب تھے۔ ایک نیا عزم، نیا جوش، نیا ولولہ ان کے اندر توانائی بن کر اتر رہا تھا۔

''چند دن بعد خوب سوچ سمجھ کر مجھے جواب دینا۔ اور ہاں اگر آپ چاہیں گے تو دولت و جائیداد کی دیوار ڈھائی بھی جاسکتی ہے، وجہ صرف یہی ہے کہ میں آپ کو کھونا نہیں چاہتا۔'' انہوں نے بات کرتے ہوئے خلوص سے کہا۔ وہ متفکر سا ہاتھ ملا کر چلا گیا۔

□●□

آج ایک ہفتے سے زائد ہوچکا تھا۔ وہ آفس پابندی سے جارہا تھا مگر حسن صاحب کے پاس جانے کی ہمت و حوصلہ نہ تھا۔ حالانکہ تین روز قبل وہ ڈسچارج ہوکر گھر جاچکے تھے مگر کمزوری اور طبیعت مکمل طور پر ٹھیک نہ ہونے کے باعث وہ آفس نہیں آرہے تھے۔ آفس کے ضروری کام کے لئے وہ ان کے سیکریٹری کو استعمال کررہا تھا۔

زندگی میں پہلی بار وہ اس ٹینشن کا شکار ہوا تھا جس سے وہ خلاصی نہ پارہا تھا۔ مشعل جیسی بدتمیز، مغرور، خودسر اور ازحد آزاد خیال لڑکی کبھی بھی اس کی آئیڈیل نہ رہی تھی۔ اس کے لباس، اس کے انداز، اس کی طرز گفتگو کچھ بھی تو اس کی طبیعت و مزاج سے ہم آہنگ نہ تھی اور نہ ہی وہ اس کے ذریعے دولت مند بننے کا آرزومند تھا۔ لیکن اس دن سے آج تک اس کی نگاہوں میں حسن صاحب کا آس بھرا لہجہ، پُر امید نگاہیں، التجائیہ انداز اور ہر طریقے سے اس کی منشاء کو مدنظر رکھ کر پیشکش کرنا اسے مخمصے میں ڈالے ہوئے تھا۔ اس کا دل و دماغ پوری شدت سے انکاری تھا۔ کسی طرح بھی مشعل کو اپنانے پر تیار نہ تھا۔ پہلی مرتبہ اس نے بے جی سے یہ بات چھپائی تھی۔ جانتا تھا وہ ہر طرح سے اس کی پسند و فیصلے کو ہی ترجیح دیں گی۔

آج آفس میں حسن صاحب کا پیغام آیا تھا کہ وہ اس سے ملنا چاہتے ہیں۔ وہ جان بوجھ کر کام میں لگا رہا تھا اور چھٹی میں سب سے پہلے باہر نکل گیا تھا اور اب گھر آکر وہ پریشان تھا۔ اس کا ضمیر اسے سخت ملامت کررہا تھا کہ اسے اس طرح اس شریف و مخلص شخص کے صبر کا امتحان نہ لینا چاہئے اور اپنا فیصلہ سنا دینا چاہئے کہ وہ ان کی بیٹی سے شادی کرنے کی قربانی دینے کو ہرگز تیار نہیں ہے۔ مگر یہاں آکر حسن صاحب کی امیدوں و خواہشوں کے خیال سے وہ ہارنے لگتا تھا۔ اس کی حساسیت و نرم دلی اسے بے سکون کرڈالتی اور ذہن میں مسلسل سوالات احساسات حملہ آور ہوجاتے تو وہ مضطرب ہواٹھتا۔ دل کہتا بھلا ایک شخص کی آرزو کی خاطر وہ اپنی زندگی داؤ پر کیوں لگا دے؟ ضمیر پکار اٹھتا اصل زندگی وہی ہے جو دوسروں کو خوشیاں دینے کے لئے وقف ہو۔

دماغ چیخ اٹھتا کہ نہیں، زندگی ایک بار ملتی ہے اسے کسی دوسرے کی خودغرضی کی خاطر رائیگاں نہیں کرنا چاہئے صرف اپنی مسرتوں کو ترجیح دینی چاہئے۔

احساسات شور مچانے لگتے کہ وہ کس طرح حسن صاحب جیسے اچھے و پُرخلوص شخص کو نہ کہہ سکتا ہے۔ ان کے بہت احسانات ہیں اس پر۔

''یہ زرینہ کو بھی پتہ نہیں کیا ہوجاتا ہے، جب دھن سوار ہوگی تو ہر روز چکر پر چکر لگاتی ہے۔ اب ایک ہفتہ گزر بھی گیا اور اسے کچھ ہوش ہی نہیں کہ یہاں آنا بھی ہے یا نہیں۔ ہر روز انتظار کرتی ہوں کہ آج آئے، شاید آجائے مگر وہ تو لگتا ہے یہاں کا راستہ ہی بھول گئی ہے، سوچ رہی ہوں میں خود ہی چلی جاؤں۔ دراصل مجھے انتظار ہے، اس سے مل کر.....''

انہیں محسوس ہوا کہ وہ اتنی دیر سے بولے جارہی ہیں اور شاہ ویز کوئی جواب نہیں دے رہا۔ انہوں نے مڑ کر دیکھا تو اسے دونوں ہاتھوں میں سر تھامے آنکھیں بند کئے کرسی پر بیٹھا پایا۔

''خیریت تو ہے نا بیٹا..... کیوں اس طرح بیٹھے ہو؟'' انہوں نے گھبرا کر اس کا شانہ ہلا کر کہا۔

''اوہ، بے جی..... کوئی بات نہیں۔'' لمحے بھر کو غنودگی میں ڈوب گیا تھا وہ۔

''نہیں..... میں نہیں مان سکتی۔ ضرور کوئی بات ہے..... کیا اب ہمارے درمیان ایسا بھی ہوگا کہ تم اپنی پریشانی مجھ سے چھپاؤ گے؟'' ان کا لہجہ آزردہ تھا۔

''ایسا کبھی ممکن نہیں ہے بے جی۔ آپ پریشان مت ہوں۔''

''پھر بتاؤ کیا بات ہے؟ میں کچھ دنوں سے محسوس تو کررہی ہوں کہ تم الجھے الجھے، پریشان سے ہو مگر میں نے سوچا آفس کے کام کی زیادتی کی وجہ سے ایسا ہے۔ لیکن اب مجھے لگتا ہے کوئی اہم بات ہے، بہت زیادہ اہم و ضروری جو مجھ سے چھپا رہے ہو۔'' ان کی ممتا و شفقت نے اسے مجبور کرڈالا سب کچھ بتانے کو۔ پھر اس نے ان سے کچھ نہیں چھپایا، سب بتاڈالا اور مشورہ بھی مانگا کہ وہ کیا کرے؟

''ہمیں ان کے خلوص اور نیت پر شبہ نہیں کرنا چاہئے بیٹا، انہوں نے جس طرح سے قدم قدم پر ہمیں سہارا دیا ہے یہ ان کی نیک فطرت و دریا دلی کا ثبوت ہے اور پھر اب بھی فیصلہ انہوں نے تمہاری مرضی پر چھوڑ کر اپنی اعلیٰ ظرفی دکھائی ہے اور ان کی اس سے زیادہ سچائی کیا ہوگی کہ انہوں نے اپنی بیٹی کی عادت و مزاج کے بارے میں صاف گوئی سے بتادیا۔ میں کہتی ہوں ہاں کہہ دو۔''

اس کی بات اطمینان سے سننے کے بعد انہوں نے مشورہ دیا تھا۔

''کیا؟..... بے جی کیا کہہ رہی ہیں آپ..... وہ لڑکی مجھے قطعی پسند نہیں۔'' وہ ان کے دو ٹوک لہجے پر حیرانگی سے کھڑا ہوکر بولا۔

''شادی کے بعد اس کو اپنی پسند کے مطابق ڈھال لینے میں تو مردانگی ہے۔''

''بے جی..... بے جی! وہ لڑکی ہے، کوئی موم کی گڑیا نہیں ہے۔ نہ معلوم کیا سمجھ رہی ہیں آپ اسے..... وہ اس قدر بدتمیز، زبان دراز اور گھمنڈی لڑکی ہے جس کا آپ تصور بھی نہیں کرسکتیں۔ زرینہ خالہ کی بہو تو تھوڑی غصے کی تیز ہے لیکن وہ مشعل تمیز و آداب سے واسطہ ہی نہیں رکھتی اور خود پرست اتنی ہے کہ اپنے علاوہ اسے دوسرا نظر نہیں آتا۔''

''کوئی بات نہیں..... تمہاری صحبت میں رہے گی تو مکمل انسان بن جائے گی۔ نہ میں زرینہ ہوں اور نہ تم اصغر، کس رشتے کو کس طرح نبھایا جاتا ہے ہم اچھی طرح جانتے ہیں۔ شکر ہے میرے مولا کا، جو اس نے مجھے گھر بیٹھے بہو ولا دی۔ ورنہ نہ معلوم مجھے کیا کیا جتن کرنے پڑتے خیر وہ لڑکی بہت خوب صورت ہے، چاند سورج کی جوڑی لگے گی۔''

''جی، سورج ہے وہ، جو سوا نیزے پر ہوتا ہے..... پل بھر میں ہر شے کو خاکستر کر ڈالنے والا۔ میں تو سوچ رہا تھا آپ مجھے کوئی معقول و خوب صورت مشورہ دیں گی اس بلا سے جان چھڑانے کا مگر آپ نے فیصلہ صادر کردیا۔ کچھ تو غور کریں بے جی۔ وہ بڑے گھر کی بگڑی ہوئی لڑکی ہے جو اپنے سے کمتروں کو جانوروں سے بھی بدتر سمجھتی ہے۔''

''جب وہ ہمارے پاس آئے گی تو ہمارے جیسی ہی ہوگی۔ ہم اقرار کی یہی شرط رکھیں گے کہ لڑکی خالی ہاتھ ہمارے گھر آئے گی اور اس کے باپ کی دولت و جائیداد سے ہمارا یا اس کا کبھی بھی کوئی واسطہ نہیں ہوگا۔'' بے جی کا جوش و خروش اس کا دل جلا رہا تھا۔

''میں کل ہی جاؤں گی زرینہ کو ساتھ لے کر ان کے ہاں تمہارے رشتے کی بات کرنے، بے فکر رہو۔ میں خود ہر بات سنبھال لوں گی۔'' بہت سنجیدہ و بردبار سی بے جی اس وقت بچوں کی طرح خوش و خرم و پرجوش نظر آرہی تھیں۔ انہوں نے سختی سے اس کے ہر اعتراض، جواز اور انکار کو مسترد کردیا تھا۔ وہ بے بس سا ان کو دیکھتا رہ گیا کہ انہیں بتا

کر اپنے گلے پر چھری اس نے خود پھیری تھی۔ اب بچاؤ کی تدبیر ہی فضول تھی۔

دوسرے دن زرینہ کو بلا کر وہ باقاعدہ شاہ ویز کا پرپوزل لے کر حسن صاحب کے پاس گئی تھیں جہاں ان کی خصوصی طور پر مہمان نوازی کی گئی تھی۔ حسن صاحب تو دلی مراد بر آنے پر اس قدر خوش تھے کہ انہوں نے روایتی طور پر کچھ وقت مانگنے کے بجائے فوراً رشتہ منظور کر لیا تھا۔ بے جی کے ساتھ زرینہ بھی بہت خوش لوٹی تھیں۔ آفس سے واپسی پر شاہ ویز کو خوب ستا کر، چھیڑ کر رات کا کھانا کھا کر گھر گئی تھیں۔

''خوش نہیں ہو؟'' زرینہ کے جانے کے بعد وہ خاموش بیٹھے شاہ ویز سے مخاطب ہوئیں۔

''اب یہ پوچھنا کوئی معنی نہیں رکھتا بے جی۔''

''دیکھو شاہ ویز! اچھی چیزوں کے سب طلب گار ہوتے ہیں۔ یہ عام رجحان ہے مگر انفرادیت وخاصیت یہ ہے جب آپ اپنی اچھائی سے برائی کو بھی اچھائی میں تبدیل کر دیں۔''

''یہ سب کرنے کے لئے ایک صبر آزما عرصہ درکار ہوتا ہے۔ جو ہمارے پاس کہاں۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔

اسی دم بیل بجی تھی۔ وہ باہر گیا تو حسن صاحب وہاں موجود تھے۔ افسردگی، پریشانی، پشیمانی ان کے چہرے سے عیاں تھی۔ انہوں نے ڈرائیور کو واپس جانے کو کہا اور خود اس کے ہمراہ لیونگ روم میں داخل ہوئے جہاں بے جی موجود تھیں۔

''بہن جی! میں معذرت چاہتا ہوں۔''

''جی بھائی صاحب؟'' بے جی بوکھلا کر گویا ہوئیں۔

''آرام کے ٹائم آپ کو بے آرام کرنے پر معذرت خواہ ہوں۔''

''اوہ، کوئی بات نہیں...... آپ بیٹھیں۔ ہم دیر سے سونے کے عادی ہیں۔'' آتے ہی بلا تمہید ان کی معذرت پر ان کے دل میں کئی وسوسے آئے تھے۔

''دراصل مجھے آپ سے اور شاہ ویز سے چند ایسی باتیں کرنی ہیں جن کو ہمارے سوا اور کوئی نہ سن سکے۔ اس لئے میں آپ کے یہاں حاضر ہوا ہوں۔'' وہ صوفے پر آرام سے بیٹھتے ہوئے گویا ہوئے تھے۔

''ضرور بھائی صاحب! آپ ہم پر اعتماد کر سکتے ہیں۔ انشاء اللہ آپ کا بھروسہ سدا قائم رہے گا۔'' بے جی دوسرے صوفے پر بیٹھتے ہوئے پُراعتماد لہجے میں بولیں جب کہ شاہ ویز بھی ان کے قریب ہی بیٹھ گیا تھا۔ اس کے ہر انداز سے لاتعلقی و بے زاری عیاں تھی۔

کمرے میں مکمل سکوت تھا، صرف وال کلاک کی ٹک ٹک کی آواز معمولی سا ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔ بے جی اور شاہ ویز خاموش بیٹھے تھے۔ حسن صاحب گفتگو کے آغاز کے لئے لفظوں کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ ان کے پُروقار چہرے پر ملامت تھی۔ ذہین آنکھیں دماغی اسکرین پر ماضی کو دیکھ رہی تھیں۔ کافی دیر گزر جانے کے بعد وہ گویا ہوئے۔

''میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ بات کہاں سے شروع کروں کہ ماضی پرستوں کے لئے ہر بات، ہر یاد بھی اہم وعزیز ہوتی ہے اور ان کو دہرانے میں جو لذت وطمانیت ہوتی ہے وہ بیان سے قاصر ہے۔ میں کوشش کروں گا مختصر طور پر آپ کو ہر اس حقیقت سے آگاہ کروں جو بعد میں کسی بھی خفت یا بدگمانی کا باعث نہ بنے۔ میں محسوس کر رہا ہوں کہ شاہ ویز اس پرپوزل پر بالکل ناخوش ہیں۔ یہ ان کی سعادت مندی وازحد فرماں برداری ہے جو یہ زندگی کا اتنا اہم فیصلہ، بہن جی آپ کی وجہ سے یا میرے لحاظ میں جبراً قبول کر بیٹھے ہیں۔''

ان کی صاف گوئی اور ذہانت نے بے جی کو نروس کر دیا تھا جب کہ شاہ ویز پہلو بدل کر رہ گیا۔

''میں نے پہلے بھی کہا تھا اور اب بھی کہہ رہا ہوں کہ زبردستی کے بندھن کبھی پائیدار نہیں ہوتے اور ابھی سوچنے سمجھنے کا وقت موجود ہے۔ آپ بلا جھجک فیصلہ کریں۔''

''بھائی صاحب! ہمارے پاس صرف جو دولت ہے وہ زبان کی پاسداری ہے جو زبان اقرار کر چکی ہے وہ انکار نہیں کر سکتی۔ آپ بے فکر ہو جائیں، شاہ ویز سے آپ کو کبھی کوئی شکایت نہیں ہوگی۔'' بے جی نے تذبذب کا شکار دیکھ کر رسانیت سے سمجھایا۔

''میں کوئی جدی پشتی رئیس نہیں ہوں، میرا بچپن اور نوجوانی کا عرصہ سخت غربت وعسرت میں گزرا ہے، وقت کے بہت گرم وسرد دیکھے ہیں، فاقوں ومجبوریوں سے بھی شناسائی رہی۔ میرے والد بہت عبادت گزار ومحنتی آدمی تھے، والدہ بہت جلد ہمارا ساتھ چھوڑ گئی تھیں۔ والد نے ہی ماں کے انتقال کے بعد ان کی ذمے داری بھی نبھائی، کٹھن حالات اور بے حد غربت کے باوجود ہم بہن بھائی کو اعلیٰ تعلیم دلوائی اور یہ ان کی محنتوں ودعاؤں کا ہی ثمر ہے کہ آج میں اپنے ملک کے بڑے بزنس مینز میں شمار ہوتا ہوں...... شاہ ویز! مجھے دیکھ کر آپ کو کبھی یہ احساس ہوا کہ میرا اور آپ کا وقت کبھی ایک سا رہا ہے؟'' وہ مسکرا کر اس سے مخاطب ہوئے۔

''نہیں سر! یہ آپ کی اعلیٰ ظرفی ہے جو آپ اپنا آپ ظاہر کر رہے ہیں۔'' شاہ ویز کو اخلاقاً ہونٹ کھولنے پڑے تھے۔

''طویل صبر آزما عرصے کے بعد میں نے کاروبار ایک چھوٹے معمولی کارخانے سے اسٹارٹ کیا تھا اور اس دو تنگ کمروں کے کارخانے کو چلانے کے لئے جس طرح میں نے بینک سے لون حاصل کیا وہ جدوجہد خواری میں آج تک فراموش نہیں کر سکا ہوں، میں پُراعتماد تھا، پُرامید تھا، مجھے لگن تھی، جنون تھا اپنا آپ بدلنے کا، اپنے حالات بدلنے کا، اپنی تقدیر بدلنے کا کیونکہ اللہ تعالیٰ بھی یہی فرماتا ہے۔ بس میں نے یہی بات ذہن نشین کر لی تھی اور اکثر دہرا کر خود کو حوصلہ دیتا رہتا تھا۔ لگن سچی ہو، حوصلے چٹان ہوں تو انسان ہر شے کو حاصل کر سکتا ہے۔ غیب سے امداد ہوتی ہے آگے بڑھنے والوں کی۔ سو میں کٹھنائیوں کو عبور کر کے آگے بڑھتا چلا گیا اور کامیابیاں میری راہوں میں سرنگوں ہوتی گئیں۔ میری جدوجہد، اعتماد وکٹھن محنت نے مجھے غربت وافلاس کی پستی سے نکال کر دولت کی بلندی پر پہنچا دیا۔ میرے حوصلوں نے میری کایا پلٹ دی تھی۔ والد صاحب شکر وقناعت کے عادی تھے۔ وہ بھی میری خوش حالی دیکھنے سے قبل دنیا چھوڑ گئے تھے۔ میں نے اپنی بہن رافعہ کی شادی میں وہ تمام ارمان نکالے جو برسوں سے میرے دل میں تھے۔ رافعہ کی شادی کے دو سال بعد میں نے بھی شادی کر لی۔ رضوانہ کا تعلق متوسط گھرانے سے تھا۔ ایک فنکشن میں، میں نے اسے دیکھا تھا۔ رضوانہ میری سوچ کے مطابق بہترین بیوی ثابت ہوئی تھی۔ میری زندگی میں بہار ہی بہار ہر سُو چھائی ہوئی تھی۔ ہر طرف آسودگی وطمانیت، خوشبو کی طرح بکھری ہوئی تھی جس سے میرا جیون ہر سُو مہکتا تھا۔''

ان لمحوں میں وہ مکمل طور پر ماضی کی حسین یادوں کی گرفت میں خود کو فراموش کر چکے تھے۔

''جب مجھے رضوانہ کے پریگنیٹ ہونے کی خبر ملی تو میں بہت خوش تھا اور رضوانہ بھی۔ اسے لڑکیوں سے جنون کی حد تک لگاؤ تھا اور جب رپورٹس کے ذریعے اسے قبل از وقت معلوم ہوا کہ اس کی کوکھ میں پرورش پانے والی بیٹی ہے تو اس کے ساتھ ساتھ میں بھی سرور تھا۔ ہم نے بچی کے لئے بے تحاشا شاپنگ کی اور ہم نے اپنی آنے والی بیٹی کا نام مشعل پسند کیا۔ رضوانہ کو ڈلیوری سے دو ماہ قبل میں نیویارک لے گیا اور ایک رات اس کی حالت اچانک خراب ہو گئی۔ نہ معلوم اس کے کیس میں ایسی کیا پیچیدگی ہو گئی تھی کہ ایک ہفتے شدید تکلیف میں گزارنے کے بعد وہ ڈلیوری سے قبل ہی مجھے ہمیشہ کے لئے چھوڑ گئی...... اس کے جانے کے بعد کئی ہفتے مجھے اس کی جدائی کا یقین نہیں آیا۔ میں سچ مچ دکھ اور صدمے سے پاگل ہو گیا تھا۔ میرا دکھ دوہرا تھا۔ رضوانہ خود گئی تو ساتھ میری امانت کو بھی لے گئی تھی۔ شاید میری بیٹی کو وہ جنم دیتی تو اس کے سہارے ہی زندگی گزارنا سہل ہو جاتا، ایک سہارا مل جاتا۔ میں اکثر یہی سوچا کرتا۔ تین ماہ بعد مجھے رافعہ اور احمد کے اصرار پر پاکستان آنا پڑا۔ واپسی کا سفر آنسوؤں اور یادوں کے سنگ طے ہوا تھا۔ نگاہوں میں بار بار وہ منظر تھے جب میں رضوانہ کو ساتھ لے کر نیویارک جا رہا تھا۔ کتنا خوش تھا میں...... مسرتیں ہمسفر تھیں۔ اور اب ہمسفر ہی ساتھ چھوڑ گئی تھی، تہی دست، تہی دامن ہو گیا تھا میں۔ دکھوں نے قید کر لیا تھا۔ ایئرپورٹ سے ٹیکسی میں بیٹھا میں سوچ رہا تھا کچھ ماہ قبل ان راستوں سے گزرتے ہوئے رضوانہ بھی میرے ساتھ تھی۔ آج میں تنہا سوچ رہا ہوں، انسان فانی ہو چکے ہیں، جگہوں کو بقا ہے۔ کسی نکلنے والے جلوس کی وجہ سے راستے بلاک تھے۔ ٹیکسی ڈرائیور نے متبادل راستوں سے ٹیکسی نکالنی شروع کی تھی۔ میں خالی خالی نگاہوں سے کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا کہ معاً میری نگاہوں نے ایک پریشان کن منظر دیکھا۔ سامنے کچرے کا ڈھیر تھا اور اس کے کنارے گلابی کپڑے میں لپٹا یقیناً وہ انسانی وجود تھا...... کپڑا مسلسل حرکت میں تھا۔ ٹیکسی آگے بڑھ گئی تھی لیکن میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ آیا جو میں نے دیکھا ہے وہ حقیقت ہے یا نگاہوں کا دھوکا؟ یا میرے ذہن کا تصور جہاں میں اپنی ان دیکھی بیٹی کو اکثر کھلکھلاتے دیکھتا ہوں۔ گاڑی خاصی آگے نکل آئی تھی لیکن میرا ذہن وہیں اٹک گیا تھا۔ عجیب بے چینی واضطراب نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ ایک کشش تھی، ایک اضطراب، ایک وابستگی جیسے کوئی مجھے اپنی طرف کھینچ رہا ہے، پکار رہا ہے، بلا رہا ہے۔ میں بے خود سا ہو اٹھا، میں نے ڈرائیور سے ٹیکسی واپس اسی راستے پر لے جانے کو کہا اور کچھ دیر بعد میں کوڑے کے ڈھیر سے اس گلابی کپڑے میں لپٹی بچی کو گود میں اٹھا رہا تھا جو بھوک کی شدت سے ہاتھ پاؤں چلا چلا کر رونے لگی تھی۔ حیرت انگیز طور پر میرے اندر کی بے سکونی واضطراب کو سکون ملنے لگا۔ میں نے بے اختیار اسے سینے سے لگا کر بھینچ لیا اور میرے سلگتے وجود میں ٹھنڈک پھیلتی چلی گئی۔ ٹیکسی ڈرائیور جو بہت حیرانی سے میری حرکات دیکھ رہا تھا کہنے لگا۔

''صاحب جی! کیا کر رہے ہیں آپ؟ کوڑے پر پڑے ملنے والے بچے کوڑا ہی ہوتے ہیں صاحب تبھی تو ان کو اس جگہ پھینک دیا جاتا ہے۔'' اس کے لہجے میں کراہیت تھی۔

''ایسے نہیں کہو یار! اگر ایسی بات ہے بھی تو اس معصوم کا اس میں کیا قصور۔ پھر ایک گناہ کے بعد کتنا بڑا گناہ یہ ہے اللہ کے بنائے بندوں کو ایسی غلاظت پر پھینکنا۔ توہین انسانیت ہے یہ۔ بھلا اس میں ایسے معصوموں کا کیا قصور؟''

''چھوڑیں صاحب! اسے آپ یہیں پھینکیں اور چلیں۔''

''لیکن اس کا کیا ہوگا...... میں اسے کچرے پر نہیں پھینکوں گا۔'' مجھے قطعی گوارہ نہیں تھا۔

''جب اس کے سگے ہوتوں نے اسے یہاں پھینکا ہے تو آپ بھی پھینک دیں...... ابھی تھوڑی دیر میں کتے آ کر صفایا کر دیں گے یا پھر کسی زہریلے کیڑے کا شکار ہو کر مر جائے گی۔''

''ایسی بات منہ سے نکالتے ہوئے اللہ کے قہر سے ڈرو۔ کیا انسانوں پر اتنا برا وقت آ گیا ہے کہ کتوں اور کیڑوں کی خوراک بنیں؟'' مجھے شدید غصہ آ گیا تھا۔

''صاحب! آپ جلدی کریں...... آپ سے بسم اللہ ہوئی ہے۔ ابھی اور سواری بھی پکڑنی ہے۔''

''چلو......'' میں بچی کو لے کر ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ ڈرائیور نے حیرت سے مجھے دیکھا مگر پھر کچھ نہیں کہا۔ رافعہ مجھے بغیر اطلاع کے آتے دیکھ کر پہلے حیران ہوئی پھر میرے

سینے سے لگ کر رونے لگی۔ رضوانہ کے اور اس کے بہت اچھے تعلقات تھے۔ اس کی موت سے اسے بھی بہت صدمہ پہنچا تھا۔ اس کے آنسو رک نہیں رہے تھے اور مجھے فکر اس بچی کی تھی جو روتے روتے سو گئی تھی اور میں اسے دانستہ بیڈ پر لٹا آیا تھا۔

''رافعہ! ملازمہ سے کہو بے بی ٹب میں باتھ کے لئے پانی تیار کرے۔ تم اتنے فیڈر تیار کرو میں وارڈ روب سے بے بی سوٹ نکال کر لا رہا ہوں۔ وہ بہت بھوکی ہے۔ مگر پہلے باتھ دینا لازمی ہے اسے تا کہ جراثیم سے محفوظ ہو وہ۔'' میری بات سن کر کچھ تعجب اور کچھ خوف سے وہ میری شکل دیکھنے لگی پھر اور بھی تیزی سے رونے لگی۔

''میں پاگل نہیں ہوا ہوں رافعہ۔''

''پھر کس بچی کی بات کر رہے ہیں بھائی جان؟ مشعل کو تو اللہ نے دنیا میں آنے سے قبل ہی چھین لیا۔'' رافعہ کی بات نے مجھے نئی راہ دکھائی۔ مشعل جو روشن ہونے سے قبل ہی تاریک ہو گئی تھی میرے اندر نئی زندگی بن کر جگمگا اٹھی اور میں بے اختیار کہہ اٹھا۔

''نہیں رافعہ! اللہ بے رحم نہیں ہے...... اگر ہم سے کچھ لیتا ہے تو دیتا بھی ہے۔ اللہ نے ایک مشعل لے کر دوسری لوٹا دی ہے۔ آؤ...... آؤ میں تمہیں دکھاؤں۔''

''بھائی جان! آپ تو کہہ رہے تھے......''

''ہاں...... میں نے صحیح کہا تھا مگر یہ بھی درست ہے کہ یہ مشعل ہے...... میری مشعل۔'' میں نے اس بچی کو اٹھا کر والہانہ انداز میں چوما اور رافعہ کو اصل صورت حال بتا دی۔

''کیا مطلب بھائی صاحب! یہ آپ کی بیٹی نہیں ہے؟'' ان کے خاموش ہوتے ہی بے جی بولیں۔

''جی بہن جی! اس حقیقت سے آپ کو باخبر کرنے کے لئے مجھے آپ ہی کا گھر منتخب کرنا پڑا کہ میں نے آج تک یہ حقیقت مشعل سے پوشیدہ رکھی ہے اور تا حیات مخفی رکھوں گا۔ بہر حال حقیقت کچھ بھی سہی مگر مجھے وہ بیٹی سے بڑھ کر عزیز ہے۔ بہت سوچ کر میں نے آپ کو اس راز میں شامل کیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ میرا اعتماد زائل نہیں ہوگا۔ اب اصل فیصلے کی گھڑی ہے۔ میں آپ کو وقت دوں گا لیکن زیادہ نہیں کیونکہ مجھے ایک ہفتے بعد بزنس کے سلسلے میں باہر جانا ہے کیونکہ بزنس میری کچھ عرصے سے ڈاؤن جا رہی ہے۔''

میں آپ کو یہ بتا دوں کہ مشعل کی نسبت میں نے اپنی بہن اور بہنوئی کے اصرار پر بچپن میں ہی اپنے بھانجے جو یعنی جواد سے طے کر دی تھی اور اس حوالے سے میں نے ڈبل معاملات نبھائے ہیں مگر اب جب کہ میرا بزنس وقت کی نزاکت کا شکار ہے، میں ان کی فرمائشوں کی ادائیگی کے قابل نہیں ہوں تو میری بہن نے یہ کہہ کر نسبت توڑ دی کہ مشعل جیسی لڑکی کو وہ بہو نہیں بنا سکتیں۔ میرا آپ کو بھی یہی مشورہ ہے کہ آپ بھی خوب سوچ سمجھ لیں تا کہ بعد میں کسی پچھتاوے کی گنجائش نہ نکلے۔''

اپنی بات کے اختتام پر ان کے چہرے پر حزن و ملال تھا۔ بے جی نے شاہ ویز کی جانب دیکھا تھا جو ہونٹ بھینچے آنکھیں جھکائے گہری سوچ میں مستغرق تھا۔

''فیصلہ جو ہے وہی رہے گا سر۔'' اس نے کہا تو اس بار اس کے لہجے میں طمانیت و آسودگی تھی۔ شاید وہ مشعل کے اسٹیٹس کے برتری کے احساس سے نکل آیا تھا۔

''ہاں بھائی صاحب، آپ سے بلند و عظیم آدمی کے سامنے بھلا ہماری حیثیت ہی کیا ہے۔ لوگ صرف اچھائی و عظمت کا دعویٰ کرتے ہیں مگر آپ نے عمل کر کے دکھایا۔'' وہ عقیدت بھرے لہجے میں گویا ہوئیں تو حسن صاحب ممنونیت سے مسکرائے تھے۔

''سر! شادی بہت سادگی سے ہوگی اور دوسری بات آپ جہیز کے نام پر ایک روپیہ بھی نہیں دیں گے۔'' اس نے مضبوط مگر مؤدبانہ لہجے میں کہا۔

''میرے پاس جو بھی ہے سب میری بیٹی کا ہی ہے۔ پھر......''

''پلیز سر! میں نے پہلے بھی آپ کو بتایا تھا یہ میری حمیت اور وقار کے منافی ہے۔''

''او کے، اس موضوع پر ہم پھر کبھی بعد میں بات کریں گے۔ فی الحال وہی ہوگا جو آپ چاہتے ہیں۔'' ساتھ ہی وہ اجازت لے کر اٹھ گئے تھے۔

□●□

کلب سے واپسی پر جو جو کلب کے پارکنگ لاٹ میں مل گیا تھا۔ اسے دیکھتے ہی بھاگ کر اس کے قریب آ کر گویا ہوا۔

''میری بات سنو مشی پلیز!''

''مجھے تمہاری کوئی بکواس نہیں سننی...... گیٹ لاسٹ۔'' اسے دیکھتے ہی غصے و تنفر سے اس کی رگیں تن گئی تھیں۔ چہرہ انگارہ بن گیا تھا۔

''پلیز...... پلیز مشی، آئی ایم ویری اپ سیٹ۔''

''مائی فٹ......'' وہ کندھے اچکا کر لاپروائی سے گویا ہوئی۔

''مجھے معاف کر دو...... میں تمہارے بغیر مر جاؤں گا۔'' جو جو رو پڑا تھا۔

''کب مرو گے؟ دو ہفتے ملے بغیر بھی زندہ ہو۔'' وہ استہزائیہ انداز میں مسکرائی۔

''تم...... تمہارا یہی رویہ رہا تو میں زندہ نہیں رہ پاؤں گا۔ پلیز، فار گاڈ سیک مائنڈ مت کرو سب بھلا دو...... چلو ہم کورٹ میرج کر لیتے ہیں ورنہ مما اور انکل ہمیں جدا کر دیں گے۔'' وہ اس کے قریب جا کر راز دارانہ لہجے میں بولا تو مشعل بری طرح کھول اٹھی۔ وہ فطرتاً آزاد خیال و بے باک ضرور تھی مگر اپنے باپ کی عزت کا خیال اسے ہر دم رہتا تھا۔ اس کے ساتھ زندگی گزارنے کا خواب اس نے بھی دیکھا تھا مگر باپ کی مکمل رضا مندی اور سسرال کی محبت و آؤ بھگت کے ساتھ۔ ایسی کورٹ میرج کا وہ تصور بھی نہ کر سکتی تھی جس میں نہ صرف اس کے باپ بلکہ اس کا بھی کردار مسخ ہوتا۔ اب تو میرج ہی ممکن نہ تھی۔

''تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ میں تم کو ابھی بھی لفٹ دوں گی؟''

''کیونکہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو...... کرتی ہو نا؟''

''ہرگز نہیں۔''

''تو، امپاسبل تم مجھ سے محبت کرتی ہو۔'' وہ مصر تھا۔

''میں نے کہا نا دفع ہو جاؤ...... مجھے تم سے محبت نہیں ہے۔ اور آئندہ میرے راستے میں آنے کی کوشش مت کرنا ورنہ تمہیں شوٹ کر دوں گی۔'' وہ چیخ کر بولی۔

''ایسے نہ کہو مشی، میں اپ سیٹ ہوں...... ہر وقت تمہیں سوچتا ہوں مگر مما......''

''ہاں، ہاں...... کہو مما سے ڈر لگتا ہے، ان کی مرضی کے بغیر تم کھل کر سانس بھی نہیں لے سکتے۔ ہونہہ، میں ایسے آدمی پر تھوکنا بھی پسند نہیں کرتی جس میں اپنے رائٹ کے لئے اسٹینڈ لینے کی ہمت بھی نہ ہو۔ گیٹ لاسٹ...... گیٹ لاسٹ۔'' وہ اسے اپنے آگے سے دھکا دے کر کار کی طرف بڑھ گئی۔

''میں کہتی تھی نا چھوڑ دے اس بد ذات لڑکی کا پیچھا...... مگر میں تیرے آگے کوئی حیثیت ہی کہاں رکھتی ہوں۔ اب خوش ہو گیا ہوگا اپنی بے عزتی کروا کر۔'' کاروں کی قطار کے پیچھے سے رافعہ بیگم نمودار ہوئیں اور خشمگیں نگاہوں سے مشعل کو گھورتی ہوئی جو جو سے غصے میں مخاطب ہوئیں۔

''اوہ...... تو آپ کی یہ ڈپلومیسی تھی۔'' اس نے کار سے ٹیک لگا کر ان سے استہزائیہ لہجے میں کہا۔

''میں تمہارے منہ لگنا پسند نہیں کرتی۔ اس کا پیچھا کر کے یہاں پہنچی ہوں۔''

''مما...... مما! آپ اتنی ہیڈ وومن نہ بنیں۔'' جو جو نے منمنا کر احتجاج کیا۔

''چپ کر...... کیوں اسی لڑکی کے پیچھے خوار ہو رہا ہے؟ میرے بیٹے کو لاکھوں لڑکیاں مل جائیں گی۔ معلوم تو بھائی صاحب کو ہوگا جب اس پہاڑ کو چھاتی پر ساری عمر رکھیں گے۔ کون پوچھے گا اس لڑکی کو...... یہ تو میری ہی ہمت تھی جو اس عذاب کو اٹھانے چلی تھی۔ اگر بروقت عقل نہ آتی تو ساری عمر سر پکڑ کر روتے ہوئے گزر جاتی۔ دیکھوں گی نا اب کوئی کیسے اس لڑکی کا ہاتھ تھامتا ہے۔'' وہ تیز تیز کہہ کر جو جو کو تقریباً گھسیٹتے ہوئے وہاں سے لے گئی تھیں۔

وہ بہت ضبط سے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی تھی مگر اندر شرارے دوڑ رہے تھے۔ آنکھوں میں شعلے رقصاں تھے۔ اسٹیئرنگ اس کے ہاتھوں میں لٹو کی طرح گھوم رہا تھا۔ بے حد رش ڈرائیونگ کے باعث کئی جگہ ایکسیڈنٹ ہوتے ہوتے بچا۔ پورٹیکو میں کار روک کر دروازہ ایک زوردار آواز کے ساتھ بند کر کے آگے بڑھی تھی۔

حسن صاحب لاؤنج میں اس سے بات کرنے کے لئے پچھلے دو گھنٹوں سے محو انتظار تھے۔ اسے اندر داخل ہوتے دیکھ کر شفقت و ملائمت سے گویا ہوئے۔

''ہیلو مائی سویٹ ڈاٹر۔''

''پاپا! کیا اب کوئی بھی مجھ سے شادی نہیں کرے گا؟'' وہ بلا جھجک بات کرنے کی عادی تھی اور اب تو ویسے بھی وہ رافعہ کی طنزیہ گفتگو اور حقارت سے بھرپور لہجے پر کھول رہی تھی۔

''جی...... کس نے کہا یہ؟'' انہوں نے اپنی حیرانی پر فوری قابو پا کر استفسار کیا۔

''وہی میڈ وومن رافعہ احمد نے۔'' اس نے کچھ دیر قبل گزرنے والا واقعہ سنا کر کہا۔

''کیا ہو گیا ہے رافعہ کو...... کیا بچکانہ پن ہو کر رہی ہے؟'' پریشان لہجے میں جیسے وہ خود سے مخاطب تھے۔

''بچکانہ نہیں، انتقامانہ۔ بری تو وہ تھیں ہی مگر اب تو ناقابل برداشت ہیں۔''

''اصل مسئلہ جواد احمد کا ہے مشی! اگر اس میں معمولی سی بھی ہمت و بہادری ہوتی تو وہ ایسا ہونے نہیں دیتا۔ حالانکہ میں نے جو کچھ کیا ہے ہنڈرڈ پرسنٹ آپ کے فیوچر کی پلاننگ کے تحت کیا ہے مگر جو جو......''

''نام مت لیں اس بزدل کا، اس کی وجہ سے یہ سب ہوا ہے اور آج اس طرح آنٹی مجھے چیلنج کر کے گئی ہیں کہ اب میں کسی سے بھی شادی کر کے انہیں دکھاؤں گی کہ انہیں تو اپنے بزدل و بے ہمت بیٹے کے لئے لڑکیاں ڈھونڈنی پڑیں گی مگر میرے پاپا کو میں خوار نہیں ہونے دوں گی۔ کیا پاپا کوئی ہے آپ کی نظر میں ایسا جس سے ہم کل شادی کر سکیں؟''

ہر کام کو بہت سہل، ہر شے کو اپنی مٹھی میں محسوس کرنے والی لڑکی کے لئے ایک دن میں شادی جیسا حساس و نازک کام کرنا کوئی دشوار و مشکل نہ تھا۔ اس کا اعتماد وحدوں سے

نکل چکا تھا۔ صبر و قناعت، استدلال و دانشمندی سے تو کبھی بھی اس کا واسطہ نہیں پڑا تھا۔ اس کی سوچ ٹی وی ریموٹ کی مانند تھی کہ بٹن پُش کرنے سے لمحے بھر میں دنیا کے کسی بھی ملک کو دیکھ سکتے ہیں۔ اس کی خواہشیں اس کی استطاعت سے بڑھ گئی تھیں۔

''پاپا! کیا امپاسبل ہے کل میری شادی ہو جانا؟'' ان کو خاموش دیکھ کر وہ گھبرا کر گویا ہوئی۔ وہ دل میں ٹھان چکی تھی کہ اب کل ہی شادی کر کے رافعہ بیگم کو نیچا دکھائے گی، ان کے چیلنج کا منہ توڑ جواب دے گی۔

''نہیں، کیوں امپاسبل ہوگا..... میری چاند سی بچی کو تو کوئی کل کیا آج ہی اپنائے گا۔'' انہوں نے خوش دلی سے بازو کے گھیرے میں لے کر جواب دیا۔ رب کی اس مہربانی پر وہ ازحد شکر گزار تھے جس کی خصوصی نظر کرم سے وہ بہت آسانی سے اس مرحلے سے گزر گئے تھے ورنہ شاہ ویز کے اقرار کے بعد انہیں یہی فکر پریشان کئے ہوئے تھی کہ کس طرح ضدی و خودسر بچی کو اس رشتے کے لئے راضی کریں گے کیونکہ وہ اس کی چڑ اور شاہ ویز سے مخالفت کو بخوبی جانتے تھے۔

''میں آپ کو یہی بتانے والا تھا کہ کل شاہ ویز کا پرپوزل لے کر ان کی والدہ آئی تھیں اور میں نے ہاں کہہ دی ہے۔'' انہوں نے مصلحتاً اس سے مکمل بات چھپاتے ہوئے کہا۔

''شاہ ویز؟ یو مین پاپا! وہ مرزیل مزاج آدمی جو ہماری فرم میں ایمپلائز ہے؟'' شاہ ویز کا نام سنتے ہی اس کے ذہن میں دھماکے ہوئے تھے اور رنگوں میں اس کا چہرہ ابھر آیا تھا۔ لمحہ بھر میں اس کے اندر سرخ آندھی چلنے لگی۔

''وہ دو کوڑی کا ملازم، اس کی ہمت کیسے ہوئی یہاں پرپوزل بھیجنے کی؟ آپ نے..... آپ نے پاپا اس کی مدر کو دھکے دے کر نہیں نکلوایا؟ اس فقیر کی جرأت کیسے ہوئی؟'' اس وقت وہ رافعہ کا چیلنج، اپنا ارادہ بلکہ عزم سب بھول گئی۔

''نہیں..... میرے خیال میں اس وقت ان حالات میں شاہ ویز سے بہتر کوئی اور لائف پارٹنر آپ کو نہیں مل سکتا بلکہ اس میں اس قدر صلاحیتیں ہیں کہ بہت جلد وہ بزنس ورلڈ میں بھرپور شناخت سے ابھرے گا۔''

''لائف پارٹنر؟ وہ اس قابل نہیں ہے کہ چند لمحوں کے لئے پارٹنر بنایا جائے۔''

''ابھی آپ اس کی صلاحیتوں سے واقف نہیں ہیں۔''

''اور نہ کبھی واقف ہونے کا ارادہ ہے۔'' وہ دوبدو گویا ہوئی۔

''سوچ لیں آپ۔ جلدبازی کے فیصلے اچھے نہیں ہوتے۔ میں آج ہوں، کل نہیں ہوں گا تو کون پرواہ کرے گا آپ کی؟ کون سہارا دے گا؟''

''پاپا..... پاپا! یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟'' وہ ان کے سینے سے لگ گئی۔

''جو حقیقت ہے یہ آپ کو بھی سوچ لینا چاہئے۔ میری زندگی اب ہواؤں میں رکھے چراغ کی مانند ہے۔ نہ معلوم کس سرکش جھونکے سے ہمیشہ کے لئے گل ہو جائے۔'' اسے سمجھاتے ہوئے باوجود ضبط کے ان کی آواز بھرا گئی تھی جب کہ مشعل رو پڑی تھی۔

''ایسی باتیں کیوں کر رہے ہیں پاپا؟ آپ کو میری عمر بھی لگ جائے۔''

''میری فکر و پریشانی جب ہی دور ہوگی جب تم اپنے گھر عزت سے جاؤ گی۔ سگے رشتوں کو آپ بھی پرکھ چکی ہو اور میں بھی..... خوب سمجھ میں آ گیا ہے کہ رشتوں سے زیادہ دولت کو اہمیت حاصل ہے۔ دولت ہے تو سب اپنے، دولت نہیں تو کوئی بھی نہیں۔ شاید رشتے تو رشتے، برے وقت میں اپنا سایہ بھی ساتھ چھوڑ جاتا ہے میری جان۔''

''لیکن پاپا! میں سایہ نہیں ہوں..... کبھی بھی آپ کو نہیں چھوڑوں گی۔'' وہ ان کے سینے سے سر لگا کر بھیگی آواز میں بولی۔

''نہیں بیٹا! ایک نہ ایک دن بیٹیوں کو ماں باپ کو چھوڑنا ہی ہوتا ہے۔ یہ قانونِ قدرت ہے..... ایک فرض اولین ہے جس کی ادائیگی ہر والدین کو سرخرو کر جاتی ہے اور میں بھی سرخرو ہونا چاہتا ہوں مشی..... کیا آپ اپنے پاپا کی پہلی اور آخری خواہش پوری نہیں کریں گی؟ میں رافعہ کو بتانا چاہتا ہوں اگر آپ میرا ساتھ دو۔''

''لیکن ایک ورکر کس طرح میرا لائف پارٹنر بن سکتا ہے۔ آئی مین پاپا، لوگ کیا کہیں گے، میر کا جوتا ہم نے سر پہ رکھ لیا۔''

''لوگوں کی نہیں میری پرواہ کرو۔'' وہ اس کی اضطرابی کیفیت نوٹ کر رہے تھے مگر جانتے تھے کچھ عرصے بعد وہی شاہ ویز کی تعریفیں کرے گی اور ان کے انتخاب کو سراہے گی۔

''بٹ پاپا آئی ڈونٹ لائک شاہ ویز۔''

''میری خاطر پسند کر لیں اسے اور آج رات فیصلہ کر کے مجھے صبح اثبات میں جواب دیں..... اگر انکار کرنا چاہیں تو سوچ لیں، میں موت سے دوبارہ فائٹ نہ کر سکوں گا۔'' اپنی بات کہہ کر وہ رکے نہیں، لاؤنج سے فوراً نکل گئے۔

رات اور پھر پورا دن گزر جانے کے باوجود بھی وہ فیصلہ نہ کر سکی تھی۔ دل و دماغ میں عجیب سی جنگ چھڑی ہوئی تھی۔ بار بار وہ اس فیصلے پر آ کر اٹک جاتی کہ کس طرح شاہ ویز جیسے لڑکے کے ساتھ گزارہ کر سکے گی اور پاپا کو کوئی اور نہیں ملا؟ جوجو کے علاوہ بھی بے شمار ایسے نوجوان موجود تھے جو، جوجو سے بھی اعلیٰ اسٹیٹس رکھتے تھے اور اہم بات یہ تھی کہ اس کی محبت کا دم بھرتے تھے، اس کے طلب گار تھے۔ شاید شاہ ویز نے ہی کوئی ایسا چکر چلایا ہے جو پاپا کو اس کے علاوہ کوئی اور نظر ہی نہیں آیا۔ ایک عرصے سے وہ سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے اس کا ذکر کرتے رہتے تھے۔ ہمہ وقت ان کے لبوں پر اس شخص کی تعریفیں رہتی تھیں۔ اور آج وہ جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔

سب دولت اور پاپا کے لمبے چوڑے بزنس کو ہتھیانے کے چکر میں پہلے ہمارے اپنوں نے چال چلی تھی اور اب کچھ مختلف انداز میں وہی پلاننگ ہے۔ کاش ہم غریب ہوتے تو شاید ایسا نہیں ہوتا..... اوکے میں پاپا کی زندگی کی خاطر مکار، دھوکے باز، کمینے شخص تمہارے ساتھ شادی کرنے کو تیار ہوں..... کیونکہ پاپا ابھی ایموشنل ہیں، ان کی کمزوری و بیماری کو مدنظر رکھ کر مجھے تمہارا ساتھ گوارا کرنا ہوگا اور ساتھ تمہیں مزہ بھی چکھاؤں گی۔ دولت و جائیداد ہتھیانے کے خواب، خواب ہی رہیں گے۔

اس نئی سوچ نے اسے ایک دم ہی فریش کر دیا۔ وہ مسروری اٹھ بیٹھی۔ اس نے سوچ لیا باپ کی حالت اس قابل نہیں کہ کوئی خلاف مزاج بات برداشت کریں۔ ابھی ان کی بات مان کر، ان کی خواہش پوری کر کے، ان کا مان بھی سلامت رکھ سکتی ہے۔ رافعہ کا چیلنج جیت کر انہیں شکست بھی دے سکتی ہے اور کچھ عرصے بعد شاہ ویز سے ڈائیورس لے لے گی۔ ویسے بھی اس شخص کی ہمت کہاں اس کی مرضی کے بغیر کوئی قدم اٹھانے کی۔ وہ کبھی اسے چھو نہیں سکتا۔

''واہ! یہ تھرل فنٹاسٹک ہے..... لائف انجوائے کرنے کا بہترین موقع۔ کتنا مزہ آئے گا جب اس اکڑباز کو انگلیوں کے اشارے پر چلاؤں گی، اس کی بے بسی و بے کسی کا تماشہ کس قدر دلفریب ہوگا۔ ہاہا، بہت شریف بنتا ہے، بہت سنگ دل و متقی پرہیزگار جو کسی لڑکی کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنا بھی گناہ سمجھتا ہے، بتاؤں گی حسن کیا ہوتا ہے، دلربائی کسے کہتے ہیں؟ جذبات میں آگ لگا کر دور کھڑے ہو کر تماشہ دیکھنا میری فیورٹ ہابی ہے۔'' وہ مطمئن سی حسن صاحب کے پاس آ گئی۔

''پاپا! میں نے فیصلہ کر لیا ہے..... مجھے آپ کی ہر خواہش منظور ہے۔'' اس نے سر جھکا کر آہستگی سے کہا تو انہوں نے آگے بڑھ کر اس کو سینے سے لگا لیا۔

□●□

''شاہ ویز! مجھے ہمیشہ یہ آرزو رہی کہ کاش میرا کوئی بیٹا ہوتا، جو میرا سہارا بنتا، میرا بازو ہوتا۔ اس خواہش کا اظہار آج آپ کے سامنے کر رہا ہوں۔ جب میں نے پہلی دفعہ آپ کو دیکھا تو میرے دل میں خود بخود ہی ایک نرم گوشہ آپ کے لئے پیدا ہو گیا تھا۔ آپ مجھے اپنے اپنے سے لگے تھے۔ میں نے اکثر آپ کو قریب رکھا۔ آپ کی صلاحیتوں، ذہانتوں کو پرکھنے کے لئے مشکل سے مشکل کام کروایا اور ہر بار ملنے والی کامیابی پر مجھے خود سے اعتراف کرنا پڑا کہ آپ ایک غیر معمولی صلاحیتوں والے انسان ہیں۔ عام لوگوں سے زیادہ قوتِ ارادی و اعتماد رکھتے ہیں اور مشعل سے شادی کی ہامی بھر کر آپ نے جس شرافت، سعادت مندی و روشن خیالی کا ثبوت دیا ہے وہ قابل فخر و ستائش ہے۔ میں نے خوب سوچ کر فیصلہ کیا ہے کہ آپ ہی میرے حقیقی بیٹے بننے کے لائق ہیں۔''

آج آفس آنے کے بعد وہ خود اس کے روم میں چلے آئے تھے اور سیکرٹری کو انفارم کر دیا تھا کہ وہ انہیں ڈسٹرب نہ کرے اور نہ کسی کو یہاں آنے دے۔

''پلیز سر! شرمندہ نہ کریں۔ میں بے حد معمولی، عام سا بندہ ہوں۔'' وہ جھینپ کر گویا ہوا۔

''ہیرے کی قدر صرف جوہری کرتے ہیں ینگ مین، اب ہم بے کھوٹ رشتوں میں بندھ چکے ہیں۔ بے ریائی و منافقت ہمارے درمیان نہیں ہے، باہمی رشتوں سے قبل ہمارے دلی تعلقات استوار ہو چکے ہیں اور جب خلوص و اعتماد کی مہکار ہمارے اردگرد مہکنے لگتی ہے تو ہمارے درمیان کوئی پردہ داری نہیں رہنی چاہئے۔ دراصل اس وقت میرا بال بال قرضے میں جکڑا ہوا ہے۔ بزنس کی حالت نہایت ابتر ہے۔ اس وقت صرف بھرم ہے جو بھاری ہے ورنہ بزنس تو بری طرح بکھر چکا ہے جس کو دوبارہ بحال کرنے کے لئے سخت جدوجہد کرنی پڑے گی۔''

''جی سر! میں آگاہ ہوں تمام حالات سے۔'' نہ معلوم کیا وجہ تھی کہ پہلے وہ حسن صاحب کے ساتھ بلاتکلف گفتگو کرتا تھا مگر اب عجیب سی جھجک و تکلف خود بخود قائم ہو گیا تھا۔

''مشی اس صورتحال سے بالکل بے خبر ہے۔ میں نے خود اسے بے خبر رکھا ہوا ہے۔ وہ بہت حساس ہے۔ احساسِ محرومی اسے توڑ پھوڑ کر رکھ دے گا جو مجھ سے قطعی برداشت نہیں ہوگا بیٹا۔ اس کا بہت خیال رکھنا۔ مجھے احساس ہے وہ ازحد ضدی، خودسر، وگستاخ ہے مگر پھر بھی ایک کمزور لڑکی ہے جس کے احساسات بہت نازک ہیں اور جس طرح آپ کے ساتھ رشتہ استوار ہو رہا ہے، ان الجھے ہوئے حالات میں شاید وہ فوری طور پر آپ کو قبول نہ کرے، اس لئے مائی سن! آپ کو کچھ وقت کے لئے صبر و تحمل، ضبط و بردباری کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔'' ان کا لہجہ شکستہ و التجائیہ تھا۔

''جی، میں سمجھتا ہوں۔'' اس نے آہستگی سے جواب دیا۔

''اللہ آپ کی عمر دراز کرے، ہمیشہ کامیابیوں سے نوازے، آپ نے بھاری بوجھ سے مجھے آزاد کر دیا ہے۔'' فرطِ جذبات سے ان کی آواز کانپ رہی تھی۔

□●□

مشعل کی ضد تھی وہ شادی بالکل خاموشی سے کرے گی۔ دوسری طرف شاہ ویز بھی سادگی کا خواہاں تھا۔ حسن صاحب اپنے تباہ حال کاروبار اور قرض داروں کے باعث ان کی باتیں ماننے پر مجبور ہو گئے تھے۔ اکلوتی بچی کے حوالے سے تمام خواہشات و آرزوئیں دل میں ہی بسورتی رہ گئی تھیں لیکن وہ پُرامید تھے کہ کاروبار جب دوبارہ مضبوط ہو جائے گا تو وہ ہر ارمان پورا کریں گے۔ ان کو اس تباہی کے مقام پر لانے والا کوئی غیر نہیں ان کی اپنی سگی بہن تھی۔ انہوں نے مشعل کی طرح انہیں عزیز رکھا،

بغیر کبھی ہر طرح سے انہیں سپورٹ کرتے رہے۔ احمد کو بزنس انہوں نے ہی اسٹارٹ کر کے دیا جہاں منافع تو ان سے چھپایا جاتا تھا مگر نقصان ہمیشہ ان کے اکاؤنٹ سے پورے کئے جاتے۔ اس کے علاوہ رافعہ کی شاہ خرچیوں کے علاوہ مشعل سے دو سال بڑے جواد کی ہر ذمے داری ان کے سپرد تھی۔ اس کے علاوہ بھی وہ ماں بیٹا مشعل کے ذریعے اپنے لاکر زبھرتے رہے اور آج بہت مُردہ ضمیر کے ساتھ ان کے تمام احسانات کو بھلائے قرابت داری و محبت کو بھلائے وقت کی طرح بدل گئے تھے۔

حسن صاحب دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر بہن کو مشعل کی شادی کا انویٹیشن کارڈ دینے گئے تھے۔ وہاں گیٹ پر ہی چوکیدار نے مطلع کیا کہ رافعہ کی فیملی صبح ہی ورلڈ ٹور پر گئی ہے۔ حسن صاحب دل برداشتہ ہو گئے۔ ان کی بہن نے انہیں انفارم کرنا بھی ضروری نہیں سمجھا تھا اور ساتھ ہی ان کی پست و گھٹیا ذہنیت کھل کر سامنے آئی تھی۔ کس قدر دوغلی اور چھوٹی فطرت تھی رافعہ کی۔ ان سے مطالبہ کر رہی تھیں ایک کروڑ روپے لینے کا کہ بقول اس کے بزنس میں زبردست خسارہ ہوا ہے اور ان کی معذرت پر جھٹ سے رشتہ توڑ گئی تھیں۔ اب فیملی کے ساتھ ورلڈ ٹور پر جانے کے لئے دولت کہاں سے آئی تھی۔ وہ سخت متنفر ہو گئے۔

□●□

''میں کہوں آپا! کیا ہتھیلی پر سرسوں اگانے چلی ہو...... اس طرح ہوتی ہے شادی؟'' زرینہ حیران پریشان سی شاہ ویز کی شادی کا کارڈ پا کر دوڑی چلی آئی تھیں۔

''شاہ ویز کی خواہش ہے شادی بالکل سادگی سے ہو۔''

''کیوں سادگی سے ہو؟ پہلی پہلی شادی ہے، وہ بھی اکلوتے، لاڈلے بیٹے کی اور وہ بھی اتنے بڑے اعلیٰ خاندان میں...... ہماری برداری میں پہلی بار کسی اونچے رئیس گھر کی لڑکی بہو بن کر آ رہی ہے۔ جتنی بھی خوشیاں منائی جائیں کم ہیں۔'' وہ از حد پُرجوش تھیں۔

''دراصل وہ لوگ بھی خاموشی سے شادی کرنا چاہ رہے ہیں اور تمہیں شاہ ویز کی عادت تو معلوم ہے جو دل میں ایک مرتبہ ٹھان لے، اس پر ہی اڑ جاتا ہے۔ اس کی خواہش تھی شادی ایک ڈیڑھ سال بعد ہو مگر یہاں مسئلہ ہے، لڑکی کے باپ کو دل کی بیماری ہے۔ جس کے علاج کے لئے وہ شادی کے دوسرے دن باہر جا رہے ہیں۔ ان کے آنے کے بعد ہی ولیمے کی تقریب ہو گی اور وہ ہی تب بھی اپنے ملنے ملانے والوں کو بیٹی کی شادی کی خبر کریں گے۔'' بے جی نے پالک کاٹتے ہوئے مکمل وضاحت کر دی تھی۔

''لو بھلا، یہ کیا بات ہوئی؟ اکلوتی لڑکی کی شادی اتنے امیر ہونے کے باوجود اس طرح کریں گے...... کیا چکر ہے آپا؟''

''مجھے تو کچھ گڑبڑ لگ رہی ہے۔'' وہ بھونچکا رہ گئیں۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے زرینہ! کاروباری لوگوں کے دشمن زیادہ ہوتے ہیں، دوست کم۔ بس یہی وجہ ہے۔'' بے جی کا لہجہ اطمینان سے لبریز تھا جب کہ زرینہ بیگم کی شعلہ صفت طبیعت میں پٹاخے چھوٹ رہے تھے۔ تھیں تو بے جی کی چھوٹی بہن مگر جس قدر بے جی کے مزاج میں بردباری، ملائمت، متانت اور سادگی تھی ان کی طبیعت بالکل متضاد تھی۔

''کیسی منحوس خبر سنائی...... میں تو سوچ رہی تھی وہ بڑے باپ کی بیٹی جہیز میں کوٹھی، بنگلے، کاروں کے علاوہ اتنا کچھ لے کر آئے گی کہ تمہارے گھر میں جگہ ہی نہیں ہو گی رکھنے کے لئے...... مگر ان امیروں سے اچھے تو ہم غریب ہی ہیں جو اپنی ناک اونچی رکھنے کے لئے بھلے ادھار مانگ کر ہی بیٹیوں کے ساتھ ٹرک بھر کر سامان بھیجتے ہیں اور میں نے چاروں بیٹیوں کی دفعہ پوری برادری کی دعوت کی تھی اور اصغر کی شادی تو اتنی دھوم سے کی تھی کہ آج تک لوگ مثالیں دیتے ہیں۔'' انہوں نے فخر سے جتایا۔

''اب تک قرضہ بھی تو ادا کر رہی ہو ان شادیوں پر لٹانے والا۔ ایسی نمود و نمائش کا کیا فائدہ جو ناک تو اونچی کر دے مگر نگاہیں جھکا دے۔ اس سے تو سادگی بھلی ہے۔''

''ارے رہنے دو آپا! تم نے سارا اثر بے چارے شاہ ویز پر ڈال دیا ہے۔ تمہاری ہی پٹی میں آ کر اس نے جہیز لینے سے انکار کر دیا ہو گا۔ ہونہہ، میں کہوں اس میں برائی کیا ہے؟ لڑکی اپنا جہیز خود برتتی ہے، سسرال پر اس کا کیا احسان؟''

''میں تمہیں نہیں سمجھا سکتی، شاہ ویز آ جائے تو خود اس سے بات کر لینا۔ وہ مجھ سے زیادہ سمجھدار ہے۔ یہ بتاؤ میں پالک گوشت پکا رہی ہوں، تم کیا کھاؤ گی؟'' انہوں نے کٹے ہوئے ٹماٹر، ہری مرچیں گوشت میں ڈالتے ہوئے موضوع بدلا تھا۔

''فریج میں کچھ نہیں رکھا...... میں گردے کی درد کی وجہ سے پالک نہ کھا سکوں گی۔''

''چکن قورمہ اور شامی کباب ہیں...... ساتھ میں پھلکے ڈال دیتی ہوں۔''

□●□

نکاح نامے پر سائن کرتے وقت کسی انجانے جذبے کے تحت اس کے ہاتھ کانپ اٹھے تھے۔ ایک بے چینی، ایک اضطراب نے اس کی رگ و پے میں سنسنی دوڑا دی تھی۔

''مشعل حسن بیگ! یہ شریک سفر ہے تمہارا...... تم جو اپنے سے کمتر لوگوں کو نظر بھر کر دیکھنا بھی گوارہ نہ کرتی تھیں آج ایک کمتر، بے حیثیت، اپنی ہی فرم کے ملازم کی بیوی ہونے جا رہی ہو؟'' ایک زہریلی سوچ ذہن کے کسی گوشے سے ابھری تھی۔ وہ لمحے بھر کو دم بخود رہ گئی۔

''نہیں، نہیں...... یہ حقیقت نہیں ہے...... نہ ہی مشعل حسن بیگ اتنی بے مول و بے وقعت ہے۔ یہ صرف پاپا کی خوشی و صحت کے لئے کی گئی ایموشنل کمٹ منٹ اور ایک انوکھا و منفرد ایڈونچر، تھرل اور لائف انجوائے منٹ ہے جو بہت جلد ڈراپ کر دیا جائے گا۔ پھر اس اکھڑ و بد دماغ شخص سے اپنی توہین کا بدلہ لینے کا بہترین موقع۔'' فوراً ہی اس کے فخر و خود اعتمادی نے ہمیشہ کی طرح اس کا دفاع کیا تھا اور اس نے مطمئن ہو کر سائن کر ڈالے تھے۔ نکاح کے بعد پُرتکلف ڈنر تھا۔ شادی کی سادہ سی تقریب حسن صاحب کی رہائش گاہ پر تھی۔ حسن صاحب نے اپنے چند قابل اعتماد دوستوں کو مدعو کیا تھا۔ شاہ ویز کے ساتھ بھی باراتی بن کر بے جی اور زرینہ کی فیملی آئی تھی۔ بہت مختصر سے لوگ تھے۔ ریڈ شرارہ سوٹ میں نازک جیولری اور عمدہ میک اپ میں وہ ہمیشہ کی طرح حسین تر لگ رہی تھی۔ حسن صاحب کے دوستوں کی بیویوں اور بیٹیوں میں گھری وہ بالکل خاموش بیٹھی تھی۔ گرل فرینڈ اس نے بنائی نہیں تھی۔ بچپن سے بوائے فرینڈ زبنانے کی عادی تھی جن میں سے کسی کو بھی اس نے نکی کے خیال سے انوائٹ نہیں کیا تھا یا ضروری نہیں سمجھا تھا۔

رخصتی سے قبل حسن صاحب نے تنہائی میں بے جی اور شاہ ویز سے کچھ ضروری گفتگو کی تھی جس سے وہ بے خبر تھی۔ اس کی نگاہیں شاہ ویز پر تھیں جو کاٹن کے سوٹ میں ملبوس بالکل عام و سادہ لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر کوئی مسرت و شادمانی کے رنگوں کی برسات نہ تھی۔ وہی سنجیدہ، خاموش و پُروقار انداز تھا اور چہرے پر چھایا ہوا سکوت وانز حد سنجیدگی سے محسوس ہو رہا تھا وہ اپنی شادی میں نہیں بلکہ کسی کے چہلم میں آیا ہوا ہے۔ اس کا یہ انداز اسے سخت ناگوار گزر رہا تھا جب کہ اس کا خیال تھا وہ بے اندازہ دولت پانے کے ساتھ ساتھ اس جیسی حسین و جمیل لڑکی مل جانے پر بے حد خوش ہو گا مگر یہاں کوئی سرشاری و بے خودی دیکھنے کو نہ ملی۔ وہ تپ اٹھی تھی۔

رخصتی کے وقت اس کا کوئی ارادہ نہیں تھا رونے کا مگر جب حسن صاحب نے اسے سینے سے لگایا تو دل ایک دم ہی موم بن گیا اور وہ بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ اسی دم بے جی کی نرم آغوش نے اسے تھام لیا تھا اور خلوص سے حسن صاحب کو تسلی دے رہی تھیں جو اسے وداع کرتے وقت اپنے جذبات اور آنسوؤں پر قابو نہ رکھ سکے تھے۔ انہیں روتا دیکھ کر اس کے حواس ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ ایک ناشناسا دکھ اور جدائی کی تکلیف دہ صورت حال سے وہ نڈھال ہو کر بے ہوش ہو گئی تھی۔

شاہ ویز کے لئے اس کی بے ہوشی از حد حیران کن اور دلچسپ تھی۔ بھلا اس قدر اسٹرانگ اور چنگیز خان و ہٹلر ٹائپ مزاج اور طبیعت رکھنے والی لڑکی کے اعصاب اتنے کمزور اور نازک ہو سکتے ہیں؟ بہر حال وہ اسی حالت میں رخصت ہو کر گھر آئی اور ایک مرتبہ پھر اس کے بازوؤں میں سفر کر کے اپنے حجلۂ عروسی میں پہنچی تھی جو اصغر نے اس کی غیر موجودگی میں گلاب و موتیا کے پھولوں کی لڑیوں سے سجا ڈالا تھا۔ اسے ایک انداز سے بیڈ پر چھوڑ کر وہ کمرے سے نکل گیا تھا۔ خوشی کا تعلق دل سے وابستہ جذبات سے ہوتا ہے۔ زندگی کے اس اہم ترین دن و رات کی اہمیت تب ہوتی اگر مشعل ایک عام سی لڑکی ہوتی، مشرقی اقدار و مذہبی اطوار کی پروردہ عام اور خالص لڑکی، جس کی زندگی میں آنے والا وہ پہلا اور آخری مرد ہوتا تو آج کی رات بڑی حسین، بہت فسوں خیز و دلربا ہوتی۔ اس کے جذبوں کی شوریدگی و دلکشی اس کے وجود کے ہر حصے کو روشن کر دیتی۔ لیکن یہاں ایسا کوئی منہ زور جذبہ نہ تھا بلکہ کوئی بھی جذبہ نہ تھا۔ ہر طرف سناٹا تھا، گمبھیر و تاریک سناٹا...... سرد سکوت و پُرہیبت ویرانی!

□●□

''کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ کسی امیر سیٹھ کی اکلوتی بیٹی اس طرح بھی ہو سکتی ہے۔ توبہ بھئی، اس سے اچھی شادی کسی فقیر کی بیٹی کی ہوتی ہو گی۔ چند لوگ بلائے اور بیٹی کو ایسے بیاہ دیا جیسے کوئی گناہ چھپ چھپا کے کیا جاتا ہے۔ لڑکیوں کے کتنے ارمان، کیسی خواہشیں ہوتی ہیں، بیچاری لڑکی بے ہوش نہ ہو گی تو کیا ہو گی...... نہ مہندی، نہ اُبٹن، نہ مایوں...... ارے کوئی بھی تو بچی کا ارمان نہ نکالا گیا۔''

زرینہ کو شروع سے اس شادی کو اس سادگی سے انجام دینے پر اعتراض اور شدید اختلاف تھا۔ وہ تو ویسے بھی اپنی رائے دینے میں ذرا بھی دیر نہ کرتی تھیں۔ اب بھی مسلسل ان کی زبان رواں تھی۔

''بہو فرح! دیکھنا ذرا دلہن کے کمرے میں جا کر۔ شاید ہوش آ گیا ہو۔'' بے جی فرح سے آہستگی سے مخاطب ہوئیں تو وہ اثبات میں گردن ہلاتی آگے بڑھ گئی۔

چند لمحے قبل ہی اس کی آنکھ کھلی تھی۔ وہ ساکت لیٹی چھت کو گھور رہی تھی۔ پھر بیڈ کے چاروں اطراف لٹکی گلاب و موتیا کی لڑیاں اور اجنبی کمرہ لمحہ بھر میں شعور بیدار کر گیا تھا...... وہ جھٹکے سے اٹھی تھی، اس طرح اٹھنے سے بھاری کام والے بھاری دوپٹے نے جو بے شمار سیفٹی پنز سے سیٹ تھا بری طرح بال کھینچے تھے۔ ایک آہ سی نکل گئی تھی۔ آہستہ سے سر سہلاتے ہوئے اس نے کمرے کا جائزہ لیا تھا۔

پنک کلر اسکیم میں کمرے کی ہر شے گلابی تھی۔ کمرہ بہت سادہ مگر خوب صورت لگ رہا تھا اور اپنے مالک کے مزاج کی طرح سرد و بے نیازی کے تاثر سے بھرپور تھا۔ شاہ ویز کا تصور آتے ہی اس کے ہونٹوں پر پُراسرار مسکراہٹ ابھری تھی۔ ابھی بیڈ سے اترنے کا ارادہ کر رہی تھی کہ معاً دروازہ کھلا اور ایک مسکراتی ہوئی لڑکی اندر داخل ہوئی تھی۔

''شکر ہے آپ جاگ گئیں۔'' فرح نے صریحاً ہوش کا نام نہ لیا تھا اور اس کے قریب آ گئی۔

''مجھے نیند آ رہی ہے...... میرا نائٹ ڈریس کہاں ہے؟'' اس نے فرح کی دوستانہ مسکراہٹ کو یکسر نظر انداز کر کے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔ نئی نویلی بلکہ بالکل تازہ دلہن کا رعونت بھرا تحکمانہ لہجہ فرح کو شدید حیران کر گیا۔ وہ وہیں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

''کیا ہوا؟ میں نائٹ ڈریس کا پوچھ رہی ہوں۔'' اس کی خود اعتمادی عروج پر تھی۔

''وہ..... وہ ڈریسنگ روم میں ہے۔ لیکن ابھی آپ ڈریس چینج مت کریں۔ ابھی شاہ ویز بھائی..... آپ کے لئے کچھ لاؤں، کولڈ ڈرنکس، چائے، کافی، آئس کریم؟'' اس کی نگاہوں سے عیاں ہوتی ناگواری و برہمی نے فرح جیسی بولڈ اور تیکھے مزاج کی لڑکی کو بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ اکلوتی بڑی بھابی کے رتبے سے اسے چھیڑنے، شاہ ویز کے حوالے سے تنگ کرنے کا پروگرام بنا کر آئی تھی مگر یہاں دلہن کے تیوروں اور چہرے کے زاویوں سے تو لفٹ صاف نظر آ رہی تھی بلکہ اسے لگ رہا تھا کہ دولہا میاں کو بھی لفٹ دینے کا کوئی ارادہ ہرگز نہ تھا۔

''تھینکس..... میں صرف اس وقت سونا پسند کروں گی۔ سوتے وقت مجھے معمولی سی بھی ڈسٹربنس پسند نہیں ہے۔'' وہ غرارہ سنبھالتی اٹھی تھی۔

''پلیز..... پلیز، آپ تھوڑا انتظار کریں، میں شاہ ویز بھائی کو بھیج رہی ہوں۔'' وہ اسے ڈریسنگ روم کی طرف بڑھتے دیکھ کر منت بھرے لہجے میں بولی پھر پھرتی سے کمرے سے نکلی تھی تاکہ دلہن کے روپ اجاڑنے سے قبل وہ شاہ ویز کو یہاں بھیج دے۔ کیسی عجیب سر پھری دلہن تھی وہ جس کو اپنے دلہناپے کا کوئی احساس نہ تھا۔ جیون ساتھی کے جذبات و احساسات کی پرواہ نہ تھی۔ لڑکی اس انداز سے ایک بار ہی سجتی ہے، دلہن ایک بار ہی بنائی جاتی ہے، امنگوں بھری، مسرتوں سے لبریز ساعتیں فقط ایک ہی بار تو آتی ہیں۔ پھر وہ احمق کیوں اپنے ہاتھوں سے ان چراغوں کو گل کر رہی ہے۔''

نیچے آ کر اس نے سب طرف شاہ ویز کو دیکھا مگر اس کے ساتھ اصغر کی غیر موجودگی بھی یہ ظاہر کر رہی تھی کہ وہ دونوں بلا اطلاع گھر سے غائب ہیں۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

''تمہیں دلہن کو دیکھنے کے لئے بھیجا تھا یا اس طرح کمرے لگانے کو؟ کیا ہوا..... اس کو ہوش آیا یا نہیں؟ آپا پریشان ہو رہی ہیں۔'' زرینہ فرخ سے ڈپٹ کر مخاطب ہوئیں۔

''وہ ہوش میں آ گئی ہے، اب بے ہوش ہونے کی آپ لوگوں کی باری ہے۔'' اس نے مسکرا کر آخری جملہ آہستگی سے کہا تھا۔

''ارے کیا بڑبڑا رہی ہے..... پوری بات کیوں نہیں کرتی؟''

''آنٹی! دلہن کو ہوش آ گیا ہے اور اب وہ سونا چاہتی ہے۔''

''لو بھلا..... یہ کیا بات ہوئی؟ کیوں سونا چاہتی ہے؟ نئی نویلی دلہنوں کے یہ ڈھنگ ہوتے ہیں؟ ہوش گنوا کر اپنے باپ کے گھر سے آئی، کوئی رسم پہلے ہی نہ ہوئی تھی۔ اب سوچا تھا کچھ رسمیں کر کے دل کے ارمان نکالیں گے تو وہ بھی ندارد۔ سارے ارمان دل کے دل میں ہی رہ گئے۔'' وہ برابر میں کھڑی بے جی سے سرد آہ بھر کر گویا ہوئیں۔

''بہو! پوچھا تھا کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟'' بے جی تحمل سے فرح سے مخاطب ہوئیں۔

''جی ہاں بے جی! انہوں نے منع کر دیا تھا۔'' فرح نے آہستگی سے کہا تھا۔

□●□

رات کے پچھلے پہر وہ آیا تھا۔ ہاتھ بڑھا کر ہینڈل گھمایا تو معلوم ہوا دروازہ اندر سے لاک ہے۔ بے ساختہ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہو کر غائب ہوئی تھی۔ اس نے جیب سے چابی نکال کر دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو کر دروازہ لاک کر دیا تھا۔ مدھم مدھم روشنی میں کمرے کی یخ بستہ فضا مہک رہی تھی اور سجی ہوئی مسہری کے بیچوں بیچ سر سے پیر تک چادر تانے بے خبر سو رہی تھی یا ایکٹنگ کر رہی تھی۔ وہ بیڈ کے قریب کھڑا سینے پر دونوں بازو باندھے بغور اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دل میں کوئی خوش رنگ ہلچل نہیں تھی۔ نہ ہی جذبات میں گرمجوشی تھی۔ پھر بھی عجیب سے احساس سے اس لمحے وہ دوچار ہوا تھا۔ چند لمحے اس کی طرف دیکھنے کے بعد وہ شانے اچکاتا ہوا ڈریسنگ روم کی طرف بڑھ گیا۔

حسن بیگ صاحب نے اس کے رویے کی، احساسات کی پہلے ہی ترجمانی کر دی تھی۔ اگر نہ بھی کرتے تو وہ خود اس کے جذبات سے آگاہ تھا۔ جو جو کے ساتھ اس کی اٹو الومنٹ سے وہ بخوبی واقف تھا۔ جس طرح اور جس مجبوری کے تحت وہ اس سے رشتہ جوڑنے میں راضی ہو گئی تھی وہ اس کے لئے حیرت کا مقام تھا۔

اب اس کے اس بیگانہ و بے نیاز رویے نے ظاہر کر دیا تھا وہ صرف اس سے ظاہری رشتہ جوڑنا چاہتی تھی اور بس۔ یہی خواہش اس کی بھی تھی۔

نہ معلوم کس بناء پر اس کی آنکھ کھلی تھی۔ نیم بیدار آنکھوں سے لیٹے لیٹے ہی اس نے گردن گھما کر دیکھا، رات کو سلیپنگ پلز لینے سے قبل تمام کھڑکیاں، دروازے وہ لاک کر کے سوئی تھی اور صرف نائٹ بلب روشن رکھا تھا مگر اس وقت کمرہ روشنی سے بھرا ہوا تھا اور کھڑکیوں کے شیشوں سے ٹکراتی سنہری کرنیں پتہ دے رہی تھیں صبح کی آمد کا۔ شاید صبح ہوئے کافی وقت گزر بھی چکا تھا۔

''جب سب لاک کر کے سوئی تھی تو پھر کس نے اندر آ کر کھڑکیوں سے پردے ہٹائے ہیں..... جب کہ دروازہ بدستور لاکڈ نظر آ رہا تھا..... پھر کس طرح..... کہیں..... کہیں؟'' ایک خیال تیر بن کر اس کے اندر پیوست ہوا تھا۔ وہ کچھ گھبرا کر، کچھ بوکھلا کر سیدھی اٹھ بیٹھی تھی۔ نگاہیں ڈائریکٹ صوفے پر بیٹھے اطمینان سے چائے پیتے اور ساتھ اخبار کا مطالعہ کرتے شاہ ویز سے ٹکرائی تھیں اور اس کے خیال کی تصدیق ہو چکی تھی۔

''تت..... تت..... تم اندر کیسے آئے؟'' اس کی حالت قابل دید تھی۔

''صبح بخیر۔'' شاہ ویز نے چائے کا گھونٹ لے کر نگاہیں اخبار پر مرکوز کئے کہا۔

''مائی فٹ۔ میں پوچھتی ہوں تم نے اندر آنے کی جرأت کیسے کی؟ اجازت کیوں نہیں لی؟'' وہ غصے سے بل کھاتی اس کے قریب آ کر پھنکاری۔

''محترمہ! یہ میرا کمرہ ہے اور میں نے آج تک کسی ذی شعور شخص کو اپنے ہی کمرے میں اجازت لے کر داخل ہوتے نہیں دیکھا۔ اس نے اخبار ٹیبل پر رکھ کر اطمینان سے جواب دیا۔ مشعل اس کے جواب پر پہلی مرتبہ لاجواب ہوئی تھی۔ پھر اس نے شاہ ویز میں حیرت انگیز تبدیلیاں دیکھی تھیں کہ اس کا اس کے سامنے رہنے والا بے بس و مؤدب انداز یکدم بدل گیا تھا بلکہ وہ بہت مطمئن، با اعتماد و بااختیار نظر آ رہا تھا۔

''فافٹ تیار ہو کر نیچے آؤ، سب انتظار کر رہے ہیں ناشتے پر۔''

''میں بریک فاسٹ تنہا کرنے کی عادی ہوں اور آئندہ مجھ پر اپنے فیصلے ٹھونسنے کی کوشش ہرگز مت کرنا۔ انڈرسٹینڈ؟'' اس کی جارحیت عود کر آئی۔

''سمجھنے کی مجھے نہیں تمہیں ضرورت ہے۔'' اس نے خالی مگ ٹیبل پر رکھا اور اس کے مقابل کھڑا ہو کر کہنے لگا۔ ''کل تک تم اپنے باپ کے گھر میں تھیں تو اپنی چلاتی تھیں۔ آج تم میرے گھر میں یعنی مجازی خدا کے گھر میں ہو تو تمہیں اس گھر کے طور طریقے اپنانے ہوں گے۔ ان پر چلنا ہو گا۔ انڈرسٹینڈ؟ میں صرف ایک بار سمجھاتا ہوں۔'' مشعل نے اس کے سخت تنبیہی لہجے پر حیرانی سے دیکھا۔ وہ مشعل کو دیکھ رہا تھا..... اُف، کیا سحر انگیز بولتی آنکھیں تھیں، روشن روشن، پرکشش آنکھیں، اس کا دل بے ساختہ بری طرح دھڑکنے لگا تھا..... رگ و پے میں سنسناہٹیں دوڑ گئیں۔ اس نے نہ صرف نگاہیں جھکا لیں بلکہ رخ پھیر کر کھڑی ہو گئی۔ پہلی ہی نظر میں وہ اس کی نگاہوں سے شکست کھا گئی تھی۔ کس قدر لعنتیں دیتی تھی وہ، کتنا طنز کرتی تھی اس کی جھکی نگاہوں کے حوالے سے۔ وہ ہمہ وقت جھکی رہنے والی پلکیں اٹھیں تو ایک قیامت برپا کر گئی تھیں۔ کتنا استحقاق و یقین تھا ان آنکھوں میں۔ عجیب سحر انگیز سی کشش۔

''فافٹ تیار ہو کر نیچے آؤ۔'' وہ کہہ کر نیچے آ گیا جہاں بے جی کے ساتھ خالہ زرینہ اور فرح بھابی کچن میں مصروف تھیں۔ مزےدار خوشبوئیں وہاں پھیلی ہوئی تھیں۔

''شادی کے پہلے ہی دن اتنی بے قاعدگی۔ صبح سویرے بیدار ہونے والا شخص گیارہ بجے بیدار ہو رہا ہے۔'' اصغر اسے دیکھ کر شرارت سے بولا۔

''بالکل غلط..... شاہ بھائی تو صبح سویرے ہی اٹھ گئے تھے۔ ایکسرسائز اور واکنگ سے فارغ ہو گئے ہیں۔ آپ خود بے خبر پڑے سو رہے تھے۔'' انڈے فرائی کرتے ہوئے فرح نے جتانے والے انداز میں کہا تو اصغر جھینپ کر مسکرانے لگا۔ جب کہ حلوہ ڈش میں نکالتی ہوئی زرینہ اس کے شانے پر پڑا دوپٹہ دیکھ کر دانت پیس کر گویا ہوئیں۔

''تمہارے دیدوں کا پانی بالکل ہی ڈھل گیا ہے بہو! ساسوں، میاں اور دیور کے سامنے ننگے سر کیا فراٹے سے زبان چلا رہی ہو۔ کچھ تو شرم کرو۔''

''سوری آنٹی۔ دراصل چائنا سلک کے دوپٹے کہاں سنبھلتے ہیں، سر سے پھسلتے رہتے ہیں۔''

''ہاں..... تم سے نہ زبان سنبھالی جاتی ہے اور نہ دوپٹہ، صرف میاں کو قابو کرنے کے گر جانتی ہو۔'' وہ موقع محل دیکھ کر بات کرنے کی عادی نہ تھیں۔

''زرینہ! معمولی معمولی سی بات پر جھگڑنے نہ بیٹھ جایا کرو۔ ٹھیک کہہ رہی ہے بہو۔ یہ دوپٹے سر پر نہیں ٹھہرتے۔'' بے جی کو غیر جانب داری سے بولنا پڑا تھا۔

''شاہ ویز، بھابھی کب تک نیچے تشریف لائیں گی؟ سچ اب تو چوہے بھی پیٹ میں بھاگ دوڑ کر کے نڈھال پڑے ہیں۔'' اصغر نے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر دہائی دی۔ میز لذیذ ڈشوں سے بھری تھی۔ وہ سب کرسیوں پر براجمان مشعل کی آمد کے منتظر تھے اور قبل اس کے کہ شاہ ویز کوئی جواب دیتا سامنے نیچے اترتی مشعل کو دیکھ کر وہ گنگ رہ گیا۔ باتھ گاؤن میں اس کی گلابی پنڈلیاں عریاں تھیں۔ تولیے کو سر پر لپیٹ رکھا تھا۔ شفاف چہرے پر بھی پانی کے قطرے موجود تھے۔ وہ دوسری سیڑھی پر آ کر رک گئی تھی جب کہ نیچے ایک دم ہی سناٹا چھا گیا تھا۔ اصغر نے گردن جھکا لی تھی۔ بے جی اور زرینہ ایک دوسرے سے نگاہیں چرا رہی تھیں۔ فرح کے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ تھی۔

''آپ لوگ ناشتہ کریں پلیز۔'' وہ کہہ کر اٹھا اور ایک جست میں کئی سیڑھیاں پھلانگ کر اس کے پاس پہنچا اور وہ جو کچھ کہنے کے لئے لب وا کر رہی تھی کہ بازو سے پکڑ کر کھینچتا ہوا کمرے میں لایا تھا۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے؟'' وہ جھلا کر بولی۔

''شٹ اپ۔'' وہ اس سے بھی دگنی آواز میں دھاڑا تھا۔ ''تمہاری ہمت کیسے ہوئی اس بیہودہ حلیے میں سب کے سامنے نیچے جانے کی؟ میں نے تمہیں سمجھایا بھی تھا کہ اب اس گھر میں آ گئی ہو، اس گھر کے طور طریقے اپنانے ہوں گے۔ یہاں کسی بیٹی، بہن، بہو کے سر سے آنچل بھی ڈھلک جائے تو سخت معیوب سمجھا جاتا ہے اور تم اپنی خوب صورتی کے زعم میں اس ادنیٰ درجے کی بے حیائی کا مظاہرہ کرتی باتھ گاؤن میں نیچے چلی آئیں۔ انسلٹ کروا دی میری سب کے سامنے۔'' وہ سخت طیش میں تھا۔

''مسٹر! مجھ پر اپنے بیک ورڈ فیملی کے گھٹیا سیٹ اپ ٹھونسنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں وہی کروں گی جو میں کرنا چاہتی ہوں اور کسی خوش فہمی میں رہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں یہاں صرف پاپا کی خواہش کے احترام میں چند دنوں کے لئے آئی ہوں..... بہت جلد چلی جاؤں گی تم سے ڈائیورس لے کر۔'' وہ سر سے تولیہ ہٹاتی تمسخرانہ لہجے میں بولی۔

''پھر تو یہ گھر نہیں ۔مکڑی کا جال ثابت ہوگا تمہارے لئے۔''
''کیا؟ کون روک سکتا ہے مجھے یہاں سے جانے سے؟''
''فی الحال اس فضول ٹاپک کو یہیں رہنے دو اور فوراً ڈریس چینج کرو۔'' اس نے وقت کی نزاکت کو محسوس کر کے قصداً لہجے اور چہرے پر نرمی طاری کی۔
''میرا سوٹ کیس کہاں ہے؟''
''آپ کے کپڑے یہاں موجود ہیں، وہی پہنیں۔ اس گھر سے یہاں کچھ نہیں آئے گا۔تمہارا سوٹ ڈریسنگ روم میں موجود ہے۔'' اس نے ڈریسنگ روم کا دروازہ کھول کر کہا جہاں سی گرین شلوار سوٹ بڑے سے دوپٹے سمیت ہینگر میں جگمگا رہا تھا۔ساتھ میچنگ سینڈل، جیولری اور پرس بھی موجود تھا۔
''وہاٹ ...... میں نے آج تک ایسے ڈریس نہیں پہنے، نہ میں عادی ہوں۔'' وہ منہ بنا کر اس لباس کو حقارت سے دیکھ کر بولی۔
''آج سے آپ یہی ڈریس زیب تن کیا کریں گی اور بہت جلد عادی ہو جائیں گی۔''
''تو ...... نیو مسٹر! مجھ پر اپنی مرضی چلانے کی کوشش مت کرو ...... ورنہ میں ابھی اور اسی وقت یہاں سے چلی جاؤں گی۔'' وہ بپھر اٹھی۔
''کوشش کر کے دیکھ لو ...... کبھی کامیابی نہیں ہوگی۔'' ڈریسنگ روم کی طرف اسے دھکیل کر اس نے سخت لہجے میں کہا۔

□●□

''اوئی اللہ ...... کیسی بے غیرت لڑکی ملی ہے آپا، کیسی بہو ملی ہے تمہیں؟ تمہارے ساتھ ساتھ میری بھی ناک کٹوا دی اس نے۔فرح کو دیکھو کس طرح دھیمے دھیمے مسکرا رہی ہے۔خوب سمجھ رہی ہوں اس کے طنز کو ...... مجھے جتا رہی ہے وہ۔''
اصغر ناشتے سے فارغ ہو کر چلا گیا تھا۔انہوں نے بھی ناشتہ کر لیا تھا۔فرح مشعل کا ناشتہ کمرے میں دے آئی تھی۔اب وہ ٹیبل صاف کرتی مسکرا رہی تھی۔اپنی ساس کی عادت وہ بخوبی جانتی تھی کہ وہ ہمیشہ دوسروں کی بہوؤں کے پھوہڑ پن، سلیقہ مندی، شرم و حیا کی مثالیں دے کر اس کا ناک میں دم کئے رکھتی تھیں اور اب سگی بہن کی بہو کے حوالے سے شروع سے وہ ہرٹ ہو رہی تھیں اور اب مشعل کے ہاتھ گاؤن والے پوز نے تو انہیں ازحد خجلی و شرمساری سے دوچار کیا تھا اس کے سامنے۔
''ایسی بات نہیں ہے زرینہ! دراصل مشعل کی ماں بچپن میں ہی اسے چھوڑ کر مر گئی تھی۔اس کی تربیت زیادہ تر انگریز آیاؤں نے کی ہے۔اسی وجہ سے وہ ایسی نزاکتوں کو نہیں جانتی۔اب یہاں رہے گی تو سب سمجھ جائے گی، بدل جائے گی۔'' بے جی نے بہت تحمل و بردباری سے مشعل کی حمایت کی تھی۔
''مجھے تو وہ کسی کو گھاس ڈالتی نظر نہیں آ رہی۔ آئے ہائے، شاہ ویز جیسے شریف اور خوش مزاج بچے کے نصیب پھوٹ گئے۔کیسی بے حیا و بد دماغ بیوی ملی ہے۔''
''پریشان مت ہو زرینہ! کچھ عرصے بعد ٹھیک ہو جائے گی۔'' زرینہ کے ساتھ ساتھ یہ تسلی انہوں نے خود کو بھی دی تھی۔زرینہ کے مقابل ان کی قوت ارادی و قوت برداشت بہت زیادہ تھی۔پھر رخصتی سے قبل خصوصی طور پر حسن صاحب نے اس کی تمام حرکات و عادات کے متعلق بتا کر التجائیہ درخواست کی تھی کہ وہ ساس بن کر نہیں، ماں بن کر اس کی کوتاہیوں و نادانیوں کو معاف کر دیا کریں گی اور بیٹی کی طرح خیال رکھا کریں گی۔وہ ان سے وعدہ کر چکی تھیں۔ویسے بھی وسعت قلبی کے باعث وہ زیادہ تر درگزر سے کام لینے کی عادی تھیں۔ان کا امتحان بہت کٹھن و صبر طلب تھا۔یہ انہیں شام تک معلوم ہو چکا تھا۔
مشعل نے ناشتے کی طرح دوپہر اور رات کا کھانا بھی اپنے کمرے میں کھایا تھا اور سارا وقت تنہا کمرے میں رہی تھی۔اس کی ہٹ دھرمی اور دیدہ دلیری دیکھ کر زرینہ کو اپنی بہو کے بگڑنے کا احساس ہوا تو وہ رات کے کھانے کے بعد رکی نہیں، چلی گئی تھیں۔ساتھ بیٹے بہو کو بھی لے گئی تھیں۔
رات میں وہ جلد ہی کمرے میں آ گیا تھا۔وہ بے تکلفی سے بیڈ پر تکیوں کے سہارے نیم دراز کوئی میگزین پڑھ رہی تھی۔گلابی خوب صورت نائٹی میں اس کی اجلی رنگت دمک رہی تھی۔سرخی مائل اخروٹی بال ریشم کے لچھوں کی طرح بکھرے ہوئے تھے۔مصنوعی آرائش سے مبرا چہرے پر بلا کی دلکشی و جاذبیت تھی کہ نگاہ بھٹک کر رہ جائے۔مگر وہ بہت مضبوط اعصاب کا مالک تھا۔کوئی عام جذباتی و کمزور اعصاب انسان نہیں تھا۔ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالنے کے بعد خاموشی سے ڈریسنگ روم کی طرف بڑھ گیا تھا۔نائٹ سوٹ بدل کر آیا تو اسے اپنا منتظر پایا۔
''تم اس کمرے میں سوؤ گے؟''
''یس ...... کیوں کہ میں ان احمق شوہروں میں سے نہیں ہوں جو کسی بھی اختلاف کی بنا پر کمرے سے باہر یا کمرے میں صوفے پر سوتے ہیں۔سائیڈ پر جاؤ۔'' اس نے بیڈ پر لیٹتے ہوئے سنجیدگی سے کہا اور اپنا تکیہ اس کی گردن کے پیچھے سے کھینچ کر آگے ہونے کا اشارہ کیا۔مشعل نے اس کے طرز عمل کو بہت استعجاب سے دیکھا تھا مگر پھر کچھ سوچ کر اس کے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ ابھری تھی۔مغرور نگاہوں میں چمک بڑھنے لگی تھی۔
''اوہ ہو ...... مرد کتنا ہی اسٹرانگ ہو مگر ''حسن'' اور ''سیکس'' اس کی کمزوری ہوتے ہیں۔حسن کے جلوؤں کی تاب بڑے بڑے سورما نہیں لا سکے، سیکس کی کشش میں تو بڑے بڑے وضعدار و بے نیاز اُلّو بن کر انگلیوں پر ناچتے ہیں۔بہت جلد تم نے سرنڈر کر دیا ...... بس اتنی سی برداشت تھی تمہاری؟ ...... اتنی جلدی میرے حسن کے آگے سرنگوں ہو گئے؟'' اس کی زبان کی کاٹ تلوار کی کاٹ سے زیادہ کاری تھی۔
''محترمہ! آپ سمجھتی ہیں کہ مرد کاٹھ کا اُلّو ہوتا ہے جس کو انگلیوں کی جنبش پر باآسانی نچایا جا سکتا ہے؟ آپ کا خیال ہے حسن بڑی طاقت ہے مرد کو زیر کرنے کے لئے ...... آپ سمجھتی ہیں سیکس مرد کی بہت بڑی کمزوری ہے، اس کمزوری کی بنا پر عورت اسے اپنا غلام بنا سکتی ہے؟ ہوں ...... مرد کے بارے میں آپ کا ہر خیال، ہر سوچ، ہر فلسفہ بالکل غلط ہے۔آپ کے خیالات و نظریات انتہائی گمراہ کن ماحول کی پیداوار ہیں۔آپ ایک بھٹکی ہوئی لڑکی ہیں۔مرد کیا ہے یہ آپ جان ہی نہ سکیں۔اینی وے، اب میری رفیق حیات بننے کے بعد آپ کو معلوم ہوگا دراصل مرد ہوتا کیا ہے ...... مجھے معلوم ہے کل رات کی آپ کی نگاہ میں کوئی کشش و وقعت نہ ہوگی جو یونہی گزر گئی۔شادی کی پہلی رات کی اہمیت صرف وہی لڑکی سمجھ سکتی ہے جو اپنی حیا و نسوانیت کے وقار کو سنبھال کر رکھتی ہے، جو لڑکی عصمت کے تصور کو فرسودہ سمجھ کر اس کے ساتھ کھیلتی ہے وہ قابل احترام و قابل اعتبار نہیں ہوتی۔''
اس کے آنچ دیتے لہجے میں کیا تھا کہ وہ سُن ہو گئی۔اے سی کی کول کولنگ میں بھی مساموں سے پسینہ پھوٹ نکلا تھا۔نگاہیں اٹھنے کے قابل نہ رہی تھیں۔
''مردوں کی تو آپ کو کمی کبھی نہیں رہی ہے ...... مجھ غریب سے آپ کی شادی کا فیصلہ صرف انجوائے منٹ اور تھرل ہے، شوہر تو آپ کو بالکل بھی نہیں چاہئے۔عاشق بھی آپ کے بے شمار ہیں۔اور آپ یہ ازبر کر لیں میں وہ نہیں ہوں جو آپ نے سمجھا ہے اور نہ وہ بنوں گا جو آپ بنانا چاہتی ہیں۔میری طرف سے آپ کی رونمائی کا تحفہ بھی وارننگ ہے۔آج اور ابھی سے ہی نیک و وفا پرست بننے کی جدوجہد شروع کر دیجئے، اوکے گڈ نائٹ۔'' اس نے ہاتھ بڑھا کر ٹیبل لیمپ آف کر دیئے۔دبیز تاریکی ہر سُو چھا گئی تھی۔وہ سن دل و دماغ لئے بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔سماعت، بصارت، گویائی سلب ہو گئی۔ہلنے جلنے کی سکت نہ تھی۔صرف کیے بعد دیگرے ہوتے ذہن میں دھماکوں کو سُن رہی تھی۔اس نے کیا سوچا تھا؟ وہ کیا نکلا تھا؟ سنگدل، کٹھور، بے حس، لفظوں کی مار مارنے والا ظالم انسان۔
وہ آسمانوں پر اُڑتی تھی۔
زندگی پھولوں، خوشبوؤں، اجالوں میں بسر کی تھی۔
جو چاہا وہ پایا، من مانی کرنا اس کا شیوہ تھا۔
اپنی منوانا جنونی عادت تھی۔اسے کسی نے گرم نگاہ کی مار مارنے کی کوشش بھی نہ کی تھی۔ازحد نازونعم میں پرورش پا کر وہ جوان ہوئی تھی۔
جوانی بھی کتنی ہوشربا تھی اس کی، جس نے دیکھا دیوانہ ہو گیا۔دیوانوں کو تڑپانا اس کا شغل تھا۔وہ تڑپ عجب لطف دیتی تھی۔
مردوں کو وہ بے وقوف مخلوق سمجھتی تھی۔اس کے شعور کے مطابق مردوں کی کمزوری، جسم ہوتے ہیں اور اسی کمزوری کا سہارا لے کر انہیں جس طرف چاہو جھکا دو۔بھلا مرد کی زندگی کا مقصد ہی کیا ہے کہ وہ ہمیشہ حسین عورت کے تلوے چاٹتا رہے۔خوب صورت عورت صرف چاہے جانے کے لئے ہوتی ہے، ناز اٹھوانے کے لئے ہوتی ہے۔عورت اگر معاشی طور پر مضبوط ہو تو اسے کبھی مرد کی غلامی نہیں کرنی پڑتی۔وہ تو ویسے بھی پاپا کی تمام جائیداد کی اکلوتی وارث ہے ...... ہونہہ، سمجھتا کیا ہے خود کو؟ ذلیل، کمینہ، اُلّو کا پٹھا، مکار، جعلساز ......
شدید غصہ اور تنفر اس کی رگ رگ میں لہو بن کر دوڑنے لگا تھا۔
''میں نہیں سوؤں گی یہاں۔'' اس نے آگے بڑھ کر ٹیبل لیمپ روشن کر کے چیخ کر کہا۔
''اس وقت میں کوئی ڈرامہ برداشت نہیں کر سکتا ...... خاموشی سے سو جاؤ۔'' وہ رخ موڑے ہوئے ہی سخت لہجے میں گویا ہوا تھا۔
''میں تم جیسے گھٹیا آدمی کے قریب رہنا اپنی توہین سمجھتی ہوں۔''
''اب تمہیں عادت پڑ جائے گی۔'' اس نے ذرا بھی مائنڈ نہیں کیا۔
''ہرگز نہیں ...... میں ابھی اسی وقت پاپا کے ہاں جاؤں گی۔'' ایک چھلانگ میں وہ بیڈ سے اتر گئی تھی۔شاہ ویز کو مجبوراً اٹھنا پڑا تھا۔
''سوری، یہ خواہش تمہاری پوری نہیں کر سکتا۔حسن صاحب آج صبح ہی بنکاک کے لئے روانہ ہو چکے ہیں اور انہیں ایئرپورٹ سی آف کر کے آیا ہوں۔''
''وہاٹ ...... وہاٹ ......؟ پاپا مجھے انفارم کئے بنا کیسے جا سکتے ہیں؟'' حیرت و بے یقینی سے اس کی آنکھیں پھٹ گئی تھیں۔
''ریلیکس پلیز، وہ تم سے ملنے آئے تھے، تم سو رہی تھیں۔انہوں نے تمہیں ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ایئرپورٹ سے انہوں نے کال بھی کی تھی مگر تم شاید تب بھی سو رہی تھیں۔اس لئے کال ریسیو نہیں کی۔'' وہ اطمینان سے کہتا ہوا اس کے چہرے کے بنتے بگڑتے زاویوں کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔
''تم مجھے اب بتا رہے ہو دھوکے باز آدمی ...... جھوٹ بول رہے ہو تم ...... پاپا کبھی بھی مجھے انفارم کئے بغیر نہیں جاتے۔'' اسے برا بھلا کہتی وہ جھپٹ کر سائیڈ ٹیبل پر رکھے موبائل کی طرف بڑھی اور پھرتی سے گھر کے نمبر نوش کئے جہاں ملازم نے کنفرم کر دیا تھا کہ پاپا بنکاک گئے ہیں اور واپسی کی کوئی اطلاع نہ تھی۔
بہت بری طرح شاکڈ ہوئی تھی وہ ...... ازحد چاہنے والے پاپا کا کون سا روپ تھا یہ؟ ...... کیا وہ ایک ہی دن میں اتنی پرائی اور اجنبی ہو گئی؟ اس قدر غیر اہم اور ناقابل اعتبار

کہ انہوں نے پہلے اسے اپنے ٹور کے بارے میں آگاہ کرنا مناسب نہ سمجھا۔ یہ کیا ہوا؟ اپنے بیگانے بنا دیئے گئے تھے، غیروں کو ہر بات کی آگاہی تھی۔

"پلیز سو جاؤ..... مجھے صبح آفس بھی جانا ہے۔" وہ جو اس کی پل پل بدلتی حالت کا جائزہ لے رہا تھا، نرمی سے بولا اور ساتھ لیمپس آف کر دیئے تھے۔

□●□

رات نہ معلوم کون سے پہر تک وہ فوں فوں کرتی کمرے میں اِدھر اُدھر چکر لگاتی رہی۔ شاہ ویز آنکھیں بند کیے اس کی حرکات و سکنات سمجھ رہا تھا۔ کافی دیر بعد وہ بڑبڑاتی ہوئی صوفے پر جا بیٹھی تھی۔ شاید تھک گئی تھی۔ کمرے میں خاموشی ہوتے ہی شاہ ویز کی آنکھوں میں نیند اتر آئی تھی اور وہ بے خبر سو گیا تھا۔

حسب معمول صبح فجر کے وقت اس کی آنکھ کھل گئی تھی لیکن روز کی طرح آج وہ فوراً اٹھ کھڑا نہ ہوا تھا۔ رات دیر سے سونے کے باعث طبیعت میں کسلمندی تھی اور کچھ اعصاب ابھی تک اس اچانک ہونے والی اتنی اہم تبدیلی کو قبول نہ کر پائے تھے۔ عجیب بوجھل و بے کیف سی دھند دل و دماغ پر چھائی تھی جس سے وہ خود کو اندھیرے کنوئیں میں مقید محسوس کر رہا تھا۔ دس منٹ تک وہ ساکت لیٹا سوتی جاگتی کیفیت میں چھت کو گھورتا رہا پھر ایک دم نماز قضا ہونے کے خیال نے اس کے اعصاب کو جھنجوڑ ڈالا تھا۔ تیزی سے بیڈ سے اترا تھا اور باتھ روم کی طرف بڑھتے ہوئے اس کی نگاہ صوفے پر بے خبر سوتی ہوئی مشعل پر پڑی تھی۔ گلابی نائٹی میں وہ خاصی بے ترتیبی سے سو رہی تھی۔ سفید دودھیائی ہاتھ نیچے لٹکا ہوا تھا۔ سرخی مائل براؤن بال چہرے پر ریشم کی طرح بکھرے ہوئے تھے۔ وہ چند سیکنڈ اس کی طرف بغور دیکھتا رہا۔ ایک لمحے کو انسانی ہمدردی کی رمق اس کے اندر پیدا ہوئی تھی۔ اس نے چاہا آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ اوپر کر دے مگر پھر دوسرے لمحے اسے احساس ہوا اسے ہاتھ لگانا گویا قیامت چھیڑنے کے مترادف ہے۔

اس کی نیچر سمجھتے ہوئے وہ اپنے خیال کو عملی جامہ پہنانے کے خیال کو ترک کر کے باتھ روم کی طرف بڑھ گیا۔ نماز اور ایکسر سائز سے فارغ ہونے کے بعد وہ آفس جانے کے لئے تیار ہونے کمرے میں آیا تو مشعل ہنوز بے خبر سو رہی تھی۔ البتہ اب ہاتھ سینے پر تھا۔ بے جی کی تربیت کا اعزاز تھا یا اس کے اندر ہی انسانیت کا لحاظ اور فطرت میں سادگی و حساسیت اعلیٰ پائے کی تھی جس کی بنا پر وہ ازحد خاموشی سے تیار ہو کر کمرے سے نکل گیا تھا۔ مشعل بے خبر سوتی رہی تھی۔

"کیا ہوا..... ناشتہ کیوں نہیں کر رہے..... کوئی پریشانی ہے؟" بے جی ناشتے کی ٹیبل پر تمام لوازمات یوں ہی دھرے دیکھ کر اس سے مخاطب ہوئیں۔

"میں صرف چائے پیوں گا بے جی۔" اس نے ٹی پاٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا تو بے جی نے ہاتھ تھام لیا۔

"میں خالی پیٹ چائے کبھی نہیں پینے دیتی۔ یہ اچھی طرح معلوم ہے تمہیں اور کیا بات ہے؟ کیوں اتنے فکر مند ہو۔ مجھے بتاؤ تو آخر..... ورزش کے بعد جوس بھی نہیں پیا ہے تم نے اور رات کو بھی کھانے میں چند لقمے ہی لئے تھے۔"

"بے جی! جو بلا آپ نے میرے گلے میں ڈالی ہے اسی کا اثر ہے یہ۔"

"بری بات۔ وہ انسان ہے، ایسے مت کہو۔" انہوں نے زبردستی اسے فرائی انڈے اور ٹوسٹ کھانے پر مجبور کیا تھا۔ ساتھ رسانیت سے سمجھایا بھی تھا۔

"وہ انسان ضرور ہے مگر انسانیت سے دور کا بھی اس کا واسطہ نہیں ہے۔ بہت غلط کیا ہے آپ نے بے جی اس بدتمیز لڑکی کو بہو بنا کر۔"

"کیا غلط فیصلہ ہوا..... کیا، کیا اس نے؟"

"بے جی آپ فجر سے پہلے کی بیدار ہو چکی ہیں اور پہلے کی طرح ہی میری خدمت میں لگی ہوئی ہیں۔ کیا آپ کو محسوس ہو رہا ہے کہ آپ کی بہو گھر آ چکی ہے؟ کسی مڈل کلاس فیملی سے بہو لے کر آتیں تو اب آپ کو اس طرح کام نہیں کرنا پڑتا بلکہ وہ آپ کی خدمت کرتی اور میرا خیال رکھتی۔ تب محسوس ہوتا اس گھر میں آپ کی بہو اور میری بیوی آ چکی ہے لیکن..... لیکن اب ایسا لگ رہا ہے گویا عذاب مول لے لیا ہو۔"

"اس طرح بدگمان مت ہو اس بچی سے۔ میرے کہنے سے زندگی کا اتنا اہم فیصلہ کر ہی لیا ہے تو اسے اللہ کے بعد میرے حوالے کر دو۔ دیکھنا چند دنوں میں ہی کس طرح اس کے طور طریقے بدلتی ہوں۔ پھر خود ہی بڑے فخر سے اسے اپنی بیوی اور میری بہو تسلیم کرو گے۔"

بے جی کی خوش گمانیوں پر وہ بے ساختہ مسکرا اٹھا تھا۔

"ہاں، ہاں..... ہنس لو، اُڑا لو میرا مذاق..... مجھے پرواہ نہیں۔"

"بے جی! میں بھلا ایسی گستاخی کر سکتا ہوں؟" وہ فوراً ہی سنجیدہ ہو گیا۔

"بہو کو ناشتے میں کیا پسند ہے..... مجھے بتاؤ تاکہ اس کے اٹھنے پر تیار کر دوں۔"

"یہ تو آپ اپنی بہو صاحبہ سے خود ہی معلوم کیجئے گا۔" وہ لاپرواہی سے گویا ہوا۔

شاہ ویز ناشتے کے بعد آفس چلا گیا تھا اور کہہ گیا تھا کہ رات دیر سے آئے گا۔ انہوں نے ناشتے کے برتن سمیٹ کر ٹیبل صاف کی اور کچن میں برتن دھو کر فارغ ہی ہوئی تھی کہ صفائی کرنے والی ماسی آ گئی۔ ماسی کے جانے کے بعد گیٹ بند کر کے پلٹی ہی تھیں کہ وہ سامنے کھڑی نظر آئی۔ چہرے پر رعونت و مکمل بے زاری کے تاثرات سجائے۔

"اٹھ گئیں بیٹی!" وہ مسکرا کر اس کی جانب بڑھتی ہوئی گویا ہوئیں۔

"شٹ اپ، آئی ایم نوٹ یور ڈاٹر۔" وہ خاصے تحقیر بھرے لہجے میں گویا ہوئی۔ بے جی اس کی بات تو نہیں سمجھی تھیں مگر اس کے چہرے، آنکھوں و لہجے سے جھلکتی تحقیر و تضحیک نے انہیں پل بھر میں باور کرا دیا کہ اسے ان کا مخاطب کرنا برا لگا ہے۔ چند ثانیے وہ گومگو کی کیفیت میں ٹھٹھک کر رک گئی تھیں مگر پھر ایک نئے حوصلے سے آگے بڑھی تھیں۔

"ناشتے میں کیا لیں گی آپ؟" انہیں خود اس بار اپنا لہجہ اجنبی لگا۔

"اونلی ون کپ ٹی ود آؤٹ شوگر۔"

"میں سمجھی نہیں بیٹی۔" بے جی کو اس نے چند لمحوں میں گڑبڑا کر رکھ دیا تھا۔

"صرف ایک کپ چائے لے کر آؤ۔ وہ بھی بغیر چینی کے۔" اس نے منہ بنا کر کہا۔

بے جی پرانے خیالات کی عورت تھیں۔ ان کے ہاں صبح نہار منہ صرف چائے پینے کا رواج نہ تھا۔ ان کے خیال میں ناشتہ بھرپور انداز میں کرنا چاہئے کیونکہ صبح آغاز ہوتا ہے اور انسان کو رات تک ڈھیروں کاموں سے گزرنا ہوتا ہے۔ اس لئے انسان کو شروع میں بھرپور توانائی حاصل ہونی چاہئے اور اسی نظریے کے تحت وہ پھرتی سے مشعل کے لئے چائے کے علاوہ دوسرے لوازمات بھی لائی تھیں اور بہت چاہ سے اس سے مخاطب ہوئی تھیں۔

"صبح ہی صبح میں نہار منہ کبھی بھی شاہ ویز کو چائے پینے نہیں دیتی اور آپ کو بھی نہیں پینے دوں گی۔ اس سے بہت نقصان ہوتا ہے۔ پہلے کچھ کھا لیں پھر چائے....."

"وہاٹ؟ اب مجھے یہ تم سے سیکھنا ہوگا کہ میرے لئے کیا بہتر ہے اور کیا نہیں؟" وہ شدید غصے میں تنتناتی ہوئی کرسی کو ٹھوکر مار کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"نہیں بیٹی....."

"شٹ اپ، میں نے کہا نا میں تمہاری بیٹی نہیں ہوں۔ مجھے پکارنے سے پہلے اپنی اوقات دیکھو، تم جیسی اولڈ وومن کو میں ملازم رکھنا بھی پسند نہیں کرتی۔ ہونہہ..... مجھے سکھانے چلی ہے ان پڑھ، گنوار عورت۔ اپنے اس جاہل، اجڈ بیٹے کو اپنے یہ جاہلانہ مشورے دینا۔ آئندہ کبھی میرے منہ لگنے کی کوشش مت کرنا..... انڈر اسٹینڈ؟" وہ بولنے پر آئی تو بولتی ہی چلی گئی۔ ازحد بے حس و بدلحاظ تھی وہ۔ مکمل بدتمیز بھی۔ اسے بالکل پرواہ نہیں تھی کہ اس کے ان جملوں نے بے جی جیسی مشفق و باوقار شخصیت رکھنے والی عمر دراز عورت کو کس قدر نادم و شرمندہ کر ڈالا تھا۔ وہ گم صم سی کھڑی رہ گئی تھیں۔ بھلا انہوں نے کب ایسی بدتمیزی و گستاخی دیکھی تھی۔ بلاشبہ گزرا ہوا وقت عسرت و تنگ دستی کا شکار رہا تھا مگر ان سے کبھی کسی نے اونچی آواز میں بات نہ کی تھی۔ کسی نے تحقیر کی نگاہوں سے نہ دیکھا تھا۔ ان کی طبیعت میں ہی وقار و تمکنت تھی۔ کچھ وہ شروع سے ہی خوددار و حساس تھیں۔ کڑے سے کڑے وقت میں اللہ کے سوا کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلایا تھا۔ آج اس دو دن کی آئی لڑکی نے کتنی بدتمیزی سے اپنے قدموں تلے ان کی عزت، وقار و مرتبہ کچل ڈالا تھا۔ ان کی رگ رگ میں کراہیں پھیلتی چلی گئیں۔ سچ مچ ان کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ اگر وہ آگے بڑھ کر کرسی تھام نہ لیتیں تو زوردار انداز میں زمین بوس ہوتیں۔ جب کہ مشعل نے چائے کو بھی ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ وہ بڑبڑاتی ہوئی اوپر کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ پھر چند لمحے بعد دوبارہ برآمد ہوئی تو پرس ہاتھ میں تھامے سن گلاسز آنکھوں پر چڑھائے تیزی سے سیڑھیوں سے اتری تھی اور بے جی کو نظر انداز کر کے گیٹ کی طرف بڑھی تھی۔

"کہاں جا رہی ہیں آپ؟" بے جی لپک کر اس کی جانب بڑھی تھیں۔

"کیوں..... تمہیں بتانا لازمی ہے؟" اس کا لہجہ ہنوز گستاخانہ تھا۔

"ہاں....." بے جی کو جلد ہی احساس ہوا شاہ ویز جو اس کے بارے میں کہتا تھا سو فیصد درست تھا۔ زیادہ نرمی برتنا اس کے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔

"کیوں کہ تم اس گھر کی بہو ہو اور ہمارے گھرانے کی بہوئیں ایسی شتر بے مہار نہیں ہوتیں۔ تمہیں اپنے گھر سے باہر جانے کے لئے شاہ ویز کی اجازت لینا لازمی ہے۔"

"اس گھرانے کی بہوئیں کیا ہیں اور کیا نہیں مجھے اس کی پرواہ نہیں اور نہ ہی میں کسی کے دباؤ میں آنے والی ہوں۔ میں اپنی لائف اپنے طریقے سے گزارنے کی عادی ہوں۔ یہاں میں کسی کا انٹرفیئر برداشت نہیں کر سکتی اور بائی دا وے میں شاہ ویز سے اجازت کیوں لوں؟"

"وہ شوہر ہے تمہارا..... اسی کے حوالے سے تم اس گھر میں آئی ہو۔"

"شوہر....." وہ قہقہہ لگا کر ہنسی۔ "اپنے بیٹے سے پوچھنا میں نے اسے شوہر کا درجہ دیا ہے؟"

بے جی اس کی زبان درازی پر چکرا کر رہ گئیں جب کہ وہ سکون سے وہاں سے چلی گئی۔

□●□

پہلی مرتبہ زندگی میں انہیں ایسی بدتمیزی و تحقیر کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ سو دل پر یکلخت ہی منوں بوجھ گر سا گیا تھا۔ مشعل کے جانے کے بعد کافی دیر تک وہ گم صم بیٹھی رہی تھیں۔ پھر ضمیر کے کسی گوشے سے ہی صدا ابھری تھی کہ اتنی جلدی پہلے ہی مرحلے پر ہمت ہار دی؟ شکست تسلیم کر لی؟ انہوں نے تو شاہ ویز سے بڑے بڑے دعوے کئے تھے اس کو

سدھارنے کے، راہِ راست پر لانے کے اور بہترین و مکمل لڑکی بنانے کے..... وہ کیا ہوئے؟ سب خس کم بن کر بہہ گئے اور یہاں انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اتنی جلدی شکست تسلیم نہیں کریں گی، جلد نہ سہی بہر حال کامیابی ضرور حاصل کریں گی۔

اس عزم نے ان کے حوصلے از سرِ نو توانا کر دیے اور وہ مطمئن ہو کر اٹھ گئیں۔ اسی دم زرینہ آ گئیں۔ سلام دعا کے بعد اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑا کر ان کی طرف چہرہ جھکا کر سرگوشی کرتے ہوئے گویا ہوئیں۔

''بہو بیگم کہاں ہیں؟'' بے جی جو پہلے ہی ان کے اس سوال کی توقع کر رہی تھیں گھبرا گئی تھیں۔ جھوٹ انہیں پسند نہیں تھا، سچ ان کی طبیعت بتانا گوارا نہ کر رہی تھی۔ وہ اسی شش و پنج میں مبتلا تھیں کہ زرینہ اپنی جلد باز طبیعت کے باعث خود ہی کہہ اٹھیں۔

''اوپر ہوں گی اپنے کمرے میں..... اور کہاں جائیں گی؟ سچ آپا، مجھے تمہاری بہو کے لچھن اچھے نہیں لگے۔ نئی نویلی دلہن کے یہ طور طریقے ہوتے ہیں؟ اللہ توبہ، نہ شرم نہ حیا۔ کیسے بے حیاؤں کی طرح ایسے ہی اٹھ کر چلی آئی تھی۔''

''ماں تو اس بچی نے دیکھی نہیں۔ آیاؤں کی گودوں میں پل کر جوان ہوئی ہے۔ پھر آزادی بھی ہر قسم کی ملی۔ کوئی روک ٹوک نہیں، کوئی سمجھانے والی عورت نہ ہو تو بچے بگڑ ہی جاتے ہیں۔ خیر سے اب یہاں آ گئی ہے، رفتہ رفتہ سمجھ جائے گی۔'' بے جی نے اطمینان سے کہا۔

''ارے چھوڑو آپا! سب کو اپنی طرح سیدھی و معصوم نہ سمجھا کرو..... وہ جس قسم کی لڑکی ہے میں تو اس دن اس کے تیوروں سے پہچان گئی تھی۔ کیسی تحقیر و اہانت تھی اس کی نگاہوں میں۔ گویا ہم کوئی انسان نہیں زمین پر رینگنے والے کیڑے، مکوڑے ہوں۔ اصغر کہہ رہا تھا دعوت کرنے کی مگر میں نے منع کر دیا۔ ہماری دعوت، ہمارا گھر کہاں تمہاری بہو کے مزاج کے شایانِ شان ہو سکتا ہے۔''

ان کے لہجے میں طنز نہیں بلکہ احساسِ کمتری و دکھ تھا۔ بے جی نے بہت محبت سے انہیں سمجھایا۔ کافی دیر وہ بیٹھی رہی تھیں اور اس دوران بے جی دل ہی دل میں یہ دعائیں مانگتی رہی تھیں کہ مشعل ان کی موجودگی میں نہ آ جائے جوان کا بھرم، ان کی عزت بہن کے سامنے بکھر جائے اور شاید اللہ کو ان کا وقار عزیز تھا۔ زرینہ چلی گئیں مشعل کی آمد سے قبل ہی۔ انہوں نے تشکر بھرا سانس لیا تھا۔

شام کے سائے بڑھ کر رات کی تاریکی میں بدلنے لگے تھے۔ وہ مغرب کی نماز سے فارغ ہو کر وظائف پڑھنے لگی تھیں اور پھر ان سے فراغت کے بعد بھی بہت ٹائم گزر گیا تھا۔ مشعل ابھی تک گھر نہیں لوٹی تھی۔ فکر و پریشانی ان کے اعصاب پر سوار ہوتی جا رہی تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ کہاں گئی ہے اور کس طرح معلوم کیا جائے کہ ابھی تک کیوں نہیں لوٹی ہے۔ کئی بار دل میں خیال آیا کہ شاہ ویز سے رابطہ کریں لیکن پھر ہر بار یہی سوچ کر اس خیال کو رد کرنا پڑا کہ وہ پہلے ہی اس سے بدظن و ناخوش ہے اب اگر اسے یہ معلوم ہو جائے کہ مشعل گھر سے گئی ہوئی ہے اور وہ بھی بغیر اطلاع و اجازت تو وہ گھر میں طوفان مچا دے گا۔ شاید وہ اپنے آپ کو نظر انداز کرنا تو برداشت کر بھی لے مگر ان کی اجازت نہ لینے پر وہ قطعی برداشت نہ کر سکتا تھا۔

عشاء کی نماز پڑھ کر بھی خوب خشوع و خضوع سے انہوں نے مشعل کی خیریت سے لوٹ آنے کی دعائیں مانگی تھیں۔ ابھی وہ جا نماز تہہ کر رہی تھیں کہ فون کی بیل بج اٹھی۔

''ہیلو!'' انہوں نے قابلِ داد پھرتی سے ریسیور اٹھا کر کہا تھا۔

''بے جی! کیا ہوا؟ آپ اتنی پریشان کیوں لگ رہی ہیں؟'' دوسری طرف سے شاہ ویز کی پریشان کن آواز ابھری تھی۔ انہوں نے فوراً ہی خود کو کنٹرول کیا۔

''صبح سے نکلے ہوئے ہو اب گیارہ بجنے والے ہیں۔ گھر واپسی کی کوئی فکر ہی نہیں۔ پریشان نہیں ہوں گی تو خوش ہوں گی؟''

''اوہ تھینکس گاڈ! ورنہ میں سمجھا تھا آپ کی لاڈلی بہو نے کوئی کارنامہ انجام دیا ہے۔ سوری بے جی! دراصل آپ تو جانتی ہیں جو کاروبار کا حال ہے۔ یہاں حالات معمول پر لانے کے لیے مجھے انتھک محنت و جدوجہد کرنی پڑے گی۔ یا یوں سمجھیے کہ ایک ڈوبے ہوئے تباہ حال جہاز کو دوبارہ سے ساحل پر کھڑا کرنا ہے اور ایسا کرنے کے لیے رات دن مجھے محنت کرنی ہے۔ اور آپ کو میرا ساتھ دینا ہو گا۔''

''میں بھی سٹھیاتی جا رہی ہوں۔''

''ایسا نہ کہیں بے جی! میں نے یہ بتانے کے لیے فون کیا تھا کہ میں لیٹ آؤں گا۔ آپ فکر مت کیجیے گا اور کھانا کھا لیجیے گا۔ میں کھانا کھا کر آؤں گا۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔''

''بے جی! آپ کی لاڈلی بہو کمرے سے باہر بھی نکلی ہیں یا آپ وہیں خدمت کر رہی ہیں؟'' اس کی آواز میں شوخی تھی۔ بے جی لمحہ بھر کانپ سی گئیں۔

''اتنی بدگمانی اچھی نہیں ہوتی۔ ٹھیک ہو جائے گی وہ بہت جلد۔ کھانا ڈھنگ سے کھانا، کبھی لاپروائی سے دو تین لقمے لے کر ہی فارغ ہو جاؤ۔ بہت لاپروائی برتتے ہو اپنی صحت کے بارے میں۔''

ریسیور رکھ کر وہ سر تھام کر کرسی پر بیٹھ گئی تھیں۔ شاہ ویز کا لیٹ آنا انہیں ایک طرح سے امدادِ غیبی لگا تھا۔ اس کی طرف سے اطمینان ہونے کے بعد پھر نئے سرے سے انہیں مشعل کی غیر موجودگی کی تشویش ہونے لگی تھی۔

بالآخر ایک بجے کے بعد وہ گھر میں داخل ہوئی تھی اور قبل اس کے کہ وہ کچھ پوچھتیں وہ دھڑ دھڑ سیڑھیاں چڑھتی اوپر غائب ہو چکی تھی۔

کچھ دیر انہوں نے انتظار کیا کہ وہ شاید نیچے آئے مگر وہ نہیں آئی تھی۔ انہیں خود ہی اوپر آنا پڑا۔ اوپر کمرے کا دروازہ اندر سے لاکڈ تھا۔

''ہو از ات؟'' دروازہ کھٹکھٹانے پر اندر سے اس کی چنگھاڑتی ہوئی آواز آئی۔

''کھانا کھا لو بیٹی۔''

''میں کھانا کھا کر آئی ہوں..... مجھے ڈسٹرب مت کرو، جاؤ یہاں سے۔'' تحکمانہ لہجہ، بے ادبی و بدتمیزی سے بھرپور تھا۔ وہ چند ساعتیں بند دروازے کو تاسف سے دیکھتی رہیں پھر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی وہاں سے نیچے آ گئیں۔ یہ گھر جو کل تک انہیں اپنی پناہ گاہ لگا کرتا تھا جہاں وہ عزت و احترام و سکون محسوس کرتی تھیں آج یکلخت خار دار جھاڑی بن گیا تھا جہاں ان کی عزت و وقار کی دھجیاں بکھر گئی تھیں۔ دل کی عجب ناقابلِ فہم سی حالت ہو گئی تھی۔ کبھی خوب آنسو بھر بھر چلے آتے تو کبھی وہ خود کو تسلی دے کر بہلانے لگتیں۔ اس کی گستاخیوں و بدتمیزیوں کو نا سمجھی و لاابالی پن سمجھ کر بھلانے کی سعی کرتے کرتے کچھ ہی وقت گزرا تھا کہ شاہ ویز آ گیا اور اسے دیکھ کر انہیں خود کو بالکل نارمل ظاہر کرنے میں زیادہ دقت نہیں ہوئی تھی۔

''کھانا لگاؤں؟'' وہ اس کے تھکے تھکے چہرے پر نگاہیں ڈال کر بولیں۔

''نہیں..... میں نے کہا تھا کھانا کھا کر آؤں گا۔'' وہ ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتا گویا ہوا۔

''اچھا پھر دودھ لے آتی ہوں۔''

''نہیں بے جی، ابھی کسی چیز کو طبیعت نہیں چاہ رہی ہے۔ صرف سونے کو دل چاہ رہا ہے۔'' اس کے لہجے میں شدید تھکن تھی۔ بے جی فکر مندی سے گویا ہوئیں۔

''بیٹا! اتنی محنت مت کرنا کہ خود کو مشین ہی سمجھ لو۔''

''ابھی از حد پرابلمز ہیں، بہت مسائل ہیں، ایک عرصے تک شاید خود کو مشین بنانا ہی پڑے گا۔ آپ کی دعائیں ساتھ رہیں تو انشاء اللہ بہت جلد ہم ان مشکلات و مسائل سے چھٹکارا پا لیں گے۔''

''ہاں ضرور، اللہ محنت کبھی ضائع نہیں کرتا۔ انشاء اللہ بہت جلد سرخرو ہو جاؤ گے۔ جاؤ، جا کر آرام کرو۔ بہت رات گزر گئی ہے۔'' بے جی اٹھتے ہوئے گویا ہوئیں۔

وہ اوپر چلا آیا۔ دروازہ باہر سے نہیں کھلا جس کا مقصد تھا اندر سے لاک ہے۔ اس کے تھکن زدہ اعصاب ایک دم ہی کشیدہ ہو گئے تھے، فراخ پیشانی پر سلوٹیں پڑ گئی تھیں۔ جیب سے چابی نکال کر لاک کھولا تھا۔ اندر دبیز تاریکی نے اس کا استقبال کیا۔ فل اے سی کی کولنگ نے اس کے اندر سرد سی لہر دوڑا دی۔ کمرے میں اندھیرا اس قدر گہرا تھا کہ چند لمحے وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہر طرف دیکھنے کے باوجود ڈریسنگ روم کی طرف نہ بڑھ سکا تھا۔ پھر اندازے کے مطابق بڑھا بھی تو کارپٹ پر پڑی کسی شے سے الجھ کر گر اٹھا۔ سنبھلتے سنبھلتے بھی نامعلوم ٹیبل یا صوفے سے سر اس طرح ٹکرایا تھا کہ اندھیرے میں تارے نظر آ گئے تھے۔ وہ ہونٹ بھینچے اٹھنے لگا تو وہ شے اس کے ہاتھ میں آ گئی جس سے وہ الجھ کر گرا تھا۔ بلاشبہ وہ سینڈل تھی جو مشعل نے لاپروائی سے پھینک دی تھی۔ شدید غصے میں سینڈل اس نے زور سے اچھالی اور خود اٹھنے لگا تھا۔ اسی لمحے مشعل کی چیخ کمرے میں گونجی تھی اور ساتھ ہی کمرہ ٹیبل لیمپ کی روشنی سے منور ہو گیا تھا۔

''تم..... تم نے مجھے یہ سینڈل ماری ہے؟'' وہ سر پکڑے غرائی تھی۔

''یہ کیا جہالت ہے..... سینڈل یہاں رکھنے کی جگہ ہے؟'' وہ اس سے زیادہ سختی سے گویا ہوا۔

''ہاں..... میں انہیں یہاں ہی رکھوں گی۔'' ہٹ دھرمی اس کی سرشت تھی۔

''تمہیں اگر یہ اتنے ہی عزیز ہیں تو اپنے سر پر رکھو مگر میں اپنے کمرے میں یہ بے ڈھنگا پن پسند نہیں کروں گا اور تم نے کمرہ لاک کیوں کیا تھا؟ تمہیں معلوم نہیں کہ نیچے بے جی تنہا ہیں۔ بجائے اس کے کہ ان کی تنہائی شیئر کرتیں، یہاں کمرہ لاک کر کے انہیں بالکل تنہا چھوڑ دیا۔ میں تمہیں انسانیت سے اس قدر عاری نہیں سمجھتا تھا۔'' وہ درشت لہجے میں کہہ رہا تھا۔

''میرے آنے سے قبل وہ تمہاری غیر موجودگی میں کس کے ساتھ اپنی تنہائی شیئر کرتی تھیں؟ اینی وے، مجھے عادت نہیں اولڈ پیپلز کو کمپنی دینے کی۔ مجھ سے امید توقع رکھنا بھی نہیں۔ میں تمہاری تھرڈ کلاس عورتوں کی طرح بوڑھوں کی خدمت کروں گی۔ مجھے نفرت ہے ایسی عورتوں سے جن کی صورتوں سے خوشامد ٹپکتی ہے اور لباس سے لہسن، پیاز اور مسالوں کی بو آتی ہے۔''

''وہ بو تمہارے اس لباس سے پھوٹتی قیمتی مہک سے زیادہ قیمتی و بے مثال ہے۔ وہ خوشامد نہیں بلکہ ان کی نیک نیتی و وفاداری کا ایسا خوب صورت نور ہے جو تمہارے پھٹکار زدہ چہرے پر کبھی چمک ہی نہیں سکتا۔ ان عورتوں کے مقابلے میں تم از حد بدصورت بلکہ کریہہ صورت ہو۔'' وہ غصے سے بولتا ہوا واش روم کی طرف بڑھ گیا اور کچھ

دیر بعد جب وہ نائٹ سوٹ بدل کر باہر آیا تو وہ نچلے تیز کیے بیٹھی تھی۔

''کیا کہا تم نے مجھے...... میں بدصورت ہوں؟ کریہہ صورت ہوں؟ تمہارے لو اسٹینڈرڈ کی عورتوں کے آگے کچھ نہیں، میں...... یعنی اس ملک کے ٹاپ بزنس مین حسن بیگ آفندی کی اکلوتی بیٹی، جس کے حسن کے چرچے ہر سُو ہیں، جس کی ایک نگاہ کے لئے لوگ مر مٹنے کے لئے تیار رہتے ہیں، جو زمین پر نہیں اپنے نامراد عاشقوں کے دل پر چلتی ہے۔ میرا مقابلہ اپنی ان کالی کلوٹی، بے ہنگم و بے ڈھب عورتوں سے کر رہے ہو جن کو ان کے مرد ہی نظر بھر کر دیکھنا پسند نہیں کرتے۔''

''یہی فرق ہے ان عورتوں میں اور تم میں...... وہ عورتیں کسی غیر مرد کے نام کو اپنی زبان پر لانا بھی گناہ عظیم سمجھتی ہیں اور تم جیسی تھرڈ ذہنیت بڑے فخر سے اپنے مجازی خدا کو اپنے ناکام عاشقوں کے مشغلے بتا رہی ہے۔ عصمت و حرمت کیا ہوتی ہے تم کیا جانو۔ اینی وے میں مزید بک بک سننے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ پلیز خود بھی سو جاؤ اور مجھے بھی سونے دو، بہت تھکا ہوا ہوں۔'' اسے غصے سے بل کھاتا دیکھ کر وہ ڈپٹ کر گویا ہوا اور بیڈ پر دراز ہو گیا۔

''خوب جانتی ہوں میں تم جیسے شریفوں کو۔''

''میں نے کہا نا اب کوئی آواز نہیں آنی چاہئے۔'' اس دفعہ وہ اتنی سختی سے بولا تھا کہ اس کی زبان دوبارہ نہ کھل سکی۔ اس نے اس کے برابر سے تکیہ گھسیٹا اور لائٹ آف کر کے صوفے پر دراز ہو گئی۔

□●□

''سر! بہت پرابلمز ہیں...... اگر اس ماہ کے آخر تک بینک کو انسٹالمنٹ نہیں پہنچی تو وہ قانوناً بیگ صاحب کی فیکٹری فروخت کر کے اپنی رقم حاصل کرنے کے حقدار ہوں گے اور ایک فیکٹری اور ان کے ذاتی بنگلے کے علاوہ اب کچھ بچا بھی نہیں ہے۔ لیکن سر اگر یہ فیکٹری اور بنگلہ فروخت ہو بھی گیا تو ہم بینک کو مکمل قرضہ پھر بھی نہ لوٹا سکیں گے۔ بھاری رقم پھر بھی ہم پر ڈیو رہے گی اور اس طرح وہ سب منظر عام پر آ جائے گا جو ہم بمشکل لوگوں کی نگاہوں اور پریس سے چھپاتے آئے ہیں۔ یوں سمجھئے کہ برسوں کی عزت و وقار خاک میں مل جائے گا۔ جس کو بیگ صاحب کبھی بھی برداشت نہ کر پائیں گے۔'' حسن بیگ کے پرانے منیجر نے مکمل کھاتا اس کے آگے کھول کر رکھ دیا تھا۔

وہ کچھ دیر گم صم بیٹھا رہا پھر کچھ توقف کے بعد گویا ہوا۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا ایسا کیوں ہوا؟ بیگ صاحب بہت سادہ و نیک انسان ہیں۔ عام بڑے لوگوں کی طرح ان میں کوئی بھی بیڈ ہیبٹ نہیں ہے۔ میں نے انہیں ہر قسم کی خرافات سے دور دیکھا ہے پھر یہ سب...... اتنا زبردست لاس میری سمجھ سے باہر ہے۔''

''بلاشبہ آپ کی باتیں بالکل درست ہیں...... بیگ صاحب بالکل سیدھے اور متقی قسم کے بندے ہیں اور ساتھ ہی بے حد سخاوت و حلاوت طبیعت بھی پائی ہے۔ ان کی آمدنی کا آدھا حصہ تو غریب و نادار لوگوں کی خدمت کے لئے وقف تھا۔ کئی ٹرسٹ ان کی زیر نگرانی چل رہے تھے۔ خیر نیکی تو کبھی ضائع نہیں جاتی۔ یہ ان کی نیکیوں کا ہی اجر ہے کہ سب کچھ تباہ ہونے کے باوجود ان کی ساکھ و عزت برقرار ہے بلکہ ان کے قریبی لوگوں کو بھی معلوم نہیں ہے اور ہماری کوشش یہی ہے کہ کسی کو معلوم نہ ہو اور ہم جلد اسٹیبلشڈ ہو جائیں۔ لیکن آپ کو عقلمندی اور حد درجہ سمجھداری سے کام لینا ہوگا۔ بیگ صاحب اپنی سادگی و اعتماد کے توڑ دیئے جانے پر اس حال کی طرف بڑھے ہیں۔ دراصل بزنس مین وہی کامیاب ہوتا ہے جو بزنس کو بزنس کی طرح کرتا ہے۔ یعنی میرا مطلب ہے بزنس میں کوئی مروت و رعایت نہیں کرنی چاہئے۔ اگر کریں بھی تو اس حد تک کہ آپ اور آپ کا بزنس اس سے متاثر نہ ہو اور اس میدان میں بیگ صاحب نے اپنی فطری ہمدردی و نرم دلی دکھائی تھی اور ان کو اس حال تک پہنچانے والے کوئی غیر نہیں خود ان کی سگی بہن، ان کے شوہر اور بہن کا بیٹا شامل ہے۔ بلکہ مشعل بی بی بھی اپنے فادر کی طرح طبیعت کی مالک ہیں۔ انہیں بھی ان لوگوں نے خوب بے وقوف بنایا۔ تینوں تو دونوں ہاتھوں سے لوٹتے تھے ہی ساتھ مشعل بی بی کو بھی بہلا کر بے حساب دولت سمیٹی ہے اور وقت پڑنے پر پیٹھ دکھا کر چلے گئے۔''

''بے فکر رہیں آپ...... میں لوگوں کی فطرت سے جلد واقف ہو جاتا ہوں نہ موقع پرست ہوں اور نہ ہی لوگوں کو موقع دیتا ہوں۔'' اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''اب میرے لئے کیا حکم ہے؟'' وہ فوراً کھڑا ہو کر مؤدب لہجے میں گویا ہوا۔

''ورکرز کی کیا کنڈیشن ہے؟ کیا وہ چند ماہ ہاف سیلری پر کام کرنے پر راضی ہو جائیں گے؟ بعد میں انہیں ان کی سیلریز سے ڈبل رقم ادا کی جائے گی۔''

''میں ورکرز یونین کے لیڈر سے بات کر کے آپ کو جواب دوں گا۔''

''اوکے، میں بھی چند دنوں میں ٹائم نکال کر ان سے بات کروں گا۔ فی الحال تو ابھی آرڈرز کی دستیابی کے لئے شدید محنت کرنا پڑے گی اور ساتھ ہی میں مکمل کوشش کروں گا بینک منیجر کچھ عرصہ خاموش ہو جائے اور انشاء اللہ ایسا ہو جائے گا۔ کیونکہ ہمارا ریکارڈ بہت اچھا رہا ہے۔'' اس کے لہجے میں یقین و امید تھی۔

□●□

دو ہفتے سے زائد دن گزر گئے تھے۔ مشعل کی وہی روٹین تھی، اپنی مرضی سے گھر سے نکل جانا اور رات دیر سے گھر میں داخل ہونا۔ شاہ ویز اس دوران بزنس کے الجھاؤ میں اس طرح الجھا ہوا تھا کہ صبح جلد گھر سے نکل جاتا تھا اور اس کی واپسی رات کافی دیر تک ہوتی تھی اور واپسی پر وہ اس حد تک تھکا ہوا ہوتا کہ بے جی بالکل رسمی بات چیت کرتی تھیں اس کی تھکن کے خیال سے۔ جب کہ مشعل کو شروع میں انہوں نے بہت سمجھانے کی کوشش کی مگر اس کی ہٹ دھرمی اور گستاخیوں کے باعث خاموش ہو گئیں۔ اب انہیں ہر وقت یہ خوف ستانے لگا تھا کہ کبھی اس کی غیر موجودگی میں شاہ ویز گھر آ گیا تو کیا ہوگا؟ وہ کیا جواب دیں گی؟ اور پھر کیا ہوگا؟ یہ سوالات و اندیشے انہیں ہر دم پریشان کئے رکھتے اور وہ یہی دعائیں مانگتیں کہ مشعل شاہ ویز کی آمد سے قبل گھر آ جائے اور ابھی تک ایسا ہی ہوا تھا اور بہت دانشمندی سے انہوں نے اس کی ان حرکتوں کو پوشیدہ رکھا تھا۔

لیکن ہر وقت دعائیں مستجاب نہیں ہوتیں اور اکثر وہ بھید کھل جایا کرتے ہیں جن کو ہم پوشیدہ رکھنا چاہتے ہیں۔ حالات بدلتے اور بگڑتے کیا دیر لگتی ہے۔ آج بھی مشعل حسب معمول صبح سے غائب تھی اور اب رات کے بارہ بج چکے تھے اور اس کا کوئی پتہ نہیں تھا۔ شاہ ویز نے کار پورچ میں کھڑی کی اور اندر جانے کے لئے قدم بڑھائے ہی تھے کہ گیٹ کھلا دیکھ کر وہ چوکیدار سے مخاطب ہوا۔

''خان بابا! گیٹ بند کیوں نہیں کیا؟''

''صاحب! ابھی چھوٹی بیگم صاحبہ کا انتظار کرتا ہے۔'' چوکیدار نے مستعدی سے جواب دیا۔

''چھوٹی بیگم صاحبہ...... کون؟ کس کی بات کر رہے ہیں؟'' وہ پریشان سا اس کی طرف بڑھ گیا۔

کار کی آواز سن کر گھبرا کر ٹیرس سے جھانکتی بے جی اسے حیران و پریشان چوکیدار کی طرف بڑھتے دیکھ کر خوف، گھبراہٹ و پریشانی سے کانپ اٹھیں۔

''ہمارا چھوٹا مالکن...... آپ کا بیوی صاحب۔'' چوکیدار کے جواب نے اس کے چودہ طبق روشن کر دیئے تھے لمحے بھر کو اسے اپنے کانوں پر یقین ہی نہیں ہوا تھا۔

''کب گئی تھیں وہ؟'' اس کے چہرے پر اترتی سرخی بے جی اوپر سے صاف دیکھ رہی تھیں۔ بالآخر وہی ہوا جس کا انہیں ڈر تھا۔

''وہ تو صاحب! روز جاتا ہے۔ کبھی گیارہ بجے، کبھی دس بجے اور کبھی بارہ بجے، پھر رات کو بھی ایسا ہی آتا ہے گیارہ، بارہ بجے تک۔'' ادھیڑ عمر کا وہ پٹھان چوکیدار بہت سادگی سے اسے اپنی ڈیوٹی سمجھ کر معلومات فراہم کر رہا تھا۔

شاہ ویز کے ذہن میں دھماکے ہو رہے تھے۔ اپنی بے خبری پر اسے رنج تھا۔ وہ سیدھا اندر چلا آیا۔ بے جی اس کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں پا رہی تھیں۔ انہوں نے عشاء کی نماز پڑھ لی تھی۔ پھر اس کے سوالوں سے بچنے کے لئے نفلوں کی نیت باندھ لی تھی۔ شاہ ویز ان کے کمرے سے نکل آیا اور لاؤنج میں بیٹھ گیا۔ اسے خود پر غصہ تھا کہ اچھی طرح اس کی نیچر کو جاننے کے باوجود بھی اس نے کیوں اس سے غفلت برتی۔ بے شک بزنس کے مسئلوں میں الجھ کر وہ خود سے بھی غافل ہو گیا تھا مگر اب احساس ہو رہا تھا کہ ان مسئلوں میں بڑا مسئلہ تو خود اس محترمہ کی ذات کا ہے۔

بے جی کے گریز و اجتناب سے وہ سمجھ گیا کہ یقیناً اس کے سوالات سے بچنے کے لئے جاء نماز پر کھڑی ہوئی ہیں ورنہ وہ اذان ہوتے ہی نماز ادا کرنے کی عادی ہیں۔ خود بخود ہی اس پر یہ بات عیاں ہو گئی کہ وہ بے جی کو بھی مطلع کر کے نہیں جاتی ہوگی کہ کہاں جا رہی ہے؟ کیوں جا رہی ہے؟ اس خیال نے اس کی رگ رگ میں انگارے دوڑا دیئے۔ بے جی کی توہین اسے محسوس ہوئی۔ ایک بجے کے بعد صبر و ضبط کی حدوں سے وہ نکل گیا تھا۔

مشعل مسکراتی، گنگناتی اندر داخل ہوئی تھی۔ پہلی نظر سامنے صوفے پر بیٹھے شاہ ویز پر پڑی۔ خلاف معمول اسے آج خود سے پہلے موجود دیکھ کر ایک ساعت کو ٹھٹکی تھی۔ پھر اس کے سامنے سے اسے مکمل طور پر نظر انداز کر کے اس طرح گزر گئی جیسے وہاں رکھے بے جان فرنیچر کا وہ بھی ایک حصہ ہو۔

''شاہ ویز! درگزر سے کام لینا بیٹے، وہ ابھی نا سمجھ ہے۔'' بے جی اسی لمحے باہر آ کر بہت نرمی سے اس سے مخاطب ہوئی تھیں۔

''شکر ہے آپ کی نفلیں تو ختم ہوئیں۔ میں سمجھا تھا آپ نے ایک لاکھ کی نیت باندھ لی ہے۔'' وہ خفگی سے گویا ہوا۔

''جاؤ آرام کرو، میں دودھ کمرے میں رکھ آئی تھی۔''

''بے جی! آپ کو صرف ہاں یا ناں میں جواب دینا ہے، بالکل ایمانداری کے ساتھ۔ مشعل آپ کی اجازت سے جاتی ہے؟'' وہ اس وقت سنجیدگی سے گویا ہوا۔

''میں نے کہا نا وہ نا سمجھ ہے۔'' بے جی گڑبڑا کر گویا ہوئیں۔

''نہیں بے جی! یہاں بات نا سمجھی کی نہیں، میری حمیت و وقار کی ہے...... آپ کو اللہ کو حاضر و ناظر جان کر سچائی کا ساتھ دینا ہوگا۔'' اس نے اپنی بات دہراتے ہوئے کہا تو بے جی کو سچائی کا دامن تھامنا پڑا۔ انہوں نے انکار میں گردن ہلا دی تھی۔ لیکن آگے بڑھ کر رقت آمیز لہجے میں بولیں۔

''اسے معاف کر دو بیٹا! فضول میں بات بڑھانے سے تماشہ بنے گا۔''

''آپ فکر مت کریں بے جی! ہمارا تماشہ بننے کے دن گزر گئے ہیں۔ آپ جا کر آرام کریں، بہت ٹائم ہو گیا ہے۔'' اس نے زبردستی انہیں کمرے میں بھیجا تھا۔ وہ بیڈ روم میں داخل ہوا تو مشعل نائٹی پہنے باتھ روم سے برآمد ہوئی تھی۔

''کہاں گئی تھیں؟'' وہ اس کے قریب آتے ہوئے استفسار کرنے لگا۔

''کیوں بتاؤں؟'' وہ بالوں میں برش چلاتے ہوئے لاپروائی سے گویا ہوئی۔

''شرافت سے بتاؤ میرے ضبط کا امتحان مت لو۔'' اس کی آواز میں انگارے دہک رہے تھے۔ ''تمہاری ہمت کیسے ہوئی بے جی کی اجازت کے بغیر یہاں سے قدم نکالنے کی۔''

''اوہ..... تو یوں کہونا اس بڑھیا نے کان بھر دیئے۔''

''شٹ یور ماؤتھ..... اگر بے جی کی شان میں کوئی گستاخی کی تو زبان کھینچ لوں گا۔''

''مجھ سے اس لہجے میں بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے مسٹر! میں کسی کی دھونس میں آنے والی نہیں ہوں اور ہمیشہ اپنی مرضی سے چلنے کی عادی ہوں۔''

''جبر اہی سہی، ناپسندیدگی کے باوجود تم میری زندگی میں شامل ہو چکی ہو اور ہمارے یہاں اپنی مرضی نہیں ہمیشہ بیوی کو شوہر کی مرضی کے مطابق چلنا پڑتا ہے۔ اپنی نہیں، ہسبنڈ کی مرضی مقدم سمجھی جاتی ہے۔''

''شو..... ہر..... ہونہہ، شکل دیکھی ہے کبھی آئینے میں؟ تم تو میری پرچھائیں چھونے کے قابل نہیں ہو۔ میں نے صرف پاپا کی خاطر یہ قبول کیا ہے، وہ بھی چند دنوں کے لئے۔ ورنہ اس ڈربہ نما گھر میں رہنا میری توہین ہے۔''

شاہ ویز کے جبراً اور ناپسندیدہ لفظوں نے اس کے اندر احساسِ توہین بیدار کر دیا تھا۔ منہ پھٹ وہ سدا کی تھی، خود پرست انتہا کی۔ اپنی ذات کے بارے میں ریمارکس وہ کبھی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ جواباً شاہ ویز کو اس نے کھری کھری سنائی تھیں۔

''تمہارے لئے یہ رشتہ جوڑنا جتنا آسان تھا میرے لئے یہ رشتہ توڑنا اتنا ہی مشکل، بلکہ ناممکن ہے۔ اس لئے میرا خیال ہے ساری توانائی رشتہ مضبوط کرنے پر لگاؤ۔ کہیں ایسا نہ ہو لوگ تمہارا تماشہ دیکھیں اور تم منہ چھپاتی نظر آؤ۔'' اس کی سرد و خشک آواز گونجی۔

''میں تمہارے منہ لگنا نہیں چاہتی۔'' وہ صوفے کی طرف بڑھتے ہوئے چیخی۔

''میری بھی ایسی گھٹیا خواہش نہیں ہے۔'' وہ دوبدو بولا۔

''تو سر پر کیوں سوار ہو؟''

''کہاں گئی تھیں..... اور کس کی اجازت سے.....؟''

''تم جاتے ہو..... تمہیں کوئی روکتا ہے؟''

''مجھے روکنے والا ایسا کوئی پیدا نہیں ہوا۔ نہ ہوگا۔''

''میں بھی اپنی مرضی کی مالک ہوں۔'' اس نے شانے اچکا کر کہا۔

''اس گھر میں صرف میری مرضی چلے گی۔''

''اس گھر میں حکمرانی کی خواہش بھی نہیں ہے۔''

''تمہیں میری مرضی پر چلنا ہوگا۔''

''میں کسی کی مرضی کی تابع نہیں ہوں۔''

''میں تمہارا شوہر ہوں.....''

''میں اپنے آپ کو تمہاری بیوی نہیں سمجھتی۔''

''تمہارے سمجھنے یا نہ سمجھنے سے حقیقت بدل نہیں سکتی۔''

''تم شوہر بنائے جانے کے قابل نہیں ہو اور نہ میں تمہیں کبھی شوہر تسلیم کروں گی۔''

''ہا..... پہلے خود کو اس قابل تو بناؤ کہ تمہیں بیوی کا درجہ دیا جائے۔'' اس کے لہجے میں مکمل طنز و تضحیک تھی۔ مشعل کے انگ انگ میں شرارے پھوٹنے لگے۔

''شٹ اپ..... تم نہایت گھٹیا، کمینے، ذلیل انسان ہو۔ مکار، چالاک و فریبی شخص..... میرے پاپا کی دولت و جائیداد پر قبضہ جمانے کے لئے تم جیسے فقیر و کمتر انسان نے کتنی اچھی اداکاری کی۔ شرافت و سعادت مندی کا ڈرامہ کھیل کر میرے معصوم و سادہ مزاج ڈیڈی کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنی اکلوتی بیٹی کو تم جیسے کنگلے کے نکاح میں دے گئے۔''

''خاموش رہو.....'' اس کی آنکھیں لہو رنگ ہو رہی تھیں۔

''کسی میں ہمت نہیں ہے مجھے خاموش کروانے کی۔ میں یہاں سے چلی جاؤں گی۔ مجھے نہیں رہنا تمہارے ساتھ۔'' وہ پاؤں پٹخ کر گویا ہوئی۔

''میں لحاظ کر رہا ہوں ورنہ تمہیں خاموش کرنا اچھی طرح جانتا ہوں..... اب تمہاری آواز اس کمرے سے باہر نہیں جانی چاہیے۔''

''تم میری آواز نہیں بند کر سکتے..... میں سب کو بتاؤں گی، پوری دنیا کو بتاؤں گی کہ تم کون ہو۔'' وہ حلق پھاڑ کر چیختی ہوئی صوفے سے اٹھ گئی تھی۔

''کون ہوں میں؟'' ضبط و برداشت کے کناروں پر تھا وہ۔

''مکار، فریبی، چالباز، کسی بے نام و نشان خاندان کے فرد..... جن کا کام بڑے لوگوں کی چاپلوسی کرنا، ان کا اعتماد جیتنا ہے تاکہ ان کی دولت پر قبضہ کر سکو۔ یہی تم جیسے لوگوں کا پلان ہوتا ہے جو تم نے میرے ذریعے حاصل کیا۔ اتنی دولت جائیداد کبھی تمہارے باپ نے بھی خواب.....''

تڑاخ، تڑاخ، تڑاخ، عورت کی زبان لمبی ہوتی ہے تو مرد کے ہاتھ دراز ہو جاتے ہیں۔ وہ جو ضبط کی طنابیں پوری شدت سے کھینچے کھڑا تھا، بات اس کی ذات تک رہتی تو وہ کبھی بے قابو نہ ہوتا مگر خاندان اور پھر باپ تک کوئی اس کے پہنچ جائے وہ کیسے برداشت کر سکتا تھا۔ وہ شدید طیش میں آگے بڑھا تھا۔ لمحے بھر میں مشعل کا کومل کومل چہرہ سرخ انگارہ بن گیا۔ رگ رگ میں جلن و درد کی ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ وہ دونوں ہاتھ رخساروں پر رکھے ششدر سی، بے یقینی سے اس کی جانب دیکھے جا رہی تھی۔

❑●❑

حسن صاحب سے کئے گئے وعدوں کی زنجیر نے اسے باندھ رکھا تھا مگر آج وہ اپنی برداشت و صبر کھو چکا تھا اور اسے ذرا بھی ڈھیل دینے کا روادار نہ تھا۔ مشعل پر ہاتھ اٹھانے پر اسے کوئی شرمندگی یا پشیمانی نہ تھی البتہ وجیہہ چہرے پر قہر و غصے کے رنگ ہنوز پھیلے ہوئے تھے۔

''انسان اور جانور میں تم کوئی فرق نہیں سمجھتی مگر اب میں تمہیں سمجھاؤں گا کہ انسان سے کس طرح مخاطب ہوتے ہیں اور آئندہ میرے بیک گراؤنڈ کے بارے میں بولنے سے قبل آج کے یہ لمحات یاد رکھنا اور یہ بھی اپنی ناقص عقل میں یاد رکھنا کہ مرد کا ہاتھ ایک بار اٹھ جائے تو کبھی رکتا نہیں۔ تم جیسی لڑکی پر مجھے بار بار ہاتھ اٹھاتے پر کوئی شرمندگی یا افسوس بھی نہ ہوگا۔'' وہ کہہ کر باہر نکل گیا۔ ساتھ ہی زوردار آواز میں دروازہ بند کر کے۔

وہ چلا گیا اور اس کے گم صم حواس لوٹ آئے۔ لبوں سے آہ و فغاں کا طوفان بہہ نکلا۔

''پاپا..... پاپا..... آپ مجھے کس وحشی کے حوالے کر گئے ہیں؟ کس قصائی کے سہارے چھوڑ گئے ہیں؟ وہ سنگدل جو جھکنا نہیں جانتا، جس کا ظاہر جتنا پرکشش و خوب صورت ہے باطن اتنا ہی سیاہ و بدہیئت۔ مجھے بچائیں پاپا..... مجھے بچائیں۔ وہ وحشی مجھے مار ڈالے گا..... مجھے مار ڈالے گا۔'' روتے روتے بیڈ پر ڈھے گئی۔ وہ زندگی میں پہلی مرتبہ روئی تھی۔ بے تحاشہ، پہلی مرتبہ ہی کسی نے اسے درد سے آشنا کیا تھا ورنہ آج سے پہلے تو وہی لوگوں کو زخم لگاتی آئی تھی۔ ہاتھ سے بھی اور زبان سے بھی۔ اب احساس ہو رہا تھا درد کتنا تکلیف دہ ہوتا ہے۔ چوٹ کس طرح جسم کے ہر عضو میں سرایت کر کے بے چین کر ڈالتی ہے۔

تھپڑوں سے زیادہ اس ظالم و بے حس شخص کی زبان سے نکلے لفظ چرکے لگا چکے تھے۔ وہ دہری اذیت میں مبتلا تھی۔ روتے روتے آنسو خشک ہو گئے تھے۔ اس نے وال کلاک کی طرف دیکھا۔ رات گزرنے کو تھی۔ وہ پلٹ کر نہیں آیا تھا اور اسے پرواہ بھی نہ تھی۔ پہلے تو وہ صرف اس سے چڑتی تھی مگر اب نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے اٹھ کر آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔ دونوں رخسار سوج گئے تھے جن پر اس درندے کی انگلیوں کے نشان ثبت ہو کر چہرے کی تمام خوبصورتی ماند کر رہے تھے۔

''میں مزہ چکھا دوں گی تجھے کمینے انسان..... کیا سمجھ کر تُو نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا؟ اس ملک کے بڑے بزنس مین کی بیٹی ہوں، کسی گھسیارے کی اولاد نہیں۔'' وہ غصے سے کھولتے ہوئے تصور میں شاہ ویز سے مخاطب ہوئی تھی۔ پھر لائٹ آف کر کے بیڈ پر سونے کے لئے لیٹ گئی تھی۔

❑●❑

صبح ناشتے سے فارغ ہو کر وہ بے جی کے پاس کچن میں چلا آیا۔

''بے جی! مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں کہ آپ نے مجھ سے مشعل کی حرکات چھپائیں۔ میں جانتا ہوں کہ آپ امن پسند و صلح جو طبیعت کی مالک ہیں مگر بے جی، پلیز اب آپ اس کی بالکل طرفداری نہیں کریں گی۔ میں نے آپ سے کہا تھا کہ یہ انسانیت و احساسات سے بالکل عاری ایک خود پسند و خود پرست لڑکی ہے جس کو اپنے علاوہ سب جانور نظر آتے ہیں۔'' وہ از حد سنجیدہ تھا۔

''کیا تم نے کچھ کہا اسے؟'' بے جی چونک کر گویا ہوئیں۔

''اسے انسان بنانے کا وقت آ گیا ہے۔ اب اس کے ساتھ کوئی رعایت نہ ہوگی۔''

''یہ بات غلط ہے شاہ ویز! اس گھر میں آئے اسے صرف ایک ماہ ہوا ہے۔ ابھی اسے ہمارے ماحول کو سمجھنے اور اپنانے میں وقت لگے گا۔ ہمارے گھرانوں کی لڑکیاں جب دلہن بن کر آتی ہیں تو انہیں ایک عرصہ لگتا ہے سسرال میں گھلنے ملنے میں، پھر وہ تو بڑے گھر کی لڑکی ہے۔ محلوں میں رہنے والی شہزادیوں کی مانند زندگی گزارنے کی عادی۔ اس گھر میں اسے بہلنے میں کافی وقت لگے گا۔'' انہوں نے نرم روی سے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''کوئی شہزادی وہزادی نہیں ہے..... بدتمیز و خود سر روح ہے وہ۔ میں آفس جا رہا ہوں اور پلیز..... پلیز بے جی۔'' اس نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے ملتجی لہجے میں کہا۔ ''وہ کتنا بھی شور کرے، چیخے چلائے آپ اوپر نہیں جائیں گی۔''

''کیا مطلب ..... کیا بند کر کے جا رہے ہو اس کو؟'' تحیر آمیز لہجے میں استفسار تھا۔

''بند کر کے ہی جا رہا ہوں بے جی۔'' اس نے بے جی کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے نرم لہجے میں کہا اور ان کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر رسانیت سے گویا ہوا۔

''جسم کے کسی حصے میں کینسر ہو جائے تو اس عضو کو جسم سے کاٹ کر پھینک دیا جاتا ہے باقی بدن کی فلاح کے لئے بقا کے لئے۔ اور آپ کی جو بہو صاحبہ ہیں ان کی بدمزاجی و بدتہذیبی کینسر سے بھی زیادہ مہلک و تباہ کن ہے۔ اس کا علاج نرمی و تحمل مزاجی سے ہرگز نہیں ہوگا۔ اس کے لئے ہمیں بہت صبر برداشت کی ضرورت پڑے گی۔ یہ سمجھئے کہ آج انہیں ٹریٹمنٹ کی پہلی ڈوز دی جا رہی ہے۔ آگے اس سے بھی زیادہ ہیوی ڈوز آئیں گے جس کی آپ کو ابھی سے عادت ڈالنی ہوگی اگر چاہتی ہیں وہ محترمہ انسانیت سیکھ جائیں۔''

''یہ میری ہی نہیں اس کے باپ کی بھی خواہش ہے مگر اس طرح .....''

''پلیز ..... پلیز بے جی! آپ اس طرح یا اس طرح بالکل نہیں کریں گی صرف میرے ساتھ تعاون کریں گی۔ او کے، میں جا رہا ہوں۔ امید ہے آپ میری پریشانیوں کو کم کرنے میں میری مدد کریں گی۔'' وہ انہیں کو مگو کی حالت میں چھوڑ کر چلا گیا۔ چند ثانیے بعد وہ وہیں سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔

اس وقت انہیں شدت سے احساس ہو رہا تھا اپنی غلطی کا، اپنی جلد بازی اور غلط فیصلے کا۔ شاہ ویز کے انکار کو انہوں نے کوئی اہمیت یہ سوچ کر نہ دی کہ وہ اپنی شرمیلی عادت کے باعث یونہی دکھاوے کو انکار کر رہا ہے ورنہ ہسپتال میں اس کے درشت لہجے کے باوجود وہ خود اس کے حُسن سے مبہوت ہو گئی تھیں۔ گلاب سی رنگت والا تر و تازہ شاداب چہرہ، ستواں ناک، دراز پلکوں کی چھاؤں میں جگمگ جگمگ کرتی آنکھیں، پھول کی پنکھڑیوں سے یاقوتی لب ..... وہ سراپا حُسن تھی۔ پھر بھلا کوئی مرد اتنی حسین لڑکی سے کیونکر رشتہ استوار کرنا نہ چاہے گا۔ یہی سوچ کر انہوں نے بہت تیزی سے اسے اس کی شریک سفر بنایا تھا اور اب ایک ماہ سے زائد عرصہ گزر جانے کے بعد انہیں محسوس ہوا کہ حسین صورت رکھنے والے ضروری نہیں کہ حسین سیرت بھی ہوں۔ شاہ ویز عام مردوں کی طرح حُسن پرست نہ نکلا تھا ورنہ صورت حال یہ ہرگز نہ ہوتی۔

''کتنی بڑی خطا ہو گئی مجھ سے ..... شاید اس کا ازالہ میں کر بھی نہ پاؤں۔ ساری زندگی چادر دیکھ کر پاؤں پھیلائے اور چند جذباتی لمحوں میں خود کو ہی عریاں کر ڈالا۔ آہ، کاش میں شاہ ویز کی بات مان لیتی اور متوسط طبقے سے ہی بہو لے آتی تو آج میں بھی مطمئن ہوتی اور میرا بچہ بھی ازدواجی زندگی کی مسرتیں سمیٹ رہا ہوتا۔'' وہ خود سے مخاطب تھیں۔ پچھتاوے کسی ناگ کی طرح انہیں ڈس رہے تھے۔

❑●❑

وہ پریشان سا، کار بے مقصد دوڑاتا پھر رہا تھا۔ آفس میں بھی کوئی کام نہ ہونے کے سبب زیادہ دیر نہیں رکا تھا۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا مسائل و پریشانیوں میں اضافہ بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ بینک والے زیادہ مہلت دینے سے معذرت کر چکے تھے۔ فیکٹری و کارخانوں میں ورکرز کب تک ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ سکتے تھے۔ اب انہوں نے بھی آہستہ آہستہ احتجاج کرنا شروع کر دیا تھا۔

بزنس کی پرابلمز مسلسل بڑھ رہی تھیں دوسری طرف مشعل کی بدتمیزیوں نے اسے دوہرے عذاب میں مبتلا کر دیا تھا۔ رات کو وہ کبھی حد سے تجاوز نہ کرتا۔ عورتوں پر ہاتھ اٹھانے والے مردوں سے اسے سخت چڑ تھی مگر رات کو اس پر انکشاف ہوا کہ عورت پر ہاتھ اٹھانا بزدلی ہے مگر مشعل جیسی ڈکٹیٹر پر ہاتھ اٹھانا ہرگز بزدلی نہیں ہے۔ عورت، عورت میں بھی فرق ہوتا ہے۔

ایک فون کال سے ہی اس نے معلوم کر لیا تھا کہ وہ روز اپنا وقت کلب میں گزارتی ہے جہاں اس کے بوائے فرینڈز کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ یہ جان کر اسے کوئی تعجب نہیں ہوا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا وہ کس کیٹگری کی ہے۔ مگر یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ کل تک اس نے یہ سب کیا لیکن اب ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ کل ساری رات طیش میں اس نے بیڈروم کے برابر والے روم میں گزاری تھی۔ مشعل کی بدتمیزی پر اتنا طیش اسے آیا کہ بے اختیار اس کا ہاتھ اٹھا اور اس کے رخساروں پر تھپڑ لگا کر بھی اسے کسی قسم کی شرمندگی یا پچھتاوے کا احساس نہ ہوا تھا۔ ذہن الجھنوں و پریشانیوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا اور اسی کشمکش میں ایک اباؤٹ ٹرن لیتے ہوئے روڈ کراس کرتی خاتون سے کار ٹکرا گئی۔

ایک دھماکا ہوا تھا ..... خاتون کے ہاتھ میں پکڑے شاپنگ بیگ سے سامان نکل نکل کر سڑک پر بکھر گیا تھا۔ لمحے بھر کو تو اس کا ذہن بالکل ماؤف ہو کر رہ گیا۔ پھر لمحے کے ہزارویں حصے میں گویا اس کے اندر حادثے کی نزاکت کا احساس جاگزیں ہوا تو وہ برق رفتاری سے کار کا دروازہ کھول کر باہر نکلا اور تیر کی طرح ان کی طرف بڑھا جو سڑک سے اٹھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

''آپ ..... آپ کو کوئی چوٹ تو نہیں لگی؟'' درمیانی عمر کی خاتون کو آہستگی سے اٹھتے دیکھ کر حواس کچھ بحال ہوئے تو وہ بوکھلا کر استفسار کرنے لگا۔

''نہیں بیٹا، کوئی خاص چوٹ نہیں ہے۔'' وہ شال درست کرتے ہوئے شفقت سے بولیں۔

''آپ کے ہاتھ پر چوٹ آئی ہے۔ خون نکل رہا ہے۔ آیئے میں ڈاکٹر کے پاس لے چلتا ہوں آپ کو۔ شاہ ویز بصد اصرار انہیں نزدیکی کلینک لے آیا جہاں ہاتھ پر ڈریسنگ کرنے کے بعد ضروری ٹریٹمنٹ کے بعد ڈاکٹر نے انہیں فارغ کر دیا۔ وہ انہیں لے کر کار کے پاس آ گیا۔

''بہت معذرت خواہ ہوں ..... میری وجہ سے آپ کو اتنی تکلیف اٹھانا پڑی اور آپ کا سامان بھی ضائع ہو گیا۔'' وہ شرمندہ لہجے میں ان سے مخاطب ہوا۔

''نہیں، نہیں ..... شرمندگی کی کوئی بات نہیں۔ غلطی میری ہی تھی کہ روڈ کراس کرتے وقت بھی سوچوں میں گم تھی۔ اور سامان کوئی خاص نہیں صبح ناشتے کے سامان کے علاوہ کچن کی چھوٹی موٹی چیزیں تھیں۔'' انہوں نے شائستگی سے سارا الزام اپنے سر لے لیا تھا۔ شاہ ویز ان کی سادگی سے کافی متاثر ہوا تھا۔

''مہربانی ہے آپ کی۔ ورنہ غلطی سو فیصد میری ہی تھی۔ بہرکیف آپ نے مجھے ذاتی شرمندگی سے بچا لیا۔ بے حد مشکور ہوں۔ آئیں میں آپ کو ڈراپ کر دوں۔''

''نہیں شکریہ بیٹے! گھر نزدیک ہے، چلی جاؤں گی۔''

''پلیز اتنی خدمت کا تو موقع دیجئے تاکہ ضمیر کی ملامت سے سرخروئی ملے۔'' اس کے خلوص و مہذب انداز نے انہیں مزید انکار نہ کرنے دیا۔ وہ بیٹھ گئیں۔ ان کے بتائے گئے راستوں پر وہ کار دوڑاتا ان کے مطلوبہ ٹھکانے پر پہنچ گیا۔ وہ خوب صورت کاٹیج تھا جس کی دیواریں پھولوں کی بیلوں سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ انہوں نے کار رکتے ہی اترنے کی کوشش کی تھی مگر کامیاب نہ ہو پائیں تو شاہ ویز سے مخاطب ہوئیں جو گردن جھکائے ان کے اترنے کا منتظر تھا۔

''بیٹا! آپ کو مجھے سہارا دینا ہوگا۔ دراصل اس وقت ٹانگ میں اتنا درد نہیں تھا مگر اب لگ رہا ہے سن ہو کر رہ گئی ہے۔''

''آپ کی ٹانگ میں بھی چوٹ آئی ہے اور آپ نے مجھے بتایا نہیں۔''

''چوٹ نہیں آئی صرف گرنے کی وجہ سے درد ہو رہا ہے۔'' وہ اس کے سہارے سے آہستگی سے چلتی ہوئی گیٹ سے اندر داخل ہو گئی تھیں۔

لان میں بیٹھی دوسری خاتون گھبرا کر آگے بڑھی تھیں۔

''کیا ہوا آپی؟'' شدید پریشانی ان کے چہرے سے عیاں تھی۔ دوسری سائیڈ سے سہارا دے کر انہوں نے انہیں کرسی پر بیٹھنے میں مدد دی تھی۔ ان کی آنکھوں میں تکلیف کا احساس تھا مگر لبوں پر دھیمی مسکراہٹ تھی۔

''بیٹھیں بیٹا۔'' انہوں نے سامنے رکھی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

''نہیں تھینکس، میں اب جاؤں گا۔ بہت دیر ہو گئی ہے۔''

''بہت عرصے بعد کسی مخلص انسان سے ملاقات ہوئی ہے میں اس طرح آپ کو نہیں جانے دوں گی۔ چائے کا ٹائم ہے، چائے پی کر جایئے گا۔'' وہ بصد اصرار گویا ہوئیں۔

''مجھے دیر ہو رہی ہے۔ میں جاؤں گا۔''

''چلے جایئے گا مگر چائے پینے کے بعد۔ حرا! فٹافٹ چائے یہیں لے آؤ۔'' شاہ ویز سے مخاطب ہونے کے بعد وہ قریب کھڑی حیران و پریشان سی خاتون سے مخاطب ہوئیں جو عمر میں ان سے چھوٹی تھیں۔ شاہ ویز ان کے خلوص کو اس بار ٹھکرا نہ سکا۔ حرا خاموشی سے اندر بڑھ گئی تھیں جب کہ وہ ان کے سامنے بیٹھا ان کے سوالوں کے جوابات دے رہا تھا جو عام سے اور معمولی تھے۔

''ماشاء اللہ، شکل سے ہی کسی مہذب و وضعدار فیملی کے دکھائی دیتے ہو ورنہ اس کٹھور و بے حس دور میں لوگ انسانوں کو ٹائروں تلے کچل کر مڑ کے بھی نہیں دیکھتے ہیں اور آپ سے معمولی سی ٹکر تو ہوئی تھی، کتنا ایثار کیا آپ نے۔''

''پلیز، شرمندہ نہ کریں ..... یہ میرا فرض تھا۔'' اس نے انکساری سے کہا۔

''آپ نے اپنا نام بتا دیا، میرا نہیں پوچھا۔ مجھے فرح رضوی کہتے ہیں۔ میرے جاننے والے مجھے آپی کہتے ہیں لیکن آپ مجھے آنٹی کہہ سکتے ہیں۔'' وہ خاصی باتونی تھیں اور اتنی ہی باہمت بھی جو اتنی تکلیف کے باوجود بہت حوصلے و ہمت سے باتیں کر رہی تھیں۔

چائے کے دوران بھی وہ اس سے اس کے کاروبار کے متعلق کافی معلومات لیتی رہی تھیں جب کہ ان کی بہن حرا بالکل خاموش تھیں۔

❑●❑

وہ سارا دن سوتی رہی تھی۔ اب بیدار ہوئے بھی خاصا وقت گزر گیا تھا مگر وہ اسی طرح ساکت لیٹی چھت کو گھور رہی تھی۔ چہرے کی جلن تو غائب ہو گئی تھی مگر انا پر بھڑکتی آگ میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ کھولتے ذہن کے ساتھ چھت کو گھورتی رہی۔ وقت گزرتا رہا۔ ساکت مسلسل لیٹنے سے کمر درد کرنے لگی تو کروٹیں لیتی رہی مگر پھر ایک احساس نے اسے اٹھنے پر مجبور کر ڈالا۔ وہ اٹھ کر باتھ روم کی طرف بڑھ گئی۔ باتھ لے کر باہر آئی، بال برش کرنے کے بعد وہ دروازے کی طرف بڑھ گئی مگر دروازہ باہر سے لاک تھا۔ اس نے بہت کوشش کی، ہینڈل ادھر ادھر خوب گھمایا مگر لاک نہ کھلا تھا۔ پہلے تو حیرانگی سے وہ بند دروازے کو دیکھتی رہی اور خود کو یہ تسلی دیتی رہی کہ وہ اس قدر پاور فل نہیں ہو سکتا کہ اسے کمرے میں بند کر کے جائے۔ لاکھ وہ خود سری کر لے مگر اسے اس طرح بند کر کے جانے کی جرأت نہیں کر سکتا۔

جوں جوں وقت گزرتا گیا اس کی بے یقینی پر صداقت کی مہر ثبت ہوتی گئی۔

''میں چھوڑوں گی نہیں تجھے ..... جرأت کیسے ہوئی تیری مجھے بند کر کے جانے کی؟'' غصہ و وحشت و جنون بن اٹھا۔ اس نے وحشیوں کی طرح دروازے پر مکّے، لاتیں

برسانا شروع کر دیں۔ ساتھ ہی ساتھ اس کے چیخنے کی آوازیں کمرے میں گونج رہی تھیں۔

دروازہ بھاری و عمدہ لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ اس کے جنونی مکوں اور لاتوں کی معمولی سی دھمک صرف اندر گونج رہی تھی۔ باہر معمولی سی بھی آواز پیدا نہ ہو رہی تھی۔ کافی دیر تک وہ دروازے پر طبع آزمائی کرتی رہی مگر سب بے سود تھا۔ شدید ترین بھوک کے احساس نے اسے جلد نڈھال کر دیا۔ وہ بے دم سی کارپٹ پر بیٹھ گئی۔

رات کلب میں بھی اس نے ڈنر نہیں کیا تھا۔ فرینڈز کے اصرار پر ایک سینڈوچ کھایا تھا۔ اکثر ایسا ہوتا تھا وہ رات کو سوپ پیا کرتی تھی اور صبح ناشتے میں اپنی فیورٹ ڈشز شوق سے کھایا کرتی تھی۔ رات بھی اس نے یہی سوچا تھا کہ اس بڑھیا سے من پسند ناشتہ بنوائے گی اور ڈٹ کر کھائے گی لیکن ناشتے اور لنچ کا ٹائم گزر چکا تھا۔ وال کلاک گیارہ بجا رہا تھا یعنی ڈنر کا ٹائم بھی گزر رہا تھا بلکہ گزر چکا تھا۔ اس نے روم ریفریجریٹر کھول کر دیکھا، وہ مشروبات کے کینز اور بوتلوں سے بھرا ہوا تھا۔ کل تک اس میں فروٹس بھی بھرے ہوئے تھے جو اب غائب تھے جو یقیناً جان بوجھ کر غائب کیے گئے تھے۔ اس نے جھٹکے سے ڈور بند کیا تھا۔ غصہ بھی بھرے پیٹ زور دکھاتا ہے۔ خالی پیٹ غصہ، جھنجھلاہٹ، انتقام والا سب ہوا ہو گئی تھی۔ وہ جو از حد ناز و نعم میں پلی بڑھی تھی جس کی خدمت کے لئے خادمائیں دست بستہ حاضر رہا کرتی تھیں آج بھوک کی مار سہہ رہی تھی۔ اس نے جو ہونٹوں سے نکالا فوراً پایا تھا۔ بھوک کیا ہوتی ہے؟ پریشانی کس بلا کا نام ہے، افلاس کس کو کہتے ہیں؟ وہ نہیں جانتی تھی۔ اس نے گویا جنت میں آنکھ کھولی تھی۔ ہر شے کو اشارے پر پایا تھا۔ پھر آج یہ کیا ہوا تھا؟ وہ کہاں پہنچ گئی تھی؟ مزاحمت، مدافعت سب دم توڑ چکی تھی۔

پیٹ میں ایک بھونچال تھا، ہاتھ پاؤں بھوک کے مارے بے جان ہوئے جا رہے تھے۔ نگاہوں میں لذیذ و خوش رنگ کھانوں کی ڈشز گھوم رہی تھیں۔ اس کے ڈائننگ روم میں بہت لمبی ڈائننگ ٹیبل لذیذ کھانوں کی ڈشوں سے بھری ہوئی تھی۔ پاپا کو پاکستانی کھانے پسند تھے۔ اس کو چائنیز اور امریکن، دو افراد کے لئے اتنا کھانا بنتا تھا جو برائے نام ہی کھاتے تھے۔ ظاہر ہے نوکروں کے خوب مزے تھے۔ وہ بہت بدتمیز و ہٹ دھرم تھی مگر کھانے پینے کے معاملے میں کبھی بھی اس نے ملازموں کو پریشان نہیں کیا تھا، نہ ہی کسی قسم کی روک ٹوک تھی۔

''آہ..... کیا میں بھوک سے مر جاؤں گی؟ میں مشعل انڈسٹریز کی اکلوتی وارث، اپنے پاپا کی لاڈلی بیٹی، جس کے صدقے میں ہزاروں لوگوں کا پیٹ بھرتا ہے، بھوک سے نجات ملتی ہے، آج وہی بھوک سے مر جائے گی کل نیوز پیپرز میں کتنی انوکھی و سنسنی خیز خبر شائع ہو گی کہ ملک کے مشہور صنعت کار حسن بیگ کی اکلوتی بیٹی بھوک کی تاب نہ لا کر ہلاک ہو گئی۔ اوہ، کیسی حسرت ناک و تعجب خیز موت لکھی ہے میری۔ کیا مرتے وقت میرے پاپا بھی میرے قریب نہ ہوں گے؟ آہ..... پاپا میرے پاس آئیں، میں مر رہی ہوں۔ بھوک سے مر رہی ہوں۔'' آنسو بھر بھر اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔ بھوک سے اسے اپنی جان نکلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ کمرے کی ہر شے گول گول دائروں میں گھوم رہی تھی۔

رات کے نہ معلوم کس پہر دروازہ کھلا تھا اس نے خود میں ہمت نہ پائی تھی اٹھ کر بیٹھنے کی۔ نیم وا آنکھوں سے اسے اس سنگدل کا چہرہ نظر آ رہا تھا جس پر ابھی بھی کرختگی و درشتگی سرخی بن کر چھائی ہوئی تھی۔ اس نے ہاتھ میں پکڑی ٹرے ٹیبل پر رکھی۔ کمرہ اشتہا انگیز خوشبوؤں سے بھر گیا۔ ساتھ اس کے بھوک سے قریب المرگ حواس دوبارہ بیدار ہونے لگے۔ اس کی آنکھیں پوری طرح وا ہو گئیں اور شاہ ویز پر نگاہ پڑتے ہی کل والی تذلیل از سر نو تازہ ہو گئی۔

''میرا خیال ہے پہلی ڈوز نے کافی اثر دکھایا ہے۔'' وہ اس کی بکھری، بگڑی حالت دیکھ کر تمسخر سے گویا ہوا۔ ''آؤ کھانا کھاؤ۔ میرے خیال میں اتنی سزا کافی ہے۔'' شاہ ویز کے لبوں پر کاٹ دار مسکراہٹ تھی۔ آنکھوں میں برتری کی چمک، لہجہ نرم تھا مگر انداز جارحانہ تھے۔ تیور بگڑے ہوئے چہرے کے تاثرات میں بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ مشعل کسی مشعل کی طرح ہی جل اٹھی تھی۔

بھوک بھوک کرتے اعضا کو اس نے تھپک کر سلا دیا اور دل میں فیصلہ کر لیا کہ اس کے کھانے کھانے سے بہتر ہے بھوکے مر جانا، بھلا ایسے کم ظرف و چھچھورے شخص کا کھانا زہر سے بھی بدتر ہے جو مار کھا کر، عزت نفس کو مار کر کھانے کو ملے۔

''آئیں نا میڈم! آپ کی خدمت میں کھانا پیش ہے۔'' وہ آگے بڑھا اور کچھ جھک کر استہزائیہ لہجے میں مخاطب ہوا۔

''نہیں کھانا مجھے تمہارا کھانا..... لے جاؤ یہاں سے۔'' وہ غرائی تھی۔

''آؤ شاباش۔ اچھے بچے ضد نہیں کرتے۔'' اس کا انداز سو فیصدی چڑانے والا تھا۔

''میں کہتی ہوں دفع ہو جاؤ یہاں سے..... ورنہ شوٹ کر دوں گی تمہیں۔''

''مجھے معلوم تھا۔ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔'' یکدم ہی اس کے تیور بدلے تھے۔

''مجھے تمہارے ساتھ نہیں رہنا..... ہرگز نہیں رہنا۔ تم انسان نہیں وحشی درندے ہو۔'' شاہ ویز کے اہانت آمیز سلوک نے اس کے باغی ذہن کو مزید باغی کر دیا تھا۔

''اب جیسا بھی ہوں تمہارا نصیب ہوں، جاہل، اجڈ، گنوار، درندہ، وحشی، فقیر، حقیر، جیسا بھی ہوں تمہیں مجھے بھگتنا ہو گا کیونکہ خواہ نیچا دکھانے کے لئے ہی سہی، خواہ انجوائے منٹ کی خاطر تم نے نکاح نامے پر اپنی مرضی سے سائن کیے تھے اس لئے مجھے برداشت کرنا تمہیں ناگوار نہ گزرے گا۔ اس معاملے میں تو میرے ساتھ زیادتی و زبردستی کی گئی ہے اس کے باوجود میں تمہیں برداشت کر رہا ہوں بلکہ آخری سانس تک بھگتنے کا عہد کر چکا ہوں۔'' اس کا لہجہ از حد پُرسکون ہو چکا تھا۔ وہ اتنے پُرسکون و دھیمے انداز میں بات کر رہا تھا گویا بہت پیار بھری باتیں کر رہا ہو اور اس کے اسی انداز نے مشعل کو بھڑکا ڈالا تھا۔

''جب تمہارے ساتھ تمہاری مرضی و پسند کا خیال نہیں رکھا گیا تو کیوں مجھے بھگت رہے ہو؟ چھوڑ دو۔ اپنی دنیا اپنی پسند سے بساؤ اور مجھے آزاد کر دو۔''

''یہی تو فرق ہے..... یہی تو فرق ہے تمہارے اور میرے اسٹینڈرڈ میں جہاں شوہر بھی لباس کی طرح تبدیل کیے جاتے ہیں، بیویاں سینڈل کی طرح بدل دی جاتی ہیں۔ لیکن ہمارے ہاں ایسی کوئی بے حمیتی کی مثال نہیں ہے۔ دل چاہے نہ چاہے پسند ہو یا ناپسند، فراخ دلی سے رشتہ نبھانا ہی پڑتا ہے۔''

''یوں کہو نا تم لوگ منافقت پسند ہو۔'' وہ پھنکاری۔

''نہیں! ایثار پسند و جرأت مند۔'' دوبدو جواب آیا۔

وہ خالی پیٹ اس سے مزید بحث نہیں کر سکتی تھی۔ خاموش ہو گئی۔ اسے توقع تھی شاہ ویز آئے گا اور اپنے رویے پر معذرت کرے گا، ہاتھ اٹھانے پر شرمندگی کا اظہار کرے گا، معافی مانگے گا، غلطی پر گڑگڑائے گا۔ مگر اسے محسوس ہوا معافی مانگنا، شرمندگی کا اظہار کرنا تو درکنار اس نے سیدھے منہ بات بھی نہ کی تھی بلکہ وہ اسے جلی کٹی سنا کر بری ہو رہا تھا۔ وہ ان مردوں میں سے تھا جو اپنے ہر عمل کو جائز سمجھتے ہیں، اپنے علاوہ کسی کو مقدم نہیں جانتے۔

وہ دوسرے آدمیوں سے مختلف تھا..... بالکل مختلف، بے حس و کٹھور۔

''کھانا کھا رہی ہو یا اپنے ہاتھوں سے کھلاؤں؟ گو کہ یہ کافی ناپسندیدہ عمل ہو گا میرے لئے مگر کیا کروں، بچپن سے کافی رحم دل واقع ہوا ہوں، بھوکی بلیوں کو اپنے حصے کا دودھ پلا دیا کرتا تھا۔ پھر تم تو انسان ہو اور تم بھوک سے مر جاؤ یہ گناہ میں نہیں کر سکتا۔'' وہ ٹیبل پر برتن رکھتے ہوئے اطمینان سے کہہ رہا تھا اور اس کے تیور دیکھ کر مشعل کو یقین کرنے میں دیر نہ لگی کہ وہ سچ مچ اسے زبردستی اپنے ہاتھ سے کھلانے پر آمادہ ہے۔

''کمینہ۔'' وہ دانت پیستی ہوئی آگے بڑھی اور ایک پلیٹ میں بریانی نکال کر کھانے لگی۔ اس کا ارادہ تھا چند لقمے لے کر اٹھ جائے گی مگر کھانا انتہائی لذیذ بنا ہوا تھا یا اس کی بھوک انتہائی درجے کو پہنچی ہوئی تھی۔ ایسی ندیدوں کی طرح کھانے پر ٹوٹی تھی کہ کمرے میں شاہ ویز کی موجودگی بھی فراموش کر بیٹھی تھی۔ کھانے کے بعد پانی پی کر سیدھی ہوئی تو سامنے بیٹھے شاہ ویز کو دیکھ کر اسے احساس ہوا کہ وہ کس طرح کھانے پر ٹوٹی تھی اور بہت جلد ہر پلیٹ صاف کرتی گئی تھی۔ اس کی نگاہوں میں بھی نہ معلوم کیا تھا کہ پہلی بار اسے شرمندگی در شرمندگی کا احساس ہوا اور نگاہیں بے اختیار عارضوں پر جھکتی چلی گئیں۔

زیادہ وقت نہیں گزرا تھا اس بات کو جب اس کی شدید خواہش یہ رہتی تھی کہ وہ اس شخص کی جھکی جھکی گھنی پلکوں کے سائے میں چھپی رہنے والی آنکھوں کو دیکھے اور اس خوش فہمی میں بھی کہ وہ نگاہیں اس کے رعب حسن سے جھکی رہتی ہیں یا وہ اس کے سحر زدہ حُسن سے بچنے کے لئے نگاہوں کو جھکا کر رکھتا ہے۔ مگر اب جب کہ وہ اس کے ساتھ ازدواجی بندھن میں بندھ چکی تھی تو وہ بڑے استحقاق بھرے انداز میں وہ نگاہیں اس کی جانب اٹھتی تھیں جو بڑے سے بڑے جارمنگ شخص کو نگاہوں اداؤں کی مار سے گھائل کر دیا کرتی تھیں۔ نہ معلوم کیوں شاہ ویز جیسے عام سے بندے کو شکست نہ دے پائی تھی۔ شاید اس لئے کہ وہ بے حد عام سا نظر آنے والا بندہ عام شخص نہ تھا۔ اس کی سرخی مائل گندمی رنگت والے نقوش بہت جاذب نظر تھے۔ اس کے چہرے کی وجاہت کو اس کی سنجیدگی و متانت نے مزید بڑھا دیا تھا۔ اس کے متناسب دراز قد میں عجیب کشش و وقار تھا اور آنکھوں میں بلا کی ذہانت و خود اعتمادی کے علاوہ ایسی سحر انگیز چمک تھی کہ جو مقابل کی جانب اٹھتی تو اسے اپنے سحر میں جکڑ لیتی تھی۔

ابھی بھی ایسا ہی کچھ ہوا تھا جو اس نے بے ساختہ نگاہیں جھکائی تھیں۔ شاہ ویز نے اس کی جھینپ بھری شرمندگی کو پوری طرح محسوس کیا تھا اور اپنے بھوک پر لیکچر دینے کے پروگرام کو ملتوی کر دیا تھا۔ اس کے خیال میں جو پہلے سے شرمندگی کے بحر میں غوطہ زن ہو مزید اسے ڈبونا ذلالت تھی۔

مشعل کو ندیدوں کی طرح کھانے پر ٹوٹتے دیکھ کر لمحے بھر کو تو اس کے ضمیر نے اسے کچوکے لگائے تھے اور اسے اس طرح بھوکے رکھنے پر خود کو ظالم تصور کیا تھا مگر پھر مشعل کی بدتمیزی و زبان درازی کے مناظر یاد آئے تو اسے اپنا فیصلہ بالکل درست و حق بجانب لگا۔ خود بخود ہی نگاہوں میں تفاخر و تمسخر چھلکنے لگا تھا۔

''میرے خیال میں تمہاری عقل ٹھکانے پر آ چکی ہو گی۔'' اس نے کافی دیر بعد کمرے کی خاموشی توڑتے ہوئے گفتگو کا آغاز خاصے اطمینان بھرے انداز میں کیا۔

''مطلب؟'' اس کی غراہٹ نما آواز ہونٹوں سے خارج ہوئی تھی۔

''مطلب یہ مسز شاہ ویز! کہ کل صبح سے آپ اس گھر کی بہو کے فرائض سنبھالیں گی۔ صبح کا بریک فاسٹ، دوپہر کا لنچ، شام کی چائے، رات کے ڈنر کی تیاریاں اب آپ کی ذمے داری ہوں گی۔ بے جی نے اپنے فرائض کی بہت ادائیگی کر دی۔ اب کل سے تم اپنی ڈیوٹی سنبھالو گی اور مجھے بار بار اپنی بات دہرانے کی عادت نہیں ہے سمجھیں۔'' جملے کی آخری ادائیگی میں اس کے لہجے میں سختی در آئی تھی۔ مشعل نے پہلے چند لمحے اس کی جانب گھور کر دیکھا مگر اس کی نگاہیں اٹھتی دیکھ کر یکلخت ہی رخ موڑ کر کھڑی ہو کر تنفر سے گویا ہوئی۔

''ہونہہ..... پہلے بیوی کے فرائض کی ادائیگی کے قابل تو ہو، پھر بہو کی بات کرنا۔'' اس کے لہجے میں ایسی کاری ضرب تھی کہ شاہ ویز کی انا و حمیت جھنجھنا اٹھی تھی۔ آن واحد

میں اس نے آگے بڑھ کر اس کی کلائی پکڑ لی تھی۔ وہ جو اپنی جگہ اکڑ کر کھڑی تھی اس کے اچانک کلائی دبوچنے سے سنبھل نہ سکی اور کسی ٹوٹی شہتیر کی طرح اس کے سینے سے آ لگی۔ کمرے کی فضا ایک دم ساکت ہوگئی۔ وقت کی تال رک گئی۔ ہر شے منجمد ہوگئی۔ مشعل اس کے آہنی سینے سے لگی کھڑی تھی۔ اس کے نزدیک، اتنی نزدیک کہ اس کے آہنی سینے کے اندر دھڑکتے دل کی دھڑکنیں با آسانی شمار کرسکتی تھی جو بالکل نارمل تھیں۔ جب کہ خلاف معمول اس کی دھڑکنیں اتنی منتشر اور بے قابو بے ہنگم انداز میں تھیں کہ لگتا تھا کسی بھی لمحے دل سینہ توڑ کر باہر نکل پڑے گا۔ اس کے مضبوط ہاتھوں میں ایسی تپش تھی جس سے اسے اپنا جسم سن ہوتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ عجیب سی سنسناہٹ رگ و پے میں سرایت کرگئی تھی کہ وہ کوشش کے باوجود اس کی گرفت سے خود کو نہ نکال سکی۔

''مرد کو جب مردانگی کے طعنے ملیں تو اسے وحشی بننے سے کوئی نہیں روک سکتا اور وحشی انسانیت و اخلاقیات سے بالکل بے بہرہ ہوتے ہیں محترمہ! اور جب اخلاقیات کے تقاضوں پر حیوانی تقاضے غالب آجائیں تو کچھ باقی نہیں بچتا۔ شرافت، لحاظ، مروت، حیا سب احساسات مفقود ہو جاتے ہیں اور میں چاہتا ہوں ہمارے درمیان حجاب و احترام کا پردہ گرا رہے تو بہتر ہے۔'' وہ اسے بازوؤں کے حصار میں لئے ہوئے اس کے رنگ بدلتے چہرے پر نگاہیں گاڑے آہستہ آہستہ گمبھیر لہجے میں ایک ایک لفظ کہہ رہا تھا۔ وہ بے جان انداز میں نگاہیں جھکائے سن رہی تھی۔

''میں نے پہلے بھی کہا تھا اور اب بھی کہہ رہا ہوں خود کو اس قابل بناؤ کہ تمہیں بیوی کے درجے پر فائز کیا جائے۔'' اس نے آہستگی سے اسے خود سے دور کیا تھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

□●□

''پڑ گئی ٹھنڈک...... سکون مل گیا؟''

بے جی جو ابھی نماز سے فارغ ہو کر کمرے سے نکلی تھیں، سامنے کڑے تیوروں سے کھڑی مشعل کو دیکھ کر رک گئیں۔ مشعل نے غصے سے انہیں مخاطب کیا تھا۔

''یہ...... کیا کہہ رہی ہو بیٹی...... میں سمجھی نہیں؟'' وہ پریشانی سے گویا ہوئیں۔

''ہونہہ...... میرے سامنے معصوم بننے کی اداکاری کی ضرورت نہیں ہے۔ خوب جانتی ہوں تمہاری ان چالاکیوں کو۔ تم جیسی مڈل کلاس عورتوں کے بارے میں سنا تھا کہ کس طرح بیٹوں کو سکھا کر ان کی بیویوں کے خلاف کرتی ہیں۔ اپنی حکمرانی کی خاطر دوسروں کی زندگیوں میں آگ لگا کر رکھتی ہیں۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ میرے مقدر میں بھی ایسی ہی کوئی چالاک عورت لکھی ہوگی۔''

''بہو! پہیلیوں میں بات مت کرو۔ جو کہنا ہے صاف کہو۔'' بے جی بڑے تحمل و بردباری سے اس کی بکواس کے دوران کھڑکیاں بند کرتے ہوئے نرمی سے گویا ہوئیں۔

''میری بات بالکل صاف ہے...... تم جان بوجھ کر انجان بن رہی ہو اولڈ وومن۔''

''میرے خیال میں تم کو میرا اعتبار، میری کسی بات پر یقین نہیں آئے گا اور میں ایسا ارادہ رکھتی بھی نہیں کیونکہ میں اپنے قول و عمل کی اپنے اللہ کے آگے جواب دہ ہوں اور بے شک وہ نیتوں کو درست پہچانتا ہے۔'' بے جی سادہ مگر مضبوط لہجے میں اس سے مخاطب ہوئی تھیں۔

''مجھ کو باہر جانے سے کوئی بھی نہیں روک سکتا، کسی کے باپ میں ہمت نہیں ہے کہ مجھے میری مرضی کے خلاف کوئی فیصلہ کرنے سے روکے۔'' بے جی کو پرسکون انداز میں بات کرتے دیکھ کر وہ بری طرح سلگ اٹھی تھی۔ اس کا خیال تھا وہ ان سے بدتمیزی سے بولے گی، چیخے چلائے گی تو وہ بھی جواباً اس سے منہ زوری کریں گی اور اسی بات کو بڑھا کر وہ شاہ ویز کی برتری کو زیر کرے گی۔ اسے بے جی پر بہت ناز ہے۔ مگر یہاں تو انہوں نے نرم مزاجی سے اس کی پلاننگ خراب کر ڈالی تھی۔

''میں نے تمہیں پہلے دن سمجھایا تھا کہ شاہ ویز کی اجازت سے قدم باہر نکالنا مگر تم نہیں مانیں، کوئی پروا نہیں کی۔ میں نے ہر طریقے سے تمہارے اس طرز عمل کو شاہ ویز سے چھپائے رکھنے کی کوشش کی تھی مگر ایسے طرز عمل چھپائے نہیں چھپتے ہیں۔ بالآخر پرسوں رات وہ سب ہوگیا جو میں کروانا نہیں چاہتی تھی۔ بہو! یہ بات ایسے سمجھ لو یا غیرت مرد کتنا بھی پڑھ لکھ جائے، کسی بھی بڑے عہدے پر پہنچ جائے اندر سے وہ وہی روایتی مرد رہتا ہے۔ عورت کو اپنی ملکیت سمجھنے والا، جاہل و تنگ نظر، محض شک کی بنا پر قتل کر ڈالنے والا۔''

''ہونہہ...... میں ایسے مردوں کی جاہلیت و تنگ نظری اچھی طرح درست کرنا جانتی ہوں۔'' وہ منہ ٹیڑھا کر کے نخوت سے گویا ہوئی۔ بے جی کے اخلاق و نرم مزاجی نے ذرا بھی اس پر اثر نہ کیا تھا۔ بے جی بھی اس کے مزاج کو اچھی طرح سمجھنے لگی تھیں کہ وہ صرف اپنی بات اور مرضی کو اہمیت دینا جانتی ہے کسی اور کی کوئی اہمیت و وقعت اس کے نزدیک نہیں ہے۔ سو اس کا حل انہوں نے یہی نکالا کہ اکثر اس کی باتوں کو نظر انداز کرنے لگیں۔

اس وقت بھی اسے بحث کے موڈ میں دیکھ کر وہ خاموشی سے آگے بڑھ گئیں۔

نامعلوم شاہ ویز کے تھپڑوں کا اثر تھا یا اس کے خطرناک تیوروں کا خوف کہ وہ پھر دوبارہ گھر سے باہر قدم نکالنے کی جرأت نہ کرسکی مگر اس کی ضد و ہٹ دھرمی اپنی جگہ قائم تھی۔ اپنے بیڈ روم سے باہر نکلنا اس نے بالکل چھوڑ دیا تھا۔ سارا وقت ٹیلی ویژن دیکھنے اور سونے میں گزارتی تھی گھر کے کام سے اور بے جی سے اسے کوئی سروکار نہ تھا۔ شاہ ویز کو چڑانے کے لئے ناشتہ کھانا سب کمرے میں ہی کرتی تھی۔ اس دوران بے جی نے ہی شاہ ویز کو قابو کیا ہوا تھا ورنہ وہ تو بری طرح تپا ہوا تھا کہ اس کے اتنے سمجھانے کے باوجود اس کے طور طریقوں میں معمولی سا بھی فرق نہیں آیا تھا۔

بے جی نے مشکلوں سے اسے کچھ بھی کہنے سے روکا ہوا تھا اور بے جی کی کوئی بات وہ کسی طرح بھی نہیں رد کرسکتا تھا۔ نتیجتاً اس نے اس سے بالکل بات کرنا چھوڑ دی تھی۔ کمرے میں صرف سونے کے وقت جاتا تھا۔

□●□

''ارے واہ، آج تو ہمارے بھاگ جاگ گئے۔ آپا جان، کیسے وقت مل گیا...... ہم غریبوں کی یاد کیسے آگئی؟'' کافی دنوں بعد بے جی کو اپنے گھر پر آتے دیکھ کر زرینہ خوشی سے چہک کر گویا ہوئیں۔

''میں بھولی ہی کب تھی، اپنوں کی یاد سے دل کا گلشن ہمیشہ ہی مہکتا رہتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ وقت کے ظالم شکنجے میں جکڑ کر ملنے کے مواقع کم ملتے ہیں۔ مگر اپنوں کو فراموش نہیں کیا جاتا۔'' وہ حسب معمول اپنے نرم و مشفق لہجے میں کہتی ہوئی ان کے ساتھ پلنگ پر بیٹھ گئیں۔

''آپا! آج تو رک جاؤ، تم سے تم سے بہت سی باتیں کرنے کو دل چاہ رہا ہے۔''

''سارا دن بہت ہوتا ہے باتوں کے لئے...... تم جانتی ہو میں رک نہیں سکتی۔ شاہ ویز کو میرے بغیر رہنے کی عادت کہاں ہے۔''

''اوہو...... کیا کہہ رہی ہو آپا! خیر سے شاہ ویز شادی شدہ ہوچکا ہے۔ آج بیوی والا ہے کل بچے کا باپ بھی بن جائے گا اور تم اسی طرح اسے بچے کی طرح پلو پکڑا کر رکھو گی۔ چھوڑ دو بھی ان باتوں کو، آخر کب اس کی بیوی کو ذمے داریاں سونپو گی۔ میں سب سمجھتی ہوں، تم نہ بتاؤ تو اس کا یہ مطلب تھوڑی ہے کہ میں بالکل ہی بے خبر رہوں۔''

زرینہ اکثر ان سے ملنے گھر جاتی رہتی تھی۔ شروع شروع میں بے جی نے ممکن حد تک مشعل کے طور طریقے ان سے مخفی رکھے تھے مگر جب تک وہ مزید چھپا سکتی تھیں۔ پھر زرینہ ایک حاضر دماغ، چالاک اور گہری نگاہ رکھنے والی تیز و طرار عورت تھیں۔ بھلا ان کی زیرک نگاہی سے کس طرح یہ طور و اطوار چھپ سکتے تھے۔ رفتہ رفتہ بے جی کے کچھ نہ بتانے کے باوجود وہ باخبر ہوگئی تھیں۔

''تم سے بھلا میں کیا چھپاؤں گی۔ تم فضول سوچوں کو دل میں جگہ نہ دیا کرو۔''

''رہنے دو آپا، بہن بھی کہتی ہو اور سلوک غیروں والا کرتی ہو۔ حالانکہ میں تو رتی رتی بات جب تک تم کو نہ بتا دوں مجھے قرار نہیں ملتا۔ ہر دوسرے تیسرے دن بھاگی بھاگی پہنچ جاتی ہوں دل کا بوجھ ہلکا کرنے تمہارے پاس اور ایک تم ہو پوچھنے پر بھی نہیں بتاتی ہو۔ ارے اپنوں سے دل کی بات کہنا کوئی گناہ تھوڑی ہوتا ہے اور مانو تو دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔'' زرینہ کو عادت تھی ہمارے معاشرے کی ان نوے فیصد عورتوں کی طرح جو دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے بہانے یا غم غلط کرنے کی نیت سے معمولی و ناقابل توجہ بات کو بڑھا چڑھا کر دوسروں تک پہنچاتی ہیں اور یہی چھوٹی چھوٹی باتیں ان کے گھروں کو برباد کرتی ہیں اور ذہنی سکون کو تباہ اور ساتھ ہی غیبت کرکے اپنے نامۂ اعمال کو سیاہ کرتی ہیں۔

جب کہ بے جی ان دس فیصد عورتوں میں سے تھیں جو اعلیٰ ظرف و بلند اخلاق کی بدولت لوگوں کی بڑی سے بڑی خطا، زیادتی و دل شکنی کو درگزر کرنے، معاف کرنے کا حوصلہ رکھتی ہیں۔ جو بڑے لوگوں کی برائیوں کو بھی ان کی چند اچھائیوں کے تناسب سے دیکھتی ہیں اور ہمیشہ اچھا اور بہترین کرنے کی سعی میں مگن رہتی ہیں۔ شاید ایسے لوگوں کی وجہ سے ہی رشتے استوار رہتے ہیں۔ شمع کی طرح خود کو جلا کر روشنی دینا ہی تو انسانیت کی معراج ہے۔

''کیا بتاؤں تمہیں؟ سب اپنی آنکھوں سے دیکھ کر تو آئی ہو۔'' وہ مسکرائیں۔

''ہاں...... بس اللہ میری آنکھیں سلامت رکھے۔'' وہ جل بھن ہی تو گئیں۔

''آمین، گھر میں خاموشی ہے۔ بہو گھر میں نہیں ہے کیا؟'' انہوں نے گھر پر طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ عام دنوں سے نسبتاً آج گھر چم چم کر رہا تھا۔

جس چارپائی پر وہ بیٹھی تھیں اس پر دھلی ہوئی پرنٹڈ چادر بچھی تھی، ساتھ ہم رنگ گاؤ تکیے رکھے تھے جن سے وہ ٹیک لگائے بیٹھی ہوئی تھی۔ سامنے آنگن کا سرمئی فرش چمک رہا تھا۔ دیوار کے سائیڈ میں رکھے گملوں میں گلاب، موتیا، صدا بہار کے پھول مہک رہے تھے۔ سائیڈ میں معمولی سی کھدائی کرکے توری کی بیل لگائی گئی تھی جو ایک ستون کے سہارے چڑھ رہی تھی اور اس میں ہرے پتوں کے درمیان پیلے پیلے پھول بہار دکھا رہے تھے۔ تار پر رنگ برنگے کپڑے سوکھ رہے تھے۔ کچن کا دروازہ بند تھا مگر لگ رہا تھا اس کی جالیوں کو خوب رگڑ رگڑ کر دھویا گیا ہے مگر اس سے قبل وہاں میل کی تہہ دور سے نظر آتی تھی۔

''گئی ہوئی ہے میکے ایک ہفتے سے...... جبھی تو گھر میں اتنا امن و سکون نظر آرہا ہے۔'' وہ اٹھتے ہوئے گویا ہوئیں۔ ان کے انکار کے باوجود لیموں کی سکنجبین بنا کر لے آئی تھیں۔

''لو آپا! مجھے معلوم ہے تمہیں بہت پسند ہے یہ۔'' وہ لبالب بھرا گلاس ان کی طرف بڑھا کر گویا ہوئیں۔ دوسرا گلاس خود پکڑ کر بیٹھ گئیں۔

''عجیب ہی دور چل پڑا ہے آپا! بچے تو ہم نے بھی پیدا کئے ...... ہر طرح کی مصیبتیں و تکالیف برداشت کیں مگر مجال ہے کبھی حکیم ڈاکٹروں کی شکل بھی دیکھی ہو۔ ہر درد، ہر مشکل اپنی جان پر جھیل کر کبھی اُف تک نہ کی۔ مگر یہ دور یہ وقت ...... توبہ توبہ، بے غیرتی و بے حیائی کی بدترین مثال ہے۔'' ان کے لہجے میں حقیقتاً دکھ تھا۔ چہرے سے شدید ناپسندیدگی عیاں تھی۔

''بہو امید سے ہے ...... ابھی ابتدائی دن ہی چل رہے ہیں مگر ڈاکٹروں کے چکر تو یہ بھلی! نا معلوم کون کون سے ٹیسٹ ہو رہے ہیں، کون کون سے ایکسرے اتارے جا رہے ہیں اور دوائیں الامان، لگتا ہے کمرے میں پورا میڈیکل سٹور کھل گیا ہے۔ مزید افسوس تو یہ ہے کہ اتنا روپیہ بہانے کے باوجود بہو بیگم کو آرام نہیں ہے، وہ مطمئن ہی نہیں۔'' وہ گھونٹ گھونٹ شربت پیتے ہوئے اپنے من پسند موضوع پر شروع ہو چکی تھیں۔

''بات دراصل یہ ہے زرینہ! تمہارا ہمارا وقت بہت اچھا تھا۔ خالص ہوا، خالص فضا، خالص غذا ہمیں میسر تھی۔ اس لئے ہمیں دواؤں سے نجات ملی ہوئی تھی اور جو چھوٹی موٹی بیماریاں ہوتی بھی تھیں تو وہ گھریلو ٹوٹکے استعمال کرنے سے رفع ہو جایا کرتی تھیں۔ اب نہ وہ دور رہا اور نہ صاف ستھری آب و ہوا، اب ہر جگہ آلودگیاں پھیل گئی ہیں جن سے نہ آب و ہوا محفوظ رہے ہیں اور نہ ماحول ہی محفوظ رہا ہے۔ اس وجہ سے نئی نئی بیماریاں بھی تیزی سے پھیل رہی ہیں اور حفاظتی طور پر حاملہ خواتین کو ایسے مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے تاکہ آنے والی نسل صحت مند پیدا ہو۔'' بے جی نے گلاس خالی کر کے تدبر سے انہیں سمجھایا۔

''آپا کبھی تو میری طرف داری بھی کر لیا کرو ...... ہمیشہ بہو کی حمایت لیتی ہو۔ تم میری بہن ہو یا اس کی؟'' حسب عادت وہ بری طرح جھلا اٹھی تھیں۔

''میری طبیعت تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں کبھی بھی حق و صداقت کا ساتھ نہیں چھوڑوں گی۔ غلط کو غلط کہنا ہی تو ایمانداری ہے۔ پھر میں کیوں تمہاری ہاں میں ہاں ملاؤں، تمہاری بہن ہوں کوئی دشمن نہیں ہوں جو تمہیں برائی کی طرف دھکیلوں گی۔ کتنی بار سمجھایا ہے کہ دانشمندی یہی ہے کہ وقت کے ساتھ اپنے آپ کو بھی بدلو۔'' انہوں نے رسانیت سے سمجھایا۔

''آپا! انسان، انسان ہوتا ہے کوئی کپڑے نہیں جو گرم سرد برسات کے لحاظ سے بدلے جائیں۔'' ان کی اپنی ہی منطق تھی۔ روٹھے انداز میں گویا ہوئیں۔

''انسان ہر خوبیوں سے مالا مال ہے۔ جو کرنے کی ٹھان لے اپنی قوت ارادی و استقامت سے کر سکتا ہے۔ خیر چھوڑو اس ذکر کو۔ کبھی تنہائی میں میری باتوں کو سوچنا۔''

''لو، میرا ابھی دماغ خراب ہو گیا ہے۔ یہ تو بتانا ہی بھول گئی کہ سائرہ آئی ہوئی ہے۔'' وہ دھیرے سے پیشانی پر ہاتھ مارتے ہوئے بولیں۔

''کب آئی ہے ...... کہاں ہے؟'' انہوں نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پُرمسرت لہجے میں کہا۔

''پرسوں آئی تھی، برابر والوں کے ہاں قرآن خوانی میں گئی ہے ...... اب آتی ہی ہوگی۔''

''سائرہ پرسوں آئی ہے اور تم نے مجھے خبر بھی نہیں کی۔''

''میں تو کروا رہی تھی مگر سائرہ نے ہی منع کر دیا کہ اچانک جا کر خالہ کو زیادہ خوش کروں گی۔ اس لئے میں بھی خاموش ہو گئی۔'' انہوں نے جھٹ صفائی دی۔

''سب خیریت سے تو ہیں نا اس کے سسرال میں ...... اور باقر میاں کا کیا حال ہے؟''

''وہی بدحال ہے، باقر کمبخت اور اس کے گھر والے لعنتی۔ نہ معلوم کب یہ زمین ان کے وجود سے پاک ہو گی۔'' ان کی زبان ایک بار پھر رواں دواں تھی۔

''توبہ زرینہ! کسی کو تو بخش دیا کرو ...... ہر ایک کے لئے دو دھاری تلوار بنی رہتی ہو۔'' بے جی چھوٹی بہن کی بدگوئی سے ازحد نالاں تھیں۔

''ہاں، ہاں ...... مجھ جیسی عورتوں کی زبان تو سب دیکھ لیتے ہیں مگر دل پر لگے زخم کسی کو نظر نہیں آتے۔ آگ لگتی ہے تو دھواں اٹھے گا ہی۔''

''کوئی بات ہو گئی ہے؟'' زرینہ کی آنکھوں میں چمکتے آنسو دیکھ کر بے جی پریشانی سے بولیں۔

''باقر کو کاروبار میں گھاٹا ہو گیا ہے اور اس نے گھاٹا پورا کرنے کے لئے سائرہ کو یہاں پانچ لاکھ روپے لینے بھیجا ہے۔''

''پانچ لاکھ کوئی معمولی رقم نہیں ہوتی۔ پھر نقصان ہوا ہے تو بیوی کے میکے سے رقم منگوانا کوئی شرافت والی بات نہیں ہے۔''

''اب بھی کوئی نہ کہے۔ اگر کہو تو بیٹی کو ساری زندگی چھاتی پر بٹھا لو ورنہ خاموشی سے مطالبات پورے کئے جاؤ اور پورے کئے بھی۔ مگر ہر بات کی ایک حد ہوتی ہے۔ چور، ڈاکو بھی اپنا کوئی اصول بناتے ہیں لیکن بھائی باقر میاں کا تو کوئی اصول ہی نہیں ہے۔ جب کوئی نقصان ہوا بیوی کو اٹھایا، میکے بھیج دیا۔ جب کوئی ضرورت پڑی اندھے کی لاٹھی کی طرح بیوی کا استعمال کیا۔ میں تنگ آ گئی ہوں آپا۔ مجھ میں اب بالکل تاب نہیں ہے اور نہ ہی کوئی زیور ایسا بچا ہے جس کو فروخت کر کے باقر کی فرمائشیں پوری کروں۔'' دکھ، غصہ، جھنجلاہٹ، پریشانی، آزردگی کیا کچھ نہ تھا ان کے بھیگے لہجے میں۔

''اس سے دو بدو بات کرو، سمجھاؤ کہ شریف لوگوں کا یہ شیوہ نہیں ہوتا، ہاتھ پھیلانے والوں کی نگاہیں اور گردن ہمیشہ نیچی رہتی ہیں۔''

''وہ اتنا شریف اور خاندانی ہوتا تو ایسی حرکتیں کرتا ہی کیوں ...... اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ سائرہ کے بانجھ پن سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔ ذرا بھی کچھ کہو تو یہی دھمکی ملتی ہے کہ وہ دوسری شادی کر کے سائرہ کو طلاق دے کر ہمیشہ کے لئے چھوڑ دے گا۔''

''اوہ، اتنا کم ظرف و گھٹیا شخص ہے وہ۔ اولاد دینا یا نہ دینا اللہ کے اختیار میں ہے۔ اور جو اللہ کے کاموں میں دخل دیتے ہیں بہت عبرتناک انجام ہوتا ہے ان کا۔ پھر کون سی سائرہ بوڑھی ہو گئی یا شادی کو ہزاروں سال بیت گئے۔ پانچ سال تو ہوئے ہیں۔ اس کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔ وہ خوب نوازنے والا ہے۔'' بے جی نے انہیں تسلی دی۔ آنسو خشک کئے۔ پانی پلایا۔

کچھ دیر بعد ہی سائرہ پڑوس سے واپس آ گئی اور بے جی کو دیکھ کر بے ساختہ ان سے لپٹ گئی۔ انہوں نے بھی ازحد محبت سے اسے اپنی آغوش میں لیا تھا۔

''کب آئیں خالہ جان آپ؟'' وہ ان سے علیحدہ ہو کر گویا ہوئی۔

''کافی دیر ہو گئی ہے ...... تم سناؤ کیسی ہو؟ باقر میاں کیسے ہیں؟''

''باقر ٹھیک ہیں اور میں آپ کے سامنے ہوں۔'' وہ دھیرے سے ہنسی تھی۔ ''شاہ ویز کی شادی کی مبارکباد قبول کریں، اماں نے بتایا ہے کہ افراتفری میں اچانک شادی ہوئی ہے اس لئے معاف کیا ورنہ آپ پر جرمانہ لگاتے اس طرح بہنوں کو بغیر بلائے بھائی کی شادی کرنے کا۔''

''ارے رہنے دو شادی، بس منہ نہ کھلواؤ میرا۔'' زرینہ اٹھتے ہوئے بڑبڑائی تھیں۔ بے جی نے کچھ کہنے کے لئے ہونٹ وا کئے، پھر بند کر لئے تھے۔ جب کہ زرینہ جو کسی کام کے ارادے سے اٹھ کھڑی ہوئی تھیں دھپ سے دوبارہ براجمان ہو کر گویا ہوئیں۔

''شادی کے بعد تو میں نے مردوں کو خمیر لگے آٹے کی طرح پھولتے دیکھا ہے۔ خوشی و راحت کا احساس ان کے انگ انگ سے ظاہر ہوتا ہے۔ شادی کے پانچ بلکہ چھ ماہ بعد بھی شاہ ویز بیٹا بالکل نہیں بدلا، وہی سنجیدگی و خاموشی اس کی ذات میں رچی بسی ہے۔ بلکہ پہلے سے کمزور ہو گیا ہے۔ ابھی تک میں نے اس کے چہرے پر آسودگی نہیں دیکھی۔''

''اماں اب باتیں ہی کرتی رہیں گی یا کچھ خالہ جان کی خاطر مدارت کا بھی انتظام کریں گی؟'' سائرہ نے بے جی کے چہرے پر پھیلتے تکلیف دہ رنگ محسوس کئے تو ماں کو ٹوکا تھا۔

''میں مہمان تھوڑی ہوں بیٹی! جو پکا ہے وہی کھا لوں گی، گھر کی سدھری ہوئی حالت دیکھ کر ہی میں نے محسوس کر لیا تھا کہ میری بیٹیوں میں سے ہی کوئی آئی ہوئی ہے۔'' انہوں نے شفقت سے سائرہ کے سر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''ہماری بہو بیگم میں ایسی سلیقہ مندی و پھرتی کہاں ہے۔ دو سال میں ہی گھر سڑا کر رکھ دیا تھا اس نے اور کہنے پہ ان کی زبان درازی سے کون جیت سکتا ہے بھلا؟''

''اماں! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ برائیاں کر کے کیوں تھکتی نہیں ہیں؟'' سائرہ زچ ہو کر گویا ہوئی۔ اس کے اس انداز نے ان کے پتنگے لگا دیئے تھے۔

□●□

تم اپنے آپ کو کب تک چھپاؤ گے خود سے
بکھر گئے تو سمیٹے نہ جاؤ گے خود سے
بڑے جتن سے گھروندے بنا رہے ہو تم
وہ وقت آئے گا بس کر گراؤ گے خود سے

''سر! ایک میڈم ملنے آئی ہیں آپ سے۔'' وہ راکنگ چیئر سے سر ٹکائے اپنی خیالی دنیا میں غلطاں تھا جب پیون نے اندر آ کر اطلاع دی تو وہ چونک کر سیدھا ہو بیٹھا۔

''کون ہیں؟''

''معلوم نہیں سر! پہلی دفعہ دیکھا ہے۔ انہوں نے آپ کا نام لے کر کہا کہ وہ آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔'' پیون نے مؤدب لہجے میں جواب دیا۔

''بھیجو اندر ......'' اس کی یادداشت میں کوئی ایسی خاتون نہیں تھیں جو اس سے ملنے کے لئے آفس پہنچ جائیں۔ ساری زندگی صرف دو عورتوں سے اس کے تعلقات رہے تھے جن میں اول بے جی، دوئم زرینہ خالہ کی ذات تھی اور اسے یقین تھا ان دونوں میں سے کوئی یہاں نہیں آ سکتی ہے۔ وہ اسی کشمکش و پیچ میں مبتلا تھا کہ لائٹ پرپل سادہ ساڑھی میں ملبوس اندر داخل ہوتی فرح رضوی کو دیکھ کر وہ احتراماً کھڑا ہو گیا۔

''حیران ہو گئے نا؟ آپ سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ میں یہاں پہنچ جاؤں گی۔''

''شیور، سرپرائز ہے میرے لئے ...... آپ بیٹھیں پلیز۔'' ان کے خلوص بھرے شوخ لہجے نے اس کے لبوں پر مسکراہٹ بکھیر دی تھی۔

''آپ تو ایسا رخ بدل کر نکلے تھے کہ دوبارہ حال پوچھنے بھی نہیں آئے۔'' انہوں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے شکوہ کیا۔

''سوری، دراصل کچھ مصروفیات ایسی رہیں کہ میرے ذہن سے محو ہو گیا سب۔''

''ہاں، میں سمجھ سکتی ہوں۔ اس مصروف ترین دور میں کہاں فرصت مل سکتی ہے ...... لیکن وقت نکالا جائے تو نکل آتا ہے۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے جیسے ہم وقت کے قیدی بن کر

رہ گئے ہوں۔ اپنی مرضی، اپنا اختیار سب کہیں کھو کر رہ گیا ہے۔''
''جی آپ کیا لیں گی...... ٹھنڈا یا گرم؟''
''کچھ نہیں، صرف آپ سے ملنا تھا۔'' انہوں نے انکساری سے کہا۔
''بتائیں میں کیا خدمت کر سکتا ہوں آپ کی؟'' انٹرکام پر کافی کا آرڈر دینے کے بعد وہ ان سے مخاطب ہوا۔ بہت خاموشی سے وہ ان کی کیفیت نوٹ کر رہا تھا۔ ان کی ہر جنبش بتا رہی تھی وہ اس سے یوں ہی ملنے نہیں آئی ہیں۔ ان کی آمد کے پیچھے ضرور کوئی مقصد ہے جسے بتاتے ہوئے وہ ہچکچاہٹ کا شکار ہیں۔ انہیں حوصلہ دینے کے لئے ہی وہ خود مخاطب ہوا تھا۔
''خدمت نہیں ضرورت کہیں بیٹا!'' وہ سنجیدگی سے گویا ہوئیں۔
''جو آپ مناسب سمجھیں۔''
''ایک عرصہ ہوا مجھے لوگوں پر اعتماد کرنا چھوڑے ہوئے۔ سنا ہے سانپ سے ڈسا ہوا رسّی سے بھی خوفزدہ رہتا ہے، یہی حال میرا بھی ہے۔ خیر مزید کیا بتاؤں، وقت کا چلن جو ہے اس سے سب ہی واقف ہیں۔ جب انسان پر برا وقت پڑتا ہے تو سب غیر ہو جاتے ہیں اور یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔'' وہ دھیمے لہجے میں کہتی ہوئی گویا خود سے مخاطب تھیں۔ گہرے رنج و تاسف کی سرخی ان کے پُروقار چہرے پر پھیل گئی تھی۔ شاہ ویز خاموش بیٹھا ان کے بولنے کا منتظر تھا۔ وہ چند لمحے خاموش رہی تھیں پھر آنکھوں میں اترتی نمی کو پلکیں جھپک جھپک کر زائل کرتے ہوئے نرم مسکراہٹ سے گویا ہوئیں۔
''نامعلوم کیوں بعض دفعہ مجھ پر اسی طرح پاگل پن کا دورہ پڑ جاتا ہے اور میں فضول بولنے لگتی ہوں۔ میں یہ کہنے آئی تھی، میرے پاس خاصی رقم ہے اور میں چاہتی ہوں اسے بزنس میں لگا دوں۔''
''کون سا بزنس کرنا چاہتی ہیں آپ؟''
پیون کافی لے آیا تھا اور دونوں کو سرو کر کے جا چکا تھا۔ فرح رضوی خاصی پُرجوش دکھائی دے رہی تھیں۔
''میں خود کوئی بزنس کرنا نہیں چاہتی بلکہ چاہتی ہوں کہ کسی کے بزنس میں روپیہ لگا کر منافع حاصل کرتی رہوں۔''
''ہوں...... منافع کمانے کے تو اور بہت سے ذریعے ہیں۔ پھر آپ نے بزنس کو ہی کیوں سلیکٹ کیا؟ میرے خیال میں ایک دفعہ کی حادثاتی ملاقات میں کوئی کسی کو اچھی طرح پرکھ نہیں سکتا۔ آئی مین اعتماد نہیں کر سکتا۔'' اس کے لہجے میں خود اعتمادی تھی۔
''درست کہہ رہے ہو بیٹا! میں نے پہلے ہر ممکن کوشش کی اور دھوکا کھایا اور یہاں مشعل انڈسٹریز میں قدم رکھنے سے قبل میں نے بہت چھان بین کی ہے، ہر طریقے سے، ہر طرح سے تسلی کرنے کے بعد میں یہاں داخل ہوئی ہوں۔ حسن بیگ صاحب کی تو ایک دنیا معترف ہے اور پھر وہ تو اپنے حسن اخلاق سے پہلے ہی گرویدہ بنا چکے ہیں۔ مکمل بھروسے اور پورے اعتماد کے ساتھ میں آپ کے بزنس میں روپیہ لگانے کو تیار ہوں۔''
''آپ اتنی جلد بازی میں فیصلہ مت کریں۔ پہلے ایک ہفتہ آپ خوب سوچ سمجھ لیں۔'' فرم کی جو حالت تھی وہ سب سے چھپی ہوئی تھی ایسے میں ان کی طرف سے شراکت داری کی آفر خاصی پُرکشش تھی مگر ایسے میں کچھ عرصہ بہت صبر و ضبط سے کام لینے کا تھا۔ کسی بھی طرح وہ فوری رقم کی ادائیگی نہ کر سکتا تھا جس کی یقیناً وہ ڈیمانڈ کرتیں کہ وہ تو بیگ صاحب کی ایمانداری و بزنس کی شہرت سن کر آئی تھیں۔ انہیں کیا معلوم باہر سے خوب صورت نظر آنے والی عمارت اندر سے بالکل کھوکھلی اور بوسیدہ ہے۔ جو اپنا وزن سہارنے کی ہمت کھو بیٹھی ہو وہ بھلا کسی اور کے لئے کس طرح سہارا بن سکتی ہے؟ لیکن وہ انہیں کس طرح مطلع کرتا؟
''میں بہت سوچ سمجھ کر آئی ہوں۔ اب کسی سوچ و بچار کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ مطمئن انداز میں گویا ہوئیں۔
''او کے...... لیکن مجھے کچھ وقت چاہیے۔''
''اچھا میں انتظار کروں گی بہت بے چینی سے۔ کل آپ کو جواب دینے میرے گھر آنا ہوگا اور جواب بھی ہاں میں ہونا چاہیے۔''

□●□

آفس سے واپسی پر وہ بے جی کو لینے کی خاطر خالہ زرینہ کے ہاں گیا تھا۔ وہاں سائرہ نے بڑے اصرار سے انہیں روک لیا تھا حالانکہ بے جی کی مرضی نہیں تھی۔ وہ انکار کر رہی تھیں۔ وجہ وہ بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ گھر کی ذمے داری کے خیال سے وہ رکنا نہیں چاہ رہیں ورنہ سائرہ جو ان کی بہت چہیتی اور لاڈلی بھانجی تھی اس کے لاڈ بھرے اصرار کو وہ کبھی نہ رد کرتیں مگر اب اس سے زیادہ انہیں مشعل کا خیال تھا۔ مشعل کا خیال آتے ہی اس نے انہیں وہاں چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا اور کہہ آیا وہ رافعہ کی خوشی کی خاطر انہیں وہاں چھوڑے جا رہا ہے کل واپسی پر ضرور لے کر جائے گا۔ وہاں سے چلا آیا تھا۔ گھر جانے کی اب کوئی جلدی نہیں تھی۔
بے جی کی خاطر، ان کی پریشانی کے خیال سے وہ فوراً گھر بھاگا کرتا تھا۔ اب بے جی گھر میں نہیں تھیں سوائے کوئی فکر و پریشانی بھی نہیں تھی۔
مشعل اپنی بدتمیزی و بدمزاجی کے باعث بالکل پس منظر میں چلی گئی تھی۔ شادی کو چھ ماہ ہو گئے تھے۔ اس عرصے میں اس کے مزاج و انداز میں کوئی بہتری نہیں آئی تھی۔
موسم میں ہلکی خنکی تھی۔ دھیرے دھیرے چلتی ہوا کیف آور تھی۔ چاند آسمان پر تاروں کے جھرمٹ میں بڑی شان سے چاندنی لٹا رہا تھا۔ وہ کافی وقت تک بے مقصد سڑکوں پر کار دوڑاتا رہا تھا۔ کافی شاپ سے کافی پی کر اٹھنے کے بعد اس نے رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی تھی۔ وقت خاصا گزر چکا تھا۔ اس نے کار گھر جانے والے راستے پر ڈالی۔ رات گہری ہو چکی تھی۔ سڑکوں پر ٹریفک بہت کم تھی۔ وہ رش ڈرائیونگ کرتا ہوا گھر پہنچا تھا۔
''کہاں گئے تھے؟'' اندر قدم رکھتے ہی مشعل بم کی طرح بلاسٹ ہوئی تھی۔
''اوہ! سو فیصد بیویوں والا سوال اور انداز بھی۔'' وہ شانے اچکا کر طنزیہ مسکراہٹ سے گویا ہوا۔
''بیوی...... مائی فُٹ، کسی خیال میں مت رہنا۔'' وہ پاؤں پٹخ کر چیخی۔
''میں بالکل حقیقت پسند بندہ ہوں...... اس لئے خیالوں، خوابوں سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔''
''میں کہتی ہوں آخر مجھے اس طرح ٹارچر کرنے کا مقصد کیا ہے؟ کس بات کی مجھے سزا دی جا رہی ہے...... میں کب تک اس ڈربے میں بند رہوں گی؟''
''تمہیں کوئی سزا نہیں دی جا رہی۔ کون ٹارچر کر رہا ہے تمہیں؟'' وہ اطمینان سے صوفے پر بیٹھ کر پیروں سے موزے اور جوتے اتارتے ہوئے گویا ہوا۔
''یہ سزا نہیں تو کیا ہے کہ میں اپنی مرضی سے کہیں نہیں جا سکتی۔ نہ میرے فرینڈز مجھ سے رابطہ کر سکتے ہیں، مجھے قید کر کے رکھا جا رہا ہے یہاں۔'' وہ تیز لہجے میں کہہ رہی تھی۔ جھنجھلاہٹ، اکتاہٹ، غصہ، کھسیاہٹ اس کے لہجے، اس کے چہرے، اس کے ہر عضو سے عیاں تھا۔
شاہ ویز صوفے کی بیک سے ٹیک لگائے بہت ایزی انداز میں بیٹھا تھا۔ اس نے نگاہیں اس کے سراپے پر ڈالیں۔ بلیک ٹراؤزر پر ہاف آستین کی سرخ شرٹ جس پر بلیک فینسی ورک تھا، ٹراؤزر کے کھلے پائنچوں میں بھی سرخ و سیاہ ہی کام ہوا تھا۔ وہ سوٹ اس کے سانچے میں ڈھلے جسم پر غضب ڈھا رہا تھا۔ اخروٹی سرخی مائل بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ کانوں میں بلیک اسٹون کے خوب صورت ٹاپس جگمگا رہے تھے۔ چہرہ میک اپ سے بے نیاز ہونے کے باوجود بہت پُرکشش و شاداب لگ رہا تھا۔
وہ حسین تھی۔
چاندنی رات کی فسوں خیز روشنی کی طرح۔
موسم بہار میں کھلے گلاب کی طرح۔
حُسن تو مرد کی کمزوری رہا ہے۔
پھر وہ بھی تو مرد تھا، کہیں نہ کہیں تو آدمیت غالب آ ہی جاتی ہے۔ اس نے اسے دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس سے کچھ فاصلے پر کھڑی چست لباس میں دوپٹے، چادر سے بے نیاز وہ نئے انداز میں اس کے احساسات جگا گئی۔ اس کے اندر عجیب سی ہلچل مچی تھی۔ وہ گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔
''مجھے یہاں نہیں رہنا...... دم گھٹتا ہے میرا یہاں پر...... میں یہاں سے جاؤں گی۔'' مشعل اپنے مخصوص لب و لہجے میں کہہ رہی تھی اور وہ اپنے اندر اٹھتے اضطراب کی کشمکش سے نبرد آزما تھا۔ جذبات کسی طوفان کی صورت اختیار کرنے لگے تھے۔
''یہ کیا ہوا مجھے؟ میں جو اپنے ارادوں میں اٹل ہوں، اپنی انا و خودداری کے آگے بڑی سے بڑی خواہش کی پروا نہیں کرتا۔ اب ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ کیوں اس لمحے اس کی قربت کی چاہ میرے دل میں پیدا ہوئی۔ کیا میں اتنا گھٹیا ہوں؟ اتنا گرا ہوا ہوں کہ محض نفس کی تمنا پر اس کا ساتھ چاہ رہا ہوں، جس کی بدتمیزی و ہٹ دھرمی کے باعث ایک نگاہ دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا۔ کیا میں اتنا کمزور ہوں، اتنا بے بس...... نہیں مجھے خود کو سنبھالنا ہوگا۔ اس مغرور لڑکی کے آگے مجھے کبھی نہیں جھکنا۔''
مشعل کہہ رہی تھی۔ چیخ رہی تھی، اپنے غصے کا اظہار کر رہی تھی۔
اس کے جذبات، احساسات، خیالات سے بے خبر۔ وہ اٹھ کر باتھ روم کی طرف بڑھ گیا۔ کافی وقت شاور کے نیچے گزارنے سے دل و دماغ میں سکون و ٹھنڈک سرایت کر گئی تھی باڈی اسپرے استعمال کرنے کے بعد نائٹ سوٹ پہن کر باہر آ گیا تھا۔
وہ اب تک کھڑی تھی۔
''کھڑی کیوں ہو...... بیٹھو نا۔'' اس نے ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے قریب ہی بٹھا لیا تھا۔ نامعلوم کچھ وقت پہلے جو اس کے اندر جذبات کا بحر بیکراں متلاطم ہوا تھا اس کا اثر تھا یا اس کے چہرے پر ایسی بے بسی تھی گویا کسی آزاد پرندے کے پَر کاٹ کر پنجرے میں ڈال دیا جائے تو وہ مضطرب و بدحواس رہتا ہے۔ کچھ ایسی ہی کیفیت اس لمحے مشعل کے چہرے پر تھی۔ فی الحال جو بھی تھا اس کے اندر نرم گوشہ پیدا ہو گیا تھا۔
''مشعل! اب تک جو ہوا سو ہوا لیکن اب میں پوری سنجیدگی و خلوص کے ساتھ کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں جس پر تمہیں بھی سنجیدگی سے غور کرنا ہوگا۔ آج سے قبل جو بھی ہوا اس کا مجھے افسوس ہے۔ وہ سب میں برداشت نہیں کر پایا اور یقیناً کوئی بھی مرد اتنا اعلیٰ ظرف اور اتنے بڑے دل کا مالک نہیں ہوتا کہ اپنوں کے متعلق بے حیا و جھوٹے

الزامات برداشت کرے۔ غصے میں وہ سب ہو جاتا ہے جس کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ میری بات سمجھ رہی ہو نا؟'' چند لمحوں کے توقف کے بعد وہ آہستگی سے گویا ہوا۔
مگر وہ اس طرح وہاں بیٹھی تھی گویا سماعت، بصارت اور گویائی سے محروم پتھر کی مورت ہو۔
''وقت کسی کی ملکیت نہیں ہوتا، یہ ہوا کے جھونکے کی طرح ہے جو کسی کی گرفت میں نہیں آسکتا لیکن کسی نہ کسی انداز میں اپنے گزرنے کا احساس ضرور دلاتا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو وقت گزر جائے اور پچھتاوے چھوڑ جائے، پچھتاوے صرف تاسف و دکھ دیتے ہیں۔ تم خاموش کیوں ہو؟ کچھ تو کہو۔'' وہ بڑے دوستانہ لہجے میں مخاطب تھا۔
ایک لمحے کو تو مشعل غیر شناسا احساسات سے دوچار ہوئی تھی مگر پھر فوراً ہی سنبھل گئی۔
''کب تک خاموش رہو گی...... کچھ تو بولو۔''
''کیا بولوں؟ میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تم کیا کہنا چاہتے ہو؟'' وہ سرد و سپاٹ لہجے میں بولی۔ وہ کسی طور بھی شکست ماننے کو تیار نہیں تھی۔ شاہ ویز کی نرم مزاجی، دوستانہ انداز، بدلا ہوا لب و لہجہ کچھ بھی تو اس پر اثر انداز نہ ہو سکے تھے۔
''یہی کہ جو ہوا اسے بھلا کر اس وقت سے ہم نئی اور خوبصورت زندگی کا آغاز کریں۔ جہاں خوشیوں و مسرتوں کی آبشاریں بہتی ہوں، محبت و یگانگت کے رنگ ہوں، پھول ہوں، کہکشائیں ہوں۔'' اس کے تھکے ہوئے اعصاب پر اس کی مدہوش قربت نشہ سا طاری کرنے لگی تھی اور اس کی حالت اس شرابی کی سی تھی جو نشے میں سنبھلتے سنبھلتے بھی لڑکھڑانے لگتا ہے۔ مشعل جو اکڑی بیٹھی تھی اس بار اس نے اس کے لہجے کی تبدیلی پر چونک کر اس کی جانب دیکھا۔ وہائٹ ڈریس میں اس کی مردانہ وجاہت نمایاں تھی۔ اس نے اسے پہلی مرتبہ مسکراتے ہوئے دیکھا تھا۔ بڑی روشن روشن مسکراہٹ تھی۔ سحر انگیز آنکھوں میں جذبوں کا رنگ تھا۔ از حد بولڈ اور ماڈرن ہونے کے باوجود وہ اس لمحے اس کی نگاہوں سے نگاہیں نہ ملا سکی۔
''کر رہی ہو دوستی؟'' غیر ارادی طور پر اس نے اس کے شانے پر بازو رکھ کر کہا۔ مشعل کو محسوس ہوا دہکتے ہوئے انگارے اس کے بازو پر آ رکھے ہوں۔ اس نے سراسیمگی سے اس کی جانب دیکھا وہ سراپا آتش بنا ہوا تھا، ہوش و خرد سے قطعی بیگانہ۔ مشعل کے ذہن میں وہ الفاظ گونجنے لگے جو بڑے فخر و اعتماد سے اس سے کہے گئے تھے۔
''محترمہ! آپ سمجھتی ہیں مرد کاٹھ کا الو ہوتا ہے جس کو انگلیوں کی جنبش پر با آسانی نچایا جا سکتا ہے۔ آپ کا خیال ہے حُسن بڑی طاقت ہے مرد کو زیر کرنے کے لئے۔ آپ سمجھتی ہیں عورت مرد کی بہت بڑی کمزوری ہے۔ اس کمزوری کی بنا پر عورت اسے اپنا غلام بنا سکتی ہے؟ ہوں...... مرد کے بارے میں آپ کا ہر خیال، ہر سوچ، ہر فلسفہ بالکل غلط ہے۔ آپ کے خیالات و نظریات انتہائی گمراہ کن ماحول کی پیداوار ہیں۔ آپ ایک بھٹکی ہوئی لڑکی ہیں۔ مرد کیا ہے یہ آپ جان ہی نہ سکیں۔ اب میری رفیق حیات بننے کے بعد آپ کو معلوم ہوگا کہ دراصل مرد ہوتا کیا ہے۔'' اس کی زبان سے نکلے لفظ انگارے بن کر آج تک اس کے اندر دہک رہے تھے۔ یکلخت ہی ان پر ٹھنڈے پانی کی پھوار پڑنے لگی تھی۔ چھن...... چھن...... انگارے بجھتے گئے۔ فخر و انبساط کی لہریں سی جسم و جاں میں دوڑنے لگیں۔
''ہا...... ہا......'' اس نے اپنے شانے سے اس کا ہاتھ ہٹا کر اپنے گلابی خوب صورت ہاتھوں میں لے لیا، پھر ہنستے ہوئے طنزیہ لہجے میں گویا ہوئی۔
''مجھے یقین تھا تم بہت جلد کاٹھ کے الو بن جاؤ گے۔ حُسن بڑی طاقت ہے اور عورت ہر مرد کی کمزوری ہے...... ہے نا؟...... ہا...... ہا......'' وہ ہنس رہی تھی۔ بڑی کاٹ اور زہر تھا اس کی ہنسی میں۔ از حد تحقیر و اہانت تھی۔ شاہ ویز نے اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ بے ساختہ کھینچا تھا۔ پیشانی پر شکنیں نمودار ہونے لگیں۔
''شٹ اپ...... میں نے کہا نا جو ہوا اسے بھول جاؤ۔'' وہ سنجیدہ تھا۔
''ہونہہ...... کیوں بھول جاؤں؟'' وہ ایک جھٹکے سے کھڑی ہو کر پھنکاری تھی۔
''اس لئے کہ میں بات بڑھانا نہیں چاہتا۔''
''میں اس موضوع پر کوئی بات کرنا نہیں چاہتی اور نہ ہی تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔ اگر ڈیڈی نے کسی وجہ سے مجھے تم جیسے آدمی کے پلے باندھ دیا ہے تو اس کا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ تمہیں اپنے قریب آنے دوں گی۔ مجھے آج بھی تم سے اتنی ہی نفرت ہے جتنی اس وقت تھی جب تم نے آفس کے پارکنگ لاٹ میں جو ہوے جھگڑا کیا تھا۔ پھر نامعلوم کس چالاکی سے تم نے چالیں چل کر مجھ سے ہر رشتے کو جدا کروا دیا اور اب تم چاہتے ہو میں خود کو تمہاری خواہشوں کی بھینٹ چڑھا دوں۔ نو، امپاسبل، نو، نیور امپاسبل، وہ بولتی چلی گئی۔
اس کے بدن کا تمام خون چہرے پر آ گیا...... کان سنسنانے لگے۔ دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے۔ سارا خمار، ساری سرشاری، تمام جذبات بھاپ بن کر اڑ گئی۔ ضبط سے رگیں تن گئیں۔ آنکھوں میں لہو چھلکنے لگا۔ اس نے مرد ہو کر پہل کی تھی۔ اپنی انا، اپنی حمیت و مردانگی سب کو پس پشت ڈال دیا تھا اور جواباً کیسی تذلیل سے نوازا گیا تھا۔ وہ سامنے کھڑی لڑکی نہیں کوئی حسین مگر زہریلی ناگن لگ رہی تھی جو کومل و معطر احساسات و جذبات سے بے بہرہ ہو جاتی ہے جس میں صرف اور صرف انتقامی جذبات پروان چڑھتے ہیں۔
وحشت، جنون و اشتعال سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔
''آئندہ میرے متعلق کبھی خواب میں بھی......''
''شٹ اپ...... شٹ اپ...... اسٹاپ اٹ......'' اس کی ضبط کی طنابیں چھوٹ چکی تھیں۔ ایک ادائے کافرانہ سے بولتی ہوئی مشعل بالکل خاموش ہو گئی۔
''تمہارے بارے میں مجھے ہر بار کچھ سوچ کر نئی شرمندگی و ذلت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ تمہاری یہ اکڑ، یہ غرور اگر چاہوں تو لمحوں میں نکال سکتا ہوں مگر شکست کھا جاتا ہوں اپنی طبیعت، اپنے مزاج سے۔'' اس کے لہجے میں الاؤ دہک رہے تھے۔ مشعل کو وہ اس وقت کوئی وحشی دیوانہ لگ رہا تھا۔ ایک خوف اس کے اندر اتر گیا۔
وہ بیڈ پر لائٹ آف کر کے لیٹ گیا۔ پھر نہ معلوم کب سویا مگر مشعل ساری رات جاگتی رہی تھی۔ شاہ ویز کی طرف سے اسے بے اعتمادی تھی۔

□●□

حرا نے بہن کی جانب دیکھا جو فون پر مصروف گفتگو تھیں پھر ایک گہری سانس لے کر بیڈ کی چادر تبدیل کرنے لگیں۔ ان کے چہرے پر افسردگی و ملال کے رنگ گہرے ہو گئے تھے۔
''حرا! چائے کے ساتھ کچھ چیزیں بنا لینا...... شاہ ویز آرہے ہیں۔'' فرح رضوی ریسیور رکھ کر ان سے مخاطب ہوئیں۔ ''بہت مشکلوں سے راضی ہوئے ہیں ہماری رقم اپنے بزنس میں انویسٹ کرنے پر۔''
''آپی! آپ نے اپنی تسلی تو پوری طرح کر لی ہے نا؟'' وہ چادر اور تکیوں کے کور تبدیل کرنے کے بعد پہلے کورز، چادر سمیٹتی ہوئی فکرمندی سے گویا ہوئیں۔
''ہاں...... ہاں خوب اچھی طرح۔ جبھی تو اتنا عرصہ لگا دیا ہے۔''
''نامعلوم کیوں مجھے یقین نہیں آتا۔ کہیں یہ ہماری رقم لے کر انکار کر بیٹھے تو ہم کیا کر لیں گے ان کا؟ پھر...... پھر ہمارے پاس کوئی اور ذریعہ اب نہیں ہے۔'' وہ اپنے دل کی بات زبان پر لے آئی تھیں۔ فرح نے وسوسوں کی شکار چھوٹی بہن کی طرف دیکھا پھر آگے بڑھ کر انہیں گلے سے لگا کر گویا ہوئیں۔
''دنیا میں ابھی کچھ لوگ ایسے ہیں جو یقین، اعتماد اور سچ کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ شاہ ویز پر میرا اعتبار و یقین کبھی رائیگاں نہیں جائے گا۔''
''چہرے ہمیشہ دھوکا دیتے ہیں۔ معصوم و سادہ بے ضرر نظر آنے والے لوگ بہت خطرناک ہوتے ہیں۔ اس بے مہر وقت میں اپنوں کا خلوص دھوکا اور محبت غرض سے لپٹی ہوتی ہے تو وہ نوجوان بالکل غیر اور انجانا ہے۔ میرے خیال میں آپ ایک مرتبہ پھر غور کر لیں آپی! اگر ہمارے ہاتھ سے یہ رقم چلی گئی تو بچے گا کیا؟'' حرا ان کے قریب بیٹھ کر محو گفتگو تھیں۔
''اللہ پر بھروسہ رکھ کر بے فکر ہو جاؤ حرا! میں نے ہر طرح سے تسلی کر کے یہ فیصلہ کیا ہے۔ پہلے بے شک تمہاری آپی بہت بے وقوف اور ناسمجھ تھی۔ اسی ناسمجھی اور بے وقوفی کے ہاتھوں از حد نقصانات سے دوچار رہی ہے۔ مگر میں سوچتی ہوں ہماری ہر غلطی ہماری رہنمائی کرتی ہے اور میں نے ان سے سبق سیکھا ہے۔ چہروں سے دھوکا کھانے کا وقت گزر گیا۔'' وہ بہن کو مطمئن کر کے تیار ہونے لگیں۔
سفید جارجٹ کی جامنی بارڈر والی ساڑھی میں سادہ جوڑے میں ان کی پُروقار شخصیت خاصی نمایاں تھی۔ گولڈن فریم کی عینک آنکھوں پر لگا کر باہر نکلیں تو حرا نے شاہ ویز کی آمد کی اطلاع دی تھی۔ وہ سیدھی ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ آئیں۔
''السلام علیکم۔'' بلیک پینٹ اور اسکائی بلو شرٹ میں ملبوس شاہ ویز سلام کرتا ہوا احتراماً کھڑا ہو گیا۔
''وعلیکم السلام بیٹا! بیٹھیں آپ۔'' وہ جواب دیتی ہوئی اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئیں۔ شاہ ویز نے ہاتھ میں پکڑے ڈاکومنٹس درمیان میں رکھی ٹیبل پر رکھ دیئے تھے۔
''میڈم! میں نے آپ سے کہا تھا کہ آپ خوب سوچ سمجھ کر فیصلہ کیجئے گا اور مجھے امید ہے آپ نے مکمل تسلی کے بعد فیصلہ کیا ہے۔'' وہ سنجیدگی سے گویا ہوا۔
''جی، ہر طرح کی تسلی کے بعد ہی میں نے آپ کو رنگ کیا تھا۔''
''اوکے، آپ ان ڈاکومنٹس پر سائن کر دیجئے۔ اس کی ایک کاپی آپ کے پاس رہے گی اور دوسری فرم کے لاکر میں۔ آپ کی رقم آپ کو گھر بیٹھے ملا کرے گی۔ لیکن ابھی چند ماہ فرم آپ کو بروقت ادائیگی نہیں کرے گی۔ انشاء اللہ چھ سات ماہ بعد آپ کو آپ کی رقم فرسٹ کو پہنچا دی جائے گی۔'' شاہ ویز حسن بیگ کی عزت اور فرم کی ساکھ کے خیال سے انہیں یہ نہ بتا سکا کہ کاروبار کی حالت بالکل تباہ ہے۔ تسلی کے لفظوں میں اس نے جتا دیا تھا کہ وہ رقم ابھی نہ دے سکیں گے۔
فرح کاروباری پیچیدگیوں کو نہیں جانتی تھیں انہیں صرف اپنی رقم کے محفوظ و منافع بخش ہونے کی تسلی نے مطمئن و مسرور کر ڈالا تھا اس لئے انہوں نے بہت خوشی سے تمام شرائط مان کر سائن کر ڈالے تھے۔
شاہ ویز نے ایک کاپی انہیں دی تھی اور دوسری اپنے پاس رکھ لی تھی۔ فرح رضوی کی رقم خاصی مالیت کی تھی۔ اس رقم سے وہ چند ضروری اور بڑے آرڈرز تیار کروا کر ڈلیور کر سکتا تھا اور ان کے ڈلیور ہوتے ہی فرم پیروں پر نہیں گھٹنوں پر کھڑی ہو سکتی تھی اور وہ یہی چاہتا تھا۔ اس نے ہر ممکن کوشش کر لی تھیں مگر کہیں سے رقم دستیاب نہ ہو سکی تھی۔

ایسے میں فرح رضوی کی پیشکش خزاں میں بہار کی سی تھی۔ اسے امید ہو چلی تھی خزاؤں کے ڈیرے اب زیادہ دن ٹھہرنے والے نہیں تھے۔

□●□

دوسرے دن بے جی دوپہر کے وقت زبیدہ کے ہاں سے آ گئی تھیں۔

گھر میں حسب معمول سناٹے اور خاموشی کا راج تھا۔ شاہ ویز آفس جا چکا تھا۔ مشعل معمول کے مطابق اوپر اپنے بیڈ روم میں براجمان تھی۔ بے جی تھوڑی سی اس خوش گمانی میں مبتلا ہو گئی تھیں کہ شاید ان کی غیر موجودگی میں مشعل گھر کی تنہائی یا اپنے فرائض و ذمے داری کو محسوس کر کے نیچے موجود ہو سب بھاپ کی طرح تحلیل ہو گئی تھی اس نے اس بات کا ثبوت دے دیا تھا کہ اسے سچ مچ اس گھر کی، گھر کے مکینوں کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ ان سے کوئی واسطہ کوئی تعلق نہیں رکھتی۔

''یا اللہ! یہ کس طرح گھر بنے گا؟ اس لڑکی کو معمولی سا بھی کوئی احساس نہیں ہے۔ میرے مولا! میں نے بہت بڑی بھول کی ہے۔ اب تو سب آپ کے ہی اختیار میں ہے کہ اس بے رحم و بے حس لڑکی کی تقدیر سنواریں، اسے اچھے برے کی تمیز بخشیں۔ گھر بسانے کی لگن اس کے اندر بیدار کریں۔'' بے جی تھکی تھکی سی کرسی پر گرنے کے انداز میں آزردگی سے اپنے رب سے مخاطب تھیں۔

وہ ایک گھریلو سیدھی سادھی عورت تھیں۔ انہوں نے عمر کا طویل عرصہ مشقت، صبر و قناعت میں گزارا تھا۔ ان کے نزدیک چھوٹی سے چھوٹی شے بھی قدر و منزلت رکھتی تھی۔ مشعل جیسی لڑکی جس نے آسائشات میں زندگی بسر کی تھی، بڑی سے بڑی مہنگی سے مہنگی، اعلیٰ شے اس کی نگاہ میں کوئی وقعت نہیں رکھتی تھی بھلا بے جی اس کی ذہنیت و احساسات تک کہاں رسائی حاصل کر سکتی تھیں؟ وہ یہی سوچ رہی تھیں۔ بھلا کب تک وہ سب برداشت کرتی رہیں گی۔

''سلام بے جی۔'' چوکیدار کی بیوی سلام کرتی ہوئی آگے بڑھی اور نیچے بچھے کارپٹ پر بیٹھ گئی۔

''ارے نیچے کیوں بیٹھ رہی ہو۔ یہاں اوپر بیٹھو۔'' انہیں اس کا نیچے بیٹھنا سخت برا لگا تھا، ساتھ اللہ کا خوف بھی۔

''میں...... میں اوپر کیسے بیٹھ سکتی ہوں جی۔ میں نوکر ہوں، بھلا نوکر اور مالک برابر برابر کیسے بیٹھ سکتے ہیں؟'' چوکیدار کی بیوی ہراساں لہجے میں گویا ہوئی۔

''نوکر ہو تو کیا ہوا انسان تو ہو۔ پھر اللہ نے سب کو پیدا کیا ہے۔ اس نے انسانوں میں چھوٹے بڑے کی کوئی حد مقرر نہیں کی تو ہم کون ہیں فاصلے رکھنے والے۔''

بے جی کو خوف تھا کہ کہیں اللہ کو برا نہ لگے۔ پھر ان کی طبیعت بھی اسی قسم کی تھی کہ وہ کبھی بھی غرور و تکبر میں مبتلا ہوئی ہوں اور نہ ہی لوگوں سے فاصلہ رکھ کر ملنے کی عادی تھیں۔ نہ کبھی خود کو کسی سے برتر جانا نہ کسی کو خود سے کمتر سمجھا۔

چوکیدار کی بیوی ان کے ہاتھ پکڑ کر اٹھانے سے اوپر بیٹھی مگر وہ جھینپی جھینپی سی تھی۔

''میں نے صبح ناشتہ بنا دیا تھا اور دوپہر کے لئے آٹا گوندھ کر فریج میں رکھ دیا تھا۔ صفائی کرنے والی سے صفائی بھی کروا دی تھی۔'' اس نے اطلاع فراہم کی۔

''اس کا اجر اللہ دے گا تمہیں۔ میری ساری پریشانی سمیٹ لی تم نے۔ بہو بیگم نے ناشتہ کیا تھا؟'' وہ مطمئن انداز میں استفسار کرنے لگیں۔

''جی کیا تھا اور انہوں نے کہا تھا کہ کوئی ان کی اجازت کے بغیر کمرے میں نہ جائے۔''

چوکیدار کی بیوی چلی گئی تھی۔ بے جی کچن میں چلی آئیں۔ کچن صاف ستھرا تھا۔ برتن اپنے ٹھکانوں پر چمک رہے تھے۔

انہوں نے فریج میں سے آٹا نکالا اور کاؤنٹر پر لے آئیں۔ سالن کی دو ڈشیں کل ہی تیار کر کے رکھ گئی تھیں، اب انہیں صرف گرم کرنا تھا۔ برنر جلا کر اس پر توا رکھا اور پھلکے بنانے لگیں۔ شاہ ویز کی روز بروز گرتی صحت کی طرف سے انہیں ازحد فکر تھی۔ کاروبار کے الجھاؤ میں وہ کھانا اکثر بے وقت کھاتا اور کبھی صرف چائے کافی سے ہی گزارا کرتا تھا۔ بے جی نے شروع کے چند دن تو برداشت کیا مگر پھر زبردستی اس کا کھانا گھر سے پکا کر آفس بھیجنے لگی تھیں۔ شاہ ویز نے بھرپور کوشش کی کہ وہ اتنی محنت نہ کریں مگر بے جی کی بات اس کے لئے حکم کا درجہ رکھتی تھی۔

اس نے آفس سے ملازم کو بھیج کر کھانا منگوانا شروع کر دیا تھا۔

رات کو شاہ ویز آیا تو بہت خوش تھا۔ آتے ہی بے جی سے کسی معصوم بچے کی طرح لپٹ گیا۔

''آج میں بہت خوش ہوں بے جی، پہلی کامیابی ملی ہے مجھے آج۔'' وہ مسکراتے ہوئے پرجوش لہجے میں بول رہا تھا۔ اسے خوش دیکھ کر بے جی کا چہرہ کھل گیا۔

''ماشاء اللہ...... پروردگار تمہیں اسی طرح کامیابیوں، کامرانیوں، مسرتوں سے نوازتا رہے۔''

''بے جی! پوچھیں گی نہیں یہ کس طرح ہوا؟'' وہ بازو کے سہارے انہیں لاؤنج میں لے آیا۔

''جانتی ہوں...... یہ سب تمہاری محنت اور میری دعاؤں کا نتیجہ ہے۔''

''آف کورس بے جی...... آف کورس۔ آپ کی دعائیں میرے ساتھ ہیں۔ میرے ساتھ نہ ہوتیں تو میں ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتا تھا۔ بیگ صاحب کا فون آیا تھا، وہ بھی بہت خوش ہیں اور ان کی ہی کوششوں سے فرم کو آرڈرز ملے ہیں۔ فرح رضوی بھی ہمارے لئے لکی ثابت ہوئی ہیں۔'' اس کے وجیہ چہرے پر اس وقت روشنی پھیلی ہوئی تھی۔

''بھائی صاحب کا فون آیا تھا؟ وہ بہو کے بارے میں دریافت کر رہے ہوں گے؟''

''جی ہاں......''

''کیا پوچھ رہے تھے؟''

''یہی کہ وہ کیسی ہے؟ اس کی ضد اور سرکشی میں کوئی کمی واقع ہوئی یا نہیں وغیرہ، وغیرہ۔'' بے جی کو اس نے مختصر بات بتائی ورنہ کوئی بعید نہ تھا کہ وہ مزید اس سرپھری لڑکی کی دلجوئی و خدمت میں لگ جاتیں جو اسے گوارہ نہ تھا۔

درحقیقت حسن بیگ صاحب کے اس ہفتے کئی فون آ چکے تھے اور ہر بار ان کی یہی باتیں ہوتیں کہ وہ مشعل کو خوابوں میں بہت روتا ہوا، پریشان دیکھ رہے ہیں۔

''وہ اس کی جانب سے ازحد پریشان و فکر مند ہیں۔'' شاہ ویز نے مصلحت سے کام لے کر انہیں یقین دلایا کہ مشعل بالکل ٹھیک ہے۔ وہ دوسروں کو پریشان کرنا جانتی ہے، خود کیسے پریشان ہو سکتی ہے؟ بیگ صاحب نہ معلوم اس کی تسلیوں و دلاسوں سے مطمئن ہوئے تھے یا نہیں مگر وہ اسے سمجھاتے رہے تھے کہ وہ اعلیٰ ظرف ہے، مضبوط اعصاب اور ذہانت کا مالک ہے۔ اپنی دانشمندی سے کام لے کر مشعل کی گستاخیوں و بدتمیزیوں کو نظر انداز کرے۔

شاہ ویز ان کی محبت سے خاصا متاثر ہوا تھا۔ اتنی دور رہ کر بھی بیٹی کی طرف سے غافل نہیں تھے بلکہ اس کے احساسات سے بھی باخبر تھے۔

اپنی محبت سے ہی مجبور تھے جو مشعل کو فون نہیں کر پا رہے تھے کہ جانتے تھے اس کی آزردگی ان کے حوصلوں و ضبط کے پندار کو چکنا چور کر دے گی پھر وہ اس سے دور نہ رہ پائیں گے۔ اس کی بھلائی کے لئے وہ اس سے دور تھے۔

وہ بے جی کے پاس سے اوپر آیا تو وہ بیڈ پر بے خبر سو رہی تھی۔ اس نے ایک نگاہ اس پر ڈالی پھر ڈریسنگ روم تک بڑھ گیا۔

وہ نائٹ سوٹ بدل کر آیا وہ تب بھی بے خبر سو رہی تھی، پنک چادر میں لپٹی ہوئی۔ بال تکیے پر بکھرے ہوئے تھے۔ گلابی چہرے پر اس وقت بلا کی معصومیت تھی۔

گلاب کی پنکھڑیوں جیسے لب بند تھے۔

بند آنکھوں کی سیاہ پلکیں سرخی مائل عارضوں پر جھکی دلکش لگ رہی تھیں۔ سوتے ہوئے وہ کس قدر دلکش، حسین اور معصومیت کا پیکر لگ رہی تھی۔

کمرے میں خوابناک تاریکی تھی، صرف ایک سائیڈ لیمپ سے نکلتی فسوں خیز روشنی میں بیڈ پر اس کا جسم پھیلا ہوا تھا۔ اس وقت وہ کوئی اپسرا دکھائی دے رہی تھی۔

وہ ایک ٹک اسے دیکھ رہا تھا۔ دل میں کوئی ہیجان انگیز جذبات نہ تھے۔ سوچیں صاف ستھری تھیں۔ احساسات پر بیگ صاحب کی التجاؤں کا اثر تھا۔ وہ بالکل غیر ارادی طور پر اسے دیکھ رہا تھا جیسے کسی خوب صورت منظر کو شوق و ذوق سے دیکھا جاتا ہے۔ اسے حاصل کرنے کی، پانے کی کوئی خواہش نہیں ہوتی ہے، صرف نگاہوں کو بھلا لگنے کے باعث بندہ بے اختیار نگاہیں جمائے رکھتا ہے۔

نامعلوم اس کی نگاہوں کی حدت کی تاثیر تھی یا کوئی اور احساس، اس لمحے جب وہ کچھ جھکا بڑی محویت سے اسے دیکھ رہا تھا، مشعل نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔ پہلے تو غنودگی کی سی کیفیت میں اسے خود پر جھکے دیکھتی رہی، پھر جیسے ہی غنودگی پر حواس غالب آئے، پہلے حیرت سے اس کی آنکھیں پھیلیں پھر وہ چیخ مارتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

شاہ ویز جو اسے اٹھتے دیکھ کر چونکا تھا اس کی چیخ نے اسے بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔

''کیا ہوا...... ڈر گئیں؟''

''تت...... تو...... تم کیا کر رہے تھے؟'' وہ گھبرائی، بوکھلائی اٹھ بیٹھی تھی۔

''میں کیا کر رہا تھا؟'' وہ بڑبڑایا پھر گویا ہوا۔ ''میں تمہیں دیکھ رہا تھا کہ تم سوتے میں کتنی معصوم و بے ضرر لگتی ہو۔''

''ہونہہ...... یوں کیوں نہیں کہتے کہ میری نیند سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ تم جیسے گھٹیا انسان سے اور توقع بھی کیا کی جا سکتی ہے؟'' وہ کسی ناگن کی طرح غصے سے پھنکارتی بیڈ سے اتر آئی تھی۔ اس کی آنکھوں سے چنگاریاں سی نکل رہی تھیں۔ چند لمحے قبل نظر آنے والی معصومیت غائب ہو گئی تھی۔ گلاب کی پنکھڑیوں جیسے ہونٹ آتش فشاں بنے ہوئے تھے۔ شاہ ویز بھونچکا رہ گیا۔

''ہر بات کا الٹا مطلب مت لیا کرو۔'' اس نے آہستگی سے کہا۔

''کیا الٹا مطلب؟ ابھی میری آنکھ نہ کھلتی تو...... تو......''

''میری نرمی سے ناجائز فائدہ مت اٹھاؤ۔ میرا ارادہ کچھ نہیں تھا۔ یہ سب فضولیات تمہارے گمراہ ترین دماغ کی اختراع ہیں۔ لیکن میرے نفس کا پیمانہ تمہارے ذہن کی طرح خشک و تاریک نہیں ہے۔ اور ویسے بھی میں اپنے آپ کو کسی ایسے گھٹیا کام کے لئے آمادہ نہیں کر سکتا جو میرے ایمان، میرے ضمیر، میرے کردار، میری شخصیت کو مسخ کر دے۔'' وہ بہت پرسکون لہجے میں کہتا ہوا بیڈ پر لیٹ گیا اور ساتھ ہی لیمپ آف کر دیا۔

اس کے لہجے میں پتھریلی صداقت تھی۔ایسی سچائی جو اپنا آپ منوالیتی ہے۔
مشعل کسی بھٹکی ہوئی روح کی طرح کمرے کی تاریکی میں چکراتی پھر رہی تھی۔شاہ ویز کے سکون واعتماد نے اسے زبردست شکست سے دوچار کیا تھا۔اس کی جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو اپنی نگاہوں میں خود گر جاتی مگر وہ مشعل تھی، کوئی عام لڑکی نہیں۔وہ شکست کھا کر بھی شکست کا اعتراف کرنے والوں میں سے نہ تھی۔

□●□

بے جی عصر کی نماز سے فارغ ہوکر جاءنماز لپیٹ رہی تھیں کہ کال بیل کی آواز پر انہیں دروازہ کھولنے جانا پڑا۔دروازہ کھلتے ہی باہر کھڑی فیشن ایبل خاتون کو دیکھ کر وہ کچھ کہہ بھی نہ پائی تھیں کہ وہ انہیں نظر انداز کرکے بڑے اعتماد سے اندر چلی آئی تھیں۔
''کس سے ملنا ہے آپ کو؟'' بے جی ان کے اعتماد اور چہرے پر چھائی نخوت سے گڑبڑا کر گویا ہوئیں۔گولڈن براؤن سلک کی ساڑھی، بغیر آستینوں کے مختصر بلاؤز میں نظر آتا سفید بدن، کانوں میں ڈائمنڈ کے آویزے، گردن میں ڈائمنڈ نیکلس، دونوں ہاتھوں میں طلائی چوڑیاں اور ڈائمنڈ جڑے کڑے پہنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں میں بھی ڈائمنڈ اور گولڈ کی انگوٹھیاں دمک رہی تھیں۔چہرے پر تازہ میک اپ کی چمک تھی۔سرخی مائل براؤن بال شانوں سے بھی اوپر تھے۔
''مشعل اس گھر میں رہتی ہے؟'' نفاست سے سجے سجائے خوب صورت لاؤنج کو بڑی حقارت سے دیکھتے ہوئے اسی انداز میں گویا ہوئی تھیں۔
''جی ہاں، آپ بیٹھیں میں ابھی انہیں بلا کر لاتی ہوں۔'' بے جی ان کی نگاہوں کی کاٹ و لہجے کی حقارت سے خوامخواہ گھبراہٹ کا شکار ہو رہی تھیں۔وہ انہیں بیٹھنے کا کہہ کر ہانپتی کانپتی اوپر پہنچی تھیں۔
خلاف معمول آج کمرے کا دروازہ بند تھا۔کمرے میں داخل ہونے کی اجازت بھی جلد ہی مل گئی تھی۔انہوں نے اندر جا کر مشعل کو بتایا کہ کوئی خاتون اس سے ملنے آئی ہیں۔
''کون خاتون ملنے آئی ہیں؟'' وہ جو ابھی باتھ لے کر نکلی تھی اور گاؤن میں ملبوس تھی، بالوں میں برش چلاتے ہوئے گویا ہوئی۔
''یہ......یہ تو میں نے معلوم ہی نہیں کیا۔''
''نہیں معلوم کیا تو کرکے آؤ۔میں اس طرح ہر کسی سے نہیں ملتی۔'' وہ تیوریاں چڑھا کر درشتگی سے بولی۔
بے جی اس عورت کا نام معلوم کرنے کے لئے پلٹی ہی تھیں کہ اسی دم دروازے کا ہینڈل گھوما تھا اور دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوگئی تھیں۔
بے جی تو اس کی جرأت مندی بے تکلفی پر ششدر کر رہ گئی تھیں جب کہ مشعل نے دروازے کی آواز پر مڑ کر دیکھا اور حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔
''مشعل میری جان! یہ......یہ تم ہو؟'' وہ بانہیں پھیلا کر ان کی طرف بڑھی۔مشعل جو آنکھیں پھاڑے ان کی طرف بے یقین نگاہوں سے دیکھ رہی تھی، انہیں اس طرح بے قراری سے اپنی طرف بڑھتے دیکھتے اس کا سکتہ ٹوٹا تھا۔
''پھوپھو جان......'' اس نے چیخنے کے انداز میں کہا اور دوڑ کر ان سے لپٹ گئی۔
وہ ایک جذباتی منظر تھا۔کافی دیر تک وہ ایک دوسرے سے لپٹی رہی تھیں۔بے جی ان کی نظروں سے گویا اوجھل تھیں۔
بے جی نے چند لمحے رک کر ان کا ملاپ دیکھا پھر خاموشی سے کمرے سے نکل آئیں اور کچن میں آکر ان کی خاطر ومدارات کی تیاریوں میں جت گئیں۔
بہو کے میکے سے پہلی بار کوئی آیا تھا۔انہیں تو دل کھول کر تیاریاں کرنی تھیں۔
''کہاں چلی گئی تھیں آپ؟'' جذبات متوازن ہوئے تو مشعل ان سے علیحدہ ہوتی ہوئی آہستگی سے گویا ہوئی تھی۔
''احمد کو ہارٹ سرجری کے لئے امریکہ جانا تھا، وہیں گئے تھے۔'' وہ صوفے پر نیم دراز ہوتے ہوئے گویا ہوئیں۔ان کی نگاہیں باریک بینی سے مشعل کے سراپے کا جائزہ لے رہی تھیں۔
''ہارٹ سرجری کے لئے؟ مگر آپ کے ملازم تو بتا رہے تھے کہ آپ ورلڈ ٹور پر نکلے ہیں۔'' وہ بالوں میں بینڈ لگا کر ان کے سامنے بیٹھتے ہوئے گویا ہوئی۔
''یہ نوکر بھی کمبخت بہت ہی کائیاں ہوتے ہیں۔مالکوں کی ہر بات پر ان کے کان لگے ہوتے ہیں......'' وہ دل ہی دل میں خوب تلملائیں پھر قصداً دھیمے سے مسکرا کر گویا ہوئیں۔
''ارادہ تو ورلڈ ٹور کا ہی تھا مگر احمد کو اچانک ہارٹ کی تکلیف اتنی بڑھی کہ ہمیں ٹریٹمنٹ کے لئے امریکہ جانا پڑا۔اسا معلوم کیا لیا، دیا آگے آگیا جو صرف دواؤں پر ہی ٹلی، سرجری سے بچ گئے۔روپیہ پانی کی طرح بہانا پڑا تھا جب کہیں جا کر جان چھوٹی احمد کی۔''
مشعل کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد ان کی نگاہیں بیڈروم کے ذرے ذرے کا معائنہ کر رہی تھیں۔ساتھ ہی ساتھ بولتی بھی جا رہی تھیں۔
''انکل کو بڑی تکلیف سے نجات مل گئی۔یہ خوشی کی بات ہے۔روپیہ زندگی سے بڑھ کر تو عزیز نہیں ہوتا۔انکل صحت مند ہوگئے ہیں، روپیہ بہت کما کر دے دیں گے آپ کو۔'' اس نے مسکرا کر کہا تھا۔
اس کے انداز کی سادگی، سوچ کی تبدیلی و پُروقار لہجے کی شائستگی نے رافعہ کو چونکنے پر مجبور کر دیا تھا۔
آج سے قبل وہ کہاں اتنی شائستگی و اعتماد سے گفتگو کرتی تھی۔اس کے انداز میں ہمیشہ سے لاپرواہی اور لاابالی پن شدت سے موجود تھا۔
وہ بچپن سے ان کے اندر رہی تھی۔
وہ ان کی آنکھوں سے، ان کے کانوں سے سنتی، ان کے دماغ سے سوچتی تھی۔
انہوں نے اپنی خود غرض ولالچی فطرت کے باعث اپنے سحر سے نکلنے ہی نہیں دیا تھا۔اس کے ذریعے ہی تو وہ اس کی دولت ہتھیا کر عیش وعشرت کی زندگی گزار رہی تھیں اور اب چھ سات مہینوں کے اندر وہ بالکل بدلی بدلی لگ رہی تھی۔
''کیا ہوا؟ ایسے کیوں دیکھ رہی ہیں......کوئی بات مائنڈ کر گئی ہیں؟'' اپنی طرف انہیں آنکھیں پھاڑے دیکھ کر وہ پریشانی سے گویا ہوئی۔
''نہیں بھلا میں کبھی آپ کی کسی بات کا برا مان سکتی ہوں۔'' وہ اس کی جانب محبت سے دیکھتے ہوئے شیریں لہجے میں گویا ہوئیں۔مشعل ان کے انداز پر نہال ہوگئی۔
''بھائی جان نے بہت ظلم کیا ہے میرے ساتھ۔'' وہ سرد آہ بھر کے گویا ہوئیں۔''لڑائی، جھگڑے، تُو تُو، میں میں کس خاندان میں، کس گھر میں نہیں ہوتی۔سب جگہ ہوتا ہے ایسا، مگر جلد ہی ناراضگی بھلا دی جاتی ہے۔لڑائی جھگڑے مٹا کر دوستی اور اپنائیت کے رشتے استوار ہو جایا کرتے ہیں۔لیکن بھائی جان، آہ......بھائی جان نے تو ساری زندگی کے لئے میرے اور جوجو کے دل پر داغ لگا دیا۔ایسا گھاؤ لگایا ہے کہ جس کا زخم تاحیات نہ بھر سکے گا'' وہ دہائی دینے کے انداز میں گویا تھیں اور مشعل جو ان کی کیفیت سمجھ رہی تھی، جوجو کے نام پر ایک دم اس کا دل دھڑکا تھا۔گزرے لمحوں کی فلم ذہن کی اسکرین پر چلنے لگی تھی۔اس کے اندر اضطراب سا پھیلنے لگا تھا۔
''بھائی جان کو اگر تم کو، مجھ سے، جوجو سے علیحدہ ہی کرنا تھا، تمہیں کسی دوسرے گھرانے کی بہو بنانا تھا تو کوئی اپنے اسٹینڈرڈ کا داماد، اپنی حیثیت کی فیملی تو منتخب کرتے۔انہوں نے نہ اپنے اسٹینڈرڈ کا خیال کیا نہ اپنی حیثیت کا۔صرف مجھے نیچا دکھانے کی خاطر بیٹی کی شادی اپنی ہی فرم کے ملازم سے کر دی۔ہائے ہائے کیسا غضب ہوگیا یہ؟ کس طرح میں اپنا منہ سوسائٹی کے لوگوں کو دکھاؤں گی؟ لوگوں کے غلط، الٹے سیدھے سوالوں کا جواب دوں گی؟ لوگ تو سیدھے سادھے معاملوں کو ہرا بھرا کر بدنام کرتے ہیں۔پھر یہ تو بہت ہی مشکوک معاملہ ہوا کہ نہیں۔چھپ چھپا کر بیٹی کی شادی ملازم سے کر دینا جب کہ سب جانتے تھے کہ آپ کی اور جوجو کی منگنی ہوئی ہے اور جلد شادی ہونے والی ہے۔''
وہ ایک ایک زخم ادھیڑ رہی تھیں اور اس کے اندر درد بڑھتا جا رہا تھا۔
''پھپھو! آپ نے بھی بے مروتی ولاپروائی کی حدود توڑ دی تھیں۔اس وقت ہر رشتے کو آپ نے اس طرح توڑا تھا کہ لگتا تھا ہم اب کبھی جڑ ہی نہ پائیں گے۔''
''کیسے نہ جڑ پائیں گے، رشتے کوئی کانچ کے برتن نہیں ہوتے جو ٹوٹ گئے تو ٹوٹ گئے۔نہ ہی شاخوں سے ٹوٹے پھولوں کی طرح ہوتے ہیں کہ مرجھا کر فنا ہو جائیں۔یہ تو سانسوں کی آمد ورفت کے ساتھ چلتے ہیں۔''
''جلد بازی اور غصہ انسان کو کبھی بھی درست راہ نہیں دکھاتا پھپھو جان! آپ کی باتوں، آپ کے چیلنج نے مجھے اسی وقت ہوش وخرد سے بیگانہ کر دیا تھا۔مجھے یہ ضد ہوگئی تھی کہ میں اب آپ کو اور جوجو کو شادی کر کے ہی دکھاؤں گی، خواہ اس کے نتیجے میں کچھ بھی کر گزرنا پڑے۔میری ضد و بے سکونی کو دیکھ کر پاپا نے شاہ ویز کو سلیکٹ کیا تھا۔یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے، آپ پاپا کو الزام نہ دیں۔'' اس نے فریج سے پیپسی کے کین نکال کر ایک انہیں سرو کیا دوسرا خود سپ کرتے ہوئے صاف گوئی سے بولی۔
''جلد بازاور ہٹ دھرم تو آپ صدا کی رہی ہو۔خیر یہ بتاؤ خوش تو ہونا؟''
''آف کورس......آپ کو خوش نظر نہیں آرہی؟'' وہ دھیمے سے مسکرائی تھی۔
''نہیں۔'' وہ اس کے سادہ حلیے کا جائزہ لے کر اطمینان سے گویا ہوئی تھیں اور اپنے جواب پر اس کے چہرے کے بدلتے رنگوں نے ان کے شکوک کو تقویت دی تھی۔
''ضد اور جلد بازی وقتی طور پر مسرت فراہم کرتی ہے اور یہ مسرت لمحاتی ہوتی ہے۔ساری حیات کے لئے زادِ راہ نہیں بن سکتی۔'' دھیرے دھیرے کین سے سپ کرتے ہوئے وہ بہت آہستگی سے گویا تھیں۔ان کے چہرے پر عجب مسکراہٹ تھی۔
مشعل خجل سی ہوگئی۔بے شک رافعہ اسے غیر متوقع طور پر یہاں آکر ملی تھیں۔حسن بیگ سے اس کا کوئی رابطہ ابھی تک نہیں ہوا تھا۔دو ماہ ہوگئے تھے اسے گھر سے باہر نکلے، شاہ ویز کی طرف سے لگائی گئی پابندی کی اس جیسی سرپھری لڑکی کو ایسی کوئی پرواہ یا خوف نہ تھا کہ وہ باہر نکلنا چھوڑ بیٹھی تھی۔وجہ یہ تھی کہ اسے سکون باہر بھی نہیں ملتا تھا۔حسن بیگ سے دوری اس کے لئے سوہانِ روح تھی۔
مستزاد یہ کہ انہوں نے ابھی تک پلٹ کر اس سے فون پر بات تک کرنا گوارا نہ کیا تھا اور یہ امر اس کے لئے بڑا اذیت ناک تھا۔وہ ان سے خفا تھی، مکمل طور پر ناراض۔لیکن اس کے دل میں ہمہ وقت وہی رہتے، ایسے میں اسے ان کی زیادہ یاد آتی اور دل چاہتا کوئی اپنا ہو جس سے وہ گھل مل کر باتیں کرے، ہنسے مسکرائے۔اس حبس زدہ موسم میں رافعہ بیگم کی آمد بہار کے سندیسے کی تھی۔
کچھ وہ اتنی بے تابی سے ملی تھیں کہ وہ اپنی ناراضگی وکدورت ان کے پُرخلوص و پُرجوش انداز دیکھ کر بھول بیٹھی تھی۔مگر ابھی اپنی پرسنل لائف ان سے ڈسکس کرنے میں

ایک جھجک مانع تھی۔
''جوجو کیسا ہے؟'' اس نے موضوع ہی تبدیل کر دینا مناسب سمجھا۔
''جوجو؟...... آہ...... ہاں...... مت پوچھو، بس جی رہا ہے۔'' ان کے چہرے اور لہجے میں ایسی یاسیت و رنجیدگی در آئی کہ وہ خود کو مجرم سمجھنے لگی۔
''آپ کی شادی کی خبر میرے دل پر ہی بجلی بن کر گری تھی۔ پھر میں نے ہر ممکن کوشش کی کہ جوجو کو معلوم نہ ہو۔ جب میں اتنی رنجیدہ ہوں تو اس کے دل پر کیا گزرے گی۔ مگر صد افسوس سچ بھی کبھی چھپا ہے۔ جیسے ہی اسے معلوم ہوا اس نے خاموشی سے سلیپنگ پلز بڑی تعداد میں کھالیں۔ بڑی جان توڑ محنت کے بعد وہ ہوش میں آیا تھا۔''
''وہاٹ...... کیا...... جوجو نے سوسائڈ کرنے کی کوشش کی؟'' وہ حیرانی سے کھڑی ہوگئی۔ اس کے چہرے پر خوف و پریشانی لپیٹے کی صورت ابھری تھی۔
''ہاں...... ڈاکٹرز نے بہت جدوجہد کے بعد اس کی جان بچائی تھی۔''
''اب کیسا ہے وہ؟'' وہ بے قرار سی ہو اٹھی۔
''کہہ تو رہی ہوں زندہ ہے۔'' انہوں نے طویل سانس لے کر آزردگی سے کہا۔ کمرے کی فضا یکدم بوجھل ہوگئی۔ رافعہ نہ معلوم کیا سوچ رہی تھیں۔ مشعل کے اندر اضطراب و انتشار پھیلتا جا رہا تھا۔ لفظوں کا ذخیرہ ختم ہوگیا۔
کرنے کو جیسے کوئی بات ہی نہ رہی تھی۔
سکوت ہر شے سے برسنے لگا تھا۔ دو نفوس کے باوجود وہاں سناٹا تھا۔
نہ معلوم کب تک سناٹا رہتا کہ یکدم رافعہ بولیں۔
''تمہارا ہسبنڈ تو تمہیں بہت چاہتا ہوگا۔ ہے نا؟''
''ہاں......'' غیر ارادی طور پر اس کے ہونٹوں سے جنبش ہوئی تھی۔
''کیوں نہیں...... ایک دو ٹکے کے انسان کو ہیرے جواہرات سے بھرا خزانہ مل جائے تو وہ خوش نہ ہوگا تو کون ہوگا۔ لیکن میں بتا دیتی ہوں ایسے مرد کا پیار دکھاوا، محبت جھوٹی ہے۔ بھائی جان سدا کے ظاہر پرست، جو جیسا نظر آیا اسے ویسا ہی مان لیا اور اسی سادگی کو استعمال کر کے اس ملازم نے جال پھینک کر آپ کو شکار کر لیا۔ آپ کو اس کی ریاکاریوں سے بچنا چاہئے۔ مرد اپنی جھوٹی محبت سے عورت کے دل میں جگہ بناتا ہے اور ہمیشہ کے لئے اپنے سحر میں جکڑ لیتا ہے۔'' وہ کہہ رہی تھیں۔ مشعل خاموشی سے سن رہی تھیں۔ اس نے انہیں خاموش کرنے کی کوشش نہیں کی۔
ان کی کسی بات کو جھٹلایا نہیں۔ وہ یہی چاہتی تھیں۔
وہ جانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئیں۔
پیچھے بے جی نے بے حد اصرار سے انہیں روکا تھا۔ وہ رکتی تو نہیں، مگر ٹیبل پر سجی ڈشز سے اٹھتی اشتہا انگیز خوشبوؤں نے ان کے قدم جکڑ لئے تھے۔ اعلیٰ لباس زیب تن کرنے، مہنگے ترین زیورات استعمال کرنے کے علاوہ وہ اچھا اور لذیذ کھانا بھی انہیں خوب پسند تھا۔ سو دل للچانے کے باوجود اس طرح نخروں سے بیٹھی تھیں گویا بے جی کی سات پشتوں پر احسانِ عظیم کر رہی ہوں۔

□●□

''سائرہ...... سائرہ بیٹی! کیا ہوا...... کیا کہہ رہے تھے باقر میاں؟''
زرینہ، سائرہ کے قریب بیٹھی ہوئی فکرمندی سے گویا ہوئیں جو چند لمحے قبل فون پر اپنے شوہر سے گفتگو کرنے کے بعد وہیں کرسی پر رنجیدہ سی بیٹھ گئی تھی۔ زرینہ کے دل میں تو فون آتے ہی کھد بد لگ گئی تھی گفتگو کے دوران وہ بلاوجہ ہی وہاں چکر لگاتی رہی تھیں۔ اس کے ریسیور رکھتے ہی قریب آ کر گویا ہوئی تھیں۔
''وہ پوچھ رہے تھے کہ ابھی تک رقم لے کر کیوں نہیں آئیں۔ وہاں لوگ انہیں پریشان کر رہے ہیں۔ کھانا پینا حرام کر ڈالا ہے۔ قرض داروں کے خوف سے انہوں نے گھر سے باہر نکلنا چھوڑ دیا ہے۔'' اس کی بھیگی آواز میں آنسوؤں کی آمیزش تھی۔
''کیا اس کا باپ یہاں کوئی خزانہ چھوڑ کر مر گیا؟'' انہیں تو پتنگے لگ گئے۔ اپنے مخصوص جلے بھنے انداز میں وہ چیخ پا ہوئیں۔ ''جولاٹ صاحب کی اولاد ہر چھ ماہ بعد رقم لے کر ہضم کر جاتا ہے۔ بدبخت کے کبھی بھی مطالبات پورے نہیں ہوتے اور ہوں گے بھی کیسے۔ نیت ہی نہیں بھرتی، سسرال کو بینک سمجھ لیا اور بیوی کو چیک، جب دل چاہا رقم بتائی، بھیج دیا کہ بھئی جاؤ اور لے آؤ۔'' وہ تیز تیز بول رہی تھیں۔ ان کی پڑوسن حمیدہ جو کسی کام سے آئی تھیں انہیں چیختے دیکھ کر متجسس سی اندر آئی تھیں۔
''کیا ہوا زرینہ! کیوں غصے ہو رہی ہو۔ اور سائرہ کیوں رو رہی ہے؟''
''اپنے نصیبوں کو رو رہی ہے سائرہ...... قسمت پھوٹ گئی میری بچی کی...... کیا بدذات ڈاکو ل گیا میری بچی کو۔'' وہ ماتم زدہ لہجے میں گویا تھیں۔
''ہائیں...... کیا اب ڈاکے ڈالنے شروع کر دیئے باقر میاں نے؟'' وہ حیرت سے آنکھیں نکال کر بولیں۔
''لو اب نہیں، بہت پہلے سے انہوں نے یہ کام شروع کر رکھا ہے اور یہ شوق صرف وہ سسرال میں ہی پورا کرتے ہیں۔ یہیں سے اتنا مل جاتا ہے کہ کہیں باہر ہاتھ پاؤں چلانے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی۔''
''اچھا پھر اس نے سائرہ بیٹی کو رقم لینے بھیج دیا ہے؟''
''ہاں...... اور رقم بھی اتنی ہے کہ میں نہیں دے سکتی۔ کہاں سے دوں بھلا؟ سائرہ کے ابا کوئی دولت جائیداد چھوڑ کر مرے نہیں، سرکاری نوکری پیشہ شخص تھے وہ۔ اور تھے بھی بے حد ایماندار۔ اوپر کی آمدنی کو کبھی ہاتھ نہیں لگایا۔ اب وہی بیٹے کا حال ہے ورنہ اصغر کے ساتھی سب ہی نوٹوں میں کھیل رہے ہیں۔ کاروں اور بنگلوں کے مالک بنے ہوئے ہیں۔''
''اچھی بات ہے نا اماں...... قبر میں کوٹھی، بنگلے، دولت و کاریں نہیں جائیں گی، صرف اعمال جائیں گے۔ اللہ کرے بھائی اسی طرح ایمانداری کا دامن تھامے رہیں، زندگی تو ایک دھوکا ہے۔ نہ معلوم کب دغا دے جائے۔''
سائرہ نے موضوع بدلنے کے لئے بات کی تھی اور خاموشی سے آنسو صاف کر لئے تھے۔ وہ حساس تھی۔ اپنی مجبوری اور باقر کی خودغرضی کو بخوبی جانتی تھی اور ماں بھائی کے حالات سے بھی واقف تھی۔
اس کی خوددار طبیعت بار بار ماں کے در پر ہاتھ پھیلانے کو نہ چاہتی تھی مگر باقر جب دھمکی دیتا کہ وہ دوسری شادی کر لے گا اور اسے طلاق دے کر ہمیشہ کے لئے گھر بھیج دے گا تو بس یہی طلاق کا خوف اس کی خودداری پر غالب آجاتا تھا پھر نہ چاہتے ہوئے بھی وہ مانگنے چلی آتی تھی۔
''بیٹی! یہی باتیں تم اپنے میاں کو کیوں نہیں سمجھاتیں؟ دیکھو نا اس طرح اچھا تھوڑی لگتا ہے۔ پھر وہ ایک ہی تو داماد نہیں ہیں اور بھی تو تین داماد ہیں۔ کبھی ان کے کانوں میں یہ بات پڑ گئی تو بہت برا ہوگا۔'' حمیدہ نے سائرہ کی طرف دیکھتے ہوئے ناصحانہ انداز میں کہا۔
''وہ تینوں داماد میرے ہیرا ہیں ہیرا...... بڑی عزت کرتے ہیں۔'' زرینہ فخریہ لہجے میں گویا ہوئیں۔
''دامادوں کو ہیرا سے کیڑا بننے میں کوئی دیر نہیں لگتی۔ بڑی حریصانہ طبیعت ہوتی ہے ان لوگوں کی سسرال کے معاملوں میں۔ بہوؤں سے زیادہ کائیاں اور خطرناک داماد ثابت ہوتے ہیں۔'' وہ قائل کرنے والے لہجے میں گویا تھیں۔
''میری بچی ماں نہیں بنی...... بس یہی خطا ہے اس بدنصیب کی، اس خامی کی بنا پر میاں نے انگلیوں پر نچا رکھا ہے ورنہ میری بیٹی میں کوئی عیب نہیں ہے۔ گھڑ ہے، سلیقے مند ہے، سسرال میں بھی ہر ایک کی خدمت کرتی ہے۔ پھر بھی کم بختوں کے دل موم نہیں ہوتے۔''
''مجھے تو اس کی ساس شکل سے ہی چنڈال لگتی ہے۔ یقیناً اس نے تعویذ گنڈے کروا کر بیٹے کو قابو میں کر رکھا ہے۔'' حمیدہ کو نئی سوجھی تھی۔
''نہیں خالہ! ایسی بات نہیں ہے۔ وہ......''
''تمہیں کیا معلوم، آج کل لوگ اپنا سکہ جمانے کے لئے کیسے کیسے کام کرتے ہیں۔'' وہ اس کی بات قطع کر کے پُریقین لہجے میں گویا ہوئیں۔ ان کی بات سن کر زرینہ کا بھی ماتھا ٹھنکا۔ انہیں بھی کچھ ان کی بات میں صداقت محسوس ہوئی۔
''میں نے تو کبھی اس بات کو محسوس ہی نہ کیا...... تم نے تو بالکل نئی راہ دکھائی حمیدہ۔''
''خود ہی سوچو...... کون سا مرد ہے جو آج کل کے دور میں بیوی کو اہمیت نہ دے۔ یہ تو کوئی چکر ہی لگتا ہے جو آدمی بیوی چھوڑ کر اطمینان سے بیٹھ جائے۔''
''ہاں یہ بات تو تم نے سچ کہی۔ دور ہی کیوں جاؤ، اپنے اصغر کو ہی لے لو۔ کتنی مجھ سے محبت کرتا ہے مگر بیوی کے خلاف ایک لفظ نہیں سن سکتا۔ بیوی میکے چلی جائے تو رات دن وہاں کے چکر لگاتا ہے۔ سسرالیوں کی آؤ بھگت تو پوچھو ہی نہ۔''
''آج کل ایسے ہی ہتھکنڈے اپنائے جاتے ہیں...... میں تو بہت واقف ہوں ایسے کاموں سے۔'' وہ رازدارانہ انداز میں کہتی ہوئی ان کی جانب کھسک گئی تھیں۔
''کیا تم کسی ایسے کرنے والے کو جانتی ہو جو میری بچی کی زندگی سدھار دے۔''
گھر میں ان تینوں کے علاوہ کوئی اور نہ تھا پھر بھی وہ اس موضوع پر سرگوشیوں میں بات کر رہی تھیں۔
''ہاں جانتی ہوں میں...... ایک ہیں اللہ والے۔ بہت پہنچی ہوئی ہستی ہیں۔''
''سچ؟ کبھی تم نے کوئی کام کروایا ہے؟'' زرینہ ایک دم پُرجوش ہوگئیں۔
''کوئی ایک کام؟ بہت کام کروائے ہیں۔'' وہ فخریہ انداز میں مسکرائیں۔
''اماں! یہ کن چکروں میں پڑ رہی ہیں آپ؟'' سائرہ ناگوار لہجے میں بولی۔

"یہ کن چکروں سے کیا مراد؟ یہ تو ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جہاں دوا اثر نہ کرے وہاں دعا اثر دکھاتی ہے۔" انہوں نے ڈپٹتے ہوئے کہا۔ "چلو جا کر حمیدہ کے لئے چائے بناؤ۔"
وہ انہیں مطلب برآری کے لئے موزوں لگیں تو انہیں ان کی خاطر کا بھی خیال آیا۔ سارہ جو پہلے ہی اس کام کے لئے اٹھ رہی تھی ان کے کہنے سے مزید پھرتی سے گئی۔

□●□

موسم بدل رہا تھا۔
گرمیاں رخصت ہو رہی تھیں، سردیوں کی آمد آمد تھی۔ بدلتے موسم نے ماحول میں ایک اداسی و بے کلی سی بھر دی تھی۔
وہ جو رنگوں، روشنیوں اور ہنگاموں میں زندگی بسر کرنے کی عادی تھی، ان وحشت بھری اداسیوں میں گھٹ کر رہ گئی تھی۔
رافعہ ایک مرتبہ کے بعد دوبارہ نہیں آئی تھیں اور نہ جاتے وقت اسے گھر آنے کی دعوت دے کر گئی تھیں۔ اسے یہ بات بری طرح کھلی تھی۔
انا پرست وہ سدا کی تھی، معمولی سے معمولی بات فوراً نوٹ کرتی تھی سو چاہنے کے باوجود پھپھو کی طرف نہیں گئی تھی۔
مگر دل کسی ضدی بچے کی طرح ہمک ہمک کر وہاں جانے کی ضد کر رہا تھا۔ دل کی بے سکونی تو اسی دم سے سوا تھی جب اسے معلوم ہوا تھا کہ جوجو نے اس کی شادی کی خبر سن کر صدمے سے خودکشی کر کے جان دینے کی کوشش کی تھی۔ اس انکشاف نے اس کے اندر سوئی ہوئی محبت کو از سر نو بیدار کر ڈالا تھا۔ اب وہ اسی کشمکش کا شکار ہو کر ذہنی تھکن کا شکار ہو گئی تھی۔ پھر موسم کی تبدیلی اور ذہنی تھکاوٹ نے اسے بخار میں مبتلا کر ڈالا تھا۔
کھانا اس نے کمرے میں ہی کھایا تھا۔ بخار کی شدت کے باعث نامعلوم کس وقت اس کی آنکھ لگ گئی۔ وہ وہیں بیڈ پر لیٹ گئی۔ پھر اس کی آنکھ شاہ ویز کے مسلسل پکارنے پر کھلی تھی۔
"کیا ہے؟" وہ اسے بیڈ کے قریب کچھ جھکے دیکھ کر غنودگی میں بولی۔
"محترمہ میں آپ سے گزارش کر رہا ہوں کہ سونا چاہتا ہوں۔" اس نے اسی طرح کھڑے کھڑے قدرے جھک کر کہا۔
"تو سو جاؤ..... کس نے منع کیا ہے؟" کچی نیند ابھی اس کے حواسوں پر سوار تھی۔
"اجازت نہیں لے رہا، آپ سے عرض کر رہا ہوں کہ آپ اپنی زلفوں کو سمیٹئے کیونکہ ان کی چھاؤں میں سونے کا قطعی ارادہ نہیں رکھتا۔" طنز میں ہمیشہ اس کا لہجہ از حد مہذب و شائستہ ہو جایا کرتا تھا۔
اس کی خوبصورت آنکھوں میں عجیب کاٹ و مسکراہٹ میں پنہاں تمسخر نے لمحوں میں اس کی نیند اڑا دی اور وہ جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔
"ہونہہ..... ہزار بار تھوکتی ہوں میں اس گھٹیا بیڈ پر۔"
"کوئی بات نہیں..... تھوک کر چاٹنا، آپ جیسے لوگوں کی عادت ہوتی ہے۔" وہ کہاں اس سے دبنے والا تھا سو اطمینان سے کہتا ہوا بیڈ پر دراز ہو گیا اور ہاتھ بڑھا کر ٹیبل لیمپ آف کر دیئے تھے۔
"مجھے یہاں نہیں رہنا..... میں یہاں سے چلی جاؤں گی۔" اندھیرے میں اس کی زہریلی آواز ابھری تھی۔
"کہاں..... اپنی پھپھو صاحبہ کے پاس؟"
"ہاں..... بلکہ جوجو کے پاس۔" اس کے لہجے میں عجیب سا طنز تھا۔ وہ جو دن بھر کا تھکا ہوا تھا اور اب سو کر اپنے اعصاب پُرسکون کرنا چاہتا تھا، ہلکے پھلکے انداز میں کہی گئی اپنی بات پر مشعل کے لبوں سے نکلنے والے لفظوں نے گویا اس کے اندر لاوا دہکا دیا تھا۔
اسے ایسا لگا جیسے ہزاروں سانپ اسے ڈسنے لگے ہوں۔
"کیا کہا تم نے.....؟" اس نے ہاتھ بڑھا کر ٹیبل لیمپ آن کیا اور اس کی جانب گھورتے ہوئے سرد لہجے میں استفسار کیا۔
"وہی جو تم نے سنا۔" وہ شانے اچکا کر ادا سے گویا ہوئی۔
"جوجو..... ہونہہ، کان کھول کر سن لو، جوجو کا جوک تمہارے میری زندگی میں شامل ہونے کے ساتھ ہی ختم ہو گیا تھا اس لئے اب دوبارہ تمہارے لبوں پر اس کا نام نہیں آنا چاہئے۔ انڈر اسٹینڈ۔"
آنِ واحد میں اس کی آنکھوں سے غصے کی چنگاریاں سی نکلنے لگی تھیں۔
"میں تمہیں پہلے بھی ہزار بار کہہ چکی ہوں اور اب بھی کہہ رہی ہوں، میں اس رشتے کو نہیں مانتی، اس نام نہاد تعلق کو توڑنا چاہتی ہوں۔" وہ کھلے بالوں کو اسکارف میں باندھتے ہوئے ہٹ دھرم لہجے میں کہہ رہی تھی۔
"ہمارا تعلق، ہمارا رشتہ جوڑنا جس قدر آسان تھا توڑنا اتنا ہی کٹھن بلکہ ناممکن ہے..... بہتر یہی ہوگا کہ مکمل کوشش اس بندھن کو مضبوط کرنے میں لگاؤ..... ساری حماقتیں اب ختم کر ڈالو۔"
"اسٹوپڈ میں نہیں تم ہو جو سمجھتے ہو کہ مجھے ہمیشہ اپنی قید میں رکھو گے۔"
"قیدی تم خود بن گئی ہو اپنی ضد کی، اپنی انا کی۔ میں کسی پرندے کو قید رکھنے کا قائل نہیں ہوں..... پھر کسی انسان کو قید رکھنے کا گناہ کیسے کر سکتا ہوں؟ تم سمجھنے کی کوشش کرو۔" اس نے تحمل سے سمجھانا چاہا۔
"نہیں سمجھنا مجھے کچھ..... جب یہاں مجھے رہنا ہی نہیں ہے تو سمجھ کر کیا کروں گی؟" وہ باؤں چیخ کر چیخی تھی۔
"میری نرمی سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش مت کرو۔"
"مجھے تمہاری نرمی، گرمی سے کوئی سروکار نہیں ہے، میں اس فضول رشتے کو مزید برداشت نہیں کر سکتی مسٹر شاہ ویز خان! بہتر یہی ہوگا کہ تم مجھے ڈائیورس دے دو، تم میرے اسٹینڈرڈ کے نہیں ہو اور نہ ہی میرے ساتھ کبھی انڈر اسٹینڈنگ ہو سکتی ہے۔ میں نے اتنا وقت یہاں گزارا صرف پاپا کے فیصلے کا احترام کرتے ہوئے، ان کی خواہش کی خاطر۔ لیکن اب میری برداشت کی انرجی فیل ہو چکی ہے۔ میں صبح چلی جاؤں گی۔"
پنک نائٹی میں اس کے حسین چہرے پر از حد بے زاری اور لاتعلقی تھی۔ وہ بیڈ کے قریب ہی کھڑی تھی۔ اس کے تیور بگڑے ہوئے اور انداز فیصلہ کن تھا۔
شاہ ویز اٹھ کر بیٹھ گیا۔
"میرے لئے یہ تعلق توڑنا ناممکن ہے۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔
"کیوں؟ اوہ، مجھ سے تعلق توڑنا، مطلب دولت سے تعلق توڑنا ہے..... میں جانتی ہوں دولت کی طلب نے ہی تمہیں یہ کھیل کھیلنے پر مجبور کیا ہے۔"
"تم جو بھی سمجھو، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔"
"مجھے اعتراض ہے۔ مجھے تمہاری صورت سے نفرت ہے۔ تمہارے گھر، تم سے وابستہ ہر چیز سے نفرت ہے اور یہ نفرت کی انتہا ہے کہ میں تمہارے ساتھ اب نہیں رہنا چاہتی، مجھے تم سے کوئی انسیت نہیں ہے نہ مجھے تمہاری پرواہ ہے۔ میرے سارے احساسات، تمام جذبات جوجو کے لئے ہیں۔" وہ گویا ہر قسم کے نازک احساسات سے عاری سحر زدہ لہجے میں کہہ رہی تھی۔
وہ پہلے ہی اس کی جذباتیت سے آگاہ تھا۔ پھر جوجو کے ساتھ اس کی دوستی کے آزادانہ مظاہرے دیکھ بھی چکا تھا۔ شاہ ویز کے لئے یہ سب نیا نہ تھا۔ وہ اس سے ایسی باتوں کی توقع رکھتا تھا مگر توقع اور مشاہدہ دو علیحدہ قسمیں ہیں۔ توقع نے اسے مطمئن کر رکھا تھا مگر روبرو مشاہدہ تکلیف دہ اور ناقابل برداشت تھا۔
بے شک اس نے اسے صرف اپنا نام دیا، بیوی کا درجہ نہیں دیا مگر صرف نام کے حوالے سے ہی اس کے منہ سے نکلنے والے جوجو کے لئے الفاظ اس کی مردانگی و غیرت پر تازیانہ بن کر لگ رہے تھے جن پر وہ بمشکل ضبط کئے ہوئے تھے جب کہ مشعل پر تو جیسے کوئی دیوانگی طاری ہو گئی تھی۔ وہ جیسے خود فراموشی کے عالم میں کہے جا رہی تھی۔
"جوجو کے ساتھ سے پہلے میں خود کو لڑکی ہی نہیں سمجھتی تھی۔ پاپا کی شخصیت سے متاثر ہو کر میرے سارے شوق سب کھیل حتیٰ کہ لباس و انداز بھی مردانہ تھے۔ پھر جوجو کا ساتھ ملا تو مجھے محسوس ہوا کہ میں لڑکی ہوں۔
میرے سینے میں بھی دل ہے۔
میرے جذبات ہیں۔
میری آرزوئیں اور امنگیں ہیں۔
وہ میری بانہوں میں بانہیں ڈال کر مرغزاروں کی سیر کرتا تو ہوائیں گیت گاتی تھیں، ستارے گنگناتے تھے، جھرنوں کے سرگم میں مجھے اپنے دل کی دھڑکن سنائی دیتی تھی۔
سبزے پر اس کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنا اچھا لگتا تھا۔
جب وہ میری شان میں قصیدے پڑھتا تو مجھے محسوس ہوتا ساری کائنات میرے قدموں کے نیچے چلی آئی ہے اور میں جوجو کا ہاتھ تھامے نیلے آکاش کی عمیق وسعتوں....."
"شٹ اپ..... شٹ یور ماؤتھ۔" اس کا حوصلہ، اس کی برداشت، اس کا ضبط جواب دے گیا اور وہ چیخ اٹھا۔
وہ گویا تصورات کی دنیا میں جوجو کے سنگ تھی۔ اس کے ایک دم اشتعال سے چیخنے پر وہ حواسوں میں لوٹ آئی تھی۔
اس کا غصے سے سرخ چہرہ لہو رنگ آنکھیں دیکھ کر وہ کاٹ دار مسکراہٹ سے گویا ہوئی۔
"اب میرا منہ اس وقت تک بند رہے گا جب تک تم مجھے ڈائیورس دے کر یہاں سے نہیں بھیجو گے۔"
"ہرگز نہیں..... میں کبھی بھی ایسا نہیں کروں گا۔ اس گھر سے تمہاری روح تو جا سکتی ہے مگر جسم نہیں۔" بڑی مشکل سے وہ خود پر ضبط کئے ہوئے تھا۔

''میں نے تو سنا تھا مڈل کلاس مرد بڑے جذباتی ہوتے ہیں۔ عورت کے منہ سے کسی غیر مرد کا نام سن کر اسی وقت اسے طلاق دے دیتے ہیں ...... مگر تم میں شاید حمیت نہیں ہے۔'' وہ چبا چبا کے لگا رہی تھی۔

''خاموش ہو جاؤ ...... مت میرے حوصلے کو آزمائش میں ڈالو۔''

''چچ ...... چچ ...... دولت بھی کیا شے ہے۔ بندے کو کس حد تک گرا دیتی ہے کہ وہ اپنے وقار، اپنی حمیت، اپنی مردانگی تک کو کچل ڈالتا ہے۔ کان کھول کر سن لو، میں جوجو سے ملوں گی۔''

''تم اس سے نہیں مل سکتیں۔'' وہ قریب آ کر غرایا۔

''کون روکے گا مجھے ...... تم؟ ہوں، حیثیت کیا ہے تمہاری، صرف ایک نمائشی شوہر کی۔ دولت کے حریص منافق شخص کی میں کبھی پروا نہیں کرتی اور نہ ہی کروں گی۔''

ایک عرصے بعد پھر اس پر پرانا روپ چڑھا تھا، پُراعتماد، بے باک، نڈر، ہٹ دھرم، ضدی اور اپنی بات منوانے والی سرشت عود کر آئی تھی۔

وہ برداشت کر رہا تھا۔ ضبط اور کڑے ضبط کے تپتے نئے جہانوں سے گزر رہا تھا۔ مشعل کے لبوں سے نکلا ایک ایک جملہ اس کی حمیت، انا، قوتِ برداشت و حوصلے کی ردا کو تار تار کرتا جا رہا تھا۔

''جوجو مجھ سے محبت کرتا ہے۔ میری شادی کی خبر سن کر اس نے سوسائڈ کی کوشش کی تھی۔ تھینکس گاڈ، وہ بچ گیا۔ اگر وہ مر جاتا تو میں بھی مر جاتی۔ میں اس کے بغیر کیسے جی سکتی تھی ...... جوجو ...... مائی جوجو ...... مائی ہارٹ ...... مائی لائف ...... مائی لور جوجو ......''

ضبط کی سرحدیں عبور ہو چکی تھیں۔

برداشت و حوصلے کی ردا کی دھجیاں بکھر گئی تھیں ...... ایک دہکتا ہوا الاؤ تھا، شعلے اگلتا لاوا جو شاہ ویز کی نس نس میں بہہ اٹھا ...... اور اس کی رگ رگ سے چنگاریاں نکلنے لگیں۔

وہ کسی شعلے کی مانند ہی اس کی جانب بڑھا تھا اور میکانکی انداز میں اس کا دایاں ہاتھ متواتر چلنے لگا۔

تڑاخ ...... تڑاخ ...... تڑاخ ...... کی زوردار آوازیں کمرے کی خاموش فضا میں ارتعاش پیدا کرنے لگیں۔

تھپڑ اتنے زوردار اور طاقتور تھے کہ وہ بے ساختہ درد سے چیخنے لگی تھی۔

''میں نے کہا تھا، آئندہ کبھی میرے حوصلے کا امتحان مت لینا ...... تمہاری زبان درازی بلکہ بدزبان درازی کا علاج میرے ہاتھ با آسانی کر سکتے ہیں۔ تم سمجھتی ہو اس طرح چیپ گفتگو کے ذریعے تم مجھے مشتعل کر کے اپنا کام آسان کر لوگی۔ میں عام سطحی اور نام نہاد غیرت مندی کا مظاہرہ کر کے تمہیں ڈائیورس دے دوں گا اور تم آزاد ہو جاؤ گی۔ نہیں ...... یہ ممکن ہی نہیں ...... تمہاری اس چیپ گفتگو سے میں کسی انتہائی فیصلے پر نہیں پہنچا لیکن یہ ضرور ہوا ہے کہ تمہاری اندر کی غلاظت پوری طرح عیاں ہو گئی ہے۔ تم ایک بدکردار، بدطینت و بدخصائل لڑکی ہو بلکہ صنفِ نازک کے نام پر سیاہ دھبہ ہو۔'' شاہ ویز اسے نفرت انگیز نگاہوں سے گھورتے ہوئے کہہ رہا تھا جب کہ وہ درد سے چٹختے اعصاب، تھپڑوں کی شدت سے سُن چہرہ اور آنکھوں میں پھیلتے پانی سے جلن کا احساس لئے ایک ٹک اسے دیکھ رہی تھی۔

دونوں ہاتھ اس کے ابھی تک غیر ارادی طور پر رخساروں پر تھے۔

ساکت نگاہوں سے شاہ ویز کی جنوں خیزیاں دیکھ رہی تھی۔

''مجھ سے چھٹکارا صرف موت کی صورت میں مل سکتا ہے۔''

''مر گئی ہوں میں ...... میری موت اسی دن واقع ہو گئی تھی جب تم جیسے وحشی سے میرا تعلق بندھا تھا، ان آتی جاتی سانسوں کا نام زندگی نہیں ہے۔ اس سے بہتر ہے تم میرا گلا دبا دو، نجات دلا دو اس اذیت سے، مار دو ...... مار دو مجھے ...... میں جینا نہیں چاہتی۔'' اس کا لہجہ بھیگنا شروع ہو گیا تھا لیکن وہ رونا نہیں چاہتی تھی۔ اس سنگدل و بے درد شخص کے سامنے آنسو بہانے کا مطلب ہے اپنی شکست تسلیم کرنا۔

اس کے آگے خود کو بے وقعت و ارزاں کرنا۔

''اگر تمہاری پہلی جیسی حرکتیں رہیں تو خود ہی جہنم رسید ہو جاؤ گی۔ مجھے اپنے ہاتھ آلودہ کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔'' اس وقت اس کا غصہ، بدگمانی عروج پر تھی۔

ازحد کراہیت و نفرت کا احساس اس کے لہجے اور آنکھوں سے ظاہر تھا۔

مشعل اس کے جارحانہ تیوروں سے خائف ہو کر خاموش ہو گئی تھی۔ زبان درازی اور بدتمیزی میں وہ اس سے کبھی ہار نہیں مانتی تھی مگر شاہ ویز کی ہاتھ درازی اس کی زبان درازی پر مکمل طور پر حاوی ہو چکی تھی۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ شاہ ویز بیڈ پر دراز ہو گیا۔ وہ صوفے پر بیٹھی تھی۔ زبان خاموش تھی لیکن اندر ایک حشر برپا تھا۔

□●□

فرح رضوی کئی گھنٹوں سے لائبریری میں بیٹھی کسی کتاب کے مطالعے میں غرق تھیں۔ مطالعہ ان کا جنون کی حد تک شوق بن چکا تھا۔

جب بھی ان کو فراغت ملتی وہ اپنا زیادہ تر وقت یہیں گزارتی تھیں۔ اب بھی وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر مصروف تھیں اور ایسے میں حرا سخت بوریت کا شکار ہو جاتی تھیں۔

ویسے تو وہ فطرتاً کم گو اور خشک طبیعت کی مالک تھیں۔ ازحد تنہائی پسند اور سوچوں میں گم رہنا ان کی سرشت تھی لیکن فرح رضوی سے انہیں بہت محبت و لگاؤ تھا اور ان کی مسلسل بات چیت کرنے کی عادت سے وہ کافی بہل جاتی تھیں۔

جب انہیں مطالعے کا جنون اٹھتا تو وہ اسی طرح بوریت محسوس کرتیں اور اپنے گھر میں بولائی بولائی پھرتی تھیں۔

اب بھی ایسا ہی تھا۔ وہ ان کے ڈسٹرب ہونے کے خیال سے دبے قدموں کئی چکر یہاں کے لگا چکی تھیں اور انہیں مصروف دیکھ کر خاموشی سے چلی جاتی تھیں۔ لیکن اس بار کتاب پر نگاہیں دوڑاتے ہوئے وہ گویا ہوئیں۔

''حرا! بیٹھ جاؤ ...... کیوں بار بار چکر لگا رہی ہو؟''

''ارے آپ مجھے محسوس کر رہی تھیں؟'' ان کے لبوں پر خفت آمیز مسکراہٹ پھیلی تھی جس سے پورا چہرہ روشن لگ رہا تھا۔

''ہاں ...... بالکل محسوس کر رہی ہوں۔'' جواباً وہ بھی شوخی سے گویا ہوئیں۔

''سوری ...... آپ یہاں آنے کے بعد باہر نکلنا بھول جاتی ہیں ...... اور آپ جانتی ہیں کہ آپ کے بغیر میں نہیں رہ سکتی۔''

''اچھا بابا ...... بیٹھ تو جاؤ۔'' انہوں نے بہن کا ہاتھ پکڑ کر بٹھاتے ہوئے کہا۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا کس طرح اتنا وقت آپ ان کتابوں کے ہمراہ گزار لیتی ہیں ...... مجھے تو کتابوں میں پھیلے لفظوں میں کوئی چارم نہیں محسوس ہوتا۔''

''محسوس کرو گی تو یقیناً ہوگا ...... میرے خیال میں کتابوں سے بڑھ کر ہمارا کوئی دوست، کوئی ساتھی نہیں ہو سکتا۔ کتابوں سے دوستی کر کے تو دیکھو، خود ہی مان جاؤ گی۔ گھر بیٹھے بیٹھے یہ تمہیں اگلے پچھلے زمانوں کی سیر کروائیں گی۔ تمہاری تنہائی شیئر کریں گی۔ تمہارے لبوں پر مسکراہٹیں بکھیریں گی۔ معلومات کے خزانے ملیں گے۔ سکون، امن، چین کی دنیائیں ان کتابوں میں آباد ہیں ...... تم ایک بار ان سے دوستی تو کر کے دیکھو۔ ایک اچھی کتاب سے بڑھ کر کوئی دوست نہیں ہو سکتا۔''

''میں شروع سے ہی نکمی ہوں اس معاملے میں۔ اخبار، رسالے، ڈائجسٹ مجھ سے پڑھے ہی نہیں جاتے۔ کیا کروں کہ اپنی طبیعت کے رجحان کی بات ہوتی ہے۔ اب اٹھیں یہاں سے ...... بہت وقت ہو گیا ہے۔'' حرا کے اصرار پر انہیں وہاں سے اٹھنا پڑا۔ وہاں سے وہ لیونگ روم میں آ کر بیٹھ گئیں۔

''ہوں ...... اب کہو، کیا بات ہے؟'' وہ کشنز کے سہارے نیم دراز ہو کر گویا ہوئیں۔

''میں نے یہ سوچا ہے آپی! ہم اگر اسی طرح ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہے تو ایک وقت ایسا آئے گا کہ ہمارے پاس کھانے کے لئے علاوہ خاک کے اور کچھ نہ ہوگا۔'' حرا چند لمحے توقف کے بعد فکرمندی سے گویا ہوئیں۔

''مشعل انڈسٹریز میں ہم نے رقم لگا دی ہے۔ ایک ماہ ہو چکا ہے، دو ماہ بعد ہمیں رقم ملنا شروع ہو جائے گی۔''

''مگر کب تک کھائیں گے ہم؟ ایک نہ ایک دن منافع ملنا بند ہو جائے گا اور ہم خالی ہاتھ ہو جائیں گے۔ پھر کیا کریں گے؟''

''میں نے تو کبھی اس انداز میں سوچا ہی نہیں۔'' ان کی آنکھوں میں بھی تفکرات کی پرچھائیاں ابھری تھیں۔ وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئیں۔

''میں نے یہ سوچا ہے ہم کوئی چھوٹا سا بزنس اسٹارٹ کریں، کوئی ایسا بزنس جس سے ہماری فکر بھی ختم ہو جائے اور دوسری ضرورت مند عورتوں کو بھی باعزت کام مل جائے جس سے وہ اپنی ضروریاتِ زندگی کا بوجھ بٹا سکیں۔''

''ایسا کیا کام ہو سکتا ہے؟ پھر ایسی ہنرمند عورتیں ہمیں کہاں سے ملیں گی؟''

''آپی! ہنر اور ذہانت ہماری عورتوں میں بے مثال ہے۔ ضرورت ہے انہیں استعمال کے مواقع دینے کی۔ ہمارے ملک کی عورتیں بہت باصلاحیت و ہنرمند ہیں۔ زندگی کے ہر میدان میں وہ اپنا کردار، اپنے فرائض بخوبی انجام دے رہی ہیں۔''

''تم جانتی ہو، ہماری خواتین تین فیصد ناخواندہ ہیں۔''

''جی ...... اس کے باوجود وہ اپنی بساط و صلاحیت کو بروئے کار لا کر اپنے گھر، اپنے فرائض کی ادائیگی کرتی ہیں۔ گاؤں ہوں یا شہر ہر جگہ کڑی مشقت کرتی ہیں۔ کڑھائی، بُنائی، سلائی کرنے میں ماہر، امورِ خانہ داری میں طاق، کھیتوں، کھلیانوں میں مردوں کے شانہ بشانہ کام کرنے والی۔''

وہ چند لمحے توقف کے بعد پھر گویا ہوئیں۔

''تعلیم یافتہ ہیں تو اہم عہدوں پر ذمے داریاں نبھا رہی ہیں۔ ہماری عورت گاؤں کی ہو یا شہر کی، تعلیم یافتہ ہو یا ان پڑھ، اپنی ذمے داریاں بخوبی نبھا رہی ہے۔''

''ہاں ...... ہاں، اس سے کس کو انکار ہے۔ مگر بزنس کیا سوچا ہے تم نے؟ وہ کون سا کام ہے جو ہم با آسانی کروا سکیں؟''

''کل حمیدہ آ جائے، اس سے معلوم کروں گی۔''

''وہ ایک ہفتے کی چھٹی لے کر گئی ہوئی ہے۔ اس کی بیٹی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ کیوں نہ ایسا کریں ہم خود وہاں چلیں۔ حمیدہ بہت ہمدرد اور اچھی عورت ہے۔ برسوں سے ہمارے ہاں کام کر رہی ہے اور کبھی شکایت کا موقع نہیں دیتی۔ جا کر اس کی بیٹی کو دیکھ آئیں گے تو خوش ہو جائے گی۔ اور اس کی بستی میں دوسری عورتوں سے بھی معلومات کریں گے کہ وہ کون کون سے ہنر میں طاق ہیں۔''

حرا کو ان کا مشورہ پسند آیا اور وہ جانے کے لئے تیار ہو گئیں۔

□●□

وہ صبح اٹھا تو ذہن کو بوجھل محسوس کیا۔

معلوم نہیں یہ رات والی ٹینشن کا اثر تھا یا سوچوں نے اعصاب و بدن کو تھکن زدہ کر دیا تھا۔ وہ خود کو ازحد مضطرب محسوس کر رہا تھا۔

اس نے کھڑکی کا پردہ سرکا کر دیکھا۔ شاید رات کو بارش ہوئی تھی۔ فضا میں بھیگی مٹی کی دلآویز مہک رچی ہوئی تھی۔

اس نے بے اختیار لمبی لمبی سانسیں لے کر اس مہک کو اندر اتارا اور گویا پژمردگی و اضمحلال برف کی مانند پگھلنے لگا۔

وہ کافی دیر تک دھلے دھلائے سبز پتوں پر چمکتے پانی کے شفاف قطرے دیکھتا رہا۔ پھولوں کے رنگ بارش سے دھل کر مزید شوخ ہو رہے تھے۔ بادل ابھی بھی سیاہ تھے۔ خوفناک سا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ دھیرے دھیرے چلتی ہوا میں فرحت بخش ٹھنڈک تھی۔

ساتھی من چاہا ہو، حیات پُرسکون و مسرت سے لبریز ہو تو ہر موسم دلکش و پُر بہار لگتا ہے کہ اصل موسم تو بندے کے اندر ہوتا ہے۔

اس کے اندر کا موسم حبس زدہ و خزاں آلودہ تھا۔ ذہنی تفکرات نے اسے مضطرب و بے سکون کر ڈالا تھا۔ مستزاد رات مشعل کا اپنے سامنے بے باکی سے جو جو کے لئے جذبات کا اظہار اسے، اس کی حمیت کو بری طرح گھائل کر چکا تھا۔ وہ بمشکل اپنے آپ پر قابو پائے ہوئے تھا۔ ورنہ اس کی حمیت کا تقاضا تھا کہ مشعل کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔ مشعل کے متعلق ذہن میں خیال آتے ہی اس کے خون کی روانی شریانوں میں تیز ہو گئی۔ وہ کھڑکی سے ہٹ کر باتھ روم کی طرف بڑھ گیا۔ باتھ روم سے فارغ ہو کر آفس جانے کی تیاری کرنے لگا۔ اس دوران اس نے غلطی سے بھی اس کی طرف ایک نگاہ نہ ڈالی جو صوفے کی بجائے نیچے کارپٹ پر بے سدھ پڑی تھی۔

''مجھے تمہاری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی بیٹے۔ کیا بات ہے، نیند پوری نہیں ہوئی کیا؟'' ناشتے کی ٹیبل پر بے جی اسے دیکھتے ہوئے فکرمندی سے استفسار کرنے لگیں۔

''کچھ تھکن محسوس ہو رہی ہے بے جی! آپ فکر مت کریں...... ٹھیک ہو جاؤں گا۔'' اس کے وجیہہ چہرے پر دھیمی مسکراہٹ کافی افسردہ تھی۔

بے جی بے چین ہو گئیں۔

''خوش رہا کرو شاہ ویز! تمہیں افسردہ اور اُداس دیکھ کر میں خود کو مجرم محسوس کرتی ہوں...... مجھے یہ احساس بے کل کر ڈالتا ہے کہ میری جلد بازی، ناعاقبت اندیشی کی سزا تمہیں مل رہی ہے۔'' اس کی نگاہیں اس کے وجیہہ چہرے پر تھیں۔ گرے پینٹ کوٹ میں اس کی شاندار پرسنالٹی نمایاں تھی۔ ازحد سنجیدگی نے اس کے وقار کو جاذبیت بخشی تھی۔

وہ ایسا تھا جس کی چاہ ہر لڑکی کر سکتی ہے۔ پھر وہ لڑکی کیوں خود کو نہیں بدلتی...... کیوں قدر نہیں کرتی؟

''اچھا بے جی! میں جا رہا ہوں۔'' وہ بریف کیس لے کر اٹھا تو بے جی چونک اٹھیں اپنے خیالوں سے۔

''اچھا بیٹے! اللہ کے سپرد، کار دھیان سے چلانا۔'' حسب عادت وہ اسے گیٹ تک چھوڑنے آئیں۔ اور جب تک اس کی کار نگاہوں سے اوجھل نہ ہو گئی کھڑی ہاتھ ہلاتی رہیں۔ یہ ان کا روز کا معمول تھا۔

□●□

ساری رات سوتے جاگتے گزری تھی۔

شاہ ویز سے وہ بدظن پہلے دن سے ہی تھی۔ پھر اس کے خشک و سرد اہانت آمیز رویے نے ان کے درمیان فاصلوں کی خلیج کھڑی کر دی تھی۔

وہ اپنے حُسن و جوانی کی دل ربائی و رعنائی پر نازاں تھی۔ اس احساسِ تفاخر نے اسے بہت غرور اور خود پسندی بخشی تھی۔

اپنے بے تحاشہ حُسن کے زعم پر ہی اس نے فتح حاصل کی تھی مگر پہلی بار اسے شاہ ویز جیسے کٹھور و بے حس شخص سے شکست محسوس ہوئی تھی۔

اپنی انا، اپنی خودداری اسے بے حد عزیز تھی۔

شاہ ویز کا بار بار ہاتھ اٹھانا اسے احساسِ ذلت و توہین میں مبتلا کر گیا تھا اور اب وہ اس کے ساتھ ایک لمحہ بھی گزارنے پر رضامند نہ تھی۔

جب انسان کے اندر جذبات بپھرے ہوں تو پھر وہ نفع و نقصان کے متعلق ہرگز نہیں سوچتا۔ اس وقت وہ بھی نفرت کے جذبات کے طوفان میں گھری ہوئی تھی۔ اس دم ہر چیز سے نفرت و کراہیت محسوس ہو رہی تھی۔

ہر قیمت پر وہ یہ گھر چھوڑنا چاہتی تھی پھر کبھی دوبارہ نہ آنے کے لئے۔ اس وقت اس پر صرف ایک جنون سوار تھا کہ شاہ ویز نے اس پر ہاتھ اٹھایا ہے۔ ایک بار نہیں بار بار......

شاہ ویز کے بیدار ہونے سے قبل وہ جاگ گئی تھی اور اس کے تیار ہونے اور کمرے سے جانے تک بے حس و حرکت پڑی تھی۔ پھر اس کے کمرے سے جانے کے بعد وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

اس کے گھر سے آفس جانے کا انتظار اسے تھا۔ جانتی تھی اگر اس کے ارادے کی بھنک بھی اسے مل گئی تو وہ اسے قید کر ڈالے گا۔

اس نے فیصلہ کر لیا تھا، یہاں سے پھپھو جان کے پاس جانے کا۔ کل تک وہ خواہش کے باوجود اس لئے نہ جا سکی تھی کہ وہ اسے انوائٹ نہیں کر کے گئی تھیں۔ یہ بات اسے سخت ناگوار گزری تھی۔

یہ کل کی بات تھی اور اس کی انا پر کاری ضرب لگی تھی؟

جس طرح بڑا حادثہ چھوٹے حادثے کے اثر کو زائل کر دیتا ہے بالکل اسی طرح وہ یہ فراموش کر چکی تھی کہ وہ پھپھو کے ہاں بن بلائے جا رہی ہے۔

اسے احساس تھا تو صرف یہ کہ شاہ ویز نے اس پر ہاتھ اٹھایا ہے، اسے تھپڑ مارے ہیں، اس کی توہین و تذلیل کی ہے۔

منہ ہاتھ دھو کر اس نے کپڑے چینج کئے تھے۔ بالوں میں برش کرنے کے بعد انتظار کرنے لگی شاہ ویز کے گھر سے جانے کا۔ وقت مقررہ پر وہ گھر سے نکل گیا۔ احتیاطاً اس نے کھڑکی سے ذرا جھانک کر دیکھا۔ اس کی وائٹ کرولا سڑک پر فراٹے بھرتی لمحوں میں اوجھل ہو گئی تھی۔

''کاش یہ سفر تمہاری زندگی کا آخری سفر ثابت ہو کمینے انسان!''

اس نے کھڑکی سے ہٹتے ہوئے دل ہی دل میں اسے بددعا دی۔

اس کے ٹوٹے، بکھرے اعصاب تیزی سے حیرت انگیز طور پر حرکت کرنے لگے تھے۔

سامان وغیرہ اسے کچھ نہیں لینا تھا۔

اس نے صرف ہینڈ پرس لیا تھا۔ دروازہ آہستگی سے بند کر کے بنا آواز سیڑھیوں سے وہ نیچے اتر کر آئی تھی۔ لاؤنج میں خاموشی تھی۔

اس نے محتاط انداز میں لاؤنج سے ملحقہ بے جی کے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ بے جی جو صبح سویرے اٹھنے کی عادی تھیں، شاہ ویز کے جانے کے بعد ایک ڈیڑھ گھنٹہ سو جایا کرتی تھیں۔ اب بھی وہ اس کے منصوبے سے بے خبر اطمینان سے سو رہی تھیں۔ وہ اطمینان سے چلتی ہوئی گیٹ تک آئی، دروازے میں آٹو میٹک لاک تھا جو اندر باہر سے خود بخود والا کڈ ہو جایا کرتا تھا۔

اس نے آہستگی سے بٹن پُش کیا تھا۔ دروازہ کھول کر وہ باہر آئی۔ سرد ہوا کے جھونکوں نے باہر اس کا استقبال کیا تھا۔ موسم ابر آلود اور خنکی لئے ہوئے تھا۔ تیز بخار میں تپتے اس کے جسم میں کپکپی پیدا ہو گئی تھی لیکن اس نے خود کو سنبھال لیا تھا۔

راہداری عبور کر کے وہ باہر برآمدے میں آ گئی تھی جس سے چند سیڑھیاں عبور کر کے سامنے لان تھا اور لان سے تھوڑی دور گیٹ۔ اس کی خوش قسمتی تھی کہ اس وقت لان اور گیٹ خالی تھا نہ صرف خالی تھا بلکہ کھلا ہوا بھی تھا۔ شاید چوکیدار کسی ضروری کام سے چلا گیا تھا۔

اسے لگا نصیب بھی اس کا ساتھ دے رہا ہے جو چوکیدار غائب تھا، وہ بھی گیٹ وا کر کے۔ ورنہ جب سے شاہ ویز نے اس پر باہر نکلنے پر پابندی لگائی تھی، چوکیدار بھی بہت سختی سے اپنی ڈیوٹی انجام دینے لگا تھا۔

موقع غنیمت جان کر وہ تیزی سے گیٹ عبور کر گئی تھی۔ باہر سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ چند قدم چل کر اسے ٹیکسی مل گئی۔ وہ اطمینان سے بیٹھ گئی اور اسے لگا وہ قید سے آزاد ہو گئی ہو۔ ڈرائیور کو ایڈریس بتا کر سیٹ کی بیک سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

ساری ہمت، سارے حوصلے پھپھو کو دیکھ کر بھربھری مٹی کی طرح ڈھے گئے۔ بڑی بے تابی سے ان کی جانب بڑھی۔ وہ بھی اس کی دگرگوں حالت دیکھ کر افتاں و خیزاں رہ گئی تھیں۔ بڑے پریشان انداز میں انہوں نے اسے سینے سے لگایا تھا۔ اپنوں کی چاہت کی گرمی پاتے ہی وہ موم بن کر پگھلنے لگی۔ آنسوؤں کی یلغار اور ہونٹوں سے نکلنے والی آہ و فغاں کو اس نے ذرا نہیں روکا۔

''اتنی بری حالت ہے میری جان تمہاری۔ بخار سے پورا بدن جل رہا ہے۔ اور یہ چہرے پر کیسے نشانات ہیں......؟'' اس کے بے اختیار رونے پر وہ بوکھلائی تھیں۔ چہرے پر ثبت انگلیوں کے نشانات نے انہیں دنگ کر ڈالا تھا۔

''اس وحشی نے مارا ہے مجھے۔'' اس نے سسکتے ہوئے کہا۔

''وہاٹ...... وہاٹ......؟ اس جاہل نے تمہیں مارا...... اس دو ٹکے کے مرد کی یہ مجال کہ آپ پر ہاتھ اٹھائے؟'' اس کے رخساروں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ پُرطیش لہجے میں گویا تھیں۔

''پھپھو! وہ بالکل جنگلی ہے، ایک دم وحشی، خوب صورت احساسات تو اسے چھو کر بھی نہیں گزرے..... اس کے سینے میں دل نہیں پتھر ہے۔ اس پر کوئی جذبہ، کوئی کومل احساس اثر انداز نہیں ہوتا۔''

''آپ اندر چل کر لیٹو، میں ڈاکٹر کو بلاتی ہوں..... ٹمپریچر بہت ہو رہا ہے۔ اس کے بعد بات کریں گے۔'' وہ اسے سہارا دے کر کمرے میں لائیں پھر بیڈ پر لٹاتے ہوئے پریشان کن لہجے میں گویا ہوئیں۔

''پھپھو!'' اس نے ان کا ہاتھ پکڑ کر لجاجت سے کہا۔ ''میں اب کبھی بھی اس وحشی کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔ میں اس سے ڈائیورس لینا چاہتی ہوں..... وہ نہیں مان رہا۔''

''مائی سویٹ ہارٹ! فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں..... اب میں آ گئی ہوں نا، دیکھنا کس طرح اپنی جان کے مسئلے حل کرتی ہوں۔'' وہ اس کے سرہانے بیٹھ کر بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے مسکرا کر بولیں۔

''کیا آپ مجھے ڈائیورس دلوا دیں گی؟'' اس کی آنکھوں میں چمک ابھری تھی۔

''ہاں..... ہاں.....''

''کیا وہ ڈائیورس دے دے گا؟''

''وہ کیا اس کا باپ بھی دے گا، بس اب تم خاموش ہو کر لیٹ جاؤ۔ میں ڈاکٹر کو کال کرتی ہوں اور ملازمہ سے سوپ بنانے کا کہہ کر آتی ہوں۔''

□●□

صبح سے دوپہر ہونے کو آئی تھی۔ مشعل نے بیڈ ٹی مانگی تھی اور نہ ہی ناشتے کے لئے کہا تھا۔ بے جی ظہر کی نماز سے بھی فارغ ہو گئی تھیں۔

اب انہیں بے چینی لگ رہی تھی کہ کیا بات ہے جو اس نے ابھی تک کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔ وہ کمرے سے باہر تو نہیں آتی تھی، صرف انٹر کام پر اس کے آرڈرز ملا کرتے تھے۔ اس کے حکم کے مطابق ٹرالی دروازے کے قریب بے جی رکھ کر آ جاتی تھیں۔ وہ کھانا کر ٹرالی واپس دروازے کے باہر سرکا کر دروازہ لاک کر لیا کرتی تھی اور بے جی لے آیا کرتی تھیں۔

بے جی تذبذب کا شکار تھیں کہ کیا کریں؟ کیونکہ اس کی مرضی کے بغیر وہ کمرے میں جا نہیں سکتی تھیں۔ اسی الجھن میں وقت مزید بیت گیا۔

عصر کے بعد تو ان کی قوت برداشت بالکل ہی جواب دے گئی اور وہ پریشان سی اس کے کمرے کی طرف آ گئیں۔ خلاف توقع دروازہ لاکڈ ہونے کی بجائے معمولی سا وا تھا جو خلاف معمول تھا۔ ان کا دل انجانے وسوسوں سے لرزنے لگا۔ انہوں نے آگے بڑھ کر مشعل کو چند آوازیں دیں اور جواب نہ پا کر دروازہ کھول کر اندر چلی آئیں۔ کمرے میں مسحور کن خوشبوؤں نے ان کا استقبال کیا۔

''بہو..... بہو..... بیٹی کہاں ہو؟'' وہ کمرے کو خالی دیکھ کر ڈریسنگ روم اور پھر باتھ روم کے کھلے دروازوں سے جھانک کر آوازیں دے رہی تھیں۔ وہ موجود ہوتی تو جواب دیتی۔ وہ تو خود ان کی بے خبری میں جا چکی تھی۔ بے جی کی حالت غیر ہونے لگی۔ وہ اسے ہر جگہ دیکھ چکی تھیں۔ اس کا کوئی وجود نہ تھا۔

''چوکیدار! کہاں تھے؟..... کتنی بار کہا ہے گیٹ کے پاس سے نہیں ہٹا کرو۔'' گھر کی عزت کا سوال تھا، چوکیدار سے براہ راست تو یہ سوال نہیں کر سکتی تھیں کہ اس نے مشعل کو گھر سے جاتے ہوئے دیکھا ہے اس لئے تمہید باندھنی پڑی تھی۔

''اتنی رات سے ادھر ہی ہیں بڑا بیگم صاب!'' اس نے فخریہ لہجے میں کہا۔

وہ اندر آ گئیں۔ اتنا تو وہ سمجھ گئی تھیں وہ کسی وقت گھر سے چلی گئی ہے، کیوں گئی ہے؟ یہ انہیں معلوم نہ تھا۔ عجیب اندیشے و پریشانیاں انہیں گھیرے ہوئے تھیں۔

اس کی یہ حرکت انہیں ناگوار گزری تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہاں گئی ہے؟ کیوں گئی ہے؟ اور کس طرح گئی ہے؟ اس حرکت کا مقصد کیا ہے؟

کافی سوچ بچار کے بعد انہوں نے شاہ ویز کو فون کرنے کا ارادہ کیا کہ اس طرح اس کا معلوم ہو سکتا تھا۔ پہلے بھی اس کی پردہ پوشی کر کے وہ شاہ ویز کو پریشانی میں مبتلا کر چکی تھیں اور اب ایسا ممکن نہ رہا تھا۔

''ہیلو بے جی! خیریت ہے نا؟'' فون پر بے جی کی آواز سے ہی اسے کسی خطرے کی بو محسوس ہوتی تھی۔

''بیٹا وہ..... بہو..... گھر..... میں..... نہیں ہے۔''

''کب سے بے جی؟'' اس کی آواز ایک دم ہی سپاٹ و سرد ہو گئی۔

''معلوم نہیں..... میں انتظار کرنے کے بعد کمرے میں گئی تو وہ وہاں نہیں تھی اور چوکیدار سے معلوم کیا تو وہ کہہ رہا ہے وہ گیٹ کے پاس ہی رات سے بیٹھا ہوا ہے۔ مگر اس کی بات کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔''

''اوکے..... آپ فکر نہ کریں، میں معلوم کر لوں گا۔''

''معلوم ہے وہ کہاں جا سکتی ہے؟''

''جی ہاں..... ان کا واحد ٹھکانہ رافعہ بیگم کا مسکن یعنی ان کی پھپھو جان کا دولت خانہ ہو گا۔'' اس کے لہجے میں اژدھوں کی سی پھنکار تھی۔ بے جی کانپ گئیں، آنے والے وقت کے خیال سے۔

□●□

شاہ ویز ریسیور کریڈل پر رکھ کر سر تھام کر راکنگ چیئر پر ڈھیلے انداز میں بیٹھ گیا۔ بے اختیار اس کا ہاتھ پیشانی پر آ ٹکا تھا جس کی دونوں سائیڈ رگوں میں خون کی روانی خطرناک حد تک رواں ہو گئی تھی۔ سر گویا آہنی شکنجے میں جکڑ اگیا تھا۔

شدید ترین ٹینشن اعصاب پر سوار ہوئی تھی۔

مشعل کے اس طرح گھر سے جانے کی اسے اتنی ٹینشن نہ تھی، جتنا غصہ و جنون بے جی کی لرزتی، کانپتی، ڈری سہمی، گھبرائی، فکر مند آواز سن کر ہوا تھا۔

بے جی وہ واحد ہستی تھیں جن کی خاطر وہ ہر کام کرنے کو راضی تھا جو اپنے لئے کبھی نہیں کر سکتا۔ وجاہت بھی ان کی خاطر ہی قبول کی تھی جو آج سوہان روح بنی ہوئی تھی۔ ان کی خاطر ہی وہ مشعل کو برداشت کر رہا تھا۔

اس وقت بے جی کی فکر مندی نے اسے جھنجھوڑ ڈالا تھا۔

وہ غصے و جنون کی آگ میں جل رہا تھا۔

بے جی کوئی کمزور اعصاب یا متنفر کر دینے والی عورت نہ تھیں۔ وہ ازحد صابر اور درگزر کرنے کی عادت کی مالک تھیں۔ وہ جانتا تھا اب بھی خوف و پریشانی کی انتہاؤں کو چھو کر انہوں نے اسے مطلع کیا ہے۔ تصور میں وہ ان کی پریشان صورت و کیفیت دیکھ کر مضطرب ہو رہا تھا۔ نہ معلوم کتنے لمحات اسی حالت میں گزر گئے۔ اس دوران فون کی کئی بیل بج کر خاموش ہو گئیں مگر اس وقت وہ ایک قیامت سے گزر رہا تھا۔ کسی جانب یہاں اس کا دھیان نہ تھا۔

''مے آئی کم ان سر؟'' سیکرٹری کی آواز سن کر اس نے پیشانی سے ہاتھ ہٹایا تھا اور ساتھ اسے اندر آنے کی اجازت دیتے ہوئے سیدھا ہو بیٹھا تھا۔

''سر! آپریٹر روم سے آپریٹر نے پیغام دیا ہے کہ ضروری کال آ رہی ہے اور آپ ریسیو نہیں کر رہے ہیں۔'' سیکرٹری نے مؤدبانہ انداز میں اطلاع بہم پہنچائی۔

''ہوں..... اوکے..... تھینکس..... ایک کپ کافی بھیجیں۔''

سیکرٹری ''یس سر'' کہہ کر چلا گیا۔ وہ ذہنی کثافت و غصے کے غبار سے آزاد نہ ہوا تھا کہ دوبارہ ٹیلی فون کی بیل بجنا شروع ہوئی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھا لیا۔

''سر! لائن پر حسن بیگ صاحب ہیں۔'' دوسری طرف سے آپریٹر کی مؤدبانہ آواز سنائی دی اور حسن بیگ کا نام سن کر غیر ارادی طور پر اس کے چہرے کی سرخی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ پیشانی کی شکنیں مزید بڑھ گئیں۔ مٹھیاں بھنچ گئی تھیں۔

''ہیلو..... ہیلو سر! آر یو اوکے؟'' اس کی طرف سے جواب میں خاموشی نے آپریٹر کو ہراساں کر ڈالا۔ وہ پریشان کن لہجے میں گویا ہوئی۔

''یس..... لائن کلیئر کرو.....''

آپریٹر نے لمحے میں لائن دے دی تھی۔

''ہیلو، شاہ ویز! ٹھیک تو ہیں نا آپ؟'' ریسیور سے حسن بیگ کی گھبرائی آواز سنائی دی۔ ان کی آواز سن کر اس کے اندر تک سرد لہر دوڑ گئی اور دل میں پہلا خیال یہی آیا کہ یہی وہ شخص ہے جس کی خاطر ان کی پرسکون زندگی میں ایسے اذیت ناک و ناقابل برداشت دن رات چلے آئے ہیں جن کو برداشت کرنا اب مشکل ہی نہیں ناممکن نظر آ رہا ہے۔

''ہیلو..... ہیلو..... شاہ ویز بیٹا! کیا بات ہے؟ کوئی پریشانی ہے؟ کیوں خاموش ہو؟ میں کب سے کال کر رہا ہوں۔ آپ ریسیو ہی نہیں کر رہے تھے۔ میں نے آپریٹر سے معلوم کیا تو اس نے بتایا کہ آپ آفس میں موجود ہیں۔ کافی دیر بعد آپ نے کال ریسیو کی ہے۔ اب بھی خاموش ہیں..... خیریت تو ہے نا؟ میری بچی، میری مشعل کیسی ہے؟ وہ ٹھیک تو ہے نا؟'' ان کے لہجے کی بے قراری اضطراب میں ڈھل گئی تھی۔ وہ ایک سانس میں بولتے چلے گئے۔

''جنہیں دوسروں کی خیریت مطلوب نہیں ہوتی، جو کسی کی خوشیوں سے سروکار نہیں رکھتے۔ مجھے نہیں معلوم سر! وہ خود خیریت سے رہتے ہیں یا انہیں خوشیاں راس آتی ہیں یا وہ بھی اسی طرح نامراد، بے کل و بے سکون رہتے ہیں۔''

''کک..... کک..... کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ کیا ہوا بیٹا! صاف کہو۔'' وہ ازحد بوکھلاہٹ و پریشانی کا شکار ہو گئے تھے۔ خطرے کی گھنٹی انہیں اپنے کانوں میں نہیں دل میں بجتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

''آپ کی صاحب زادی آج نامعلوم پہر میرے غریب خانے سے جا چکی ہیں، بغیر اطلاع و بغیر اجازت کے۔'' اس نے اپنے لہجے کی تلخی و تندی چھپانے کی سعی بالکل بھی نہ کی۔ اس کے سخت و تند لہجے کی ناگواریت اس کے ذہنی دباؤ کی غماز تھی۔

''اوہ...... یہ کیا ہوا...... وہ کہاں گئی؟''

''میں کیا کہہ سکتا ہوں؟'' اس کا انداز لاتعلقی و تنفر سے بھرپور تھا۔

''یہ...... یہ کیسے ہو سکتا ہے...... میں مشعل کو آپ کے اور بے جی کے سپرد کر کے آیا تھا۔''

''یہی غلطی ہوئی آپ سے۔ اپنی مرضی سے جینے والی لڑکی کو آپ نے قید رکھتی بے بی سمجھ رکھا تھا جو اتنی معصوم و سعادت مند تھی کہ اس کے پاپا نے جس کی انگلی اسے تھما دی وہ ساری زندگی اسی انگلی کو تھام کر گزار دے گی۔''

''فار گاڈ سیک شاہ ویز! میری کیفیت سمجھنے کی کوشش کرو...... میں اس سسپنس کو سمجھنے کی طاقت نہیں رکھتا...... کیا ہوا ہے؟''

''سر! بچپن میں بے جی کہا کرتی تھیں، بیٹا کبھی غلط کام نہیں کرنا، کبھی برے کام نہیں کرنا۔ جو غلط اور برے کام کرتے ہیں اللہ میاں انہیں سزا دینے کے لئے دوزخ میں ڈال دیتے ہیں جہاں انسان جل کر بھسم ہو جاتا ہے مگر اسے سکون نہیں ملتا۔ وہ جلتا ہے پھر درست ہو جاتا ہے، پھر جلتا ہے، پھر درست ہو جاتا ہے۔ اس کے درد، تڑپ، تکلیف میں کوئی کمی نہیں آتی۔ دنیا میں ہر درد، ہر تکلیف، ہر تڑپ کی انتہا موت ہے مگر وہاں نہ راحت ملتی ہے اور نہ ان تکالیف سے نجات دلانے والی موت۔ بلکہ عذاب در عذاب کا سلسلہ کبھی موقوف نہیں ہوتا، رواں رہتا ہے اور یہ میری بدنصیبی کہہ لیجئے یا قسمت کہ لوگوں کو مرنے کے بعد ان کے اعمال کی سزا ملتی ہے، میں زندہ ہی جہنم رسید ہو گیا ہوں۔ میں نے بڑی سادہ زندگی گزاری ہے، برے کاموں سے بھی بچتا رہا ہوں۔ لیکن اب سوچتا ہوں شاید انجانے میں مجھ سے بڑے بڑے گناہ ہوئے ہیں جن کا عذاب مجھے آپ کی بیٹی سے شادی کی صورت میں مل رہا ہے جو میری قوتِ برداشت کو شکست دے چکا ہے۔''

''ایسے نہ کہو بیٹا! آپ تو بہت نیک و سعادت مند بچے ہیں...... یہ سزا تو میرے لئے ہے جس کی لپیٹ میں آپ بھی آ گئے ہیں۔ میں مانتا ہوں مشی جیسی ضدی، ہٹ دھرم لڑکی کے ساتھ گزارا کرنا خود کو امتحان میں، آزمائش میں مبتلا کرنے کے مترادف ہے اور اس امتحان میں آپ جیسے بہادر و حوصلہ مند مرد ہی کامیاب ہوتے ہیں۔ مشی کم عقل و ناسمجھ لڑکی ہے۔''

''پلیز...... پلیز سر...... کم عقل و ناسمجھ نہیں بلکہ بدتمیز و اخلاق سے بے بہرہ لڑکی ہے جو نہ اپنے بڑوں کی عزت کرنا جانتی ہے نہ اپنے سے وابستہ لوگوں کی پرواہ ہے اسے بلکہ...... بلکہ میاں بیوی کے درمیان بندھے رشتے کی اس کے نزدیک کوئی وقعت نہیں ہے۔ یو ڈونٹ مائنڈ سر! وہ گھر بسانے والی لڑکی نہیں ہے۔'' مشعل کے خلاف بھرا ہوا زہر اس کے لہجے میں پھنکاریں مار رہا تھا۔ وہ بہت سخت و بے مروت لہجے میں گفتگو کر رہا تھا۔

دوسری طرف حسن بیگ کی حالت غیر ہونے لگی تھی۔ ان کے اندیشوں، خدشوں نے حقیقت کی ردا اوڑھنی شروع کر دی تھی۔ شاہ ویز کے لہجے اور طرزِ گفتگو نے باور کرا دیا تھا کہ مشعل نے یقیناً اس سعادت مند و مخلص نوجوان کو ایسی ضربیں لگائی ہیں کہ وہ جو ہمیشہ آواز نرم کر کے، نگاہیں جھکا کر شائستگی سے گفتگو کرنے کا عادی تھا اس وقت تلوار بے نیام کے مصداق ان سے مخاطب تھا۔

''صبر سے میرے بیٹے! صبر سے کام لو چند دن اور میری خاطر۔'' کسی فاقہ زدہ سائل کی طرح انہوں نے اپنا کشکول اس کے سامنے پھیلا دیا تھا۔ لہجہ نم تھا۔

''میری صبر کی انتہا ہو چکی ہے۔ میں سب کچھ گوارہ کرتا رہا ہوں، مشعل کی ہر بدتمیزی، ہر زیادتی صرف آپ کی خاطر برداشت کی۔ آپ سے کئے گئے قول کی خاطر سب کچھ کیا مگر میں احساس کو فنا کر سکتا ہوں لیکن اپنی حمیت کو نہیں زیر کر سکا۔ اس سے میں شکست کھا گیا۔ ہار گیا، بری طرح ہار گیا۔'' اس کے سرد و تُرش لہجے میں کچھ نمی آئی تھی۔

''مشعل نے ایسا کیا، کیا جو آپ کی حمیت مجروح ہوئی؟''

''آپ کی سوسائٹی میں شاید یہ بات معیوب نہ سمجھی جاتی ہو لیکن میرا ضمیر و میری غیرت یہ بات بلکہ بات نہیں گالی بھی برداشت نہیں کر سکی کہ میں اپنی بیوی کے منہ سے اس کے محبوب کے قصیدے سنوں۔'' وہ چند لمحے خاموش ہوا تھا اور بیگ صاحب پر مکمل صورتِ حال واضح ہو گئی تھی۔

چند ساعتوں تک دونوں طرف خاموشی رہی۔ شاہ ویز اپنے اندر یکدم اٹھنے والے اشتعال کو روکنے کی کوشش کر رہا تھا اور حسن بیگ صاحب اسے تسلی دینے، سمجھانے کے لئے مناسب لفظوں کا چناؤ کر رہے تھے۔

''شاہ ویز! مرد، مرد ہوتا ہے۔ طبقات بہت ساری چیزوں کو بدل ڈالتے ہیں مگر مرد کی مردانگی کو نہ آج تک کوئی اسٹینڈرڈ، سوسائٹی بدل سکی ہے نہ بدل پائے گی۔ اپنی حمیت، اپنی عزت، اپنی غیرت کے معاملے میں سب مرد ایک جیسے ہوتے ہیں۔''

''آئی ایم سو سوری سر! مجھے افسوس ہے ہمارا ساتھ اب نہیں چل سکے گا۔ میری اندرونی حالت سے آپ واقف نہ ہو سکیں گے، میں اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی معاف کرنے کی ہمت رکھتا ہوں مگر بے جی کے ساتھ زیادتی کرنے والے کو کبھی معاف نہیں کر سکتا اور نہ ہی اپنی محبت و انا سے کھیلنے والے کو معاف کر سکتا ہوں۔ اس معاملے میں، میں ازحد خود پسند و خود غرض ہوں۔ جس طرح زمین و آسمان ایک نہیں ہو سکتے، سمندر کے کناروں کا یکجا ہونا ناممکن ہے، رات دن کا ملاپ نہیں ہو سکتا، اسی طرح میرا اور مشعل کا ساتھ ممکن نہیں۔ میں سوچ سمجھ کر فیصلہ کر رہا ہوں کہ مشعل کو......''

''نہیں...... نہیں...... اللہ کے واسطے آگے ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکالنا ورنہ میں جی نہ پاؤں گا۔ یہ میری زندگی و موت کا مسئلہ ہے...... رحم کرو مجھ پر۔'' ان کی گڑگڑاتی ہوئی آواز اس کی بات قطع کر چکی تھی۔

''کوئی بھی باپ اپنی بچی کو اجڑتا نہیں دیکھ سکتا۔''

''آپ کی بیٹی بسی ہی کب تھی؟'' اس کا دھیما لہجہ سفاک تھا۔

''میرے لئے یہ احساس ہی طمانیت کا باعث ہے بیٹا کہ وہ آپ جیسے اچھے و نیک لوگوں کے درمیان ہے اور اچھائی تو ایک ایسی روشنی ہے جو ہر تاریک شے کو منور کر ڈالتی ہے۔ بے شک مشعل ابھی لاعلمی و لادینی کی تاریکی میں ڈوبی ہوئی ہے مگر مجھے یقین ہے کہ بہت جلد وہ خود روشن ہو کر دوسروں کے لئے مشعلِ راہ بنے گی۔''

''میں خوابوں پر یقین نہیں رکھتا اور آپ کو بھی ایڈوائز کر رہا ہوں کہ خواب دیکھنا چھوڑ دیجئے۔ خوابوں کی دنیا جتنی دلکش و حسین ہوتی ہے حقیقت میں اس قدر ہی بھیانک بدصورت ہوتی ہے جن سے ہم کبھی کمپرومائز نہیں کر سکتے۔'' اس کا انداز دو ٹوک تھا۔

''اس وقت آپ بہت ڈسٹرب لگ رہے ہیں...... مجھے احساس ہے یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے۔ آپ نے، بے جی نے بہت ساتھ دیا ہے میرا اور میں آپ کو بے جی کا ہی واسطہ دیتا ہوں، کسی انتہائی فیصلے پر پہنچنے سے پہلے سوچ لینا، ایک مرد کی بربادی ایک خاندان کی بربادی ہوتی ہے اور عورت کی بربادی معاشرے کی بربادی ہوتی ہے۔ مجھے معلوم ہو چکا ہے رافعہ جواد کو لے کر پاکستان پہنچ چکی ہے اور اب وہ اپنی ناکام حسرتوں کا بدلہ لے گی۔ مشعل تو شروع سے ہی اس کی آنکھ کے اشاروں پر چلتی ہے۔ آپ کو میں نے بہت ذی شعور سمجھا تھا اور آپ ہیں بھی۔ اتنی آسانی سے آپ ان سے شکست تسلیم کر لیں گے؟ مشی کے بارے میں، میں نے آپ کے کسی طرزِ عمل کو رد نہیں کیا، آپ کے کسی سلوک، کسی جبر کے خلاف کوئی بات نہ کی اور نہ آئندہ کبھی کروں گا۔ آپ نے کہا آپ انا پسند ہیں، حمیت کے بنا آپ ادھورے ہیں تو رافعہ سے جیتنا بھی آپ کی انا و حمیت کی جیت ہے۔ مشعل صرف ایک مہرہ ہے، اصل جنگ ہماری رافعہ سے ہے۔ او کے، میری باتیں ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچئے گا۔ غصہ ویسے ہی انسانی عقل کو زائل کر دیتا ہے۔ او کے، پھر رنگ کروں گا۔'' انہوں نے اللہ حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔

❑●❑

زرینہ پڑوسن حمیدہ کے ساتھ صبح سے ان کے بتائے ہوئے پیر صاحب کے پاس گئی ہوئی تھیں۔ سارہ نے بہت منع کیا مگر ان کی عادت تھی جو کام کرنے کی ٹھان لیتی تھیں وہ ہر حال میں کر کے چھوڑتیں۔ سارہ کے مسلسل انکار پر وہ غصے سے چیخ کر گویا ہوئیں۔

''اس وقت تو کیا تیرے ابا بھی قبر سے نکل کر آ جائیں تو مجھے نہ روک پائیں گے۔'' حمیدہ کے سنگ عجلت میں چلی گئی تھیں۔ اب دوپہر ہونے کو آئی تھی۔ وہ ہر کام سے فارغ ہو گئی تھی۔ کھانا پکا کر جمع شدہ کپڑے بھی دھو ڈالے تھے۔ ظہر کی نماز پڑھ کر فارغ ہوئی تو زرینہ مسکراتی ہوئی گھر میں داخل ہوئیں۔ ہاتھ میں پکڑے شاپر سے پانی کی بوتل نظر آ رہی تھی۔

''اماں! اتنی دیر لگا دی؟'' سارہ ان کے ہاتھ سے پانی کی بوتل لیتے ہوئے گویا ہوئی۔

''ارے رش ہی وہاں اتنا تھا...... اب بھی حمیدہ کے تعلقات کی وجہ سے نمبر آیا ورنہ شام تک ہی واپس آتی۔ اور ہاں یہ بوتل سنبھال کر رکھنا، اس میں پڑھا ہوا پانی ہے۔'' وہ پلنگ پر دراز ہوتی ہوئی تاکید کرنے لگیں۔ ''بہت ہی پہنچی ہوئی ہستی ہیں...... میرے بغیر بتائے فرفر انہوں نے سارے حالات خود بتا دیئے۔ میں تو حیران رہ گئی۔ کبھی سنا تھا اللہ والے بھی دلوں کا حال جانتے ہیں مگر یقین نہیں آتا تھا۔ آج تو عجیب ہی کرشمے دیکھ کر آئی ہوں۔'' وہ بہت پُرجوش و خوش تھیں۔

''اماں! بہت بھولی ہو تم...... خالہ حمیدہ پہلے ہی انہیں سب حالات بتا چکی ہوں گی، ورنہ اس دور میں مجھے یقین نہیں ہے کہ ایسے بھی لوگ ہو سکتے ہیں۔''

''یہ بدگمانی کی عادت تمہاری اچھی نہیں ہے...... بھلا ایسے لوگوں کو میں نہیں پہچانتی؟''

''بات یہ نہیں ہے اماں...... جب کوئی ہمارے رب کا نام لے کر بات کرتا ہے تو ہم خود بخود اس کی باتوں پر صداقت کی مہر لگا دیتے ہیں، اس پر یقین کر بیٹھتے ہیں کیونکہ ہمارا سارا ایمان و یقین اللہ کی ذات سے جڑا ہے اور بہت بدبخت و مردار ہوتے ہیں ایسے لوگ جو اللہ کا نام لے کر بندوں سے فراڈ کرتے ہیں۔ کتنے بڑے گناہ گار ہیں ایسے لوگ۔''

''پیر صاحب ایسے بے ایمان آدمی نہیں ہیں۔ بے چارے کوئی ہدیہ بھی نہیں لیتے۔ فی سبیل اللہ کام کرتے ہیں۔ ہاں اگر کسی کی چوکی بھرنی ہو تو پھر اس سامان کے پیسے لیتے ہیں۔''

''اچھا، کتنے پیسے؟''

''پانچ ہزار...... میرے پاس صرف ابھی پانچ سو روپے تھے وہ میں دے آئی ہوں، باقی کل لے کر جاؤں گی۔ اور ساتھ تجھے بھی بلایا ہے۔''

''اوہو...... پانچ ہزار...... اماں، یہ کوئی چھوٹی رقم ہوتی ہے؟'' سارہ مارے پریشانی کے حیرانی سے بولی۔

''ابھی یہ رقم تو پہلی چوکی بھرنے کی ہے۔ پھر جیسے جیسے چوکی بڑھے گی، رقم بھی بڑھانی پڑے گی۔ گیارہ چوکیاں بھرنی ہیں پھر اس کے بعد سب مسائل حل ہو جائیں گے۔ تو اپنے گھر میں ہنسی خوشی رہے گی، تیرے اولاد ہوگی، باقر تیرا بن جائے گا، سسرال والے تیری مٹھی میں ہوں گے، عیش کرے گی تو عیش..... رات دن کی اس گھر بدری سے بھی جان چھوٹ جائے گی۔ تو گھر میں خوش رہے گی تو مجھے بھی سکون ملے گا۔'' وہ بولتی چلی گئیں اور سائرہ کی آنکھوں میں جلن سی ہونے لگی۔ آنسو ابل پڑنے کو بے قرار تھے۔

بیٹیاں ایسا بوجھ ہوتی ہیں جنہیں نہ پھینک سکتے ہیں اور نہ رکھ سکتے ہیں۔

یہ ایسا درد ہیں جو جسم کے کسی نہ کسی عضو میں پھیل کر بے چین رہتا ہے۔

وہ ان بیٹیوں میں تھی جو والدین کی دہلیز پر موجود ہوں تو فکر بن جاتی ہیں اور سسرال کی چوکھٹ پر درد۔ وہ آنسو بھری نگاہوں سے اپنی ماں کو دیکھ رہی تھی جو اس کے حوالے سے دکھائے گئے کسی کے جھوٹے خوابوں کو سچ سمجھ بیٹھی تھیں اور بیٹی کی خوشیوں کی خاطر ہزاروں روپے دینے کو تیار تھیں جو ادھار، قرض کر کے حاصل کرتیں اور اس جعلی نام نہاد پیر کے کشکول میں ڈال آتیں۔

پریشانی جب حد سے تجاوز کر جائے تو انسان فہم و ادرک کے در وا کرنا بھول جاتا ہے۔ ورنہ بہت سادہ سی بات تھی، اگر پیر صاحب اتنی ہی باکمال و روشن ضمیر و روشن نگاہ ہستی تھیں تو ان کی تو دعاؤں میں بھی اتنی تاثیر ہوتی کہ کسی کو چوکی بھرنے کے لئے روپوں کی ضرورت ہی نہ پڑتی کہ ایسے لوگوں کی ایک نگاہ، ایک دعا ہی بگڑوں کو سنوار دیتی ہے۔ اللہ سے محبت کرنے والے دنیا کے مال و زر کو ٹھوکر مارتے ہیں۔ دولت پرستوں و دنیا پرستوں کو دھن، دولت کی چاہ گمراہ کر دیتی ہے۔ ان کے ایمان خراب اور ضمیر مُردہ کر دیتی ہے۔ اور ایسے جعلی پیروں، فقیروں کی خانقاہیں گلیوں، محلوں میں بکھری پڑی ہیں جو اللہ کے نام پر اللہ کے بندوں کو لوٹتے ہیں، ان کی پریشانیوں اور تکلیفوں کے مداوے کی بجائے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو سر عام ایسی عبرت ناک سزائیں ملنی چاہئیں کہ آئندہ آنے والی نسلیں ایسے کام کا تصور نہ کریں جس سے مسلمانوں کے تقدس کو زک پہنچے۔

❑●❑

سارا دن وہ دواؤں کے زیر اثر سوتی رہی تھی۔

شام میں بیدار ہوئی تو بخار اتر چکا تھا اور طبیعت بھی خاصی بہتر تھی۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہوئی تھی کہ رافعہ ہاتھ میں ہینگر پر لٹکا سوٹ لئے حاضر ہوئیں۔

''تھینک گاڈ! بخار اترا آپ کا۔ چلیں باتھ لے کر فریش ہو جائیں پھر چائے پیتے ہیں۔ یہ میں نے آپ کے لئے ڈریس منگوایا ہے، دیکھو اچھا ہے نا؟'' وہ اس کی جانب ہینگر بڑھاتے ہوئے مسکرا کر گویا ہوئیں۔

''اوہ سو سویٹ آنٹی! آپ کو میرا کتنا خیال ہے۔'' وہ ان سے لپٹ گئی۔

''میں خیال نہیں کروں گی تو کون کرے گا۔'' وہ پیار سے اس کے الجھے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولیں۔

بلیو ٹراؤزر سوٹ میں دیدہ زیب فینسی ورک تھا جو اس کی سرخ و سپید رنگت پر خوب جچ رہا تھا۔ گولڈن براؤن بال پشت پر لہرا رہے تھے۔ چہرہ میک اپ سے بے نیاز ہونے کے باوجود دمک رہا تھا۔ چائے کے دوران رافعہ اسے ازحد اصرار سے چیزیں پیش کرتی رہیں۔

ان کی نوازشیں عروج پر تھیں۔ مشعل نہال ہوئی جا رہی تھی۔

''کیا حشر کر دیا ہے اس کمینے نے آپ کا..... میں اسی دن کھٹک گئی تھی کہ ضرور دال میں کالا ہے۔ بھلا شوہر کی من چاہی بیوی ایسی تو نہیں ہوتی۔ اجاڑ حلیہ، ویران صورت، اداس آنکھیں، شادی کے بعد بدصورت لڑکیاں بھی خوب صورت ہو جاتی ہیں۔ مگر تمہارا تو معاملہ ہی الگ ہے۔ میں نے پوچھا بھی تم نے کہا بہت خوش ہو۔'' چائے سے فارغ ہو کر وہ کمرے میں چلی آئیں۔ وہاں بیٹھتے ہی رافعہ نے اپنا موضوع چھیڑا۔ ان کا لہجہ سنجیدہ تھا مگر آنکھوں سے چھلکتی معنی خیزی و طنز مخفی نہ تھا۔

اگر مشعل اس وقت بھی جذباتیت و اہانت کے احساس سے شرابور نہ ہوتی تو ان کی تمسخرانہ نگاہوں کو ضرور پہچان لیتی، خود کو سنبھال لیتی مگر اس وقت وہ پوری طرح ان کی خوش مزاجی و محبت کے سحر میں جکڑی جا چکی تھی۔

شاید اپنی خودداری وانا بھی فراموش کر بیٹھی تھی ورنہ ان کے سابق رویوں نے ان کی اصلیت ظاہر کر دی تھی کہ وہ کس قدر خود غرض، مطلب پرست، کینہ ور و حاسد فطرت عورت تھیں جو معاف کرنا نہیں جانتی تھیں۔ ازحد منتقم مزاج کی مالک تھیں۔

جب کہ مشعل ضدی، ہٹ دھرم، منہ پھٹ تھی مگر کینہ حسد اس میں نہ تھا نہ ہی دل میں کسی کے خلاف میل یا غبار رکھنے کی عادت تھی۔

اس کی ناراضگی، اس کا غصہ جب ہوتا تو وہ اظہار بھی کر دیتی اور ایک بار بات صاف ہونے کے بعد دل شیشے کی مانند ہر میل و غبار سے پاک ہو جاتا تھا۔

اب بھی رافعہ اس سے ملنے گئیں۔ پیار سے ملیں، شفقت سے پیش آئیں۔ اس کے دل میں ان کے خلاف بھرا تمام تنفر و غصہ غائب ہو گیا تھا۔ وہ فراخ دلی سے ان کی تمام زیادتیوں کو بھول گئی تھیں لیکن رافعہ بیگم کچھ نہ بھولی تھیں۔

''آنٹی! میں آپ کو پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔ آپ پہلی مرتبہ آئی تھیں۔'' وہ آہستگی سے گویا ہوئی۔ انداز میں شرمندگی تھی۔

''اچھا، بھائی جان کہاں ہیں..... ان کا کچھ اتا پتا ہے؟ ان سے رابطہ کرو پہلے۔ ورنہ سمجھیں گے میں نے جان بوجھ کر تمہارا گھر اجاڑا ہے۔''

''بابا نے تو شادی کے بعد سے ایک مرتبہ بھی مجھ سے رابطہ نہیں کیا ہے۔''

''آئے ہائے، یہ کس طرح ہو سکتا ہے؟ بھائی جان بیٹی کی خاطر بہن کو چھوڑ سکتے ہیں مگر بیٹی کو نہیں، یہ نہیں مان سکتی میں کہ تم جانتی ہی نہ ہو کہ وہ کہاں گئے ہیں۔'' وہ گردن ہلا کر بے یقینی سے کہہ رہی تھیں۔

مشعل جو پاپا کے نام پر بے کل سی ہو گئی تھی ان کے انداز پر تڑپ سی اٹھی۔

''میں سچ کہہ رہی ہوں..... میں نہیں جانتی پاپا کہاں ہیں۔ کبھی شاہ ویز کہتا ہے وہ بنکاک میں ہیں، کبھی سڈنی کا بتاتا ہے تو کبھی نیویارک کی خبر دیتا ہے۔''

''یہ کیا بات ہوئی..... بھائی جان لاپتہ کیوں ہو گئے ہیں؟''

''میری خود سمجھ میں نہیں آتا..... پاپا ایسا کیوں کر رہے ہیں۔'' اس نے پژمردگی سے کہا۔

''مجھے تو شاہ ویز بہت خطرناک آدمی معلوم ہوتا ہے۔ کتنی آسانی سے اس نے سب کچھ حاصل کر لیا۔ بھائی جان کا اعتماد، آپ کا ساتھ، تمام دولت و جائیداد سب پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گیا۔ نہ معلوم آدمی ہے یا جادوگر؟''

''وحشی درندہ ہے وہ آنٹی! میں اسے جان چکی ہوں۔'' وہ نفرت سے بولی۔

''ہوں..... پریشان مت ہوں..... وحشی درندوں سے نمٹنا بھی ہمیں آتا ہے۔'' وہ اسے تسلی دے کر کچن کی طرف بڑھ گئیں۔ وہ کمرے میں آ گئی۔

جاڑوں کا گلابی گلابی موسم اپنی تمام اداسیوں سمیت آ چکا تھا۔

ہر شے گویا سرد ہو کر رہ گئی۔

اس نے کھڑکی سے پردہ ہٹا کر دیکھا، باہر رات اپنے سیاہ گیسو پھیلا چکی تھی۔

ٹھنڈی ہوا سے پھول و پودے بھی ٹھٹھرتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ آسمان پر چاند پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ پُر سکوت ماحول میں پراسراری خاموشی اسے بے کل کرنے لگی۔ وہ کھڑکی سے ہٹ کر کرسی پر بیٹھ گئی۔

اس کی سوچ بے جی کی طرف سے پرواز کرتی ہوئی شاہ ویز کی طرف بڑھ گئی تھی۔

''ہونہہ..... کیا کر سکتے ہیں میرا۔ اب مجھے وہاں جانا ہی نہیں ہے تو کیوں سوچ رہی ہوں میں ان کے بارے میں؟'' اس نے خود کو سرزنش کی۔

لیکن دل کی دنیا میں عجیب سی خوف و ہراس کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔

''ہیلو جان من! تم یہاں چھپی بیٹھی ہو میں ہر طرف تلاش کر رہا ہوں۔'' معاً جوجو کی پُرجوش آواز نے اسے چونکا دیا تھا۔

اس نے چہرہ گھما کر دیکھا، جوجو والہانہ انداز میں اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔

لمحے بھر کو اس کے اندر بھی ہلچل مچی، مسرت و انبساط کی لہریں متلاطم ہوئیں، اتنے ماہ بعد اسے سامنے دیکھ کر بے اختیار اس کی جانب بڑھی تھی۔

قبل اس کے کہ جوجو کی کھلی بانہوں میں سماتی، نہ معلوم کیا ہوا کہ اس کے قریب جا کر اس طرح ٹھٹھک کر رک گئی جس طرح ریموٹ سے چلنے والے کھلونے کو اچانک اسٹل کر دیا جائے۔ یکلخت اس کے اندر ایک نامانوس سی کیفیت ابھری اور اس نے اس کے پھیلے ہوئے بازوؤں کو نظر انداز کر کے اپنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر مسکرا کر کہا۔

''ہاؤ آر یو جوجو؟''

''فائن..... مجھے تم ٹھیک نہیں لگ رہی ہو۔'' وہ شدید حیرانی کے زیر اثر گویا ہوا۔

''آئی ایم پرفیکٹلی فائن۔ تم نے ایسے کیوں کہا؟''

''یار تم میرڈ ہونے کے بعد چینج ہو گئی ہو، ویری امیزنگ۔'' وہ سنگل صوفے پر بیٹھی تو جوجو دوسرے صوفے پر بیٹھتے ہوئے شانے اچکا کر گویا ہوا۔

''میں تو ویسی ہی ہوں، ہاں تم کافی چینج نظر آ رہے ہو، خاصے فٹی ہو گئے ہو۔'' وہ اس کے بھرے بھرے جسم کو دیکھتے ہوئے شرارت سے گویا ہوئی۔

''ویسٹ کنٹری مجھے بہت سوٹ کرتی ہے..... میرا تو آنے کا ارادہ ہی نہ تھا۔ اینی وے، تم سناؤ اس کنگلو سے شادی کرنے کے بعد میں یاد نہیں آیا ہوں گا۔ تمہیں مشورہ کس نے دیا تھا اس سے شادی کرنے کا..... کسی ایسے سے تو شادی کرتی جو تمہاری شاپنگ کا بوجھ اٹھا سکتا تھا۔ اس گھٹیا شخص کی سنگت نہ معلوم تمہیں کیوں بھا گئی جو تم مجھے بھول کر اس کی ہو گئیں۔''

''پلیز جوجو! میں گلٹی فیل کر رہی ہوں..... مجھ سے نادانی میں بہت غلط فیصلہ ہوا ہے۔ وہ میرے لائق نہیں ہے، وہ وحشی ہے، ایک دم اجڈ۔ بات بات پر مارنا اس کی

سرشت ہے۔ مجھے کسی نے کبھی پھول بھی نہ مارا اور اس نے اپنے فولاد جیسے ہاتھوں سے میرا بار بار استحصال کیا ہے، بار بار مجھے ہرٹ کیا ہے۔'' اس کی ہمدردی پا کر وہ خود کو روک نہ سکی اور پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

''وہ تمہیں مارتا ہے۔ اوہ...... اوہ...... میں زندہ نہیں چھوڑوں گا اس سن آف بچ کو۔'' مشتعل وجذباتیت سے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

''نہیں جو جو...... تم اس سے لڑنا مت۔ وہ بہت ڈینجرس ہے۔ بالکل کسی پاگل کتے کی طرح۔'' مشعل گھبرا کر گویا ہوئی۔

''اپنے ریوالور کی تمام بلٹس اس کے سینے میں اتار دوں گا۔ اس نے تم پر ہاتھ اٹھا کر اپنی موت کو دعوت دی ہے...... وہ بلڈی سمجھتا کیا ہے خود کو؟''

''پلیز...... پلیز جو جو! کول ڈاؤن، کول ڈاؤن پلیز۔'' اسے غصے سے بے قابو دیکھ کر مشعل اس کا ہاتھ پکڑ کر نرمی سے گویا ہوئی۔

''وائے کول ڈاؤن؟ وہ تمہیں مارے اور میں کچھ نہ کر سکوں۔'' اس نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے محبت آمیز لہجے میں کہا۔

''ابھی نہیں...... کچھ انتظار کر لو۔ مجھے اس سے ڈائیورس لینے دو۔''

''کیا وہ تمہیں ڈائیورس دے دے گا؟''

''ہاں...... نہ دی تو میں اس کی زندگی اجیرن کر دوں گی۔'' وہ اس سے ہاتھ چھڑا کر سخت لہجے میں بولی۔

قبل اس کے کہ مزید کوئی بات ہوتی، باہر سٹنگ روم سے رافعہ کی آتی چیختی چنگھاڑتی آواز نے ان دونوں کو ہی وہاں جانے پر بے قرار کر دیا۔

وہ اور جو جو ساتھ ساتھ داخل ہوئے تھے۔ اندر شاہ ویز کھڑا تھا۔ سرخ چہرہ، بگڑے تیوروں کے ہمراہ۔ مشعل غیر متوقع طور پر اسے وہاں دیکھ کر ساکت وجامد کھڑی رہ گئی۔

''اس گھر میں پاگلوں اور آوارہ کتوں کا داخلہ ہونا منع ہے...... تمہیں جرأت کس طرح ہوئی اندر داخل ہونے کی؟'' رافعہ شعلہ جوالہ بنی ہوئی تھیں۔

''میں اپنی بیوی کو لینے آیا ہوں...... دنیا کی کوئی طاقت مجھے نہیں روک سکتی اندر آنے سے۔'' اس کے لہجے میں بھی طوفانوں کی گھن گرج تھی۔

وہ سراپا آتش فشاں بنا ہوا تھا۔ اس کی لہو رنگ آنکھیں مشعل پر تھیں۔

مشعل کا چہرہ غیر محسوس انداز میں خوف سے سفید پڑتا جا رہا تھا۔

''بیوی؟...... اوہ، شکل دیکھی ہے اپنی؟ تم جیسے تو مشی کے جوتے اٹھانے کے بھی قابل نہیں ہوتے۔'' وہ تحقیرانہ انداز میں بولیں۔

''مشعل چلو......'' شاہ ویز انہیں اگنور کر کے سخت لہجے میں اس سے مخاطب ہوا۔

''مشعل نہیں جائے گی...... تم دفع ہو جاؤ یہاں سے ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔'' جو جو کو یکدم ہی طیش آیا تھا۔

''شٹ اپ...... تمہیں ہمارے درمیان بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''میرے گھر میں آ کر مجھے ہی ڈانٹتا ہے...... میں تیرا خون پی جاؤں گا۔'' جو جو آپے سے باہر ہو کر اپنی جگہ سے ایک قدم آگے نہیں بڑھا۔

''ہاں...... میں جانتا ہوں، بھیڑیوں کی بہت پرانی نسل سے تعلق رکھتے ہو۔ مگر یاد رکھنا تمہیں مسلنے کے لئے ایک چٹکی کافی ہوگی۔''

''او مائی گاڈ...... ہمارے گھر میں ہماری ہی بے عزتی کر رہے ہو...... چلے جاؤ یہاں سے...... ورنہ ابھی پولیس بلوا کر تمہیں حوالات کی سیر کروا دوں گی۔''

''اچھا بلوایئے پولیس...... میں بھی دیکھتا ہوں کون حوالات کی سیر کرتا ہے؟ سب سے پہلے تو پولیس پکڑے گی آپ کی اس بھتیجی صاحبہ کو جو زوجہ محترمہ ہونے کے باوجود بہت خاموشی سے اس مچھر کے ساتھ گھر سے بھاگ آئی ہے۔ پھر آپ بھی ان کے ساتھ اس جرم میں برابر کی شریک ہیں انہیں یہاں پناہ دے کر......''

''نہیں...... یہ غلط ہے...... میں گھر سے تنہا آئی تھی۔'' مشعل بے ساختہ بولی۔

''پولیس تمہاری بات پر نہیں، میری بات پر یقین کرے گی۔''

''کتنی دولت چاہئے تمہیں...... میں دوں گی...... مگر مشی کا پیچھا چھوڑ دو۔ یہ تم جیسے آوارہ وحشی کے لائق نہیں ہے۔ بتاؤ اپنی قیمت بولو، کتنی دولت چاہتے ہو؟ ویسے تو سب کچھ ہتھیا چکے ہو۔ چھوڑا ہی کیا ہے۔ مگر میں مشی کی خاطر اپنی ہر شے نچھاور کرنے کو تیار ہوں۔ کہو کیا قیمت لو گے مشی کو طلاق دینے کی؟'' وہ تمسخرانہ لہجے میں اس سے مخاطب تھیں۔

شاہ ویز رافعہ بیگم کی گھٹیا فطرت اور حسن بیگ صاحب کو دیوانہ کر دینے کی حقیقت سے واقف نہ ہوتا یا حسن بیگ کی پُرشفقت شخصیت کا لحاظ نہ ہوتا تو ابھی ابھی تین لفظ کہہ کر اپنا دامن بچا کر چلا جاتا۔ مگر یہاں نہ صرف تحمل مزاجی سے رافعہ کی بکواس برداشت کرنی تھی اور مشعل کو بھی ساتھ لے جانا تھا کہ بات اب حسن بیگ کی تاکید کی ہی نہ تھی بلکہ اس قیمت کی بھی تھی۔

''میڈم! دولت پرستی میرا معیار نہیں، وفا پرستی میرا شعار ہے۔ وحشی، پاگل، آوارہ جو بھی آپ کہیں یا سمجھیں اس سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لیکن جو آپ چاہ رہی ہیں وہ کبھی نہیں ہوگا۔ یہ میں آپ کو بتا رہا ہوں۔'' اس کا سخت لہجہ اٹل تھا۔

''میں نے جو چاہا ہے وہ کیا ہے، کوئی مجھے روکنے والا پیدا نہیں ہوا۔'' وہ بل کھا کر پھنکاری تھیں۔

''اپنے ہر قول وفعل میں آپ خود مختار ہیں، کوئی کیوں روکنے لگا آپ کو۔ مگر کبھی غلطی سے بھی میرے معاملات میں مداخلت کی کوشش مت کیجئے گا ورنہ آپ کو پچھتانے کا موقع بھی نہیں ملے گا۔'' اس کے سخت لہجے میں ایسی کوئی بات تھی کہ رافعہ کچھ نہ بول سکیں۔

''سنا نہیں تم نے؟ چلو، میرے پاس ٹائم نہیں ہے۔'' وہ مشعل سے غصے سے بولا۔ مشعل کو اس کے تیور پہلے ہی دہلا رہے تھے۔ اب اس کے دھاڑنے پر دل بری طرح دھڑکنے لگا تھا۔ بے اختیار قدم اس کی جانب بڑھنے لگے۔

''مشی! تم اس کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی پھر کیوں جا رہی ہو؟ مت جاؤ۔'' اس کو شاہ ویز کی طرف بڑھتے دیکھ کو جو جو بول اٹھا۔

''ہاں، ہاں مشی! ڈرو مت، تمہیں اس کے ساتھ جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ کچھ نہیں کرے گا۔ کیا کر سکتا ہے؟ اس کی اوقات ہی کیا ہے...... اس کی چلتر بازیاں صرف بھائی جان کو بے وقوف بنا سکتی ہیں۔'' وہ مشعل کا ہاتھ پکڑ کر روکتے ہوئے بولیں۔

''میں کوئی بدمزگی نہیں چاہتا...... بہتر یہی ہوگا کہ آپ بات کو طول نہ دیں۔''

''بہتر وبدتر کی مجھے پرواہ نہیں ہے دو کوڑی کے انسان۔ یہ صرف بھائی جان کی وجہ سے تم اس گھر میں کھڑے نظر آ رہے ہو ورنہ تم جیسے اس گھر میں برتن مانجھتے اور پونچا پھیرتے نظر آتے ہیں۔ یہ سب بھائی جان کی وجہ سے ہے جو ہمارے پیر کی جوتی ہمارے سر پہ آ رہی ہے۔'' ان کے لہجے سے، آنکھوں سے حقارت جھلک رہی تھی۔ شاہ ویز کا خون شریانوں میں ٹھوکریں مارنے لگا تھا۔

''مشعل! چلو......'' وہ انہیں نظر انداز کر کے بولا۔

''مشعل تمہارے ساتھ نہیں جائے گی۔'' رافعہ ہٹ دھرم انداز میں بولیں۔

''میڈم! میری شرافت سے ناجائز فائدہ نہ اٹھائیں۔''

''ارے جاؤ۔ بہت دیکھے ہیں تمہارے جیسے شریف ہونہہ...... تمہاری شرافت یہی ہے کہ تم پھول سی بچی پر ہاتھ اٹھاؤ، جس کو کبھی کسی نے گرم نگاہ سے بھی نہ دیکھا ہو اس کو تم نے مارا، ایک بار نہیں بار بار اور ہمیں شرافت کا سبق پڑھا رہے ہو...... اگر ذرا بھی غیرت ہے تو ڈوب مرو۔''

''مام! کیوں اس نیچ کے منہ لگ رہی ہیں۔ نوکروں کو بلا کر دھکے دے کر نکلوائیں اسے یہاں سے۔'' جو جو چیخ کر بولا۔

صورت حال خاصی گمبھیر ہو گئی تھی۔

رافعہ کسی ناگن کی طرح پھنکارتی پھر رہی تھیں۔

جو جو بھی خاصا پُرجوش نظر آ رہا تھا۔

مشعل ان دونوں ماں بیٹے کے درمیان گم صم سی کھڑی تھی۔ اس کی تمام تیزی وطراری ہوا ہونے لگی تھی۔ کچھ دیر قبل جو جو سے کہی طلاق لینے والی بات وہ بھول چکی تھی۔

اب اسے ہر سمت، ہر شے سے شاہ ویز کا چہرہ جھانکتا نظر آ رہا تھا۔

لہو رنگ آنکھیں، آگ برساتا لہجہ...... وہ سراپا قہر بنا ہوا تھا۔

وہ اس کے مزاج کی گرمی سے بخوبی واقف تھی اور جانتی تھی کہ اس لمحے اس کے مزاج کا درجہ حرارت آخری ڈگری پر پہنچا ہوا ہوگا اور ایسے وقت میں وہ جو کچھ بھی کر گزرے کم ہے۔

وہ خود کو شعلوں میں گھرا ہوا محسوس کر رہی تھی۔ چاروں سمت آگ ہی آگ تھی۔

نجات کا کوئی راستہ نہیں تھا۔

فرار کی ساری راہیں مسدود تھیں۔

اس کے سر کی رگوں میں ایک دم ہی دباؤ بڑھنے لگا۔ دل کی دھک دھک بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ سرد موسم کے باوجود لمحے بھر میں پسینے میں شرابور ہو گئی۔ بے اختیار اس نے سر کو تھاما تھا۔

ہر شے گول گول گھومنے لگی تھی۔ صوفہ سیٹ، فانوس، سامنے لگی وال کلاک، دیواروں پر لگی پینٹنگز، سینریز، پردے سب چکرا رہے تھے۔

''اوکے، میں نے جو سمجھانا تھا سمجھا لیا۔ اگر آپ یہی چاہتی ہیں تو یہی سہی۔'' وہ جنون میں آگے بڑھا تھا، مشعل کے آگے کھڑے جو جو کو ایک ہاتھ سے دور دھکیلا تھا اور مشعل کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتا ہوا دروازے کی سمت گھسیٹا تھا۔ مشعل جو پہلے ہی بے دم ہو رہی تھی اس افتاد کو برداشت نہ کر سکی اور بے ہوش ہو گئی۔

''ارے...... ارے...... ارے کیسے جانور کی طرح میری بچی کو گھسیٹ رہے ہو...... یہ کیا ہوا میری مشی بے ہوش ہو گئی...... تُو آدمی ہے یا قصائی...... چھوڑ میری بچی کو۔''

پیچھے پیچھے بدحواس رافعہ آرہی تھیں چیختی ہوئیں۔ ان کے پیچھے جو جو تھا۔

''اس طرح نہیں مانے گا یہ باسٹرڈ..... میں ابھی پولیس کو کال کرتا ہوں۔'' جوجو فون کی طرف چھلانگ لگاتا ہوا چیخا۔

شاہ ویز نے جھک کر بے ہوش پڑی مشعل کو بازوؤں میں اٹھایا اور کمرے سے نکل گیا۔ رافعہ پیچھے پیچھے چیختی ہوئی آرہی تھیں۔ وہ گویا ہر احساس سے عاری ہو گیا تھا۔ دیکھنے، سننے، سوچنے کی طاقت سلب ہو گئی تھی۔ وہ مشعل کو اٹھائے آگے بڑھتا جارہا تھا۔ ملازم جو کمرے سے آتی بلند آوازوں کو باہر سن رہے تھے، اب باہر کھڑے حیرت سے سب دیکھ رہے تھے۔

''حرام خورو! کھڑے صورت کیا دیکھ رہے ہو..... پکڑو اس جاہل کو۔'' رافعہ خود اس کے جارحانہ رویے کے سامنے خود کو بے بس محسوس کر کے ملازموں سے بولیں۔ ان کے حکم پر وہ تیزی سے آگے بڑھے تھے۔

''خبردار جو میری راہ میں آئے، ورنہ میں اسے نیچے پھینک دوں گا۔'' شاہ ویز سرد مہری سے ٹیرس کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

ملازم اس کی آواز و لہجے سے سمجھ گئے کہ وہ سچ کہہ رہا ہے۔ پھر کسی میں بھی ہمت نہ ہوئی آگے بڑھنے کی۔ اپنی جگہ پر ساکت کھڑے رہے۔

شاہ ویز تیزی سے سیڑھیاں اتر کر گیٹ کے باہر کھڑی اپنی کار کی طرف بڑھ گیا اور پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر مشعل کو لاپرواہی سے سیٹ پر پٹخ دیا۔ رافعہ اوپر ٹیرس پر کھڑی اسے جاہل عورتوں کی طرح گالیوں، کوسنوں سے نواز رہی تھیں۔ ملازم معنی خیز نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

شاہ ویز نے ان کی طرف ایک نظر دیکھنا بھی گوارہ نہیں کیا تھا اور کار پوری رفتار سے آگے بڑھا دی تھی۔

□●□

شام سے رات ہونے کو آئی تھی۔

بے جی پریشانی سے بری طرح ہول رہی تھیں۔ ایک پریشانی مشعل کی تھی جو نہ معلوم کس وقت گھر سے بغیر بتائے چلی گئی تھی۔ دوسری یہ تھی کہ شاہ ویز ابھی تک گھر نہیں آیا تھا۔ یہ سب سے بڑی پریشانی تھی۔ اس کی ذہنی کیفیت سے وہ پوری طرح آگاہ تھیں۔

اسے دوبارہ فون کر کے انہوں نے کہا تھا کہ وہ مشعل کو لینے اس کے ساتھ جائیں گی تاکہ اس کے غصے کو کنٹرول کر سکیں۔ مگر شاہ ویز نے جاتے وقت انہیں فون نہیں کیا تھا۔ انتظار کر کے انہوں نے آفس فون کیا تو معلوم ہوا وہ جاچکا ہے اور اس وقت سے وہ پریشان ہو رہی تھیں۔

خیریت سے اس کے واپس آنے کی دعائیں مانگ رہی تھیں۔

کال بیل کی آواز پر وہ بے قراری سے دروازے کی طرف بڑھی تھیں اور دروازہ کھول کر ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔

''انسپکٹر صاحب! یہ بڑھیا اس بدمعاش کی ماں ہے..... یہیں لے کر آیا ہے وہ میری بچی کو زبردستی گھر سے اٹھا کر۔'' سامنے رافعہ کھڑی تھیں انسپکٹر اور سپاہیوں کے ساتھ۔ بے جی کو سکتہ ہو گیا تھا۔

''خاتون! شاہ ویز یہاں رہتا ہے؟'' انسپکٹر کی کراری، بارعب آواز انہیں جلد حواس میں لے آئی۔ ان کی زبان تو نہ اٹھ سکی صرف اثبات میں گردن ہلائی۔

''بلاؤ اسے..... کہاں ہے وہ؟'' وہ دندناتے ہوئے اندر آگئے تھے۔ ساتھ دو لیڈی کانسٹیبل بھی تھیں۔

''وہ..... وہ گھر میں نہیں ہے۔'' بے جی کی حالت غیر ہونے لگی تھی۔ پولیس کا نام ہی خوف و دہشت کی علامت ہے اور بذات خود انہیں اپنی دہلیز پر موجود دیکھ کر وہ نیم مُردہ سی ہو گئی تھیں۔

''جھوٹ بولتی ہے یہ..... وہ لوفر یہیں ہوگا۔'' رافعہ بے جی کو نفرت سے گھور کر بولیں۔

''سچ سچ بتاؤ.....'' انسپکٹر نے لیڈی کانسٹیبلز کو اوپر کی جانب تلاشی لینے کا اشارہ کیا تو وہ دونوں اوپر کی جانب دھڑ دھڑ کرتی ہوئی غائب ہو گئیں۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟ میرے بیٹے نے کیا، کیا ہے؟'' بے جی کانپتی ہوئی آواز میں استفسار کرنے لگیں۔ نیچے سپاہی تلاشی لے رہے تھے۔ اوپر لیڈی کانسٹیبلز۔ پورے گھر میں ان کے بھاری بوٹوں کی دھمک گونج رہی تھی۔

دروازہ کھولنے بند کرنے کی آوازوں سے در و دیوار لرز رہے تھے۔

ان کے بوٹ کی ہر دھمک، بند ہوتے ہر دروازے کی دھاڑ بے جی کے دل پر ضرب بن کر لگ رہی تھی۔ ان کا چہرہ دھلے لٹھے کی طرح سفید پڑ گیا تھا۔

''جیسے تمہیں تو کچھ معلوم ہی نہیں، تمہارے بیٹے نے کیا، کیا ہے؟'' رافعہ ہاتھ لہرا کر طنزیہ گویا ہوئیں۔

''خدا کی قسم مجھے کچھ نہیں معلوم..... میں نہیں جانتی کیا ہوا ہے؟ شاہ ویز کہاں ہے؟ وہ آفس سے گھر نہیں آیا۔ میں اس کا ہی انتظار کر رہی تھی۔'' وہ روہانسی ہو گئیں۔ رافعہ کی چبھتی ہوئی نگاہوں کا سامنا کرنا دشوار تھا۔

''انسپکٹر صاحب! یہ جھوٹ بول رہی ہے۔ یہ ان ماں بیٹے کی سازش ہے۔'' رافعہ انسپکٹر سے مخاطب ہوئیں۔ وہ ہاتھ پر چھڑی مارتے ہوئے بولا۔

''سب معلوم کر لیں گے..... کہاں جا سکتا ہے وہ اس شہر سے۔''

دونوں لیڈی کانسٹیبلز اور سپاہیوں نے بھی اطلاع دے دی تھی کہ گھر میں اور کوئی نہیں ہے۔

''ہائے، ہائے..... کہاں لے گیا میری بچی کو؟ انسپکٹر صاحب! معلوم کریں اس چنڈال بڑھیا سے۔ اس نے بیٹے کے ساتھ مل کر مشعل کو چھپایا ہے۔'' وہ مچل کر انسپکٹر سے مخاطب ہوئیں اور قبل اس کے کہ انسپکٹر صاحب کچھ کہتے دروازے سے اندر داخل ہونے والی شخصیت کو دیکھ کر انسپکٹر سمیت سب الرٹ ہو گئے۔

''جائیں آپ یہاں سے۔'' شاہ ویز کے ہمراہ آئی جی پولیس بلاول خان تھا۔ اس کی سخت بارعب آواز پر لمحے بھر کو انسپکٹر بوکھلایا، پھر سیلوٹ مار کر وہ باہر نکل گیا تو اس کے ساتھی بھی سیلوٹ مارتے ہوئے باہر نکل گئے۔

''یہ سب کیا ہے شاہ ویز؟'' بے جی اس کی جانب بڑھیں تو اس نے انہیں بازوؤں کے گھیرے میں لے لیا۔ بے جی کے آنسو بے قابو ہو گئے تھے۔

''میری بچی کہاں ہے؟'' رافعہ جو ایک دم بدل جانے والی صورتحال سے بھونچکا رہ گئی تھیں، بلاول خان کو اگنور کر کے اس سے مخاطب ہوئیں۔

''وہ میری بیوی ہے..... مجھے اختیار ہے جہاں چاہے اسے رکھوں۔'' اس نے تیزی سے کہا۔

''دیکھ رہے ہیں آپ آئی جی صاحب! آپ کے شہر میں کیا ہو رہا ہے۔ دن دیہاڑے ایک شریف لڑکی کو یہ بدمعاش گھر سے اٹھا کر لے آیا اور اب کہتا ہے یہ اس کا شوہر ہے۔ مشعل اس شہر کے بڑے بزنس مین کی بیٹی ہے، کسی گھسیارے کی اولاد نہیں ہے جو کوئی اٹھ کر آئے گا اور خود کو اس کا شوہر بتا کر اٹھا کر لے آئے گا۔ بولو، کیا ثبوت ہے تمہارے پاس کہ تمہاری اس سے شادی ہوئی ہے؟ کوئی گواہ ہے تمہارے پاس جو گواہی دے سکے؟'' وہ ہتھیار پھینکنے والوں میں سے نہ تھیں۔

''ایک گواہ تو میں خود ہوں اس شادی کا..... اگر چاہیں تو نکاح نامے پر میرے سائن دیکھ سکتی ہیں۔'' بلاول خان مسکرا کر گویا ہوئے۔

''آئی جی صاحب! آپ مذاق کر رہے ہیں؟'' وہ بوکھلا اٹھیں۔

''میرا آپ کا مذاق کا رشتہ ہے اور نہ ہی موقع۔ یہ جو کچھ بھی آپ نے کیا جرم ہے۔ لیکن شاہ ویز کی سفارش پر میں آپ کے خلاف کوئی قانونی چارہ جوئی نہیں کر رہا۔ مگر یاد رکھیے گا آئندہ آپ نے کوئی دوسرا ڈرامہ کرنے کی کوشش کی تو میں بالکل رعایت نہیں کروں گا۔ شریف لوگوں کی عزت سے کھیلنا شریف لوگوں کا شیوہ نہیں ہوتا۔'' بلاول خان نے تنبیہی لہجے میں کہا۔

رافعہ کچھ دیر تو کھڑی رہیں، پھر پاؤں پٹختی ہوئی چلی گئیں۔

''اب اجازت دیں شاہ ویز!'' وہ مسکراتے ہوئے گویا ہوئے۔

''بہت شکریہ انکل! آپ نے بہت تعاون کیا میرے ساتھ۔'' شاہ ویز نے ان سے ہاتھ ملاتے ہوئے مشکور لہجے میں کہا۔

''تھینکس۔ اگر کوئی پرابلم ہوں تو ضرور یاد رکھنا۔ حسن بیگ کے بہت احسانات ہیں مجھ پر..... وہ تو میں کبھی اتار نہ پاؤں گا لیکن آپ کا کام کر کے مجھے دلی مسرت ہوگی۔''

وہ انہیں ان کی کار تک چھوڑ کر آیا تو بے جی منتظر تھیں۔

''کیا ہوا ہے یہ سب؟ مشعل کہاں ہے؟ تمہیں کیسے معلوم تھا گھر پر پولیس آئی ہے؟''

''آرام سے..... آرام سے بے جی! اتنے سوالات کے جواب میں خالی پیٹ نہیں دے سکتا۔ پہلے کھانا لگائیں۔ بلکہ میں خود لگاتا ہوں۔'' بے جی کی حالت کے پیش نظر وہ کچن کی طرف بڑھتا ہوا بولا۔

بے جی نے اسے روکنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ کچھ لمحوں کی اس کارروائی نے ان کے ہاتھ پاؤں بے جان کر ڈالے تھے۔ وہ خود کو بے جان محسوس کر رہی تھیں۔

شاہ ویز نے کھانا لگایا اور اپنے ساتھ زبردستی انہیں بھی شریک کیا۔ کھانے کے بعد اس نے چائے بنائی اور دو مگوں میں ڈال کر بے جی کے پاس لے آیا اور مختصر طور پر انہیں سب بتا ڈالا۔

''مشعل کہاں ہے..... اور تمہیں پولیس کا کس نے بتایا؟''

''رافعہ بیگم کی طبیعت کو جانتے ہوئے میں سمجھ گیا تھا کہ وہ یقیناً پولیس کو لے آئیں گی اس لئے میں نے بلاول انکل سے رابطہ کر کے انہیں پوری تفصیل سمجھائی اور وہ میرے ساتھ آنے پر راضی ہو گئے۔'' وہ چائے پیتے ہوئے اطمینان سے بولا۔

''مشعل کہاں ہے؟'' بے جی اس کی جانب دیکھتے ہوئے پھر بولیں۔

''آپ کی پہنچ سے بہت دور۔'' اس کے لبوں پر پراسرار مسکراہٹ تھی۔

''پہیلیاں مت بجھواؤ..... بتاؤ کہاں ہے وہ؟'' بے جی کو اختلاج قلب ہوا۔

''پلیز بے جی، آپ مجھ سے معلوم مت کریں ورنہ میں خود کو کبھی معاف نہ کر سکوں گا۔'' وہ مگ ٹیبل پر رکھ کر کھڑا ہو گیا۔

''یہ کیا بات ہوئی؟ کیوں میرے ضبط کا امتحان لے رہے ہو؟''

''وہ ٹھیک ہے اور اس وقت تک آپ کی پہنچ سے دور رہے گی جب تک بالکل ٹھیک نہیں ہو جاتی۔'' وہ سنجیدگی سے گویا ہوا۔

''شاہ ویز!''

''بے جی! مجھے سمجھنے کی کوشش کریں۔ آج جس ذلت کے سمندر کو میں عبور کر کے آیا ہوں اگر مجھے آپ کا خیال نہ ہوتا تو میں کبھی زندہ نہ آتا۔''

''ایسی بد فالیں منہ سے نہیں نکالتے۔'' بے جی نے ہول کر کہا۔

''آپ نے ہر قدم پر میرا ساتھ دیا ہے۔ اب بھی مجھے آپ کے سہارے کی ضرورت ہے۔ دیں گی میرا ساتھ؟'' اس لمحے اس کے انداز میں اتنی بے چارگی و معصومیت تھی کہ بے جی کا موم سا دل پگھل گیا۔

''ہاں..... میری ممتا تمہارے لئے ہی وقف ہے۔'' وہ اس کی طرف دیکھ کر بولیں۔

''شکریہ بے جی! بہت شکریہ..... آپ نے ایک بوجھ سے مجھے آزاد کر دیا۔'' اس کے وجیہہ چہرے پر مسکراہٹ کی کرنیں روشن ہو گئیں۔

❑●❑

حرا رضوی کو دھن سوار ہو گئی تھی غریب عورتوں کے لئے روزگار تلاش کرنے کی۔ اور اس کام کے لئے وہ مختلف علاقوں کے سروے کرتی پھر رہی تھیں۔ فرح ان کے ساتھ تھیں۔ روز وہ کچی آبادیوں کے علاقوں میں جا نکلتیں اور وہاں جا کر انہیں روز نئی کہانیاں ملتیں جو سچی بھی ہوتیں اور پریشان کر دینے والی بھی۔ غربت و افلاس کے جبڑے تلے بھنچے غریب لوگوں کو جہاں ایک وقت کھانا بڑی محنت و مشقت کے بعد ملتا ہے، دوسرے وقت کی وہاں کوئی آس ہی نہ تھی۔ وہاں جا کر، ان لوگوں سے مل کر انہیں معلوم ہوا غربت کا آسیب کس طرح ان کی خوش حالی و مسرتوں کے ساتھ ساتھ عصمتوں کو بھی نگل رہا تھا۔

غربت و مفلسی کی بدترین صورت حال نے بے شمار دوسری برائیوں میں بڑی برائی عصمت فروشی تھی جو تیزی سے پھیل رہی تھی۔

''آپی! کیا غربت اتنی خوفناک ہے کہ انسان سے اچھے برے، جائز ناجائز کی شناخت چھین لے؟'' رضیہ نام کی لڑکی سے اس کی داستانِ حیات سننے کے بعد گھر واپسی پر حرا تاسف زدہ لہجے میں مخاطب ہوئیں۔

''اعتدال ہر جگہ ضروری ہے خواہ معاملات کی نوعیت کچھ بھی ہو اور ضروری نہیں ہے جہاں غربت ہو وہیں صرف بے راہ روی پائی جائے۔ ایسا نہیں ہوتا۔ غربت و امارت، خوش حالی ہو یا بدحالی اگر ان میں توازن نہ ہو تو دونوں راستے بدحالی کی طرف مڑ جاتے ہیں۔''

''لیکن آپی! ان میں ایک بات مشترک ہے کہ ہم اس قسم کی جتنی لڑکیوں اور عورتوں سے ملے ہیں وہ شوقیہ اس بدترین پیشے کو اپنائے ہوئے نہیں ہیں۔ وہ اس گناہ آلود فعل سے بچنا چاہتی ہیں۔''

''ہاں یہ بات تو ہے۔ ان کے ضمیر مُردہ نہیں ہوئے، صرف مجبوریاں ہی انہیں اس غلاظت کو اپنائے رکھنے پر مجبور رہیں۔'' حرا پریشان تھی۔

''میں چاہتی ہوں آپی ہم ایک ایسا انڈسٹریل ہوم بنائیں جہاں ان ہنر مند خواتین سے ان کے ہنر کے مطابق کام لیں اور پھر ان کے کام کو بوتیکس، شاپس وغیرہ پر فروخت کر کے ان کی آمدنی کا ذریعہ بنایا جائے۔''

''ایسے انڈسٹریل ہوم تو یہاں ہر گلی، ہر محلے میں کھلے ہوئے ہیں جہاں سے ان ہنر مند عورتوں کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔'' فرح پُرسوچ انداز میں بولیں۔

''فائدہ ہوتا ہے..... مگر بات ساری یہ ہے کہ ہمارے ہاں ایسے بے حس و بے ضمیر لوگوں کی کمی نہیں ہے جو ان غریب عورتوں سے کام تو بے حساب لیتے ہیں، ان کا کام آگے مہنگے داموں فروخت ہوتا ہے مگر انہیں جائز منافع دینے کی بجائے چند روپوں میں ٹرخا دیا جاتا ہے اور اپنا بینک بیلنس بڑھایا جاتا ہے۔ اسی منافقانہ طرزِ عمل کے باعث غریب، غریب تر ہوتا جا رہا ہے اور سرمایہ داروں کے سرمائے آسمان تک جا لگے ہیں۔ دولت کی غیر منصفانہ تقسیم نے کبھی بھی غریبوں کو حق نہیں دیا، معاشرے کے بگاڑ نے لوگوں کے ذہنوں کو اس حد تک متاثر کیا ہے کہ وہ چوری، ڈکیتی، لوٹ مار، قتل و زنا جیسے گھناؤنے کام کو برا نہیں سمجھتے۔''

''پھر ہم کس طرح اتنا بڑا رسک لے سکتے ہیں؟''

''ہم حقدار کو ان کا جائز حق دیں گے تاکہ وہ بھی تین وقت کی روٹی سکون سے کھانے کے علاوہ تن بھی ڈھانپ سکیں۔ اگر ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے آپی تو سمجھیں ہم نے دنیا میں آنے کا حق ادا کر دیا ہے۔'' حرا پُرجوش لہجے میں گویا ہوئیں تو فرح نے انشاء اللہ کہا۔

❑●❑

''سائرہ بیٹی! پانی پلا..... بڑی مشکل ہوئی مگر کام ہو گیا۔ اب دیکھنا باقر کیسے سدھرتا ہے۔ نیم کے پیڑ کی سب سے اونچی شاخ پر بندھوایا ہے تعویذ میں نے..... جیسے جیسے تعویذ ہوا سے اُڑتا رہے گا ویسے ویسے باقر کی بے چینی و بے قراری بڑھتی جائے گی اور ایک دن وہ تمہیں لینے آ جائے گا بغیر کسی فرمائش و مطالبے کے۔'' زرینہ نڈھال سی پلنگ پر بیٹھتے ہوئے اطمینان سے بولیں۔

''اماں! آپ درخت پر کس طرح چڑھیں..... خدانخواستہ کچھ ہو جاتا تو؟'' سائرہ گلاس انہیں پکڑاتے ہوئے خفگی سے بولی۔

''ہے نا پگلی۔ میں اس عمر میں درخت پر چڑھوں گی جب مجھ سے زمین پر بھی ٹھیک سے نہیں چلا جاتا..... ارے ایک بچے کو دس روپے دے کر اوپر چڑھوایا۔ وہ بچہ ہی باندھ کر آیا ہے سب سے اونچی ٹہنی پر تعویذ۔'' وہ پاؤں سے چپل اتار کر دراز ہوئیں۔ ''تمہیں جو چیزیں استعمال کرنے کو دی ہیں کر رہی ہو نا؟''

''میرا دل نہیں مانتا اماں! تم جو کر رہی ہو مجھے پسند نہیں ہے۔ یہ سب فضول کام ہیں..... اگر ایسی باتوں میں دم ہوتا، سچائی ہوتی تو آج کوئی پریشان حال نہ ہوتا۔ پھر ہمارے مسائل ہماری تکلیفیں ہم بھگت رہے ہیں۔ کسی دوسرے کو کیا احساس ہو سکتا ہے؟'' وہ ان کے قریب بیٹھ کر ناصحانہ لہجے میں کہنے لگی۔

''جو نیک لوگ ہوتے ہیں وہ دوسروں کے دکھوں کو اپنا دکھ سمجھتے ہیں، دوسروں کی تکلیفوں کا انہیں پوری طرح احساس ہوتا ہے تبھی تو وہ لوگوں کے کام آتے ہیں۔''

''اماں! جب ہمارا عقیدہ یہی ہے کہ صرف اور صرف اللہ پاک کی ذات سے ہمیں سب کچھ ملتا ہے، اس کے حکم کے بغیر ایک پتہ بھی جنبش نہیں کر سکتا، اس کے حکم کی ہر شے تابع ہے پھر ہم خود ہی کیوں نا اللہ سے مانگیں۔ ہمارے مانگنے میں جو تڑپ و لگن ہو گی وہ کسی اور میں نہیں ہو سکتی۔''

''میرا دماغ خراب مت کر سائرہ..... یہ جو کچھ بھی میں کر رہی ہوں تیری خوشی، تیرے گھر بس جانے کے لئے کر رہی ہوں۔ مجھے شوق نہیں اِدھر اُدھر دھکے کھانے کا۔ جو تو نے کہا وہ بھی درست ہے۔ اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے..... ہر مسلمان کا ایمان یہی ہے کہ ہر کام اللہ کے حکم سے ہوتا ہے مگر ہمارے مذہب میں دعاؤں کا بھی بڑا حصہ ہے۔ دعائیں وہ طاقت رکھتی ہیں جو تقدیر کو بدل ڈالتی ہیں۔''

''جو ہم مانگیں گے وہ دعائیں تاثیر رکھیں گی۔''

''چپ کر..... مجھے پیر صاحب نے پہلے ہی بتایا ہوا ہے کہ تو یہ سب نہیں مانے گی۔ کیوں کہ تجھ پر ہی کام کروایا ہوا ہے۔'' انہوں نے سائرہ کو ڈانٹا۔

''ایک واقعہ سناتی ہوں آپ کو ایسے ہی ایک پیر صاحب کا۔ ذرا خاموشی سے سننا۔ کسی گاؤں میں ایک پیر صاحب اپنے مرید کے ہاں گئے۔ صبح اذان ہوئی تو مریدنی نے وضو کر کے نمازِ فجر ادا کی لیکن پیر صاحب خراٹے لیتے رہے۔ مریدنی کو بڑی حیرت ہوئی کہ وہ پیر ہو کر نماز سے غفلت کر رہے ہیں، رہ نہ سکی۔ احترام سے بیدار کیا۔ یا حضرت! نماز قضا ہو رہی ہے۔ حضرت نے دل ہی دل میں گالیاں دیتے ہوئے چادر منہ سے ہٹائی کیونکہ ان کی میٹھی نیند میں خلل اندازی کی گئی تھی۔ وہ لگے انگڑائیاں لینے۔ سورج نکل آیا۔ اب خفت کی وجہ سے کچھ بن نہ سکا۔ ایک نرالی منطق سوجھی، چادر سے منہ ڈھانپ کر اس طرح بیٹھے گویا مراقبے میں ہوں۔ دو چار منٹ بعد نمائشی جھرجھری لی اور گویا ہوئے۔

''اللہ پناہ میں رکھے..... کیا بات ہے، ہمارے ایک مرید دریائے جمنا میں سفر کر رہے تھے۔ یکایک کشتی ڈانواں ڈول ہوئی۔ انہوں نے ہمیں پکارا لہٰذا ہم نے کشتی کو پیٹھ سے روکا اور بڑی مشکل سے راہِ راست پر لے آئے۔''

''سبحان اللہ! کیوں نہ ہو..... آخر ہمارے مرشد صاحب کی کرامت ہے نا۔'' وہ سیانی عورت تھی۔ پلیٹ میں گھی اور چینی ڈال کر اوپر چاولوں کی تہہ جمائی اور لا کر پیر صاحب کے سامنے رکھ دی۔ چشم زدن میں پیر صاحب چاولوں پر لپکے لیکن گھی اور چینی ندارد دیکھ کر ہاتھ کھینچ لیا۔ مریدنی ادب سے بولی۔

''کھاتے کیوں نہیں؟''

پیر صاحب غصے سے گویا ہوئے۔ ''کھاؤں خاک؟ گھی اور چینی تو ہے نہیں۔''

وہ پردہ ہٹنے کی منتظر تھی۔ چمچے سے چاولوں کو اِدھر اُدھر ہٹایا تو نیچے گھی اور چینی کی وافر مقدار نمودار ہوئی۔

''یہ کیا ہے، تمہارے باپ کا سر؟ چھ سو میل دوری سے ڈگمگاتی کشتی تو نظر آ گئی لیکن شہ رگ سے قریب گھی اور چینی کا پتہ نہ چل سکا۔'' یہ کہہ کر داڑھی پکڑ کر پیر صاحب کی مرمت شروع کر دی اور پیر صاحب خود کو چھڑا کر ایسے بھاگے کہ پھر کبھی پلٹ کر اس طرف نہ دیکھا۔''

''وہ کمبخت جعلی پیر ہو گا۔'' زرینہ اطمینان سے بولیں۔

❑●❑

شاہ ویز، مشعل کو ایک زیرِ تعمیر فلیٹ میں لے آیا تھا۔ یہ ایک غیر آباد علاقہ تھا جہاں بہت کم لوگ رہائش پذیر تھے۔

یہ اس کے دوست کا فلیٹ تھا جو ملک سے باہر تھا۔ فلیٹ اندرونی طور پر مکمل تھا۔ دوسروں میں کام ہو رہا تھا۔ مشعل کو یہاں بے ہوش چھوڑ کر گیا، گھر سے بے جی کو سمجھا کر آیا تھا کہ کچھ عرصہ انہیں یہ سب برداشت کرنا ہو گا۔ بے جی اس کی بہتری چاہتی تھیں انہوں نے وعدہ لیا کہ وہ مشعل پر سختی نہیں کرے گا، اس پر ہاتھ نہیں اٹھائے گا۔ اسے بھی اپنا رویہ درست نہ لگا، بار بار ہاتھ اٹھانا گھٹیا فعل لگا۔

لیکن اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ کسی طرح بھی رافعہ کو جیتنے نہ دے گا۔ جو بندھن اس نے مجبوری میں باندھا تھا وہ اب چیلنج بن گیا تھا۔

وہ سوچوں میں گم تھا کہ ایک کراہ کے ساتھ مشعل نے آنکھیں کھولی تھیں۔ اس کی نگاہیں سیدھی سامنے بیٹھے شاہ ویز سے ٹکرائی تھیں۔

اس کی نگاہوں میں دہکتے شعلوں نے اس کے حواس لمحے میں بیدار کر دیئے تھے۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھی تھی اور چونک کر کمرے کا جائزہ لیا تھا۔ اجنبی وبالکل سادہ کمرہ تھا۔ ہر قسم کی آرائش وآسائش سے محروم۔

خاموشی اتنی دبیز تھی گویا وہ اس دنیا کا حصہ نہ ہو۔ پہلی دفعہ اس کا دل خوف نامی شے سے آشنا ہوا تھا۔ اس نے خوفزدہ نگاہوں سے شاہ ویز کی جانب دیکھا۔ وہ اس طرح خاموش بیٹھا تھا جیسے کوئی طوفان اپنے اوپر پُرسکوت سناٹا طاری رکھتا ہے۔ اسے سخت وحشت ہونے لگی۔

''یہ کون سی جگہ ہے؟'' وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے گویا ہوئی۔

''رہنے کی جگہ ہے۔''

''لیکن ...... یہ وہ گھر تو نہیں ہے۔''

''اس گھر کے تم قابل نہیں ہو۔''

''میں ...... میں یہاں نہیں رہ سکتی۔'' اس وقت وہ بالکل بدلی ہوئی، ڈری، سہمی، خوفزدہ عام سی لڑکی تھی۔ تمام تیزی وطراری ہوا ہو چکی تھی۔

جب کہ وہ ازحد پُرسکون انداز میں اٹھ کر کھڑکی کھول کر کھڑا ہو گیا۔

باہر ایک کہر آلود رات تھی۔ شہر کی نسبت یہاں زیادہ خاموشی وسناٹے کا راج تھا۔ موسم سرما کی راتیں طویل وخاموش ہوتی ہیں کسی عمر رسیدہ کی طرح جو اپنی تمام عمر پُرشور ہنگاموں اور زندگی کی گہما گہمی میں گزار کے عمر ڈھل جانے پر خاموش ہو جاتا ہے اور یہ خاموشی اپنے اندر بہت معنی واسرار رکھتی ہے۔

وقت زیادہ نہیں ہوا تھا۔ رات کا ابتدائی حصہ تھا مگر اندر باہر پھیلی جامد خاموشی اس کے اعصاب پر گراں گزرنے لگی تھی۔

ماحول کی ساری خاموشی ووحشت اسے اپنے وجود کا حصہ لگنے لگی تھی۔ چند گھنٹے قبل جس اذیت کے صحرا کو عبور کر کے وہ آیا تھا وہ اس کے بلند حوصلے، برداشت وضبط کی کڑی مثال تھی۔ اسے خود اپنے آپ پر حیرت تھی، وہ خود کو اتنا مضبوط وبلند حوصلہ نہ سمجھتا تھا۔

مرد کتنا ہی اعلیٰ ظرف کا مالک کیوں نہ ہو، اپنی حمیت پر حملے برداشت نہیں کر سکتا۔

عزتِ نفس، انا، خودداری ...... یہی تو انسانوں کی دولت، ان کی میراث ہوتی ہے۔

مشعل سے تعلق جوڑنے کے بعد اسے ان احساسات کو بار بار تھپک تھپک کر گہری نیند سلانا پڑتا جو فوراً ہی کسی ضدی وبدتمیز بچے کی مانند مچلنے لگتے تھے۔

وہ ایثار پیشہ تھا۔

اس کی وسعت قلبی وقوت برداشت قابل ستائش تھی۔

مگر بار بار اپنی خودداری وحمیت کے ریزہ ریزہ ہونے کی تکلیف نے اسے اندر سے نڈھال کر ڈالا تھا۔ پھر آج رافعہ بیگم کی اخلاق سے گری ہوئی بکواس مستزاد اس پر گھر پولیس لے آنا، اسے سخت ناگوار گزرا تھا۔

اور جو بھی کچھ ہوا اس سب کی وجہ مشعل کی ذات تھی۔ جس کی بے حسی، بے وقوفی، وبے مروتی ہمیشہ ہی عروج پر رہتی تھی۔ جس کی آنکھوں پر ابھی تک خودغرضی وتکبر کی عینک لگی ہوئی تھی۔ وہ خود کو کروڑ پتی باپ کی اکلوتی بیٹی سمجھتی تھی۔

وہ باپ جو کبھی کروڑوں کا مالک تھا، وقت کی بدلتی کروٹ نے جسے عرش سے فرش پر لا پٹخا تھا اور وہ منہ چھپائے دور دراز علاقے میں اقامت پذیر تھا۔

اگر اس میں انسانیت نہ ہوتی، رشتوں کا تقدس، مروت، رواداری مزاج کا حصہ نہ ہوتی تو وہ بھی اسی طرح بے حسی وبے رحمی سے اسے اس کی حیثیت ووقعت کا احساس دلا کر اپنی تذلیل وتحقیر کا بدلہ لے سکتا تھا۔ جس طرح وہ اس کی عزت ووقار کو اپنی دودھاری زبان سے گھائل وپامال کرتی آئی تھی۔

اس کے لئے یہ سب کرنا کوئی مشکل نہ تھا۔ وہ اس کو اس کے اندازے سے بھی زیادہ ہزیمت پہنچا سکتا تھا۔ بات پھر اس کی قوتِ برداشت وصابرانہ تربیت کی آ جاتی تھی۔

کاش اس کے مزاج میں اتنا تحمل وبرداشت نہ ہوتی یا پھر اتنی برداشت ودرگزر سے کام لینے والا نہ ہوتا تو آج یہ تعلق توڑ دیتا جس تعلق نے اسے ماسوائے اذیتوں اور رسوائیوں کے دیا کیا تھا۔

کہر بڑھتی جا رہی تھی۔

ہر شے کثیف دھوئیں میں ملفوف دھندلی دکھائی دے رہی تھی۔ ماحول ساکت تھا۔ ہواؤں کی سرسراہٹوں میں برفیلی ٹھنڈک گھلی تھی۔

کھڑے کھڑے اس کی ٹانگیں شل ہو گئی تھیں۔ سر ایک وزنی پتھر کی مانند ہو گیا۔ ازسر نو اپنی توانائیاں کو یکجا کیا۔ ہمت وحوصلوں کو بلند کیا۔

اندر پھیلے اضطراب وانتشار کو درگزر کے کھڑکی بند کر کے پلٹ آیا۔ مشعل کسی بے جان مجسمے کی طرح بے حس وحرکت بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے پر ناقہم سے تاثرات تھے۔ غصہ، طمطراق، جھنجلاہٹ وبیزاری مفقود تھی۔

اس پر آگہی کے نئے در وا ہوئے تھے ..... ادراک وفہم کی پہلی سیڑھی پر اس کے قدم بڑھے تھے ..... شعور کے دریچوں سے سچائی کے آنگن میں جھانکنے کی سعی اس نے شروع کر دی تھی۔

''مشعل ......!'' ٹھہرے سکوت میں اس کی گمبھیر وسنجیدہ خوب صورت آواز ابھری تھی۔

مشعل نے چہرہ اٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔ وہ بھی اس کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ لمحے بھر کو نگاہوں کا تصادم ہوا تھا۔ شاہ ویز کی بولتی نگاہوں میں ایسی ہی کوئی کشش تھی جس نے اسے گھبرا کر نگاہوں کے ساتھ چہرہ جھکانے پر مجبور کر دیا تھا۔

''میں نے ہر ممکن کوشش کی ہے تمہیں سمجھانے کی، راہ راست پر لانے کی۔ پیار، نرمی، غصہ ہر حربہ حتیٰ کہ ہاتھ اٹھانے جیسا غیر اخلاقی فعل بھی میں نے آزمایا مگر تمہیں نہ سمجھنے سے دلچسپی تھی نہ تم سمجھیں۔ بلکہ تم نے ہر طریقے، ہر انداز سے مجھے ہرٹ کیا۔ نہ صرف مجھے بلکہ بے جی جیسی ازحد شفیق ومہربان بزرگ کو بھی خاطر میں نہ لائیں اور ان کے کہنے پر ان کی خاطر ہی میں نے یہ سب برداشت کیا۔ لیکن آج جو کچھ بھی ہوا اس نے وہ سب ختم کر ڈالا جو میں برداشت کر رہا تھا۔'' وہ بیڈ کے ایک طرف بیٹھ گیا تھا۔ اس کا لہجہ بے حد سنجیدگی لئے ہوئے تھا۔ وجیہہ چہرے پر بھی بلا کی سنجیدگی تھی۔ مشعل سر جھکائے لب بھینچے خاصی فرمانبرداری کا مظاہرہ کر رہی تھی جو آج سے قبل مفقود تھا۔ ورنہ وہ ایک سوال کے ستر جواب دینے کی عادی تھی۔

''اب سے تم اپنے ہر عمل کی جوابدہ خود ہو گی۔ بہت سوچ سمجھ کر چال چلنا کہ اب ہر چال تم پر واپس لوٹائی جائے گی۔ کوئی رعایت، کوئی بچت، کوئی مروت ملحوظِ خاطر نہ رکھی جائے گی، رواداری ولحاظ کا رشتہ ہم میں اب استوار نہیں ہے۔ اس لئے سوچ سمجھ کر آگے بڑھنا۔'' وہ سختی سے کہتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

□●□

کتنی دیر سے وہ اماں کو ادھر سے اُدھر چکر لگاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ رات کو اصغر نے اطلاع دی تھی کہ فریحہ کی حالت ٹھیک نہیں ہے، وہ ہسپتال میں ایڈمٹ ہے۔ بتا کر وہ رکا نہیں تھا، عجلت میں چلا گیا تھا۔

زرینہ بیگم کو بیٹے کا اس طرح اجنبی انداز میں اطلاع دینا ایک آنکھ نہ بھایا تھا۔ پھر اس کا غیروں کی طرح اطلاع دے کر فوراً چلے جانا ان کا دماغ گھما گیا۔

''اماں! بھائی سے معلوم تو کرتیں کہ بھابھی کس ہسپتال میں ہیں؟'' سائرہ اندر آتی ہوئی پریشان کن لہجے میں بولی۔

''کیا معلوم کرتی اور کیوں معلوم کرتی؟ میں لگتی کون ہوں بھلا اس کی؟'' حسب عادت وہ غصے میں آ چکی تھیں۔

''اماں! یہ وقت شکووں کا نہیں ہے ...... ہمیں ہسپتال چلنا چاہئے۔''

''پتہ، ٹھکانا بتا کر گیا ہے وہ؟ اس طرح چلتے چلتے بتا کر گیا ہے جیسے کسی غیر کو بتایا کرتے ہیں۔ کیا میں اس قابل نہیں تھی مجھے وہ ساتھ چلنے کے لئے کہتا یا بتا کر چلا جاتا کہ وہ کس ہسپتال میں ہے۔ کیا ہم جاتے نہیں، ہمارا حق نہیں ہے؟ اگر وہ باپ بننے والا ہے تو میں دادی نہیں ہوں گی؟ تم پھپھو نہیں کہلاؤ گی؟ کیا ہم خوش نہیں ہیں؟ ہمیں ارمان نہیں ہے اپنے بچے کے بچے کا دنیا میں آنے کا؟'' آخر میں ان کا لہجہ آنسوؤں کی یورش سے بھیگ گیا اور وہ چہرہ دوپٹے میں چھپا کر رونے لگیں۔ سائرہ دکھ سے ڈھے سی گئی۔

وہ اچھی طرح جانتی تھی اس کی ماں زبان کی جس قدر کڑوی ہیں، ان کا دل اس قدر ہی گداز وکدورت سے پاک ہے۔ وہ کبھی بھی کسی کی کوئی بھی بات خواہ وہ بری ہو یا اچھی صاف گوئی سے اس فرد کے منہ پر کہہ دیا کرتی تھیں۔ اس کے بعد ان کے اندر اس کے لئے کوئی بغض یا کینہ نہ رہتا تھا۔

صاف گو اور منہ پھٹ لوگ کبھی بھی لوگوں کے پسندیدہ نہیں ہوتے لیکن ایسے لوگ ان چاپلوس وکینہ ور لوگوں سے بہتر ہوتے ہیں جو آپ کے منہ پر آپ کی تعریف وتوصیف کے پُل باندھ دیتے ہیں اور پیٹھ پیچھے عیب جوئی وبدگوئی میں ملوث رہتے ہیں۔ ایسے لوگ بہت خطرناک وناقابل اعتبار ہوتے ہیں۔

زرینہ بھی اپنی صاف گوئی کے باعث لوگوں میں پسندیدگی کی نگاہ سے نہ دیکھی جاتی تھیں اور ان کی اس عادت نے ان کی بہو فریحہ کو اول روز سے ان سے متنفر ہونے کا موقع دیا تھا۔

پھر اب تو یہ دستور سا بن گیا ہے کہ شادی سے قبل بھائی بیٹے کتنے ہی چاہنے والے، محبت کرنے والے، خیال رکھنے والے ہوں بہوؤں کے آتے ہی وہ رفتہ رفتہ پہلے والے سارے رویے ومحبتیں بھول جاتے ہیں۔

پھر وہ ہر بات بیوی کے کانوں سے سننے کے عادی ہو جاتے ہیں۔

ہر منظر بیوی کی نگاہوں سے دکھائی دینے لگتا ہے۔

زبان ان کی ہوتی ہے، لفظ زوجہ محترمہ کے از بر کرائے ہوئے۔

یہاں بھی یہی ہوا تھا۔ اصغر بیوی کی چند روزہ رفاقت میں ماں، بہنوں کی برسوں کی محبت فراموش کر بیٹھا تھا۔ اور آج اس اہم موقع پر ماں کو ساتھ لے جانے کی بجائے سرسری طور پر بتا کر گیا تھا۔ ایک ماں کی اس سے بڑھ کر تذلیل مزید کیا ہو سکتی تھی۔

''اماں روئیں نہیں ...... سزا اور جزا کا سلسلہ صرف آخرت کے لئے وقف نہیں ہے، یہ یہاں بھی جاری ہے۔ جو بھی ہم کرتے ہیں اچھا، برا، جائز و ناجائز یہ سب مکافاتِ عمل بن کر قدرت ہمارے ساتھ دہراتی ہے۔ مکافات سے کوئی نہ بچ سکا۔ بھائی باپ بن جائیں گے، بھابھی ماں۔ اور یہ رشتے ہی انہیں آپ کے درد کا احساس دلائیں گے۔'' سائرہ خود کو سنبھال کر ماں کو تسلی دے رہی تھی۔

اصغر نہیں آیا۔ ساری رات ان دونوں کی پریشانی و تفکرات میں گزری۔ فریحہ کی فیملی کرائے کے مکان میں رہتی تھی۔ اس نے وہاں فون کر کے معلوم کیا تو جواب ملا وہ لوگ گھر خالی کر کے جا چکے ہیں۔ ان کی موجودہ رہائش کا کسی کو معلوم نہ تھا۔

دوسرے دن شام کو اصغر آیا۔ خاموش خاموش، پُرشکن لباس، بکھرے بکھرے بال، بے ترتیب حلیہ۔ وہ کسی سے مخاطب ہوئے بنا اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

''دیکھا؟ ساری رات ہم پر قیامت بن کر گزری اور وہ منہ سے کوئی لفظ نکالے بغیر اپنے کمرے میں چلا گیا ...... میری کوئی اوقات اس کی نگاہوں میں نہیں ہے۔ گھر میں پڑی دھول مٹی بن گئی ہوں۔'' وہ دلاسہ دیتی سائرہ سے غصے و دکھ سے مخاطب ہوئیں۔

''اماں میرا دل گھبرا رہا ہے ...... اللہ خیر کرے، بھائی کا اس طرح آنا اور خاموشی سے اپنے کمرے میں چلے جانا ...... کوئی بات ہوئی ہے۔'' سائرہ پریشان نگاہوں سے بھائی کے کمرے کے بند دروازے کو دیکھ کر روہانسے لہجے میں گویا ہوئی۔

''یہ کوئی پہلی دفعہ نہیں ہوا۔ شادی کے بعد اس کا یہی وتیرہ بن گیا ہے۔ دل چاہا تو ماں سے بات کی ورنہ بیگانوں کی طرح صبح شام یونہی گزر جاتا ہے۔''

''اسی عادت نے تمہیں خوار کر رکھا ہے اماں ...... موقع محل دیکھ کر بات نہیں کرتیں۔'' بھائی کی اس طرح آمد نے اس کے اندر عجیب بے چینی پھیلا دی تھی۔ زرینہ کو عادت کے مطابق شروع ہوتے دیکھ کر وہ زچ لہجے میں بولی۔

''ہاں ...... ہاں ...... سب کو میری زبان نظر آتی ہے ...... کوئی میرا دل نہیں دیکھتا۔'' ان کو چھوڑ کر سائرہ اصغر کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

دروازہ اندر سے لاک نہ تھا۔ ہاتھ لگاتے ہی کھل گیا۔ اس نے اندر داخل ہونے سے پہلے اصغر کو آواز دی اور اس کے آجاؤ کہنے پر اندر داخل ہو گئی۔

اندر صوفے پر وہ دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر بیٹھا تھا۔ ارد گرد کھلونے بکھرے ہوئے تھے۔

''بھائی! بھابھی کیسی ہیں؟'' اصغر کی متورم آنکھیں دیکھ کر اس کے اندر وسوسے جاگ اٹھے۔ وہ بے اختیار اس کی جانب بڑھی تھی۔

سائرہ! فریحہ ٹھیک ہے ...... لیکن مُنا نہیں رہا۔ وہ مُردہ پیدا ہوا تھا۔ ابھی اسے دفنا کر آ رہا ہوں، اپنے ہاتھوں سے اس کی ننھی منی قبر بنا کر آ رہا ہوں۔'' اصغر رو رہا تھا۔ سائرہ بھی اس خبر پر رو پڑی تھی جب کہ اس کے پیچھے آنے والی زرینہ جو تجسس کے باعث دروازے کے پیچھے کھڑی پوتے، پوتی کی خوش خبری سننے کو بے تاب تھیں، اس خبر نے ان کے حواس جامد کر ڈالے۔ انہیں محسوس ہوا کسی نے ان کا کلیجہ نوچ ڈالا ہو۔ انہوں نے لڑکھڑاتے وجود کو چوکھٹ پکڑ کر سنبھالا۔ اس وقت وہ دہرے صدمے کے زیر اثر تھیں۔ اول ان کا پہلا پوتا مُردہ پیدا ہوا، دوم انہیں اس قابل ہی نہیں سمجھا گیا کہ وہ اس کا پہلا و آخری دیدار کرتیں۔

اذیت ہی اذیت تھی!

وہ اپنا بے جان ہوتا وجود گھسیٹ کر کمرے میں بند ہو گئیں۔

سائرہ ان کی حالت سے بے خبر اصغر کو دلاسے دے رہی تھی۔ اس کا دکھ بانٹ رہی تھی۔ اسے احساس تھا۔ اس کی بیگانگی و اجنبیت کا سلوک جو اس نے ان کے ساتھ کیا اسے ان رویوں کی بدصورتی کا پوری طرح احساس تھا۔

وہ ٹھنڈا دماغ رکھنے کی عادی تھی۔ ماں کی طرح جذباتی نہیں۔ بہت ہمت و حوصلے سے اپنی کیفیت کو چھپا کر وہ دلجوئی کر رہی تھی۔

اصغر اس وقت دکھ و ملال کے گہرے ساگر میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس نے خوشی و دکھ ایک ساتھ پایا تھا۔

پہلی بار باپ بننے کی مسرت میں تو ماہ سرشار رہا تھا ...... انوکھے مسرور جذبات کے ساتھ ایک دن میں ہی اولاد کو پانے اور کھونے کے تکلیف دہ عمل سے بھی گزرا تھا۔ اولاد کو کھونے کا دکھ سوہانِ روح ہوتا ہے۔ اس دکھ میں انسان موم کی طرح پگھل کر ختم ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی اس کی دلجوئی نہ کرے تو۔ مگر دکھ، دکھ ہوتا ہے۔

سائرہ نے اس کے کپڑے پریس کئے۔ وہ نہا کر آیا تو زبردستی چائے پینے پر مجبور کیا۔ اس کی محبت رائیگاں نہ گئی۔ اصغر پہلے والا اصغر بن گیا۔

مسرت کے لمحات میں ساتھ دینے والے ہمارے دھیان سے محو ہو جاتے ہیں لیکن جو ہمارے دکھ و تکلیف میں شریک رہتے ہیں وہ کبھی فراموش نہیں ہوتے۔ وہ ہمارے قلب میں دھڑکنوں کی طرح بستے ہیں۔ رگوں میں خون بن کر دوڑتے ہیں، دکھ میں اپنائیت کی شناخت ہو جاتی ہے۔

وہ اس وقت خود کو سنبھال چکا تھا۔ دکھ کی گہری چھاپ اس کے لہجے میں موجود تھی۔

''یہ کیسی عجب بات ہے سائرہ! میں نے اسے پہلی بار دیکھا اور مجھے محسوس ہوا میرا اس کا صدیوں کا رشتہ ہے۔ اس کی صورت میری نگاہوں سے اوجھل نہیں ہو رہی تھی۔ مجھے لگ رہا ہے میں اس سے جدا ہو کر جی نہیں پاؤں گا۔ میں کیسے بھلاؤں گا اسے؟'' اصغر ایک بار پھر بے اختیار ہو گیا تھا۔

''بھائی! آپ اپنے بیٹے سے چند گھنٹوں میں اتنے مانوس ہو گئے کہ آپ کو اب کسی چیز میں کشش و زندگی محسوس نہیں ہو رہی۔ پھر اماں کا سوچیں، انہوں نے کتنے سال آپ کو لاڈ پیار و محبت سے پالا، آپ کی خوشی کو اپنی خوشی، آپ کے دکھ کو اپنا دکھ جانا، پھر آپ ان سے اتنی دور کیوں ہوئے کہ آج یہ افسوس ناک صورت حال پیش آگئی کہ آپ ان کے پوتے کو لحد میں بھی اتار آئے اور وہ کل رات سے اب تک بے تابی سے کوئی خوش خبری سننے کی منتظر ہیں۔ انصاف سے سوچئے گا بھائی! دکھ آپ کا بڑا ہے یا ان کا؟ زیادتی کس کے ساتھ ہوئی ہے، آپ کے ساتھ یا ان کے ساتھ؟'' سائرہ کو انہی لمحات کا انتظار تھا۔ وہ لوہا گرم دیکھ کر چوٹ لگانے کی عادی تھی۔

سائرہ اسے آئینہ دکھا کر جا چکی تھی۔ وہ ضمیر کے اس آئینے میں اپنی صورت کو بدصورت و کریہہ دیکھ کر لرز اٹھا۔

آج سے قبل جو اس نے کیا وہ رتی رتی اسے یاد آنے لگا۔ اسے اپنا دکھ ماں کے دکھ کے آگے حقیر و بے وقعت لگا۔

□●□

''حمیدہ! کتنی عورتیں ہیں ایسی جو سلائی، کشائی کر رہی ہوں گی اور کتنی تعداد ہو گی ان عورتوں کی جو کڑھائی کرنا جانتی ہیں؟'' فرح اپنے آگے رجسٹر کھولے تیزی سے اندراج کرنے میں مصروف تھیں۔

حمیدہ انہیں تفصیل بتا رہی تھی۔ ان کا قلم تیزی سے چل رہا تھا۔

''بیگم صاحب! عورتیں بڑی خوش ہیں جی، جب سے انہیں معلوم ہوا ہے کہ آپ ان کی محنت کا معاوضہ بھی اچھا دیں گی۔ دراصل ہمارے ہاں اس طرح کے کام تو بے حد کروائے جاتے ہیں مگر دام دیتے وقت بے ایمانی دکھائی جاتی ہے۔''

''ایسا کوئی کرنا نہ بھی چاہے تو دوسرے لوگ کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔'' حرا اس کے ساتھ مل کر مٹر کے دانے نکلواتے ہوئے گویا ہوئی۔

''وہ کس طرح چھوٹی بیگم صاحبہ؟'' حمیدہ حیران ہوئی۔

''ایک پارٹی کسی مارکیٹ سے مال اٹھا رہی ہے اور وہ اپنے کام کرنے والوں کو معاوضہ بھی برحق دیتی ہے پھر اسی مارکیٹ سے دوسرے ایسے لوگ آ جاتے ہیں جو اس پارٹی سے کم معاوضے پر مال اٹھا لیتے ہیں اور ان علاقوں میں بسے لوگوں سے کام کرواتے ہیں جہاں پسماندگی و افلاس انتہاؤں پر پہنچا ہوتا ہے۔ وہاں کام تو ہزاروں کے کروائے جاتے ہیں اور اجرت آٹے میں نمک کے برابر ملتی ہے۔ غریب اور ضرورت مند لوگ بھی سوچ کر خوش ہو جاتے ہیں کہ ان کی محنت کے عوض ان کے گھر میں ایک وقت چولہا تو جل رہا ہے اور وہ بے حس و بے ضمیر لوگ ان ضرورت مندوں کا حق مار کر اپنی تجوریاں بھرتے ہیں۔ خود تو اللہ کے غضب کا شکار ہوتے ہی ہیں ساتھ میں دوسروں کو بھی بے ایمانی کی راہ دکھاتے ہیں۔''

''بیگم صاحبہ! اگر آپ لوگوں کے ساتھ بھی ایسا ہی ہو گا تو پھر؟''

''نہیں ...... انشاء اللہ ہمارے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہو گا۔ ہم اچھے و نیک لوگوں سے رابطے رکھیں گے جو درد مند دل، ایمان، ضمیر کے مالک ہیں۔'' فرح رضوی نے رجسٹر بند کر کے مسکرا کر کہا اور کوچ پر نیم دراز ہو گئیں۔

□●□

اسے انجان راستوں سے گزر جانے کی خواہش تھی
محبت میں امر ہو جانے، مر جانے کی خواہش تھی
وہ کہتا تھا جیون تیرگی ہے
رنگ بھرنے ہیں اس میں روشنی کے
اور یہ ہم کو مختصر سے چند لمحے جو میسر ہیں
یہ لمحے ہمیں آباد کرنے ہیں
کسی کو دور سے دیکھنا، کسی سے بات کرنی ہے
جہاں یہ دن گزر جائیں، وہیں پہ رات کرنی ہے
وہ کہتا ہے محبت کا کوئی موسم نہیں ہوتا

یہ ہر موسم کا جذبہ ہے جو کبھی کم نہیں ہوتا
ادھوری سی محبت ہے ہمیں تکمیل کرنی ہے
محبت کو نئے ڈھب سے بسر کرنے کی خواہش اسے ہر شب جگاتی ہے
نہ جانے کون سی چاہت اسے ہر پل جگاتی ہے
شناسا تھا ہر ایک پل سے پر انجان رہتا تھا
بہت آباد تھا لیکن بہت ویران رہتا تھا
اسے ہر شخص کو حیران کر جانے کی عادت تھی
محبت میں امر ہو جانے کی، مر جانے کی خواہش تھی

شاہ ویز نے چونک کر دیکھا، وہ رسالے پر جھکی ہوئی تھی۔
''تمہیں کب شوق ہو گیا اردو میگزین پڑھنے کا؟ وہ بھی پوئٹری!''
''اردو میگزین بھی میں پڑھتی ہوں اور پوئٹری میری فیورٹ ہے بلکہ میں نے خود بھی پوئٹری لکھی ہے۔'' وہ اٹک اٹک کر کہہ رہی تھی اور شاہ ویز نے اس کی بات کے جواب میں بھرپور استہزائیہ قہقہہ لگایا تھا۔
''تم اور شاعری..... میں کبھی مان ہی نہیں سکتا کہ تم شاعری کر سکتی ہو۔'' اس کی آنکھیں، اس کا چہرہ، اس کی مسکراہٹ، ہر نقش میں گہرا تمسخر و استہزا تھا۔ وہ کھول اٹھی۔
''کیوں، وہ لوگ انسان نہیں ہوتے؟ اس دنیا سے تعلق نہیں رکھتے؟''
''تمہاری دنیا سے تعلق نہیں رکھتے۔''
''کیا مطلب؟''
''مطلب، رائٹرز بہت حساس لوگ ہوتے ہیں۔ مروت، خلوص وحساسیت ان کے وجود کا حصہ ہوتی ہے۔ ان کی پہچان ہوتی ہے۔ اور تم تو ان احساسات سے بالکل ہی نابلد و ناآشنا ہو۔ ان کی دنیا تمہاری دنیا سے بالکل الگ ہے۔ تمہاری دنیا سے تعلق چنگیز خان، ہلاکو خان، ہٹلر وغیرہ کا محسوس ہوتا ہے۔'' وہ ہنس رہا تھا۔ اس کی آنکھیں، چہرہ، ہر نقش ہنس رہا تھا۔
اس وقت وہ بالکل مختلف لگ رہا تھا۔ روشن چہرہ، روشن مسکراہٹ، روشن آنکھیں..... کتنا اعتماد و اطمینان تھا اس کے انداز میں۔ مشعل دیکھتی رہ گئی۔
''کیا دیکھ رہی ہو نظر لگاؤ گی؟'' نامعلوم کس موڈ میں تھا۔ بہت خوش و شوخ۔ وہ کچھ بولی نہیں، بولتی بھی کیا۔ اپنی موجودہ حیثیت کا تعین اس نے کر لیا تھا۔
وہ بھری دنیا میں بالکل تنہا ہو گئی تھی۔ اس کا کوئی اپنا نہیں تھا۔
نہ کوئی دوست
نہ کوئی ہمدرد
نہ کوئی غمگسار
لق و دق صحرا میں وہ تنہا کھڑی تھی۔ ہر سمت گھپ اندھیرا تھا، دبیز تاریکی۔
''کیا ہوا.....؟'' اس کے چہرے کے بدلتے تاثرات اس کی ذہین آنکھوں سے پوشیدہ نہ رہ سکے۔
''میں پاپا سے بات کرنا چاہتی ہوں۔'' اس نے سوچ لیا تھا اب وہ پاپا سے ناراض ہی رہے گی۔ جب انہیں اس کی پرواہ نہیں ہے تو وہ بھی انہیں یاد نہیں کرے گی۔ مگر یادوں پر کسی کا زور چل سکا ہے کبھی؟ وہ بن بلائے مہمانوں کی طرح وارد ہوتی ہیں اور بے چینی، اضطراب و بے کلی پیدا کر ڈالتی ہیں۔
پھر یاد بھی باپ کی تھی۔
جنہوں نے اسے صرف باپ کا ہی پیار نہ دیا تھا بلکہ ماں، بھائی، بہن، دوست، احباب، تمام رشتے اس ایک رشتے میں پنہاں تھے۔ انہوں نے محاورتاً نہیں، حقیقتاً پھول کی طرح اس کی نگہداشت کی تھی۔ خود سے بڑھ کر چاہا تھا۔ متاع حیات کی طرح وہ چاہ کر بھی ان کی محبت فراموش نہیں کر سکتی تھی۔
اس وقت بھی بے تاب ہو کر اس کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا تھا۔
''کیوں..... شکایت لگاؤ گی میری؟''
''وہ میرے پاپا ہیں..... جو دل چاہے گا بات کروں گی۔'' وہ زچ ہو کر بولی۔
''او کے، میں نے کب دعویٰ کیا کہ وہ میرے پاپا ہیں..... جو دل چاہے بات کرو۔''
''لیکن کیسے بات کروں؟ مجھے کیا معلوم وہ کہاں ہیں؟''
''اوہ..... یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم۔'' اس نے شانے اچکا کر افسردگی سے کہا۔ مشعل اس کے انداز پر کھول کر رہ گئی۔ صاف لگ رہا تھا وہ بن رہا ہے۔
''جھوٹ بول رہے ہو، تمہیں معلوم ہے۔'' وہ زیادہ دیر اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکی۔
''لہجہ درست کرو اپنا۔'' یکلخت اس کی شگفتگی و شوخی غائب ہو گئی۔ کسی شیر کی طرح غرایا تھا۔ وہ تھرا کر رہ گئی۔
''پاپا تمہیں بتا کر گئے ہیں، پھر تمہیں کس طرح معلوم نہیں ہے؟'' اس کی آواز دھیمی ہو گئی تھی، لہجہ پست۔
''میں نے کہہ دیا نہیں معلوم تو بس نہیں معلوم۔'' اس کا انداز ہٹ دھرمی و برتری لیے ہوئے تھا۔ وہ اسے خود پر چھایا ہوا لگ رہا تھا۔ گویا اس سے اب مقابلہ کرنا ناممکن تھا۔ وہ تنہا ہزاروں سے قوی و مضبوط تھا۔
وہ جو ناجائز کو جائز، ناممکن کو ممکن بنانے کی صلاحیت رکھتی تھی، اب محسوس کرنے لگی اپنی حق بات بھی منوانے کی صلاحیت و اہلیت کھو بیٹھی ہے۔
شاہ ویز کے چہرے سے مسکراہٹ و شوخی غائب ہو گئی تھی۔ کچھ لمحے پہلے روشن روشن نظر آنے والا چہرہ یکدم ہی درشتگی و کرختگی سے بگڑ کر رہ گیا تھا۔ اس کا موڈ دیکھ کر اس کے تمام حوصلے دھمکیں جواب دے گئیں۔ بہت غیر محسوس طریقے سے وہ اس کے زیر اثر آ چکی تھی۔
اس کا کرخت لہجہ، درشت انداز اور پھر نا قابل برداشت ہاتھ اٹھانے والا جنون، مارنے ہی اس کے اندر شاہ ویز سے خوف و وحشت کا شکار کر دیا تھا۔ اگر وہ یہ طرز عمل نہ اپناتا تو وہ بالکل بھی اس کے رعب میں آنے والی نہ تھی۔
چند لمحے وہ اسی طرح منہ بگاڑے بیٹھا رہا پھر اٹھ کر کمرے سے چلا گیا۔ مشعل نے کھل کر سانس لی اور کمرے پر نظریں دوڑاتے ہوئے پلنگ پر بیٹھ گئی۔
ہر قسم کی آرائش و زیبائش سے لاتعلق، بالکل عام و سادہ کمرہ تھا۔ دیواروں پر گرے پینٹ تھا۔ سامنے دیوار پر سنہری شیڈ والی وال کلاک کے علاوہ دیواروں پر پینٹنگ، سینری کچھ نہ تھا۔ دائیں دیوار میں درمیانی سائز کھڑکی پر سرمئی و سیاہ پرنٹ کا پردہ تھا۔ ایسا ہی پردہ کمرے کے دروازے پر بھی نظر آ رہا تھا۔ نیچے فرش پر سادہ سرمئی کارپٹ بچھا تھا۔ چھت وائٹ پینٹ کی تھی جس کے درمیان میں پنکھا ہوا دے رہا تھا۔ فرش کے وسط میں ڈبل بیڈ تھا جس پر اجلی اجلی چادر و تکیہ رکھے تھے۔ اس کے علاوہ صرف ایک کارنر ریک تھا جس میں کچھ سامان نہ تھا۔
کمرہ بے حد چھوٹا تھا۔ بیڈ اور کارنر ریک کے بعد بہت تنگ سی جگہ کھڑکی تک جاتی تھی۔ کمرہ کیا تھا ایک تنگ کوٹھڑی تھی۔ کسی کبوتر کے کابک کی طرح۔
وہ متوحش نظروں سے دیکھتی رہ گئی۔ بھلا اس جگہ کس طرح رہا جا سکتا ہے؟ یہاں انسان تو کیا کوئی جانور بھی نہ رہ پائے گا۔
وہ ازحد ہراساں و بدحواس ہو رہی تھی۔ سرد موسم میں بھی اس کی پیشانی عرق آلود تھی۔ تیور تو پہلے ہی شاہ ویز کے خطرناک نظر آ رہے تھے، اب عزائم بھی مخفی نہ رہے تھے۔ یقیناً وہ کسی خوفناک منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کی خاطر یہاں آیا تھا۔
''وہ منصوبہ کیا ہو سکتا ہے؟'' اس نے خود سے سوال کیا۔
لیکن کوئی جواب وہ سوچ ہی نہ سکی، ماسوائے اس کے کہ اگر اسے یہاں کچھ دن رکھا گیا تو وہ زندہ نہ رہ پائے گی۔ ساری زندگی آسائشوں، راحتوں میں گزری تھی۔ جن کی اس حد تک عادت پڑ چکی تھی کہ ان سے علیحدگی کا تصور ہی ایسے تڑپا دیا کرتا گویا بن جل کے مچھلی تڑپ اٹھے۔
نامعلوم کتنے لمحے یا گھنٹے گزرنے کے بعد شاہ ویز اندر داخل ہوا تھا..... ایک ہاتھ میں کچھ شاپرز تھے دوسرے میں دسترخوان، پلیٹیں، چمچے اور گلاس۔ وہ سب اس نے بیڈ اور دیوار کے درمیان میں تھوڑی سی جگہ میں رکھ دیا اور بہت ترتیب سے شاپرز میں سے کھانا نکال کر پلیٹوں میں سجا کر دسترخوان پر رکھنے لگا۔ تمام سامان سیٹ کرنے کے بعد اٹھ کر کمرے سے گیا۔ واپسی چند سیکنڈ بعد ہوئی۔ ہاتھ میں پانی کی بوتل تھی۔ وہ سائیڈ میں رکھ کر وہ دوزانو بیٹھ گیا۔ مشعل ایسے گم صم بیٹھی تھی گویا موجود نہ ہو وہاں۔
''آپ کو کھانے کے لیے انویٹیشن دینا پڑے گا یا ہاتھ جوڑ کر درخواست کرنی پڑے گی؟'' اسے خاموش بے حس و حرکت بیٹھے دیکھ کر وہ طنزیہ لہجے میں گویا ہوا۔
''مجھے بھوک نہیں ہے۔''
''میرا ساتھ دو، مجھے تنہا کھانے کی عادت نہیں ہے۔''
''میں زبردستی نہیں کھا سکتی۔'' اس کا انداز بیزار کن تھا۔
''مجھے بھی زبردستی کرنے کی عادت نہیں ہے۔ جب سے تم سے رشتہ جوڑا ہے مجھے اپنی کافی عادتوں کو ترک کرنا پڑا ہے۔ کچھ ناپسندیدگی کے باوجود اپنانا پڑا ہے ان میں ایک اس عادت کو بھی اپنانا ہی پڑے گا۔'' وہ اطمینان سے کہتا ہوا کھانے میں مشغول ہو گیا۔ اس کی جان جل کر رہ گئی۔
کیا بگڑ جاتا اگر تھوڑے سے نازنخروں کو برداشت کر کے اسے کھانا کھانے پر مجبور کر دیتا۔ عورت مار سے نہیں، پیار سے پگھل جاتی ہے۔ وہ یہ کیوں نہیں سمجھتا۔ ہر وقت اپنی انا و

برتری کا احساسِ تفاخر اسے جھکنے نہیں دیتا۔خود کو نہ معلوم کیا سمجھتا ہے۔کتنی جلدی اپنی اوقات بھول گیا ہے۔

غصہ و جنون اس کے اندر کسی طوفان کی طرح تباہی پھیلا رہا تھا۔

''نہاری تو بے جی پکاتی ہیں زبردست، اعلیٰ سے اعلیٰ۔ہوٹل کی نہاری ان کے آگے مات ہے۔اور بریانی میں تو ان کا جواب ہی نہیں۔ایسی خوشبو والی پکاتی ہیں کہ پورا محلہ مہک اٹھتا ہے۔پراٹھے گیارہ پرت والے بناتی ہیں، اتنے خستہ و کرارے کہ پیٹ بھر جاتا ہے مگر نیت سیر نہیں ہوتی۔اور شامی کباب اس قدر لذیذ ہوتے ہیں کہ ایک بار کھانے والا بار بار کھانے کی فرمائش کرے۔''وہ کھانے کے ساتھ ساتھ بے جی کی قصیدہ گوئی میں مصروف تھا۔

اس وقت اس کے چہرے پر ملائمت و محبت کے رنگ تھے۔پیشانی پر شکنوں کے ناگوار جال نہ تھے، غصے کے وقت مقابل کو بھسم کر ڈالنے والی نگاہوں میں بڑی عقیدت بھری روشنی تھی۔لبوں پر معصوم سا تبسم۔چہرے کے نقوش اپنی جگہ تھے۔کوئی ناگواریت، کوئی کرختگی و درشتگی کا جلال نہ تھا۔اس وقت دھیمے دھیمے باتیں کرتا وہ کتنا وجیہہ و پُروقار لگ رہا تھا۔بلیک جینز، پرپل شرٹ اس کے شاندار سراپا پر غضب ڈھا رہی تھی۔بلاشبہ وہ پُرکشش شخصیت رکھتا تھا۔کوئی بھی لڑکی اس جیسا جیون ساتھی پا کر فخر محسوس کر سکتی تھی۔وہ ایک آئیڈیل پرسنالٹی رکھتا تھا۔

''آہ......میں یہ کیا سوچ رہی ہوں؟ پل پل گرگٹ کی طرح رنگ بدلتا یہ شخص میرا آئیڈیل کبھی نہیں ہو سکتا۔یہ خود غرض و خود پسند بندہ، جس کی نگاہ میں صرف اپنی ہٹ دھرمی کی ویلیو ہے۔''اس نے جھٹ خود کو سرزنش کی لیکن ذہن بار بار اس کی جانب بھٹک رہا تھا۔

جس اہتمام سے وہ کھانے بیٹھا اس اشتہا سے کھایا نہ تھا، جلدی ہی ہاتھ کھینچ لیا تھا اور سب سمیٹ کر رکھ آیا تھا۔

''رات یوں ہی بیٹھ کر گزارنے کا ارادہ ہے؟''اسے اسی طرح بیٹھے دیکھ کر بولا۔''اور گزار بھی سکتی ہو۔کیونکہ سارا دن تمہارے پاس ہوتا ہے سونے، آرام کرنے کے لئے۔لیکن مجھ پر رحم کرو۔میں ایک محنت کش آدمی ہوں، کمانے کی ذمے داری ہے مجھ پر۔میں ایسی عیاشیاں افورڈ نہیں کر سکتا۔''بات بات پر طنز کی بوچھاڑ کرنا اس کی عادت بن گئی تھی۔چند لمحات قبل خوشگوار نظر آنے والا مزاج برہم ہو چکا تھا۔

''سوؤ......منع کس نے کیا ہے؟''وہ آہستگی سے گویا ہوئی۔

''ایک سائیڈ پر ہو۔پوری مسہری پر قبضہ جما کر بیٹھی ہو۔''

''وہاٹ؟ ایک بیڈ پر سوئیں گے؟''

''ہوں تو کیا ہوا؟ ہم میاں بیوی ہیں، کوئی پڑوسی تھوڑی ہیں جو اس قدر حیرانگی کا اظہار کر رہی ہو؟''وہ بیڈ پر بیٹھتا ہوا تمسخرانہ انداز میں کہنے لگا۔

وہ چند لمحے شدید حیرانگی و بے یقینی کی کیفیت کے زیرِ اثر رہی۔اس اثناء میں شاہ ویز ٹیوب لائٹ آف کر کے نائٹ بلب روشن کر چکا تھا۔نائٹ ڈریس چینج کرنے کے بعد اس نے حسبِ عادت اپنا پسندیدہ پرفیوم استعمال کیا تھا۔ایک دلآویز مہک ہر سو پھیل گئی۔

کیا خوشبو تھی۔

حواسوں پر چھا جانے والی، دھڑکنوں کو مہکانے والی، جذبات بھڑکانے والی، خوشبوؤں کا وجود نظر نہیں آتا مگر طاقت و سحر انگیز قوت ہوتی ہے ان میں پل بھر میں انسان کو دیوانہ بنا ڈالتی ہیں۔

بے خود و مست کر دیتی ہیں۔انسان خود کو بھول کر ان میں کھو جاتا ہے۔

وہ بھی سب کچھ بھول کر احساسِ تفاخر سے کھل اٹھی۔

''ہونہہ......بڑے بے حس و سنگدل بنتے تھے۔عورت و مرد کے درمیان جذباتی تعلق کی تمہاری لاجک میں کوئی جگہ و ضرورت نہ تھی۔حُسن و جوانی تمہاری کمزوری نہیں بن سکتی تھی۔تم نفس کو پیروں تلے کچلنے کے عادی تھے۔پھر اب......پھر اب سارے دعوے اور فخر کا کیا ہوا؟''وہ مسرت و کامرانی سے دل ہی دل میں قہقہے لگا رہی تھی۔آج تو اس کی جیت کا وہ وقت آیا تھا جس کا اسے کب سے انتظار تھا۔

وہ پتھر موم بن گیا تھا جس کو وہ اپنی مرضی کے سانچے میں ڈھالنے کو تیار تھی۔

''مشعل ہوں میں......وہ مشعل جو اپنے حُسن کے شعلوں سے بڑے بڑے پتھر دلوں کو موم بنا ڈالتی ہے، مٹا ڈالتی ہے، فنا کر ڈالتی ہے......ہاہاہا۔''

''میڈم! میں نے کہا تھا میں سونا چاہتا ہوں......صبح دفتر جانا ہوتا ہے مجھے۔''وہ جو بغور اس کے چہرے کے بدلتے رنگ دیکھ رہا تھا، قدرے جھک کر گویا ہوا۔اس کے چہرے سے اس کی گرم سانسیں ٹکرائیں اور ایک لطیف سی سرشاری اس کے وجود کو گدگدا گئی۔

اس نے مخمور نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔وہ ابھی تک جھکا ہوا تھا۔اس کی دلکش آنکھیں اس کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔

مسکراتی، جھلملاتی فسوں خیز نگاہیں۔

صیاد آج خود اپنے ہی جال میں آ پھنسا تھا۔شکاری خود شکار ہوتے چلا تھا۔

اپنا پن بھی اس بے گانے پن میں ہے
پورا عالم ایک دیوانے پن میں ہے
یہ جو تم سے انجان بنا پھرتا ہوں
ساری بات اسی انجانے پن میں ہے

''کیا ارادے ہیں؟''اس کا انداز سرگوشیانہ تھا مگر مشعل اس کے انداز کو سمجھ نہ سکی تھی جو سو فیصد تمسخرانہ و طنزیہ تھا۔

(اپنے دل سے پوچھو؟) وہ قصداً مسکائی اور ادائے دلربائی سے کھڑی ہو گئی۔شاہ ویز بہت دلچسپی سے اس کی حرکات و سکنات دیکھ رہا تھا۔

پھر ایک دم ہی اس کا قہقہہ کمرے میں گونجا تھا۔

وہ ہنس رہا تھا۔مشعل نے اس کی جانب دیکھا اور اس کے چہرے سے چھلکتے طنز، تمسخر اڑاتی نگاہوں نے اس کی تمام خوش فہمی و خوش گمانی ایسے غائب کر دی جیسے تتلیوں کو چھونے سے ان کے رنگ غائب ہو جاتے ہیں۔جسم برف کی سل بن گیا۔صدمے و خفت کے احساس نے آنکھیں موندنا بھلا دیا۔

احساسِ توہین و ذلت۔

احساسِ ندامت و پشیمانی۔

ایسا بھی بھلا ہونا تھا اس کے ساتھ؟ دل توڑنا اس کا مشغلہ تھا، جذبات سے کھیلنا اس کی سرشت تھی۔آج ساری بازی الٹی ہو گئی۔

اس شخص سے شکست کھا گئی جس کو شکست دینے کا تہیہ کئے ہوئے تھی۔وہ سوچ سوچ کر پچھتا رہی تھی۔پچھتا پچھتا کر سوچ رہی تھی۔

''میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا شاید آپ بھول گئی ہیں تو دوبارہ دہرا دیتا ہوں۔جو آپ مجھے سمجھ رہی ہیں اور نہ ہی وہ بننا چاہوں گا جو آپ بنانے کی سعی میں ہمہ وقت مگن رہتی ہیں۔''وہ مسکراتے ہوئے نرم لہجے میں دھیرے دھیرے کہہ رہا تھا۔انداز خاصا سادہ و معصومانہ تھا لیکن مسکراتی نگاہوں کی مضحکہ خیز چمک اس کے حواس گم کر رہی تھی۔

''بات صرف یہ ہے محترمہ! اس فلیٹ میں کمرہ بھی اکلوتا ہے اور کمرے میں یہ بیڈ، بیڈ پر بستر اور بستر پر یہ کمبل اکلوتا ہے اس لئے مجھے بستر شیئر کرنا پڑ رہا ہے۔سردی بہت لگتی ہے مجھے، بغیر کمبل کے سو بھی نہیں سکتا۔مجھے تو نیند بہت زبردست آ رہی ہے۔اوکے گڈ نائٹ۔''وہ اس کا تیزی سے سرخ پڑتا چہرہ اور کھنچے ہوئے ابرو دیکھ کر دلکشی سے مسکرایا اور کمبل منہ تک تان کر لیٹ گیا۔

وہ کتنی دیر تک یوں ہی بے حس و حرکت کھڑی رہی۔

پہلی بار اسے محسوس ہوا وہ زمین کی تہہ در تہہ گہرائیوں میں دفن ہوتی جا رہی ہو۔اعصاب کچے دھاگوں کی طرح ٹوٹنے لگے تھے۔رگوں میں خون کی بجائے آگ دوڑنے لگی تھی۔

دل کی رفتار آہستہ آہستہ مدھم ہوتی جا رہی تھی۔مساموں سے پسینہ پھوٹنے لگا تھا۔جسم کٹی پتنگ کی طرح ڈولنے لگا تھا۔آنکھوں میں اندھیرے کی یلغار بڑھنے لگی تھی۔اس نے گھبرا کر بیٹھنا چاہا، خود کو سنبھالنا چاہا مگر بے سود......وہ ٹوٹے شہتیر کی طرح بے جان ہو کر گری تھی۔سر بیڈ سے ٹکرایا تھا۔خون کا فوارہ سا چھوٹ گیا۔وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔

❑●❑

حرا رشیدہ کے ہمراہ شاپنگ کو آئی تھیں۔شاپنگ تو معمولی کرنی تھی اس بہانے مارکیٹ میں فروخت ہونے والی اشیاء کا انہیں جائزہ لینا تھا۔اس وجہ سے انہوں نے کئی بوتیکس دیکھے تھے۔اس سروے میں انہیں کافی معلومات ہوئی تھیں جو آگے چل کر ان کے لئے ازحد معاون ثابت ہوں گی۔

وہاں سے فارغ ہو کر وہ سامان خریدنے لگیں۔

رشیدہ، حمیدہ کی بہن تھی جو حمیدہ کے مقابل بہت خاموش طبع و خوش مزاج عورت تھی۔محنتی تھی، بلا کی پھرتیلی، حمیدہ سے بالکل متضاد طبیعت تھی اس کی۔وہ بیوہ تھی۔پچھلے دنوں گاؤں سے آئی تھی۔حرا کو وہ بہت بھائی تھی۔سو اس نے اسے بھی کام پر رکھ لیا تھا۔

اب رشیدہ اس کے ساتھ اور حمیدہ فرح کے ساتھ رہا کرتی تھی۔کیونکہ وہ ان کی طرح باتونی لوگوں سے راہ و رسم بڑھانے کی شوقین تھی جب کہ حرا کی طرح رشیدہ کم گو، آدم بیزار و تنہائی پسند تھی۔اپنی انہی خوبیوں کے باعث وہ دنوں میں مانوس ہو گئی تھی۔

شاپنگ سے فارغ ہو کر اس نے باہر کی طرف قدم بڑھائے تھے۔اسی لمحے دوسری جانب سے گرے پینٹ سوٹ میں ملبوس شخص موبائل کان سے لگائے آگے بڑھا تھا موبائل پر بات کرنے کے باعث اس کا چہرہ اوپر کو اٹھا تھا۔

حرا حسب عادت تیزی سے آگے بڑھ رہی تھیں۔ اسی لمحے ان کا تصادم ہوا تھا۔ ان کا شانہ اس شخص سے ٹکرایا تھا۔ بے اختیار ان کے ہاتھ میں پکڑا کانچ کے برتنوں کا شاپر چھوٹ گیا۔ تیز آواز کے ساتھ برتن ڈبوں میں ہی ٹوٹ گئے۔ حرا کے پیچھے آتی رشیدہ کے لبوں سے بے ساختہ ہی ہائے اللہ نکلا تھا جب کہ حرا گنگو کی حالت میں فرش پر گرے شاپر سے ٹوٹ کر بکھرے کانچ کے ٹکڑوں کو دیکھ رہی تھیں۔ آن واحد میں یہ سب ہوا تھا۔ وہ سنبھل بھی نہ پائی تھیں۔

''سوری...... آئی ایم سو سوری میم!'' اس نے پُروقار انداز میں معذرت کی تھی۔ حرا کی سماعتوں میں برتن ٹوٹنے کی آواز سے زیادہ زبردست چھناکا اب ہوا تھا۔ ان کی دھڑکنیں بری طرح منتشر ہوئی تھیں۔ میکانکی انداز میں اس کی جانب دیکھا تھا۔ یہ وہی تھا جس کے خوفناک تصور سے بیس سال بعد کچھ عرصہ قبل ہی تو چھٹکارا پایا تھا خود کو محفوظ تصور کرنا شروع کیا تھا۔

بے خوفی کی پہلی سیڑھی پر ہی وہ مل گیا تھا۔

جو مجسم خوف و دہشت تھا۔

گرے سوٹ والے نے بھی سرسری نگاہ ان پر ڈالی تھی مگر نگاہ اٹھی تو جھکنا بھول گئی۔ یہ وہی لمحہ تھا جب حرا نے بھی ان کی طرف دیکھا تھا۔

دونوں کی نگاہیں ملی تھیں۔

ایک میں خوف و وحشت تھی۔ دوسری میں ناقابل فہم تاثرات۔ چند لمحے وہ ایک دوسرے کی جانب دیکھتے رہے۔ اس شخص نے آگے ایک قدم بڑھایا تھا۔

حرا پیچھے ہٹی تھیں۔ ایک قدم، دو قدم، تین قدم...... پھر اردگرد لوگوں کے ہجوم کی پرواہ کرتے ہوئے سرپٹ بھاگ لی تھیں۔

وہ شخص بھی ان کے پیچھے باہر کو لپکا تھا مگر اسی دم اندر کی جانب آنے والے لوگوں کے ہجوم میں پھنس کر رہ گیا تھا۔

بھیڑ سے نکل کر باہر کی جانب گیا تو کافی تلاش کے باوجود وہ نہیں ملی تھیں۔ وہ ہتھیلی پر مکا مار کر رہ گیا۔

حرا ایسی بدحواس ہو کر بھاگی تھیں کہ انہوں نے کسی کی پرواہ نہیں کی تھی۔ انہیں دیکھ کر رشیدہ بھی افتاں و خیزاں ان کے پیچھے چلی آئی تھی۔ ہر ٹیکسی والے کو منہ مانگا کرایہ دے کر وہ گھر پہنچی تھیں۔

راستے بھر وہ مڑ مڑ کر پیچھے دیکھتی رہی تھیں گویا انہیں کسی کے تعاقب کا احتمال ہو۔ ٹیکسی بھی انہوں نے گھر سے ایک اسٹریٹ پیچھے رکوائی تھی۔ اور گھر میں داخل ہو کر تیزی سے گیٹ بند کر کے تالا لگا دیا تھا۔ اندر سے بھی تمام دروازے کھڑکیاں لاک کر ڈالی تھیں۔ رشیدہ باہر سے ہی رخصت ہو گئی تھی۔ فرخ گھر میں نہیں تھیں۔ ان کی موجودگی اس کے لئے تحفظ و ڈھارس کا باعث بنتی مگر اب ان کی آمد تک انہیں اسی طرح خوف و پریشانی کا شکار رہنا تھا۔

ہر طرح سے محفوظ ہونے کے باوجود وہ خود کو محفوظ تصور نہیں کر رہی تھیں۔ ابھی بھی اطمینان و سکون سے بیٹھنے کی بجائے مضطربانہ کمرے میں ٹہل رہی تھیں۔

اس شخص کا چہرہ ذہن کی اسکرین پر روشن تھا۔

برسوں کی دبی راکھ اڑنے لگی تھی۔ زخموں پر جمے کھرنڈوں سے خون رسنے لگا تھا۔ ماضی کبھی خوش حال حقیقت، بھی کرب ناک یاد بن کر رہ جاتا ہے۔

ماضی ہماری حیات کا وہ اہم ترین حصہ ہے جو خوب صورت ہو یا بدصورت، خوشنما ہو یا بدنما، ہر حال میں ہماری ذات سے جڑا رہتا ہے۔ ہم اسے لاکھ فراموش کرنا چاہیں، بھولنا چاہیں، جھٹلانا چاہیں، رد کرنا چاہیں نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ماضی زور آور ہوتا ہے خواہ کیسا بھی ہو۔

حرا بھی اس وقت ماضی کے عقاب کے نوکیلے پنجوں سے بچنا چاہ رہی تھیں لیکن ان سے فرار ممکن نہ تھا جلد ہی بے دم ہو کر وہ ماضی میں گم ہو گئی تھیں۔

فرخ آفندی اپنے شہر کے امراء میں شمار ہوتے تھے۔

دہلی میں ان کا مختلف کیمیکلز کا بڑا بزنس تھا۔ ان کی فیملی میں ایک بیٹا عرفان، بیٹی سارہ تھی اور ماں آفندی بیگم شامل تھیں۔ دونوں بچے شادی شدہ تھے اور زیادہ تر ملک سے باہر رہنا پسند کرتے تھے۔ ان کی بیوی کو فوت ہوئے دس سال ہو چکے تھے۔

وہ کاروبار کے سلسلے میں زیادہ تر ملک سے باہر رہتے تھے۔ بہت پُرسکون زندگی گزر رہی تھی۔ بیوی کے مرنے کے کچھ عرصے بعد تک وہ ان کی کمی محسوس کرتے رہے تھے مگر گزرتا وقت جانے والوں کو بھلا ہی دیتا ہے۔ وہ بھی تقریباً انہیں بھلا چکے تھے۔

ان کی پُرسکون زندگی میں تشنگی بھری ہلچل اس وقت پیدا ہوئی جب امی حضور بستر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔ شوگر اور دل کی بیماری نے ان کو بستر پر ڈال دیا۔ ایسے میں نوکروں کے مزے آگئے۔ وہ اپنی مرضی کے مالک بن بیٹھے۔

پورے گھر کا نظام بگڑ کر رہ گیا۔ وقت پر انہیں کوئی چیز تیار ملتی تھی نہ امی حضور کو دوا غذا مل رہی تھی۔ غصے میں انہوں نے تمام ملازمین بدل ڈالے۔

نتیجتاً بے ترتیبی کے ساتھ ساتھ کچن کے سودا سلف کے ساتھ ساتھ گھر کی اشیاء بھی چوری ہونے لگیں اور نظام میں کوئی بہتری نہ آئی۔

کئی دفعہ ملازم بدلنے کے باوجود حالات بد سے بدتر ہوتے چلے گئے تو انہوں نے گھبرا کر بیٹے بہو کو کہا کہ وہ امی حضور کی صحت یابی تک یہاں رہیں مگر عرفان بیوی کی وجہ سے آنے پر راضی نہ ہوئے۔ پھر انہوں نے بیٹی سارہ سے کہا کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ یہاں آ کر رہ لے۔ کچھ عرصہ بعد انہوں نے بھی صاف کہہ دیا وہ اپنا گھر نہیں چھوڑ سکتیں۔

سگی اولاد کی بے رخی و بے حسی نے انہیں بھی بیمار کر ڈالا تھا۔ ایسے میں ان کی ملاقات ایک پارٹی میں حرا کے ماموں سے ہوئی جو اپنی جوان سال بھانجی کی شادی کے لئے کسی اچھے رشتے کی تلاش میں تھے اور اس وقت ان کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ وہ شادی کر لیں۔ اولادوں نے آنکھیں پھیر لی ہیں۔ وہ اپنی مسرتوں میں اتنے مگن ہیں کہ انہیں باپ اور دادی کی پریشانیوں و مشکلات کا کوئی احساس ہی نہیں ہے اور وہ گھر اور کاروبار ساتھ نہیں چلا سکتے۔ ایک خیال کا کوندا سا لپکا تھا اور دوسرے دن ہی وہ اس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اشفاق صاحب کے ہاں جا پہنچے۔

اشفاق صاحب کا چھوٹا سا مکان ان کی سفید پوشی کا نشان تھا جسے دیکھ کر ان کے حوصلے اور زیادہ بلند و مضبوط ہوئے۔ اور وہ یقین کر چکے تھے کہ یہاں سے خالی ہاتھ نہیں جائیں گے۔ اور ان کے یقین کو ٹھیس نہیں لگی تھی۔ دولت ایسی شہ زور ہے جو اپنے مالک کی ہر برائی و بدصورتی کو چھپا دیتی ہے۔ یہاں بھی یہی ہوا۔ ان کی دولت نے ان کی بڑھتی ہوئی عمر، دوسری شادی، جوان شادی شدہ بچوں کی موجودگی جیسے ہر قابل اعتراض عیب کو چھپا لیا تھا۔ وہ بخوبی جانتے تھے ان حالات اور اس عمر میں ان کا ساتھ صرف متوسط گھرانے کی لڑکی نبھا سکتی ہے۔ کیونکہ ایسی لڑکیوں کی فطرت میں ہی صبر و برداشت و خدمت گزاری شامل ہوتی ہے اور ان کے طبقے میں سارہ جیسی بدلحاظ، بد احساس بیٹی اور عرفان جیسا ناخلف و ناتجربے بیٹے ہوتے ہیں جو مشکلات پڑنے پر ٹھینگا دکھا کر بھاگ جاتے ہیں۔

شادی بہت سادگی سے ہوئی تھی۔

حرا ان کے لئے ویسی ہی ثابت ہوئی تھیں جیسا انہوں نے چاہا تھا۔ وہ نہ صرف خوبصورت تھی بلکہ خوب سیرت بھی تھیں۔ چند دنوں میں ہی اس نے گھر کو گھر بنا ڈالا تھا۔ ملازم بھی ٹھیک کام کر رہے تھے۔ امی حضور کو بھی دوائیں اور غذا وقت پر ملنے لگی تو وہ بھی تندرست ہو رہی تھیں۔

''سنا تھا عورت ہی گھر کو جہنم بناتی ہے اور عورت ہی جنت۔ اب یقین ہو گیا کہ بالکل درست بات ہے جب سے میری زندگی میں آئی ہو خود کو جنت میں محسوس کر رہا ہوں۔'' وہ اس کے ہاتھ سے مگ لیتے ہوئے محبت پاش نگاہوں سے اس کو دیکھتے ہوئے گویا ہوئے۔

''چینی تو لیں۔'' حرا ان کی نظروں سے شرما کر شوگر پاٹ میں سے چینی چمچے میں بھر کر ان کے مگ کی طرف بڑھاتی ہوئی بولی۔

''تم نے اپنے ہاتھوں سے بنائی ہے...... چینی کی کیا ضرورت ہے؟'' وہ شرارت سے بولے۔

''پلیز جلدی سے پئیں...... امی حضور کی دوا کا ٹائم ہو گیا ہے۔''

''کبھی مجھ غریب کے لئے بھی ٹائم نکال لیا کرو۔'' ان کے شائستہ لہجے میں دھیمی سی شوخی تھی۔ حرا مسکرا کر رہ گئیں۔

''حرا! ایک بات بتاؤ مگر بالکل سچ سچ...... ذرا جھوٹ مت بولنا۔'' وہ کچھ دیر توقف کے بعد چائے کا مگ ٹیبل پر رکھ کر سنجیدگی سے گویا ہوئے۔

''مجھے جھوٹ بولنے کی عادت نہیں ہے۔'' حرا کو ان کا انداز غیر معمولی محسوس ہوا۔

''کیا تم مجھ سے شادی کر کے خوش ہو؟'' پہلے دن سے اپنے دل میں مچلتے سوال کو وہ زیادہ عرصہ روک نہ سکے بالآخر فراغت و تنہائی کے ان لمحات میں پوچھ بیٹھے۔

''دراصل تم کو شادی سے پہلے دیکھا نہ تھا۔ جب میں نے اشفاق صاحب سے تمہارے متعلق سنا تو میں یہی سمجھا تھا کہ ان کی بھانجی پکی عمر کی، معمولی شکل و صورت کی، عام سی لڑکی ہو گی۔ عموماً اس ٹائپ کی لڑکیوں کے رشتے صحیح عمر میں نہیں ہو پاتے۔ عمر نکل جانے کے بعد ہر قسم کے رشتے کو قبول کر کے اپنا فرض ادا کر دیا جاتا ہے۔ مگر شادی کی رات تمہیں دیکھا، مجھے یقین نہیں آیا کہ قسمت مجھ پر اس طرح بھی مہربان ہو سکتی ہے۔ تم نہ صرف بے حد حسین اور کم عمر ہو بلکہ مکمل لڑکی ہو۔ دوسری شادی ایک جوا ہوتی ہے، جس میں آپ ہار بھی سکتے ہیں اور جیت بھی۔ میں سو فیصد کامیاب رہا ہوں...... میں بہت خوش ہوں، ازحد نازاں ہوں اپنے نصیب پر...... مگر پھر سوچتا ہوں تم میرے ساتھ خوش ہو یا نہیں؟'' ان کی بات کی لمبی چوڑی تمہید ان کے اندر پلتے اپنی عمر کے کمپلیکس کی غماز تھی۔

''یہ آپ نے کس طرح سوچا کہ میں آپ کے ساتھ خوش نہیں ہوں؟'' وہ ازحد سنجیدہ تھی۔

''میں بزنس مین ہوں۔ اس فیلڈ میں زندگی گزر گئی۔ اب ہر بات خواہ وہ بزنس کے حوالے سے ہو، گھر سے تعلق رکھتی ہو یا بچوں سے، ہر تعلق معاملے میں نفع و نقصان پرکھنے کی عادت سی پڑ گئی ہے۔ تمہارے بارے میں سوچتا ہوں تو خود کو منافع بخش پاتا ہوں۔ مالا مال محسوس کرتا ہوں مگر جب تمہارے پوائنٹ آف ویو سے دیکھتا ہوں تو سراسر لوس نظر آتا ہے۔ خود کو ایک طرف رکھ کر حق بجانب بات کروں تو تمہارے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ تمہیں اپنی عمر سے دگنی عمر کا شوہر ملا۔ میرے دونوں بچے تم سے عمر میں کئی سال بڑے ہیں پھر......''

''آپ کی سوچ بالکل غلط ہے۔'' وہ ان کی بات قطع کر کے گویا ہوئی۔ ''میں بہت خوش و مطمئن ہوں...... عمروں کا تضاد کم از کم مجھ جیسی لڑکی کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتا، نہ ہی میں ناخوش ہوں، نہ اپنے نصیب سے شکوہ کناں ہوں۔ دراصل خرم صاحب! عورت مرد سے تحفظ چاہتی ہے، عزت و توقیر حاصل کرنا اس کی چاہ ہوتی ہے، چاہت و الفت پانا اس کی خواہش۔ ضروریات زندگی کے حاصل کے لئے بھرپور تعاون کی بھی طلب گار ہوتی ہے۔ جو خاوند اسے یہ سب دے سکتا ہے، وہی اس کا آئیڈیل ہوتا

ہے اور آپ میں یہ سب موجود ہے۔ میں آپ کے ساتھ بے حد خوش ہوں، آپ کی رفاقت کو زیادہ دن نہیں گزرے ہیں پھر بھی مجھے محسوس ہوتا ہے ہمارا تعلق صدیوں پرانا ہے۔'' اس کے شرمائے لجائے لہجے میں یقین وصداقت کی خوشبو تھی۔ خرم جو بغور اس کے چہرے کا جائزہ لے رہے تھے، لہجے کو کھوج رہے تھے، آنکھوں کو پڑھ رہے تھے، کیونکہ زبان جھوٹ بول سکتی ہے پر آنکھیں نہیں۔ لہجہ مصلحت کا لبادہ اوڑھ سکتا ہے، آنکھیں صرف سچ بولتی ہیں۔ لیکن یہاں سب پر صداقت کی روشنی جگمگا رہی تھی۔ ان کے دل سے ایک بوجھ ہٹ گیا۔ وہ طمانیت سے مسکرائے تھے۔

□●□

''آنکھیں کھول دیجیے محترمہ! اور کتنا پریشان کریں گی؟'' شاہ ویز جو کل رات سے خوار ہو رہا تھا، دن میں دس بجے کے بعد اسے آنکھیں کھول کر دوبارہ تیزی سے بند کرتے دیکھ کر چڑچڑے انداز میں گویا ہوا۔

''میں..... کہاں ہوں؟'' وہ آنکھیں کھول کر نقاہت سے بولی۔

''مائی گاڈ! اب یہ مت پوچھ لینا کہ 'میں کون ہوں۔' چوٹ تمہارے ماتھے پر لگی ہے، دماغ پر نہیں جو یادداشت گم ہونے کا بہانہ کروگی۔ بلکہ دماغ نامی شے سے تمہاری کھوپڑی خالی ہی ہے۔ ایسی کوئی بات ہو ہی نہیں سکتی۔'' وہ ہنوز بگڑے موڈ میں طنز پر طنز کر رہا تھا۔

''میری کچھ سمجھ نہیں آرہا۔''

''سمجھدار بھی تم کبھی نہیں رہیں۔''

''میں کیا کروں؟'' وہ زچ ہوگئی بری طرح۔

''یہ بار بار بے ہوش ہونے کا ناٹک بند کرو۔ تمہیں ہاتھوں میں اٹھائے گھومتا ہوں تو ایسی ندامت محسوس ہوتی ہے کہ چلو بھر پانی میں ڈوب مرنے کو دل کرتا ہے بلکہ ایسے محسوس ہوتا ہے گویا اپنے بداعمالوں کی گٹھڑی اٹھا رکھی ہے۔'' وہ اس کے سرہانے سے اٹھتا ہوا لاکواریت سے بڑبڑا رہا تھا۔

رات کو وہ آنکھوں پر بازو رکھے جھریوں سے مشعل کی تمام کیفیت نوٹ کر رہا تھا۔ اس متغیر چہرے اور وحشت برساتی آنکھوں نے لمحے بھر کو اس کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا کہ عورت کی تذلیل کرنے و نیچا دکھانے کی تربیت اسے نہ ملی تھی مگر فوراً ہی اس نے اپنے جذبات کو دھتکارا تھا کہ مشعل ذرا بھی نرمی والتفات کے قابل نہیں ہے۔ اس نے معمولی سی بھی نرمی دکھائی تو وہ حاوی ہو جائے گی اور وہ یہ کبھی بھی برداشت نہیں کرسکتا تھا کہ اس جیسی لڑکی اس پر حاوی ہو۔ یہ سوچ کر اس نے کروٹ لی ہی تھی کہ ہلکے سے دھماکے کے ساتھ مشعل کی چیخ بھی سنائی دی تھی۔ وہ گھبرا کر سیدھا ہوا تھا۔

مشعل کارپٹ پر اوندھی پڑی تھی اور اس کے سر سے خون تیزی سے نکل رہا تھا۔ خون دیکھ کر وہ بدحواس سا آگے بڑھا تھا۔ اسے اٹھا کر بیڈ پر لٹا کر خون بند کرنے کی کوشش کرنے لگا مگر خون بند نہیں ہوا تو وہ اسے اٹھا کر کار میں ڈال کر قریبی ہسپتال میں لے آیا۔ وہاں ڈریسنگ کروائی اور ڈاکٹر کے کہنے پر ڈرپ بھی لگوانی پڑی تھی۔

ڈرپ دو گھنٹے میں ختم ہوئی تھی۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ اسے ہوش چند گھنٹے بعد آئے گا اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ مشعل کو ہوش ہسپتال میں آئے اور وہ وہاں کوئی نیا ڈرامہ کرے۔ سو وہ دوائیں وغیرہ لے کر اسے فلیٹ میں لے آیا تھا۔

تب سے اب تک وہ جاگ رہا تھا۔ بے چینی و بے خوابی نے اسے چڑچڑا بنا دیا تھا۔ نہ چاہنے کے باوجود وہ اس سے الجھ رہا تھا۔

مشعل خاموش ہوگئی۔ اس سے لڑنے جھگڑنے کی اس میں طاقت نہیں تھی۔ سر کے ساتھ جسم کا ہر عضو درد کرتا محسوس ہو رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں میں گویا جان نہ رہی تھی۔ معدہ اندر کی جانب گویا دھنستا جا رہا تھا۔ زبان اکڑ کر رہ گئی تھی۔ اسے یاد آیا کل سے اس نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ گھر سے وہ بھوکی پیاسی نکل گئی تھی۔ پھپھو کے ہاں بھی دوپہر میں دلیہ اور سوپ برائے نام کھایا تھا۔ اس کے بعد سے اب تک بھوکی تھی اور بھوک نے ہی اس کے جسم و جان میں نقاہت پیدا کردی تھی۔

''جانتا ہوں میں کہ آپ میری صورت دیکھنے کی روادار نہیں ہیں اور یہی خواہش کچھ میری بھی ہے۔ لیکن ہمارے ساتھ یہی ٹریجڈی ہے کہ جنہیں ہم دیکھنا نہیں چاہتے، انہیں بار بار دیکھنے پر مجبور کر دیے جاتے ہیں۔ اس طرح یعنی میری طرح صابر بن کر مجھے برداشت کیجیے۔ میرا مطلب ہے آنکھیں کھولیے۔''

کچھ دیر بعد وہ ایک ٹرے میں بسکٹ کی پلیٹ اور گلاس میں دودھ لئے حاضر تھا۔

''اب یہ مت کہنا مجھے بھوک نہیں ہے کیونکہ مجھے خواتین کے نخرے اٹھانے کی کوئی پریکٹس نہیں ہے اور نہ ہی ارادہ۔'' اس نے ٹرے اس کے قریب رکھ دی۔

''مجھے بھوک لگ رہی ہے۔'' وہ اس کے مزید طنز کی متحمل نہیں ہوسکتی تھی۔

''پھر کس کا انتظار ہے..... شروع ہو جاؤ۔'' وہ کہہ کر کمرے سے چلا گیا۔ شاید اس کے آرام سے بے تکلف کھانے کے خیال سے۔ مشعل نے اٹھنے کی کوشش کی مگر سر تکیے سے اٹھاتے ہی اتنی شدید تکلیف ہوئی تھی کہ آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا تھا۔ وہ دوبارہ لیٹ گئی تھی۔

بھوک شدید لگ رہی تھی۔ ناشتہ قریب ہی رکھا تھا لیکن بے بسی کیسی تھی کہ وہ قریب رکھی ٹرے سے جھک کر کھا نہیں سکتی تھی۔ ایک بار نہیں کئی بار مگر ہر بار ناکامی سے سابقہ پڑا۔ شاید بے بسی کی انتہا یہی تھی اور اس کے ضبط کی بھی۔ دل نا آشنا جذبات سے ہمکنار ہوا تھا۔ آنسو بے بسی کا اظہار بن کر آنکھوں سے بہنے لگے۔ اس نے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ آنسو اس کی شکست کا اعتراف تھے۔ بے بسی کا تماشا تھے۔ اس کی اکڑ، ہٹ دھرمی، ضد اور برتری کا فخر، حسن و دولت کا غرور سب ان آنسوؤں میں بہہ رہا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کرلی تھیں۔ ہونٹ بھینچ لئے تھے۔

آدھے گھنٹے بعد شاہ ویز اندر داخل ہوا تھا۔ وہائٹ شلوار سوٹ میں ملبوس فریش، تازہ شیو کی نیلاہٹ اس کے چہرے کی وجاہت کو بڑھا رہی تھی۔ وہ نہا کر ناشتے سے فارغ ہو کر چائے کا کپ ہاتھ میں لئے اندر داخل ہوا تھا۔ سامنے کا منظر اس کے خلاف توقع تھا۔ وہ ٹھٹھک گیا۔

بیڈ پر رکھی ٹرے میں ناشتہ جوں کا توں تھا۔ بیڈ پر لیٹی مشعل کے چہرے پر بہتے آنسوؤں نے لمحے بھر کو اسے ہراساں کر ڈالا تھا۔ اسے صورت حال سمجھنے میں دیر نہ لگی۔ ایک مجروح مسکراہٹ اس کے سرخی مائل ہونٹوں پر رقصاں ہو کر غائب ہوگئی۔ بھوک زندگی کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ اس کی بے رحمی و سفاکی سے وہ بھی کئی بار نبرد آزما ہوا تھا۔ پھر بھلا وہ آسائشوں میں پروان چڑھی کس طرح بھوک کی سختی برداشت کرسکتی تھی۔

''مشعل..... مشعل!'' ہمدردی تھی یا ترس، انسانیت کا تقاضا تھا یا اخلاقیات کا اصرار۔ مشعل نے آنکھیں کھولیں تو اسے خود پر جھکا پایا۔

وہ محسوس کر رہی تھی، اس کی موجودگی، گرم سانسوں کی تپش چہرے پر پڑ رہی تھی۔ اس کے ملبوس سے نکلتی مخصوص مہک اس کے بھوک، بھوک پکارتے وجود کو مزید نڈھال کر رہی تھی۔

''مشعل..... مشعل! اٹھو ہمت کرو، اٹھو، ہری اپ۔'' اس کا انداز بالکل بچوں کو بہلانے والا تھا۔

غصہ، تندی، جھنجلاہٹ، طنز و بے زاری لہجے سے بالکل مفقود تھی۔ اس کے تھکے تھکے، نڈھال، پژمردہ اعصاب پر وہ شیریں لہجہ، دلگداز انداز گلاب برسانے لگا۔ سکون و سرور کی نئی کیفیت سے وہ اس لمحے آشنا ہوئی تھی۔

خوب صورت آواز ایک جادو ہے۔

تن کو سرور، من کو سکون بخشنے والا سحر۔

وہ کتنی نرمی واپنائیت سے پکار رہا تھا اور اسے اچھا لگ رہا تھا اس کا یوں اپنائیت وخلوص سے پکارنا۔

اس نے آنکھیں سختی سے بند کرلیں مگر بہتے آنسوؤں پر بندنہ باندھ سکی۔ یکدم ہی خواہش ابھری تھی کہ کاش وہ اسے اسی طرح پکارتا رہے اور حیات کی جاں گسل گھڑیاں تمام ہو جائیں۔

''پلیز مجھ پر ترس کھاؤ..... کیا مجھ کو آنسوؤں میں ڈبو کر مارنے کا ارادہ ہے؟'' نرم نرم گرتی پھوار یکدم ہی کنکریوں میں تبدیل ہوئی۔

گلابوں میں یکدم ہی کانٹے نکل آئے۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ اس کے چہرے پر نگاہیں ڈالنے کی ہمت نہیں تھی۔ وہ بھی اس وقت کسی نیکی کے موڈ میں تھا۔ بغیر کچھ جتائے، کچھ کہے، بنا خاموشی سے بسکٹ دودھ میں ڈبو کر کھلانے لگا۔ وہ کسی سعادت مند بچی کی طرح فرمانبرداری سے کھا رہی تھی۔

□●□

وہ دور بھی کتنا اچھا دور تھا
جب جگنوؤں کو پکڑا کرتے تھے
جب نادانی میں ہوا کو مٹھی میں جکڑا کرتے تھے
جب پھولوں کو اکٹھا کرتے تھے
پھر دوستوں کی نظر کرتے تھے
جب مٹی کے گھروندے بناتے تھے
جب خوشی دیدنی ہوتی تھی جب وہ
ایک ٹھوکر سے ڈھے جاتے تھے
جب چاندنی راتوں میں کھیلا کرتے تھے
جب کوئی نہ ڈھونڈ پاتا تو پھر کیسے
ہنس کر بے حال ہو جاتے تھے
اک وہ دور تھا اک یہ دور ہے

اب ہم کو کہیں بھی جگنو نظر نہیں آتے
نہ ہوا کو ہم ہاتھوں میں جکڑ پاتے ہیں
دوست تو ملتے ہیں اب بھی لیکن پھول نہیں ملتے
اب مٹی کے گھروندے بنانے سے بہت ڈر لگتا ہے
جب کوئی گھروندا ٹوٹ جائے تو دل کو کچھ ہونے لگتا ہے
اب چاندنی رات تو ہوتی ہے
پر اب ہم کھیل نہیں پاتے
نہ ہمیں کوئی ڈھونڈ سکتا ہے
نہ ہم کسی کو ہیں ڈھونڈ پاتے

رات سرد تھی۔ فضاؤں میں عجیب سوز پھیلا ہوا تھا۔

سائرہ نے ماں کو سبز قہوہ کا کپ پکڑایا اور خود وضو کر کے حسب عادت قرآن پاک کی تلاوت کرنے بیٹھ گئی اور فارغ ہوئی تو زرینہ کو بے خبر سوتا ہوا پایا۔ وہ چند لمحے کھڑی ماں کے چہرے کو دیکھتی رہی۔

گہری نیند سونے کے باوجود ان کے گندمی رنگت والے چہرے پر بے سکونی و اُداسی زردی بن کر جھلک رہی تھی۔

اصغر کو اپنے گزشتہ رویوں پر پچھتاوا تھا۔ وہ ان سے معافی مانگ کر گیا تھا۔ زرینہ کو ساتھ ہسپتال چلنے کو بھی کہا مگر وہ اتنی جلدی بہو کو معاف کر دینے والی نہ تھیں۔ اصغر کے جانے کے بعد خوب روئی تھیں۔ بیٹے سے بدگمانی مٹ گئی تھی

بہو سے اختلاف یا شکایات موجود تھیں لیکن دل کے کسی کونے میں بیٹے کی اولاد کے لئے جو محبت و ممتا کا پھول کھلا تھا، اس کے مرجھانے پر دل کے چمن میں ایسی آگ لگی تھی جو صرف آنسوؤں سے ہی بجھ سکتی تھی۔ سو انہوں نے آنسو روکنے کی کوشش نہ کی، سائرہ نے بھی انہیں نہ ٹوکا۔ وہ خود چاہتی تھی کسی طرح وہ اپنا آپ ہلکا کر لیں۔

ماں آنسوؤں سے نبرد آزما ہو کر سو گئی تھی۔ لیکن اس کے نصیب میں نیند نہیں تھی۔ بے چینی، اضطراب و انتظار اس کی ذات کا حصہ بن گئے تھے۔ چند لمحے ماں کو دیکھنے کے بعد وہ وہاں سے ہٹ کر باہر صحن میں بچھے تخت پر آ کر بیٹھ گئی۔

گملوں میں لگے پودوں سے رات کی رانی کی خوشبو سفید پھولوں سے پھوٹ رہی تھی۔ جس سے در و دیوار مہک اٹھے تھے۔ آسمان پر چاند کی حکمرانی تھی۔

ہر سُو چاندنی کی فسوں خیزی بکھری ہوئی تھی۔

لائٹس سب آف تھیں ماسوائے زرینہ کے کمرے میں جلتے نائٹ بلب کے جس کی مدھم روشنی کمرے تک ہی محدود تھی۔ صحن چاندنی میں بھیگا سحر انگیز لگ رہا تھا۔ رات، تنہائی، خاموشی و پراسرار چاندنی میں سرد فضا...... وہ کبھی اس ماحول میں تنہا نہیں رہ سکتی تھی لیکن وقت کے بدلتے تیور ہر شے کو بدل دیا کرتے ہیں۔ وہ بھی بدل گئی تھی، ایسے لمحوں سے اسے گھبراہٹ ہوا کرتی تھی۔ پر اب یہ تنہائی، اداسی و خاموشی اسے سکون پہنچایا کرتی تھی۔

''ہم لڑکیوں کی فطرت میں مانوسیت و قبولیت کا عنصر کتنی وافر مقدار میں قدرت نے ڈالا ہے۔'' اس نے تخت پر نیم دراز ہوتے ہوئے سوچا۔

''شادی سے قبل ماں، باپ، بہنوں، بھائیوں کے درمیان جب زندگی گزرتی ہے تو محبت و اپنائیت اس قدر قوی ہوتی ہے کہ ساتھ چھوڑنے کا تصور ہی سوہانِ روح لگتا ہے۔ پھر دستور کے مطابق بیٹیاں سسرالوں میں جا بستی ہیں تو پھر وہی مرحلہ گزرتا ہے جلد یا بدیر، وہ اپنے اس گھر سے بھی مانوس ہو جاتی ہیں جو ان کا ہوتا ہے اور نہیں بھی ہوتا۔''

ایک سرد جھونکا آیا اور وہ کپکپا اٹھی۔ مگر اندر جانے کو دل نہ چاہا۔

تین ماہ گزر گئے تھے اسے یہاں آئے ہوئے اور اس عرصے میں کئی بار چاہا وہ گھر لوٹ جائے، نہ معلوم وہ گھر اس کا تھا یا نہیں، اپنی حیثیت و عزت کا تعین وہ ابھی تک نہ کر سکی تھی۔

وہ بھرے پرے کنبے میں گئی تھی جہاں چار نندیں، دو دیور کنوارے تھے۔ ایک جیٹھ اور دو دیوروں کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ وہ سب ایک ہی مکان میں رہتے تھے۔ میکے کے مقابل سسرال خاصا مذہبی گھرانہ تھا۔ ساس، سسر نماز اور دوسرے معمولات کی کڑی نگرانی کرتے تھے۔ شادی کے ابتدائی ایام میں وہ بہت بدحواس و شرمندہ رہتی تھی کہ میکے میں مذہب کے معاملے میں ایسی سختی نہ تھی۔ باقی بہنیں اور اماں ایک وقت یعنی صبح کے وقت نماز فجر سے فارغ ہو کر تلاوت کرتی تھیں اور پانچوں نمازوں کا اہتمام ہوتا تھا وہ بھی آرام و پُرسکون انداز میں۔ وہ نماز پڑھنے میں تساہل سے کام لیتی تھی، کبھی پڑھی، کبھی نہیں پڑھی۔ یہی حال تلاوت کا تھا اور اس کی یہ عادت بہنوں کے نرم رویوں کے باعث پڑی تھی جو اماں سے چھپا کر نرمی سے سرزنش کر دیا کرتی تھیں۔

شادی کے بعد ان کی نرمی اس کے لئے ندامت و شرمساری بنی۔ ساس جو ہمہ وقت عبادت میں مشغول رہا کرتی تھیں بڑے فخر سے کہتیں۔ ''اپنی بچیوں کو تو ہم نے بچپن سے ہی نماز و تلاوت کی عادت ڈالی ہے۔ میری بیٹیاں کھانا چھوڑ سکتی ہیں مگر نماز و تلاوت قرآن نہیں۔ نا معلوم کیسی عورتیں ہوتی ہیں جو اپنی بچیوں کو مذہب سے غافل رکھتی ہیں۔''

نماز پڑھتی تو نندیں شکوہ کناں ہوتیں۔ ''اوہو بھابی! اتنی دیر میں نماز پڑھتی ہو کہ بندہ پانچ ٹائم کی پڑھ کر فارغ ہو جائے۔''

دوسری نند طنزیہ کہتی۔ ''سمجھا کرو، ابھی نئی نئی ہیں نا۔ کل کو ہماری طرح دھڑا دھڑ سجدے مار کر فارغ ہو جایا کریں گی۔''

''تم نہیں سمجھتی نو! یہ لمبی لمبی نمازیں محض دکھاوا ہیں...... بلکہ بہانے ہیں کام سے جان چھڑانے کے۔'' جیٹھانی مذاق میں ہر بات کہنے کی عادی تھیں۔

''ہاں بھئی۔ ان کے مزے ہیں۔ جو دل چاہے کریں ہمیں تو اتنی آزادی نہ تھی۔'' دوسری دیورانی سرد آہ بھر کر کہتی۔

''ہماری اماں نے تو کسی بہو پر پابندی نہ لگائی۔ سب شروع سے اپنی مرضی کی مالک ہیں۔ ہماری ماں جیسی ساس تو نہ کسی کو ملی ہے اور نہ ملے گی۔ بہوؤں کو اپنی مرضی پر چلانے کی بجائے ان کی مرضی پر چلتی ہیں۔'' شادی شدہ نند کسی جنگلی بلی کی طرح پنجے نکال کر غرانے لگتی۔ کبھی بات دب جاتی اور کبھی وہ طوفان اٹھتا کہ دبائے نہ دبتا۔

لڑائی جھگڑوں سے وہ ہمیشہ ہی خوفزدہ رہتی تھی۔ ایسے میں وہ کونوں کھدروں میں گھسی جلد سے جلد لڑائی ختم ہو جانے کی دعائیں مانگا کرتی تھی۔

باقر سے ملاقات رات میں ہوتی تھی وہ کبھی خوشگوار موڈ میں ہوا تو چند غیر ضروری باتیں کرتا پھر سونے کے بعد صبح ناشتہ کر کے کام پر چلا جاتا۔ بس یہ چند گھنٹوں کا ساتھ ہوتا تھا جس میں وہ باقر کو سمجھ نہ سکی۔

گھر کے عجیب گھٹے گھٹے ماحول نے اس پر منفی اثر ڈالا تھا۔ ساس بظاہر خاموش رہا کرتی تھیں مگر ان کی نگاہوں کی کاٹ اسے بوکھلا کر رکھ دیا کرتی تھی۔

نندوں کے مزاج شاہی تھے۔ دل چاہا تو بات کی ورنہ منہ پھلا کر رکھنا ان کا پسندیدہ مشغلہ ہوتا۔ اگر دل چاہتا تو بھابیوں کے ساتھ کام میں ہاتھ بٹا دیا جاتا ورنہ بچے روئیں، بیمار ہو یا کوئی تکلیف وہ اپنا کام خود کیا کرتیں۔ ایسے میں ہر وقت تسبیح گھماتی ساس کی آنکھیں اور کان بند ہو جایا کرتے تھے۔ جب دونوں شادی شدہ نندیں آتیں تو گھر میدانِ جنگ بن جایا کرتا تھا۔ کیونکہ ایک تو ان کو بیٹھ کر کھانے کی عادت تھی پھر ہر کام میں عیب جوئی اور فضول طنز و طعنے ماحول کو بارود میں بدل دیا کرتے تھے۔

سائرہ اول روز سے ہی اس احساس کمتری کا شکار ہو گئی تھی کہ اس کی تربیت مذہبی انداز میں نہیں ہوئی۔ اس احساس نے اور گھر والوں کے منفی رویوں نے اس کی ذات سے اعتماد و افتخار کے احساسات کو بھی کھرچ ڈالا تھا۔ وہ سب کے لئے سوچتی تھی۔ سب کی فکر رہتی تھی۔ ایک خوف اس کے حواسوں پر کسی آسیب کی طرح چمٹ گیا تھا کہ کوئی یہ نہ کہے سائرہ مذہب سے نابلد لڑکی ہے، اس کے سر سے کبھی دوپٹہ نہ ڈھلک جائے، فجر میں آنکھ اذان سے پہلے کھل جائے، ہر کام وقت پر تیار ہو جائے، کسی کو اس سے کوئی شکایت نہ ہو وغیرہ وغیرہ۔ اسی جنون میں وہ خود کو فراموش کر بیٹھی۔ اپنی مرضی، اپنی خوشی، اپنی اہمیت، اپنا وقار و مرتبہ سب تج ڈالا تھا۔

خصوصاً شادی شدہ نندوں کی زبان کے خوف سے از حد آپا گیری کرتی تھی۔ ایک سال میں گھر کے ماحول اور لوگوں کو سمجھنے کی صلاحیت اس میں پیدا ہو گئی۔ باقر کی طبیعت بھی عیاں ہونے لگی تھی۔

دو سال بعد اس گھرانے اور اس ماحول سے الجھن و گھٹن ہونے لگی تھی جہاں نمازیں اس طرح پڑھی جاتی تھیں جیسے کوئی وزنی ناگوار بوجھ سر سے اتار پھینکنے کی سعی کی جاتی ہے۔ سر سجدوں میں ہوتے اور دلوں میں عناد و حسد اوتیں تھرک رہی ہوتیں۔ دوسروں کو افہام و تفہیم کا درس دینے والوں کے دل آپس میں ہی حسد و بغض کا شکار رہتے۔ قرآن روز پڑھا جاتا مگر سمجھنے و عمل کرنے کی کوشش نہ تھی۔ بڑوں کو چھوٹوں کا خیال نہ تھا، چھوٹے بڑوں کی عزت کرنے سے نابلد تھے۔ عجب دوغلے و بہروپے لوگ تھے جو نماز پڑھنے و تلاوت کرنے کا دکھاوا تو کرتے تھے مگر ان کے کسی بھی طرز عمل سے ان کے عملیات کی مہک نہ اٹھتی تھی۔ جہاں گھر کے سارے لوگ پانچوں وقت اللہ کے آگے سجدہ ریز ہوتے ہوں، درس کی محفلوں میں ہر نیکی و بدی، اچھائی و برائی، اخوت و مساوات کے معنی سمجھتے ہوں تو ایسے لوگوں میں تو یگانگت و محبت، شفقت و اپنائیت کی ایسی مثالی اٹوٹ ڈور بندھی ہو، ایسا شفاف اور مہکتا، چمکتا ماحول ہو کہ دیکھنے والے رشک کر اٹھیں اور بلا جھجک خود کو مذہب کے مطابق ڈھال لیں۔

مگر وہاں سب متضاد تھا۔ کسی کو کسی کی پرواہ نہ تھی۔ جو ہٹ دھرم و زبان دراز تھیں ان سے صرف مطلب کی بات کی جاتی تھی۔ وہ باقر سمیت سب کے لئے بے دام کنیز تھی۔ اس کی وہاں موجودگی کا مقصد ہی صرف کام تھا۔

ایک دفعہ اچانک ہی اس کے کانوں میں نندوں کی بات پڑ گئی تھی۔

''بڑی بھابیوں سے تو چھوٹی بھابی اچھی ہیں۔ قائد اعظم کے اس فرمان پر دل و جان سے عمل پیرا ہیں کہ ''کام، کام اور صرف کام۔'' چھوٹی کنواری نند ہنس کر گویا ہوئی۔

''سب سے زیادہ خطرناک ہے وہ۔ بڑی بھابیاں صاف دل کی ہیں۔ جو دل میں ہوتا ہے منہ پر کہہ کر لڑ جھگڑ لیتی ہیں۔ مگر سائرہ تو پوری گھنی ہے۔ اور ایسے لوگ بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔ جڑیں تک کاٹ ڈالتے ہیں اور محسوس نہیں ہوتا۔'' یہ وہ نند صاحبہ تھیں جو سب سے زیادہ خدمتیں کرواتی تھیں اور بھابیوں کی رتی بھر عزت کرنے کی قائل نہ تھیں۔ اس کا دل بہت زور سے دھڑکا تھا۔ وہ دیوار تھام کر رہ گئی۔

''وہ کیا جڑیں کاٹے گی بانجھ، پہلے اپنی جڑیں تو تلاش کرے۔'' ساس کی کھلکھلاتی آواز پر مشترکہ قہقہہ ابھرا تھا۔

وہ وہاں سے ہٹ گئی تھی۔ آنسوؤں کا سیلاب اُمڈ پڑا تھا۔ وہ کمرے میں جا کر خوب روئی تھی۔

بے لوث خدمت و پُرخلوص اپنائیت کا کتنا شاندار انعام ملا تھا۔

یادیں اتنی تلخ و تند تھیں کہ آنسو ابھی بھی بے ساختہ اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔ اپنی حرماں نصیبی کا دکھ تنہا ہوتے ہی در آتا تھا۔ گھر کا ماحول، لوگوں کے رویے ہنوز برقرار تھے۔ کوئی اور لڑکی ہوتی تو بدظن ہو کر ان کی طرح ہی منافقت و دروغ گوئی کا لبادہ اوڑھ لیتی لیکن جو خلوص، وفا و مروت کے خمیر سے وجود پاتے ہیں وہ ایسے غلیظ لبادے نظر بھر کر بھی نہیں دیکھتے، اس نے بھی یہی کیا۔

جب برے لوگ اپنی برائی نہیں چھوڑتے تو اچھے لوگ اپنی اچھائی کیوں چھوڑیں؟ یہی اس کی سوچ تھی۔

آہستہ آہستہ کئی سالوں کی رفاقت میں گھر والوں کے علاوہ باقر کا مزاج و عادات بھی وہ بخوبی جان چکی تھی۔ باقر ایک بے حس و خود غرض شخص اور شوہر تھا۔ اسے اس کی ذرا بھی فکر و پرواہ نہ تھی۔ اس کی ہر ذمے داری سے آزاد تھا۔ بلکہ ذرا بھی اسے کاروبار میں پریشانی ہوتی یا نقصان ہوتا تو بہت سہولت سے وہ اسے میکے روانہ کر دیا کرتا تھا۔ اس بے حمیتی و بے ضمیری کا راستہ بھی اس کو ماں اور بہنوں نے دکھایا تھا۔ ایک دفعہ یہ سلسلہ نکلا تو نکلتا چلا گیا۔ شروع شروع میں اماں اور بھائی نے بغیر کسی جھنجلاہٹ و کھسیاہٹ کے منہ مانگی رقم مہیا کی لیکن بار بار کس کے پاس اتنا فالتو پیسہ ہوتا ہے دینے کے لئے پھر وہی ہوا جو ہوا کرتا ہے۔ بھائی نے اس کی آمد پر کسی گرمجوشی اور محبت کا اظہار نہیں کیا۔ بہت روکھا و جان چھڑانے والا انداز ہوتا تھا۔ البتہ اماں کے رویے و محبت، شفقت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ وہ ہر بار اسی طرح سے والہانہ استقبال کرتی تھیں اس کا اور کسی نہ کسی طرح باقر کا مطالبہ پورا کرتی تھیں۔ اس بار پہلی دفعہ ہوا تھا جو وہ اتنے ہفتے یہاں رہی تھی اور اماں رقم کا بندوبست کرنے کی بجائے تعویذوں کے چکر میں پڑ کر مزید پیسہ برباد کر رہی تھیں اور وہ خود کو زمین میں دھنستا ہوا محسوس کر رہی تھی۔ دل چاہ رہا تھا وہ چلی جائے یہاں سے۔ یہ گھر جو کبھی اس کا اپنا تھا، یہاں بہت ساری خوشیاں دیکھی تھیں۔ راحتیں پائی تھیں۔

بچپن، لڑکپن، جوانی۔

زندگی کے تین سنہرے دور اسی دہلیز پر گزرے تھے۔

اب وہ مانوسیت و وابستگی نہ رہی تھی، دل ان ہی در و دیوار کی طرف کھنچ رہا تھا، جہاں رشتے خلوص و محبت سے عاری تھے مگر وہ ان سے مانوس ہو گئی تھی، ان کی عادی ہو گئی تھی۔

''سائرہ! آدھی رات کو یہاں بیٹھی کیا کر رہی ہے تُو؟ ٹھنڈ دیکھ کس غضب کی پڑ رہی ہے؟'' زرینہ جو ٹوائلٹ جانے کے لئے اٹھی تھیں، اسے صحن میں تخت پر بیٹھی دیکھ کر، گھبرا کر اس کی طرف بڑھی تھیں مگر جواباً اس کے ہونٹوں سے کوئی لفظ نہ نکلا۔ آنسوؤں کی روانی بڑھ گئی۔

''ارے...... رے...... کیا ہوا میری بچی!'' وہ بوکھلا کر اس کے قریب بیٹھی تھیں۔

''اماں...... اماں! میں کب تک آپ پر بوجھ بنی رہوں گی؟ کب تک میری زندگی صحرا بنی رہے گی؟ مجھ سے اب برداشت نہیں ہوتا اماں! میری انا، میری خودداری، سب خاک ہو گئی...... میں تنگ آ گئی ہوں اس زندگی سے۔ مجھے زہر دے دیں، مار دیں، میں جینا نہیں چاہتی۔'' وہ ان کے بازو سے ماتھا ٹیک کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

''تجھے زہر ہی دینا ہوتا تو کیوں اتنے سال تیرا خیال رکھتی۔ مت رو، چل اندر چل، سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا۔

''مجھے اتنا عرصہ ہو گیا یہاں آئے ہوئے۔ باقر اپنے مطالبے پر اڑے ہوئے ہیں۔ کیا ان کے علاوہ گھر میں کسی اور کو میری کمی محسوس نہیں ہوتی؟ یاد نہیں آتی؟ میری موجودگی، غیر موجودگی کوئی اہمیت نہیں رکھتی؟''

''پتھروں سے صلہ نہیں مانگتے، گلہ بھی نہیں کرتے، صبر کر و صبر۔ انصاف کرنے والا اوپر بیٹھا ہے۔ وہ سب دیکھ رہا ہے، سن رہا ہے۔ کوئی عمل، کوئی حاجت، کوئی مشکل اس سے مخفی نہیں ہے...... نہ ہی وہ بندوں کو ایک مقررہ حد سے زیادہ ڈھیل دینے کا روادار ہے۔ اس کی رضا میں راضی رہنا ہی اس کے پسندیدہ بندوں کا کام ہے۔''

❐●❐

بے جی کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ عینک کو اپنی آنکھوں سے ہٹا کر دوپٹے سے صاف کر کے دوبارہ لگا کر انہوں نے نووارد کی جانب دیکھا تھا۔

''السلام علیکم بہن جی! کیا آپ مجھے پہچان نہیں پا رہی ہیں؟'' حسن بیگ صاحب نے تبسم ریز ہونٹوں سے دوبارہ سلام کرتے ہوئے کہا تو بے جی بھی حیرانگی کی زد سے نکل آئیں اور سلام کا جواب دیتے ہوئے انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ خود بھی صوفے پر بیٹھ کر بولیں۔

''مجھے ابھی تک اپنی آنکھوں پر دھوکے کا گمان ہو رہا ہے۔ آپ بن بتائے چلے آئے۔ بالکل اچانک۔''

''ہوں...... میں چاہتا تو نہیں تھا لیکن پرسوں شاہ ویز سے بات ہوئی تھی اور پہلی مرتبہ میں نے انہیں ازحد ڈسٹرب محسوس کیا۔ میں نے یہی فیصلہ کیا کہ اب میرا دور رہنا سودمند نہیں ہوگا، اس لئے میں چلا آیا۔'' وہ چند لمحے خاموش ہو کر گویا ہوئے۔ ''دراصل شاہ ویز پر دہری ذمے داری آ پڑی ہے، بزنس کی بھی اور مشعل کی بھی۔ بزنس کو بہت جلدی انہوں نے ہینڈل کر لیا ہے کہ محنتی اور لگن سے اپنا کام کرنے والے ہیں۔ بزنس کی شکایت انہوں نے کبھی نہیں کی۔ پر مجھے محسوس ہوا میرا اس طرح منہ چھپا کر فرار ہو جانا دانشمندی نہیں ہے۔ نقصان مجھ سے ہوا ہے تاوان بھی مجھے ادا کرنا چاہئے۔ راحتیں میں نے سمیٹی ہیں، صعوبتیں بھی مجھے برداشت کرنی چاہئیں۔ کیوں ایک بے قصور، بے گناہ شخص کو پھنسا کر بزدلوں کی طرح روپوش رہوں۔''

''ایسا مت سوچیں بھائی صاحب! آپ نیک اور پُرخلوص انسان ہیں۔ آپ کسی پر زیادتی نہیں کر سکتے۔ آزمائش سے تو سب کو ہی گزرنا پڑتا ہے۔ یہ آپ کی اچھائی و نیک نامی ہی کا تو انعام ہے کہ اتنے بڑے مسئلے سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس طرح نکالا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی ورنہ جن کے حالات بگڑ جائیں، سنوارے بھی نہیں سنورتے۔ رسوائی و بدنامی بعد از مرگ بھی پیچھا نہیں چھوڑتی۔ یہ اللہ کا بہت بڑا کرم ہے، شاہ ویز کا ارادہ بھی آپ کو چند ماہ بعد بلانے کا تھا۔ کاروبار ماشاء اللہ روز بروز ترقی کر رہا ہے۔ اب تنہا اس سے کیا سنبھلتا۔''

''جی مجھے معلوم ہے۔ بزنس کے معاملے میں معمولی سے معمولی بات سے مجھے آگاہ رکھتا ہے۔ یہ سب اس کی انتھک کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ میں خوش اور مطمئن ہوں اس سے۔ فکر مجھے مشعل کی جانب سے رہتی ہے۔ پچھتاوؤں اور اندیشوں میں، میں اس کی جانب سے مبتلا رہتا ہوں۔ آپ کے پاس چھوڑ گیا تھا۔ بہت خوش و مطمئن تھا کہ آپ کی صحبت میں رہ کر وہ اپنی گزشتہ زندگی کی بدتمیزیاں و گستاخیاں بھول جائے گی۔ مگر میرا یہ خیال محض خیال ثابت ہوا۔ اس کی ہٹ دھرمی اور رافعہ کے طرزِ عمل نے مجھے ہمیشہ کے لئے آپ اور شاہ ویز بیٹے کے سامنے نگاہیں جھکانے پر مجبور کر دیا ہے۔''

''ارے نہیں بھائی صاحب! یہ آپ کیسی غیریت والی باتیں کر رہے ہیں۔ ایسا کچھ نہیں ہوا جو آپ کو نگاہیں چرانے پر مجبور کر دے۔'' بے جی جیسی نرم دل اور رشتوں کا مان رکھنے والی عورت کس طرح ان کی شرمندہ صورت و پشیمان لہجہ برداشت کر سکتی تھیں۔ بامروت لہجے میں گویا ہوئیں۔

''آپ چائے لیں گے یا کافی؟''

''فی الحال تو مشعل کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''مشعل کے متعلق بھی بات ہو جائے گی۔ پہلے آپ کافی پی کر آرام کریں۔ طویل سفر طے کر کے آئے ہیں۔ اتنی بے آرامی آپ کی صحت کے لئے مناسب نہیں ہوگی۔''
ان کے اصرار پر حسن بیگ کمرے کی جانب بڑھ گئے۔

❐●❐

کتنی اچھی ہوتی ہے پُرخلوص مسکراہٹ۔

چہرے کو پُرنور کر دیتی ہے۔

دل کی کثافت دھو ڈالتی ہے۔

محبتوں کو پروان چڑھاتی ہے۔

رشتوں کو مضبوط کرتی ہے، چاہت کو کشادگی بخشتی ہے۔

سنگدل و بے حس انسان مسکراتا ہے تو کچھ زیادہ ہی جاذب نظر آتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے اس وقت شاہ ویز کسی سے موبائل پر باتیں کرتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس کا چہرہ، اس کی آنکھیں روشن روشن تھیں۔ سیاہ گھنی مونچھوں تلے سرخی مائل ہونٹوں پر جاندار مسکراہٹ تھی۔ وہ اسے یک ٹک دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ کوئی مرد بھی مسکراتا ہوا اتنا دلآویز و وجیہہ لگ سکتا ہے؟ اس نے ہمیشہ عورتوں کی مسکراہٹ کی تعریف و توصیف سنی تھی۔ وہ سمجھتی تھی صرف عورتوں کا حُسن ہی تباہ کن ہو سکتا ہے۔

قلوپطرہ کے حُسن کے قصیدے اس نے پڑھے تھے۔

مونالیزا کی مسحور کن مسکراہٹ کی وہ بھی شیدائی تھی۔ کئی پورٹریٹ مونالیزا کے اس نے پاپا سے کہہ کر اپنے بیڈ روم میں لگوائے تھے۔ وہ حسین تھی اور حُسن ہی اسے اٹریکٹ کرتا تھا۔

اس وقت بھی وہ بے خودی کے سے انداز میں شاہ ویز کو دیکھ رہی تھی۔

''بے جی! پلیز بتائیں نا کیا سرپرائز ہے میرے لئے؟'' وہ کچھ لاڈ بھرے لہجے میں بولا تو آواز مشعل کے کانوں تک بھی آئی۔

''وہیں آ کر معلوم ہوگا...... او کے، پھر میں آ رہا ہوں۔ ہاں، ہاں...... کھانا آپ کے ساتھ ہی کھاؤں گا، یہ ممکن نہیں ہے بے جی، پلیز، میں آپ سے گستاخی نہیں کر رہا۔ میں نے آپ سے وعدہ لیا تھا کہ دشمن پارٹی سے آپ کا بالکل بھی رابطہ نہیں ہوگا اور آپ معاہدے کی خلاف ورزی کرنا چاہ رہی ہیں۔ او کے، اگر آپ اپنے اصول توڑیں گی تو میں بھی پابند نہیں ہوں گا۔'' یکلخت اس کے چہرے پر سنجیدگی چھا گئی۔ مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ مشعل حیران تھی۔ وہ کون سے کوڈ ورڈز میں بات کر رہا تھا جو لفظوں سے شناسائی کے باوجود معنی سے نابلد تھی۔

''میں ضد نہیں کر رہا بے جی۔'' دوسری طرف سے کسی ایسی خواہش کا اظہار نہیں کیا گیا ہے۔ آپ کا اس طرح بے تاب ہونا، میرے نزدیک آپ کی بے وقعتی ہے جو مجھے کسی طور منظور نہیں۔'' وہ مبہم گفتگو کر رہا تھا۔ مشعل کو الجھن ہونے لگی۔ وہ شانے اچکا کر باتھ روم کی طرف بڑھ گئی۔ منہ ہاتھ دھو کر باہر نکلی تو وہ گرے کوٹ سوٹ میں ملبوس آئینے کے سامنے کھڑا بال بنا رہا تھا۔ اس کے انداز میں خاصی پھرتی تھی گویا اُڑ کر کہیں پہنچنے کا ارادہ ہو۔ بال بنا کر پھرتی سے اسپرے کیا، جرابیں اور شوز بھی قابل داد پھرتی سے پہنے گئے۔ جھک کر ٹیبل سے رسٹ واچ، ہینڈ کرچیف، موبائل اور والٹ اور سن گلاسز اٹھائے تو اس کا دل خوف سے دھڑکا۔

''کہاں جا رہے ہو؟'' وہ بے ساختہ گویا ہوئی تھی۔

''بے جی کے پاس۔'' رسٹ واچ کلائی پر باندھنے کے بعد دوسرا سامان کوٹ کی جیبوں میں منتقل کرتا ہوا مصروف انداز میں بولا۔

''مجھے یہاں تنہا چھوڑ کر؟''

''ہم نے کبھی ساتھ ساتھ رہنے کی قسمیں تو نہ کھائی تھیں شاید۔''

''کبھی کوئی بات بغیر طنز کے بھی کر لیا کریں آپ، تو مہربانی ہوگی۔'' وہ زیادہ دیر عاجزی کا مظاہرہ نہ کر سکی۔

''آپ......؟ ماشاء اللہ بھئی، آپ صرف ایک دن میں ہی اتنی باتمیز ہو گئیں، گڈ...... ویری گڈ۔'' وہ اس کی جانب دیکھتا ہوا طنزیہ لہجے میں دوبارہ گویا ہوا۔

''میری مجبوری سے لطف اندوز ہو رہا ہے کمینہ کہیں کا۔'' وہ اندر اندر گویا ہوئی۔

''میں تمہیں اس گھر میں نہیں لے کر جاؤں گا جس گھر کو تم اپنی مرضی سے چوروں کی طرح چھوڑ کر چلی گئی تھیں۔'' وہ تندی سے گویا ہوا۔

''میں یہاں قیدیوں کی طرح بند نہیں رہ سکتی۔''

''میں تمہیں بند کر کے نہیں جا رہا، باہر سے دروازہ لاکڈ نہیں ہوگا۔ تمہیں آزادی ہے گھومنے پھرنے کی۔ کیونکہ مجھے امید ہے اس دن جیسی غلطی بھاگنے کی پھر نہ دہراؤ گی۔''

اس نے لفظ بھاگنے پر ایسا زور دیا کہ وہ جو اس کی طرف دیکھ کر بات کر رہی تھی، ندامت سے نظریں جھکانے پر مجبور ہو گئی۔

''مجھے واپسی میں رات ہو جائے گی۔ کچن میں فریج کے اندر سب موجود ہے۔ جو دل چاہے پکانا اور کھانا۔''

''پکانا؟ مجھے تو پکانا نہیں آتا۔''

''پکانا نہیں آتا؟ اوہ، میں بھول گیا، آپ ایک بہت بڑے انڈسٹریلسٹ کی اکلوتی بیٹی ہیں جن کے صرف کچن میں کام کرنے کے لئے ہی ایک درجن خانساماں ہوتے ہیں۔ اینی وے وہ کل کی کمفرٹ ایبل لائف تھی جو آپ نے اپنے باپ کے ہاں گزاری۔ آج بے چارے شوہر کے ہاں ہیں جو آپ کی ایسی عیاشیاں افورڈ نہیں کر سکتا۔ یہاں تو آپ کو خود پکانا ہوگا، خود بھی کھانا ہوگا اور مجھ غریب کے پیٹ کا بھی خیال رکھنا ہوگا۔''

اسے پریشان و فکر مند دیکھ کر اس کی زبان روانی سے چل رہی تھی۔

''آئی ایم سوری، آئی ایم ناٹ کوکنگ۔'' وہ حواس باختہ تھی۔

''اوکے...... اوکے، پریشان مت ہو۔ کوکنگ آ جائے گی تمہیں۔ ابھی کچھ پکا ہوا نہیں ہے جو تمہارے لنچ میں کھایا جائے۔ بلکہ میرے پاس ٹائم نہیں ہے جو بازار سے کچھ لے آؤں۔ رات میں تو میں لیتا آؤں گا۔ کیا پکایا جائے؟ کیا پکایا جائے جو جھٹ پٹ تیار ہو جائے۔'' وہ نرم دل تھا زیادہ دیر اس کی ہونق صورت نہ دیکھ سکا۔

''انڈا...... ہاں انڈا جھٹ پٹ تیار ہو جائے گا۔ آؤ کچن میں تمہیں آملیٹ بنانا سکھاؤں۔''

وہ اس کے پیچھے چلتی ہوئی کچن میں آ گئی۔ بلیو ٹائلز کا چھوٹا سا کچن صاف ستھرا پڑا تھا۔ دائیں طرف ریک میں پلیٹیں، گلاس، جگ اور ڈشیں ترتیب سے رکھی تھیں۔ چائے کے مگ، مگ ہینگر میں لٹکے ہوئے تھے۔ اسپون کیبن میں اسپون چمچ پڑے تھے۔ نائف بک میں چاقو چھری رکھی تھی۔ بائیں طرف فریج رکھا تھا اور سامنے کاؤنٹر تھا اور کاؤنٹر سے ملحق سنک تھا جو دھلا دھلایا خشک پڑا تھا۔

''جائزہ کھانے کے بعد لے لینا، مجھے دیر ہو رہی ہے۔ پہلے میری مدد کرو۔'' وہ چولہا جلا کر فرائی پین رکھتا ہوا مخاطب ہوا۔ ''فریج میں سے انڈے نکال کر لاؤ جتنے تمہیں کھانے ہیں۔'' فرائی پین میں گھی ڈالتا ہوا بولا تو وہ ایک انڈا نکال کر لے آئی۔

''اسے توڑ کر دو۔'' اس نے پیاز کاٹتے ہوئے حکم دیا۔ ''کیا ہوا؟...... ابھی تک انڈا یوں ہی لئے کھڑی ہو؟'' وہ پیاز اور ہری مرچ کاٹ کر مڑا تو اسے کھڑے دیکھ کر گویا ہوا۔

''وہ...... وہ یہ انڈا کس سے توڑوں؟ آئی مین کیسے توڑوں؟'' وہ پریشان کن لہجے میں بولی اور وہ حیرت سے چیخ اٹھا۔

''وہاٹ...... تمہیں یہ نہیں معلوم کہ انڈا کیسے توڑتے ہیں؟ مائی گاڈ! کیا بنے گا میرا؟'' وہ اس سے انڈا لیتا ہوا آہستگی سے بڑبڑایا اور چھوٹے باؤل میں انڈا توڑ کر ڈالتے ہوئے بولا۔

''غور سے دیکھو کس طرح آملیٹ بنتا ہے۔ بریڈ فریج میں ہے وہ نکال لینا۔ چائے تھرماس میں موجود ہے۔ انڈا ابھی کھا لینا کیونکہ ٹھنڈا ہونے کے بعد ربڑ کی طرح ہو جاتا ہے اور بدذائقہ بھی۔'' وہ تیزی سے انڈا پھینٹ رہا تھا۔ فرائی پین میں پیاز اور ہری مرچ لائٹ براؤن ہو رہی تھی۔ ہاتھ کے ساتھ ساتھ اس کی زبان بھی چل رہی تھی۔

''میرے خیال میں دنیا میں واحد شے انڈا ہے جو جھٹ پٹ تیار ہو جاتا ہے اور ہوتا بھی سب کو پسند ہے۔ بچے، بڑے، بوڑھے، جوان سب ہی شوق سے کھاتے ہیں۔ کئی طریقوں سے اسے بنایا جاتا ہے۔ مجھے زیادہ تر ناشتے میں ہاف فرائی پسند ہے۔ کبھی کبھی فل فرائی پر کالا نمک چھڑک کر بھی شوق سے کھاتا ہوں۔'' مردوں کو اپنی برتری جتانے کا موقع مل جائے تو وہ کچھ زیادہ ہی ترنگ میں آ جاتے ہیں۔ وہ یہی محسوس کر رہی تھی۔ اس کی ناواقفیت نے اس کو کس قدر تقویت پہنچائی تھی۔ وہ مسلسل بول رہا تھا۔ وہ دل مسوس کر رہ گئی۔

پانچ منٹ کے قلیل ترین وقت میں وہ آملیٹ تیار کر کے اسے تھما چکا تھا۔ وہ خاموشی سے ناشتہ کرنے میں مشغول ہو گئی۔

ناشتہ کرنے کے بعد سرعت سے گیٹ کی طرف بڑھی تھی۔ اسے یقین نہیں تھا وہ سچ مچ گیٹ باہر سے لاک کر کے نہیں جائے گا۔ مگر اس وقت اس کے تحیر کی انتہا نہ رہی جب گیٹ ان لاک ملا۔

''کیا وہ چاہتا ہے میں بھاگ جاؤں؟ خود موقع دے کر گیا۔ نہیں...... شاید وہ جانتا ہے کہ میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ نہیں...... نہیں...... وہ اتنی جلدی دوسروں پر اعتماد کرنے والا بندہ نہیں ہے۔ پھر کیوں گیٹ لاکڈ کر کے نہیں گیا؟ شاید اسے یقین ہے کہ میں کہیں نہ جاؤں گی۔ سچ میں کہاں جاؤں گی؟ راستے تمام مسدود ہیں، پاپا تو مجھے بھول ہی گئے ہیں۔ آنٹی جو کتنے دعوے کر رہی تھیں شاہ ویز سے ڈائیورس دلوانے کے وہ سب باطل ثابت ہوئے۔ انہوں نے کہا تھا شاہ ویز اس کی گرد نہیں پا سکتا اور آج وہ شاہ ویز کے پاس تھی۔ وہ خود اس کی گرد کو نہ پا سکی تھیں۔ جو جو نے شاہ ویز کو مارنے کی قسمیں کھائی تھیں، اس کے خون کا آخری قطرہ تک مٹی میں ملانے کے لئے جنونی ہو رہا تھا۔ کیا کیا تھا اس نے...... شاہ ویز ان کے سامنے اسے گھسیٹتے ہوئے لے آیا تھا۔ وہ اس سے اسے چھڑانے کی سعی میں ایک مکا تک نہ مار سکا تھا۔ آج وہ اس کے ساتھ تھی، جس کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی تھی۔

''اے بی بی! کہاں جاتا ہے؟'' چوکیدار کی کڑک آواز پر وہ چونکی تھی۔ سوچوں میں وہ فلیٹ سے نکل آئی تھی۔

''تم کون ہوتے ہو پوچھنے والے؟'' اس کی رعونت ود بد بہ عود کر آیا۔

''ام چوکیدار ہے......'' ادھیڑ عمر چوکیدار نے فخر سے سینہ پھلا کر کہا۔

''چوکیدار ہو تو یہاں کی چوکیداری کرو، میری چوکیداری کرنے کی ضرورت نہیں ہے سمجھے۔'' وہ تیوریاں چڑھا کر غصے سے بولی۔

''ام اس وخت آپ کا چوکیداری کے لئے بیٹھا ہے۔''

''وہاٹ...... وہاٹ...... میری چوکیداری کے لئے کس نے کہا ہے؟''

''صاب نے......'' چوکیدار گھبرا گیا تھا۔

''کون سے صاحب نے؟''

''شاہ ویز صاب نے۔''

''کیا کہا ہے؟'' وہ کسی ناگن کی طرح بل کھا رہی تھی۔

''صاب نے بولا ان کا بیوی کو پاگل پن کا دورہ پڑتا ہے۔ ایسے میں وہ باہر کا طرف جاتا ہے۔ اگر بی بی نیچے آئے تو اس کو باہر نہیں جانے دینا ہے۔ اگر وہ ضد کرے تو کتے کو پیچھے چھوڑ دینا۔'' چوکیدار جو غصے سے اسے بری طرح بدحواس ہوتے دیکھ رہا تھا وہ اسے دورے کے اثر میں سمجھ کر خوفزدہ انداز میں کتے کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

توہین و شرمندگی کے احساس سے اس کی رنگت سرخ پڑ گئی تھی۔ اس نے قہر آلود نگاہ چوکیدار پر ڈالی جو گھبرا کر پیچھے ہٹا تھا۔ دوسری نگاہ سامنے بادام کے درخت سے زنجیر سے بندھے سیاہ بل ڈاگ پر ڈالی اور تن فن کرتی اوپر آ گئی۔

''الو کا پٹھا...... کمینہ...... سمجھتا کیا ہے خود کو؟ مجھے پاگل کہا...... خود ہوگا پاگل...... بلکہ اس کا باپ پاگل، پورا خاندان پاگل...... ہونہہ...... جبھی میں سوچ رہی تھی گیٹ کیوں لاک کر کے نہیں گیا؟ اطمینان ہوگا نا اسے کہ تیجے چوکیداری کے لئے اپنے دو باپ چھوڑ کر جا رہا ہے۔'' وہ ٹھوکر سے گیٹ کھولتی ہوئی بڑبڑاتی اندر داخل ہوئی۔

□●□

''جگ جگ جیو بہو! بہت خدمت کرتی ہو۔ خدا تمہیں اس کا اجر دے، صدا سکھی رہو۔'' حرا نے ان کے سر میں نیم گرم تیل کی مالش کر کے نرمی سے بال سلجھائے، چٹیا باندھی پھر کتنی دیر تک سر دبانے کے بعد ٹانگیں دبا رہی تھی اور جواباً امی حضور اسے دعاؤں سے نواز رہی تھیں۔

''میں نے سنا تھا سسرال اچھا نہیں ہوتا، وہاں لڑکیوں کے ساتھ سلوک اچھا نہیں ہوتا اور خصوصاً ساس تو پوری جلاد ہوتی ہے، یہ سنا تھا۔ میں بہت خوفزدہ رہتی تھی یہ سوچ کر مگر نہ معلوم کس نیکی کے بدلے مجھے آپ جیسے اچھے لوگ ملے۔''

حرا عقیدت بھرے لہجے میں بولی تو امی حضور گویا ہوئیں۔

''یہ جہاں اچھے اور برے لوگوں سے بھرا ہوا ہے۔ جس طرح سارے لوگ اچھے نہیں ہوتے اسی طرح تمام لوگ برے بھی نہیں ہوتے۔ اور یہ ساس بہو کا جھگڑا تو بہت پرانا ہے۔ دراصل یہ نا سمجھی و نا عاقبت اندیشی کا کھیل ہے۔ ساس کے قبضے میں جب گھریلو اقتدار ہوتا ہے تو بہو کو وہ رعایا سمجھتی ہے جو ہر دم اس کے قدموں تلے کچلی جاتی ہے۔ وہ یہ بھول جاتی ہے کہ سو دن ساس کے تو ایک دن بہو کا آتا ہے۔ اور بعض بہوئیں گھر کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی ساس و نندوں سے ایسا بیر باندھتی ہیں کہ بدترین دشمن بن جاتی ہیں۔ وہ یہ بھول بیٹھتی ہیں کہ آگے اسی منصب پر انہیں بھی فائز ہونا ہے اور جو کر رہی ہیں وہی پانا ہے۔ مکافاتِ عمل سب کے لئے ہے، نیکی کے لئے نیکی، بدی کے لئے بدی تیار ہوتی ہے۔''

''شکر ہے امی حضور آپ ایسی نہیں ہیں۔''

''تم بھی بہت اچھی ہو۔ اصل بہو کا سکھ تو تم نے ہی مجھے دیا ہے ورنہ پہلی بہو کے درشن سے ہی ہم محروم رہتے تھے، ہماری خدمت تو وہ کیا کرتیں اپنے خاوند اور بچوں کو ہی کبھی وقت نہیں دیا۔ بچوں کو گورنس نے پرورش کیا، کچھ سمجھدار ہوئے تو ہاسٹل بھجوا دیا۔ ان کے رات دن پارٹیز میں گزرتے تھے۔ خرم بھی ان کے ہی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ کوئی روک ٹوک، کوئی اعتراض نہیں تھا بلکہ خرم کو سکھا، پڑھا کر میرے خلاف کر دیا۔ وہ ایسا بدظن و بدلحاظ ہو گیا کہ میری پرواہ اس نے کرنا چھوڑ دی اور آج بہو کو مرے اتنے سال گزرنے کے باوجود وہ پہلے والا خرم نہ بن سکا۔'' اس کے لہجے میں حسرت پنہاں تھی۔

''ایسی بات نہیں ہے...... وہ آپ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ از حد خیال رکھتے ہیں۔ آپ رنجیدہ نہ ہوں۔''

''خیال رکھنا اور محبت کرنا مختلف جذبے ہیں۔'' ملازمہ کی آمد پر وہ خاموش ہو گئیں۔ ملازمہ نے دوسری بار خرم کی طرف سے پیغام پہنچایا تھا کہ وہ اسے بلا رہے ہیں۔

''میں تمہیں یہاں اپنے لئے لے کر آیا ہوں کہ امی حضور کی چاکری کے لئے؟'' وہ کمرے میں داخل ہوئی تو خرم کو بلیو ریشمی نائٹ گاؤن میں ملبوس ٹہلتے پایا۔ وہ اسے دیکھتے ہی خفگی سے گویا ہوئے۔ وہ آہستگی سے دروازہ لاک کر کے باتھ کی طرف بڑھ گئی۔ وہ آسمانی رنگ کی نائٹی بدل کر باہر آئی تو وہ صوفے پر بیٹھے تھے۔

''آپ خفا ہیں مجھ سے؟'' ان کی گمبھیر خاموشی کو محسوس کر کے گویا ہوئی۔

''نہیں...... لیکن آج تمہاری حیثیت کا تعین تمہیں کروا دوں۔ تم کوئی معمولی عورت نہیں ہو، اس گھر کی ملکہ ہو، میری بیوی ہو، کوئی عام عورت نہیں ہو جو ملازموں کی طرح دوسروں کی خدمتیں کرو گی۔ نہ آج کے بعد ملازموں کی طرح تمہیں کچن میں کام کرتے دیکھوں۔ ان سب کاموں کے لئے ڈھیروں ملازم رکھے ہوئے ہیں۔ تم صرف حکم چلایا کرو۔''

''ملازموں پر سب کچھ نہیں چھوڑا جا سکتا۔ میں صرف اپنی نگرانی میں کام کرواتی ہوں۔ اس طرح ان پر پریشر رہتا ہے۔''

''کوئی ضرورت نہیں...... دو ہیڈ سرونٹس اپائنٹ کر دیے ہیں۔ وہ اپنی مانیٹرنگ میں کام کروائیں گے۔ ہر تعلق، ہر رشتے کو ایک لیبل میں رکھنا چاہئے ورنہ وقت وہ ہے کہ ہمارے پاؤں کا جوتا ہمارے ہی سر پر لگتا ہے۔'' وہ سنجیدگی سے سمجھا رہے تھے۔

''امی حضور کوئی غیر نہیں، آپ کی والدہ ہیں۔ اس رشتے سے میرے لئے بھی قابل احترام ہیں۔ میں نے ماں نہیں دیکھی، امی حضور کی محبت و شفقت پا کر مجھے احساس ہو رہا ہے جیسے میری ماں مجھے مل گئی ہو۔ ان کی خدمت کر کے، ان کا خیال رکھ کر مجھے خوشی ہوتی ہے۔'' ملیو وائٹ بلب کی نشاط آمد روشنی میں حرا کا حسین چہرہ کھلے ہوئے گلاب کی مانند لگ رہا تھا۔ مستزاد اس کی غزالی آنکھوں میں چمکتے شفاف موتی...... خرم جو بہت کچھ سنانے کا ارادہ رکھتے تھے مبہوت سے رہ گئے۔ انہوں نے اپنے اردگرد بے تحاشہ حسن دیکھا تھا۔

حسین چہروں سے شناسائی تھی لیکن حسن و معصومیت پہلی مرتبہ ان کے سامنے تھا۔ وہ جتنی باہر سے خوب صورت تھی اندر سے بھی اتنی ہی پُرکشش و دلربا تھی۔

□●□

وہ بے جی کے پاس پہنچا تو بہت خفگی سے انہوں نے اس کے سلام کا جواب دیا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا ان کی ناراضگی۔ ان کے قریب بیٹھ کر شوخی سے بولا۔

''آپ ایک پرائی لڑکی کے لئے اپنے بیٹے سے خفا ہو رہی ہیں؟''

''پرائی لڑکی...... شرم کرو۔ وہ تمہاری بیوی ہے اور میری بہو۔''

''آپ کہتی ہیں تو مان لیتا ہوں۔'' اس نے شانے اچکائے۔

''اچھا، کیا بگڑ جاتا اگر میں اس بچی سے دو گھڑی بات کر لیتی، صورت سے تو اس کو ترسا ہی ڈالا ہے، آواز سے بھی محروم رکھنا چاہتے ہو...... اتنا ظلم تو مت کرو بچی پر۔''

''جی ہاں...... میں ظلم کر رہا ہوں۔ آپ دونوں کے درمیان تو قابل رشک، قابل ستائش تعلقات تھے۔ وہ اس قدر ہونہار، تابعدار، فرمانبردار بہو تھی آپ کی بھلا آپ کا اس کے بغیر دل کیسے لگ سکتا ہے۔'' اس کا لہجہ دھیما اور لفظ کاٹ دار تھے۔

''وقت کے ساتھ ساتھ انسان سب سیکھ جاتا ہے۔''

''جی...... بشرطیکہ سیکھنے والا انسان ہو۔'' وہ پھر شوخ ہوا۔

بے جی نے کچھ کہنے کے لئے لب وا کئے ہی تھے کہ سامنے سے آتے حسن صاحب کو دیکھ کر خاموش ہو گئیں۔ شاہ ویز کی اس طرف پشت تھی۔

''بے جی! کیا سرپرائز ہے وہ جس کے لئے آپ نے مجھے کال کیا تھا؟''

''السلام علیکم!'' حسن بیگ کی آواز اسے اپنی سماعت کا دھوکا لگی۔ اس نے تیزی سے مڑ کر دیکھا۔ وہ کھڑے مسکرا رہے تھے۔

''سر...... آپ...... کب...... آئے......؟''

''صبح پہنچا ہوں۔'' انہوں نے آگے بڑھ کر اسے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔

''آپ لوگ باتیں کریں، میں اتنے میں کباب فرائی کر لیتی ہوں۔'' بے جی دانستہ انہیں باتیں کرنے کا موقع دے کر چلی گئیں۔ وہ صوفوں پر براجمان ہو گئے۔

شاہ ویز حیران تھا ان کی اس طرح اچانک غیر متوقع آمد پر۔ جب کہ حسن بیگ گفتگو کے لئے لفظوں کو ترتیب دے رہے تھے۔

''مشعل کیسی ہے؟'' ان کے دل کی بے تابی پہلے زبان پر آئی۔

''جیسی آپ چھوڑ کر گئے تھے۔''

''میرا مطلب ہے بہن بتا رہی تھیں، پچھلے دنوں اسے فلو وغیرہ ہو گیا تھا۔ آپ نے بتایا تھا نہیں۔'' وہ بری طرح خجالت کا شکار تھے کیونکہ شاہ ویز کے انداز میں ذرا بھی لچک نہ تھی۔

''وہ بالکل ٹھیک ہے۔ آپ کو لے چلوں گا اس کے پاس۔''

''نہیں...... میں ابھی اس سے ملنا نہیں چاہتا، جب تک وہ اس گھر کے لائق نہیں ہو جاتی میں اس سے نہیں ملوں گا۔''

''یہ تو بہت بڑی مشکل میں آپ نے خود کو ڈال لیا ہے۔ اس طرح آپ کبھی بھی اس سے نہ مل پائیں گے۔'' اس کی صاف گوئی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ بیگ صاحب ہونٹ بھینچ کر رہ گئے۔

پھر کھانے کے دوران اور بعد تک ان کے درمیان کاروباری گفتگو ہوتی رہی تھی۔ اس دوران انہوں نے محسوس کیا مشعل کے ذکر پر اکھڑا اکھڑا بے زار دکھائی دینے والا شاہ ویز اب وہی پہلے والا شاہ ویز لگ رہا تھا۔ نرم خو، مہذب و مؤدب، بے انتہا خیال رکھنے والا۔

''ہوں...... کھوٹ صرف مشعل میں ہے۔'' انہوں نے دکھ سے سوچا تھا۔

شاہ ویز جا چکا تھا۔ بے جی عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر اپنے مخصوص وظائف میں مصروف تھیں۔

حسن بیگ سوچ رہے تھے ان کی جدائی، مکمل طور پر مشعل سے دوری نے بھی مشعل پر کوئی اثر نہ ڈالا تھا۔ وہ ویسی ہی تھی۔ ہٹ دھرم، بے حس۔

گھر محبتوں سے پروان چڑھتا ہے، آپس کا تعلق، خلوص و مروت سے مربوط ہوتا ہے۔ جہاں وفا، ایثار، الفت نہ ہو وہاں ایسے زبردستی کے بندھن زیادہ دیر استوار نہیں رہتے۔ اور یہ تعلق علیحدہ ہو جائے یہ تو انہیں مر کر بھی گوارا نہ تھا۔

''بھائی صاحب! خیریت تو ہے نا؟'' بے جی وظیفے سے فارغ ہوئیں تو حسن بیگ کو کوریڈور میں مضطرابی انداز میں ٹہلتے دیکھ کر فکرمندی سے گویا ہوئیں۔

''جی بالکل...... میں دراصل آپ کا انتظار کر رہا تھا کچھ ضروری باتیں کرنے کے لئے۔ اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو پلیز کچھ وقت دیں مجھے۔'' وہ اپنے مخصوص دھیمے و نرم لہجے میں بولے تو بے جی اثبات میں سر ہلاتی ہوئی خاصے فاصلے پر رکھی کرسی پر بیٹھ گئیں۔

''مجھے خوشی یہ دیکھ کر محسوس ہوئی ہے کہ میری طرح آپ کی بھی یہی کوشش ہے کہ مشعل اور شاہ ویز خوشگوار زندگی گزاریں اور اس میں یقیناً شاہ ویز کی کوشش بھی رہی ہے کیونکہ وہ آپ کے بغیر ایک وقت کا کھانا پسند نہیں کرتا کجا کہ اب آپ سے دوری برداشت کر رہا ہے۔ یہاں آپ کے حوصلے، شاہ ویز کی ہمت کو داد دینے کے لئے میرے پاس لفظ نہیں ہیں۔''

''کوشش تو ہماری بھرپور ہے...... آگے جو اللہ کی مرضی۔''

''بے شک...... اس کی مرضی کے بغیر کچھ بھی ممکن نہیں ہے۔ مگر یہاں میں آپ سے ایک مشورہ لینا چاہتا ہوں۔''

''جی آپ بلاجھجک کہیں بھائی صاحب!''

''میرا خیال ہے ہم انہیں کچھ عرصہ تنہا رہنے کا موقع فراہم کریں تو شاید بہتری کی کوئی سبیل نکل آئے۔ اپنوں سے دوری انسان کو بہت دکھی اور تنہا کر دیتی ہے۔ ایسے میں اگر کوئی ہمدرد و غمگسار مل جائے تو دوستی ہونے میں کوئی تامل نہیں ہوتا۔ ایسے میں انہیں ایک دوسرے کے قریب آنے کا موقع ملے گا، ایک دوسرے کو جان پائیں گے، ان

کے درمیان جو خلیج ہے وہ رفاقت میں بدل جائے گی۔ آپ کا کیا خیال ہے بہن جی؟‘‘

’’میں بھی یہی چاہتی ہوں کہ وہ جلد ایک ہو جائیں۔‘‘ بے جی نے رضامندی دے دی تو وہ مطمئن انداز میں مسکرا اٹھے۔

’’ملک سے باہر جانے پر شاہ ویز راضی نہ ہوں گے یہ میں بخوبی جانتا ہوں بلکہ اس شہر سے باہر جانے پر بھی آپ کو رضامند کرنا پڑے گا۔‘‘

’’بہتر بھائی صاحب! اسے راضی کرنا میرا کام ہے۔‘‘ بے جی اٹھتے ہوئے اعتماد سے گویا ہوئیں۔

□●□

رات شاہ ویز آیا تو دوپہر کا غصہ و جنگ کا خیال عود کر آیا اور شدت سے دل مچلا اپنے لمبے ناخنوں سے اس کا چہرہ بگاڑ ڈالنے کو مگر پھر اپنا انجام سوچ کر رک گئی۔

حقیقت یہ تھی وہ اس کی مار سے ڈر گئی تھی۔

مستزاد اس کے خوفناک تیور اور خونخوار لہجہ اسے مار ڈالتا تھا۔

’’سارا دن کیا، کیا ہے تم نے؟‘‘ اس نے کمرے کی بے ترتیب حالت دیکھ کر ناقدانہ لہجے میں کہا تو وہ اسی طرح لاتعلق بیٹھی رہی۔ کمرے کی حالت بہت ابتر ہو رہی تھی۔ صبح تک صرف بیڈ کی چادر پر شکن تھی، کمبل بغیر تہہ ہوئے پڑا تھا۔

دوپہر کو چوکیدار کی باتیں سننے کے بعد اس کا دماغ الٹ سا گیا۔ پرانی والی ضدی، خودسر، کسی کو خاطر میں نہ لانے والی مشعل بیدار ہو گئی تھی اور اس نے اشتعال میں کمرے میں رکھی ہر شے الٹ پلٹ کر رکھ دی تھی اور خود سو گئی تھی۔

’’میں تم سے پوچھ رہا ہوں کیا حالت بنا رکھی ہے کمرے کی؟‘‘ اس کو ہنوز خاموش دیکھ کر وہ چڑ کر گویا ہوا۔

’’مجھ سے بات مت کرو...... میں پاگل ہوں۔‘‘ وہ غرائی۔

’’واہ...... کیا خود شناسی ہے۔‘‘ وہ استہزائیہ لہجے میں بولا۔

’’کیا ضرورت تھی تمہیں چوکیدار سے بکواس کرنے کی؟‘‘

’’کیا ضرورت تھی تمہیں قدم باہر نکالنے کی؟‘‘

’’تم نے خود کہا تھا میں یہاں قید نہیں ہوں۔‘‘

’’مجھے معلوم تھا تم یہاں سے فرار ہونے کی کوشش کرو گی، اس لئے مجھے چوکیدار کو الرٹ کرنا پڑا تھا۔‘‘ اس نے کوٹ اتار کر چیئر پر ڈالتے ہوئے اطمینان سے کہا۔

’’کہاں جاؤں گی یہاں سے؟ سارے در تو مقفل کر دیئے ہیں۔‘‘

’’اوکے...... میں تھکا ہوا ہوں، کسی فضول بے معنی بحث میں الجھنا نہیں چاہتا۔ ڈریس چینج کر کے آ رہا ہوں، جب تک بیڈ کی حالت درست کرو۔‘‘

’’مجھے نہیں یہ سب کرنا۔‘‘

’’آ جائے گا جب کرنے کی کوشش کرو گی تو۔‘‘

’’مجھے کوشش نہیں کرنی نہیں کرنے مجھے ایسے کام۔‘‘

اس کے چہرے سے کوفت و بیزاری عیاں تھی۔ شاہ ویز کے تیور بگڑنے لگے۔ چند لمحے کھڑا وہ اس کے اٹھنے کا انتظار کرنے لگا مگر پھر خود ہی پیش رفت کرنی پڑی تھی۔

’’پہلے بیڈ کو درست کرو، تکیے ترتیب سے لگاؤ، بلینکٹ تہہ کر کے پائتی رکھو۔ تم نے کام کیا نہیں ہے مگر دیکھا تو ہے۔ کم آن ہری اپ، میں اتنے میں کپڑے چینج کر کے آتا ہوں پھر ل کر ڈسٹنگ کرتے ہیں۔‘‘ اس کا لہجہ دوستانہ مگر تیور اتنے سخت تھے کہ مجبوراً اسے اٹھنا پڑا تھا۔ تکیے اٹھا کر بیڈ سے نیچے پھینکے۔ کمبل سمیٹ کر ایک طرف رکھا۔

’’پاپا، کہاں پھنسا دیا آپ نے مجھے...... ایسا لگتا ہے کسی خطرناک جرم کی عمر قید کاٹ رہی ہوں، بلکہ...... بلکہ آپ کے لئے تو میں مر ہی گئی ہوں جو آپ نے پلٹ کر میری خبر ہی نہ لی۔ مجھے اگر اس طرح زندگی گزارنی تھی تو پھر کیوں اس قدر عیش و عشرت میں رکھا۔ میں تو کبھی تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ کروڑوں کی مالک ہونے کے باوجود اس طرح بے بس و بے اختیار ہو جاؤں گی۔‘‘ وہ تصور میں پاپا سے مخاطب تھی۔ بڑی مشکل گھڑی تھی۔ چادر سنبھل کر نہ دے رہی تھی۔ ایک طرف سے درست کرتی تو دوسری جانب سے بگڑ جاتی۔ دوسری جانب پھیلاتی تو تیسری طرف سے سمٹ آتی۔ بیڈ کے تینوں اطراف وہ چرخی کی طرح گھوم گئی تھی۔ اسے پہلی دفعہ معلوم ہوا کہ بیڈ کور بچھانا دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔ نامعلوم کس طرح ملازمائیں منٹوں میں کور چینج کر دیا کرتی تھیں اس عمدگی و نفاست سے کہ ایک شکن تک نہ ہوتی تھی۔ ان کے ہنر، مہارت اور جانفشانی کا اسے ان لمحوں میں ادراک ہوا جن کو کبھی وہ انسان بھی نہ گردانتی تھی۔

پندرہ منٹ کی جان توڑ مشقت کے بعد وہ بیڈ پر چادر بچھا پائی تھی۔ تکیے رکھنے کے بعد بھاری بھرکم فل سائز کمبل تہہ کرنے کی ہمت وہ خود میں نہ پاتی تھی۔ اسے ایسے ہی اٹھا کر بیڈ پر رکھ دیا تھا۔ پندرہ منٹ کی مشقت سے سانس ابتر ہو گیا اور پھر یکلخت پاپا کی یاد آتے ہی اس کے آنسو ابھر آئے۔ وہ بیٹھ کر بے ساختہ رونے لگی۔

پاپا کہتے تھے سب کچھ دولت و پیسہ ہی نہیں ہوتا کوئی شے تقدیر بھی ہوتی ہے۔ بعض انسانوں کو شاہ سے فقیر بنا ڈالتی ہے تو کبھی فقیر بادشاہ بن جایا کرتے ہیں۔ تقدیر زور آور و ناقابل تسخیر ہوتی ہے۔ کبھی بھی اپنے سے کمتر لوگوں کو حقیر نہ سمجھا کرو۔

وہ نخوت سے کہتی تھی۔

’’یہ نصیب، تقدیر، قسمت، غریب لوگوں کے دکھڑے ہوتے ہیں۔ وہی اس کی پرواہ کرتے ہیں کہ کب سنوریں؟ کب تقدیر کھل جائے؟ کب قسمت چمک اٹھے؟ ہمارا پرابلم نہیں ہے پاپا یہ۔‘‘

کبھی بڑے گھمنڈ، تکبر و رعونت سے کہی بات اسے نادم کر رہی تھی۔ وہ بھی تو ایک دم عرش سے فرش پر آ گری تھی۔

وہ جو خود کو بہت خاص و بلند بخت سمجھتی تھی اب محسوس کر رہی تھی وہ بھی نصیب، تقدیر، قسمت کے چکروں میں جکڑی خاص ہونے کے باوجود عام لڑکی تھی۔

’’اوہ گاڈ...... یہ تم نے بیڈ کو ریڈی کیا ہے...... بالکل اپنے مزاج کی طرح۔‘‘ وہ شب خوابی کے لباس میں باہر نکلا تو بیڈ پر نگاہیں ڈالتا ہوا حیرانگی سے چیخا تھا۔ جب کہ مشعل گریہ و زاری میں مصروف تھی۔ اس کی زندگی میں داخل ہونے سے قبل وہ آنسو نامی شے سے ناواقف تھی اور رونے والوں سے اسے سخت چڑ تھی۔ اب یہ عام تھا کہ آنکھوں میں ساون کا موسم ہمہ وقت وارد رہتا تھا۔

’’ایک تو کام بالکل پھوہڑ پن سے کیا ہے اب یہ آنسو کس وجہ سے بہا رہی ہو؟‘‘ وہ اس کے قریب بیٹھ کر سنجیدگی سے بولا۔

’’مجھ سے نہیں ہوتا اتنا مشکل کام۔‘‘ اس نے چہرہ اٹھا کر کہا۔ ’’پلیز...... مجھے بتا دو پاپا کہاں ہیں؟ میں ان سے صرف ایک مرتبہ بات کرنا چاہتی ہوں۔‘‘ اسے اچھے موڈ میں دیکھ کر اسے حوصلہ ہوا اپنے دل کی بات کہنے کا، جھٹ بولی۔

’’کیوں...... شکایت لگاؤ گی میری کہ میں نے تم سے بیڈ پر چادر بچھوائی ہے یا بہت ساری شکایتیں ہوں گی؟‘‘ اس کا موڈ خاصا خوشگوار تھا۔ وہ اس سے خاصا قریب بیٹھا دلچسپی سے اس کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔

’’اس خوف سے مجھے پاپا سے بات کرنے نہیں دیتے کہ میں آپ کی پاپا سے شکایت کروں گی؟‘‘ اسے نیا خیال سوجھا۔

’’تمہارا کیا خیال ہے میں اللہ کے علاوہ اور کسی سے خوفزدہ ہو سکتا ہوں؟‘‘ میکانکی انداز میں اس کی گردن انکار میں ہل گئی تھی۔

’’پھر تمہیں یہ خیال کیوں کر آیا؟‘‘

’’ایسے ہی...... مجھے پاپا بہت یاد آ رہے ہیں۔‘‘

’’تمہیں ایک فیصلہ کرنا پڑے گا کہ حسن بیگ کے ساتھ یا میرے ساتھ رہنے کو کہا جائے تو تم کس کے ساتھ رہنا پسند کرو گی؟‘‘ وہ اس کی جانب دیکھتا ہوا کہنے لگا۔ ’’بہت سوچ سمجھ کر جواب دینا کہ تمہاری آئندہ زندگی کا انحصار اس جواب پر ہو گا۔‘‘

’’تمہارے ساتھ۔‘‘ وہ تیزی سے بولی تھی۔

’’وہاٹ......؟‘‘ اس کے بے ساختہ جواب نے اسے حیرت سے گنگ کر ڈالا تھا۔ حیرانی سے کہہ اٹھا۔

’’نہ...... ن...... نہیں...... میرا مطلب ہے پپا کے ساتھ۔‘‘ جوش و روانی میں بے اختیار وہ اس کا نام لے بیٹھی تھی۔

شاہ ویز کے لبوں پر ایک مجروح مسکراہٹ لمحے بھر کو وارد ہوئی تھی۔ وہ جانتا تھا اس سے ہر لمحہ، ہر ساعت جان چھڑانے والی لڑکی بھلا کس طرح تاحیات ساتھ رہنا گوارا کر سکتی ہے۔ اس کا جواب یہی متوقع تھا۔

’’بہت چاہتی ہو اپنے پاپا کو؟‘‘

’’ہوں......‘‘

’’ان سے ملنا، ان کے ساتھ رہنا چاہتی ہو؟‘‘

’’ہاں۔‘‘

’’اوکے۔‘‘ شاہ ویز نیم دراز کچھ سوچتا رہا، اس کے وجیہہ چہرے پر دبیز سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ وہ کسی گہری سوچ میں مستغرق ہو گیا تھا۔ سوچیں طویل ہو جائیں تو فیصلے کمزور پڑ جاتے ہیں۔ اور وہ ایسے کسی کمزور لمحے کی گرفت میں آنا نہیں چاہتا تھا، سو تیزی سے سر جھٹک کر اٹھ کھڑا ہوا اور اس سے مخاطب ہوا۔

’’پھر تمہیں کچھ عرصہ ان طریقوں پر چلنا ہو گا جو میں تمہیں بتاؤں گا۔ وہی کرنا ہو گا جو میں تمہیں گائیڈ کروں گا۔‘‘

’’کیا کرنا ہو گا مجھے؟‘‘ وہ تحیر سے گویا ہوئی۔

’’ایک مکمل لڑکی بننا ہو گا...... ایک ایسی آئیڈیل بیٹی جو باپ کے لئے انعام ہوتی ہے، جن سے والدین کے سر اور نگاہیں فخر و افتخار سے بلند رہتی ہیں۔‘‘ وہ دھیمے لہجے میں

گویا ہوا۔
''میں مکمل لڑکی ہوں، آئیڈیل بیٹی ہوں۔ یہ تم سے کس نے کہہ دیا کہ میں ادھوری ہوں یا میرے پاپا مجھے پسند نہیں کرتے؟'' اس کے لہجے میں ناگواریت در آئی تھی۔
شاہ ویز نے ایک جلتی ہوئی نگاہ اس پر ڈالی تھی پھر خود بخود ہی اس کے لبوں پر تمسخرانہ مسکراہٹ در آئی۔ ذہن کی اسکرین پر وہ یکے بعد دیگرے تمام مناظر روشن ہونے لگے جن میں حسن بیگ کسی سائل کی طرح کشکول دراز کیے اس سے اور بی جی سے اس کے لئے عاجزی و انکساری سے مخاطب تھے۔ اگر ان مناظر میں سے کسی ایک کی جھلک بھی مشعل دیکھ لے تو شرمندگی و شرمندگی کے احساس سے ذہنی توازن کھو بیٹھے۔ اپنی شان میں اپنی ہی زبان سے نکلنے والے الفاظ طمانچے بن کر اس کے چہرے پر لگیں۔
مگر وہ اپنی وسعت قلبی و معاف کر دینے والی عادت سے مجبور کوئی ایسی بات کیے بنا صرف مسکرانے پر اکتفا کرتا تھا۔
لیکن اس کی اس مسکراہٹ و خاموشی میں ایسی کوئی کاٹ ضرور ہوتی تھی جو مشعل کے انگ انگ کو اس بری طرح گھائل کیا کرتی تھی کہ وہ زخمی ناگن کی طرح بل پر بل کھاتی تھی۔
''تم اس طرح مت مسکرایا کرو۔'' بالآخر وہ پاؤں پٹخ کر بولی۔
''کیوں؟ مسکراہٹ تو دوستانہ انداز ہوتا ہے۔'' اس کی مسکراہٹ مزید گہری ہوگئی۔
''لیکن مسکراہٹ، مسکراہٹ میں بہت فرق ہوتا ہے۔'' وہ بدستور چڑے ہوئے انداز میں بولی۔
''مسکراہٹ، مسکراہٹ ہوتی ہے۔''
''نہیں...... مسکراہٹ میں بھی اتنا ہی فرق ہوتا ہے جتنا دن و رات میں ہوتا ہے، صبح و شام میں ہوتا ہے۔ ہر مسکراہٹ کا الگ رنگ ہوتا ہے۔''
''امیزنگ...... ویری امیزنگ...... آج سے قبل میں مسکراہٹوں کی اتنی کوالیٹیز سے لاعلم تھا۔ اچھا بتائیے میری مسکراہٹ کس کوالٹی کی ہے...... کون سا رنگ ہے اس میں؟''
''حقارت و طنز کا۔ تمہاری مسکراہٹ یہ تاثر دیتی ہے گویا میں اسٹوپڈ اینڈ نان سینس اینڈ اگلی گرل ہوں۔''
''امیزنگ...... آج تو حیران کر رہی ہو۔''
''صرف مسکراہٹ ہی نہیں، تمہارے ہر انداز کے کئی رنگ، کئی پہلو ہوتے ہیں۔ تمہاری زبان ہی نہیں، تمہارے اعضا، تمہارے وجود کی ہر جنبش اظہار کے ذرائع ہیں۔''
''یہ کیٹگریز تو بہت حساسیت سے لبریز ذہنوں کے لئے ہوتی ہیں۔ تمہارا ذہن ان باریکیوں کو کہاں چھو سکتا ہے؟''
''مجھے نہیں معلوم...... تم مجھے کیا سمجھتے ہو...... شاید کوئی روبوٹ جو ہر احساس و جذبات سے عاری ہو...... جو بھی سمجھو مجھے اس سے کوئی انٹرسٹ نہیں ہے۔ میں چاہتی ہوں پاپا کے پاس رہنا اور اس کے لئے میں تمہاری خواہشات پر چلنے کے لئے تیار ہوں۔'' وہ پہلے کی طرح زبان چلانے سے اجتناب برتتی تھی، دیکھتی تھی بات بڑھ رہی ہے تو خاموش ہو جایا کرتی تھی۔ اب اس وقت تو بات بھی اس کے مفاد کی تھی۔
پاپا کو دیکھنے، ان سے ملنے کی خواہش حسرت بن کر رہ گئی۔ اس وقت وہ اس دیرینہ آرزو کی تکمیل کے لئے بے چین و بے قرار ہوگئی تھی۔
''اوکے...... صبح سے تمہاری کلاسز اسٹارٹ ہو جائیں گی۔''

□●□

سرما کی نرم و چمکیلی دھوپ پُرتکلف مہمان کی طرح کچھ دیر کو ہی آنگن میں آتی تھی۔ کوئی اس کی آمد کی تمازت سے فیض یاب بھی نہ ہو پاتا کہ وہ جھٹ کسی مغرور، نک چڑھی دوشیزہ کی مانند اپنا آنچل سمیٹ کر غائب ہو جاتی تھی۔ اس وقت بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ دھوپ نے ابھی آنگن میں قدم رنجہ ہی فرمایا تھا کہ زرینہ جو ابھی ناشتے سے فارغ ہوئی تھیں، کپ میں مزید چائے انڈیل کر پھرتی سے تخت پر جا کر بیٹھ گئیں۔
''سردی میں دھوپ کے کتنے نخرے ہوتے ہیں۔ ذرا سی ذرا شکل دکھا کر غائب ہو جاتی ہے اور گرمی میں کم بخت منہ اندھیرے ہی چلی آتی ہے اور ہر جگہ ایسے ٹھاٹھ سے جم جاتی ہے کہ پسینہ پسینہ کر ڈالتی ہے انسانوں کو۔ اب ضرورت ہے تو مجال ہے جو ٹک جائے۔'' زرینہ اپنے مخصوص جلے کٹے لہجے میں بولے جا رہی تھیں۔
''اماں! اگر ایسا نہ ہو تو ہمیں اس کی اہمیت کا، افادیت کا احساس کس طرح ہو...... قدرت کی ہر شے میں ہمارے لئے فوائد و بہتری ہے۔''
''ہاں، یہ ہم ہی ناشکرے و ناقدرے ہیں۔ صرف وقت پر مطلب کی شے کی قدر کر پاتے ہیں اور بعد میں کون شکر کرتا ہے۔ اصغر کل سے ابھی تک گھر نہیں لوٹا۔ بہو کی چھٹی تو ہوگئی ہوگی نا؟''
''ہاں اماں! کل بھابھی ہوسپٹل سے ڈسچارج ہوگئی ہوں گی۔ شاید بھائی ان کی دلجوئی کے لئے وہاں رک گئے ہوں۔ ابھی تازہ چوٹ ہے، تازہ زخم ہیں، انہیں ہمدردی و پیار کی اشد ضرورت ہے۔'' سائرہ ناشتے کے برتن دھو کر فارغ ہوئی تو سبزی کی ٹرے اٹھائے وہیں تخت پر چلی آئی۔
''دلجوئی کرنے کے لئے بھی وہی احمق رہ گیا۔ کہاں گئیں اس کلموہی کی ماں، بہنیں۔ جنہوں نے میرے بیٹے کو تو مجھ سے جدا کیا ہی تھا میرے پوتے کو بالکل ہی جدا کر دیا۔'' ان کی آواز بھر آگئی۔
''جو ہمارے نصیب میں لکھا تھا وہ ہوا...... اس میں بھلا کسی اور کیا دوش۔ کیوں کسی کو الزام دیں۔ چھوڑیں اماں، سارے گلے شکوے فراموش کر ڈالیں۔ بھابھی کو گھر لے آئیں۔ مجھے بھائی کا خیال آتا ہے۔ روز روز وہ یہاں کے اور وہاں کے چکروں میں ڈسٹرب ہو گئے ہیں۔ بھابھی گھر آجائیں گی، گھر میں رونق بھی لوٹ آئے گی اور بھائی بھی اس دہری مشقت سے خلاصی پالیں گے۔''
سائرہ نے گاجر، مٹر، آلو اور میتھی نکال کر تخت پر اخبار پھیلا کر اس پر رکھتے ہوئے اپنی جانب سے اچھی طرح صلاح دی تھی مگر زرینہ تو سوکھی لکڑیوں میں لگی آگ کی طرح بھڑک اٹھیں۔
''اس کمبخت کو یہاں لاتی ہے میری جوتی۔''
''اماں! یہ غلط بات ہے...... آپ بڑی ہیں، بزرگ ہیں۔''
''ارے بڑی ہوں، بزرگ ہوں تو اپنی ناک کٹوا لوں؟''
''میرا یہ مقصد نہیں ہے۔''
''سب سمجھتی ہوں میں...... تجھے زیادہ امن کی فاختہ بننے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اس کی یا اس کے گھر والوں کی نگاہ میں بڑی ہوتی، بزرگ ہوتی تو اس طرح کرتے میرے ساتھ؟ ہونہہ...... میں جو ہوں خوب جانتی ہوں اپنی اوقات کو۔ آج کل تو لوگوں کا چلن ہی بدل گیا ہے۔ بیٹی دینے سے قبل اس طرح چمٹتے ہیں جیسے گنے پر مکھی۔ اور جب بیٹی ٹھکانے لگ جاتی ہے تو اس طرح نکال کر پھینکتے ہیں جیسے دودھ سے مکھی۔ اور تمہیں کیا ضرورت پڑ گئی بھائی کی فکر کرنے کی۔ بھائی نے تم سے ایک دفعہ بھی پوچھا؟ ایک بار بھی فکر کی کہ بہن کتنے عرصے سے دہلیز پر آکر بیٹھی ہے، اس کا مسئلہ حل کرنا ہے یا نہیں۔''
''کب تک کریں وہ مسئلہ حل؟ ایک بار، دو بار، تین بار...... میرے پاس تو کوئی حد بھی نہیں۔ ابھی جاؤں گی، انہیں دوبارہ ضرورت کب پیش آتی ہے معلوم نہیں۔ مجھے اپنی جانب سے کوئی گلہ نہیں ہے کسی سے بھی۔'' سائرہ کے بھیگے لہجے میں دھیما پن تھا۔
''بس اسی طرح خود پر ترس کھاتی رہ اور دوسروں کو معاف کرتی رہ۔ زیادہ نہیں تھوڑا بہت اپنے آپ کو بدل ورنہ ہر طرف سے خسارے میں رہے گی۔'' زرینہ اس کو روہانسا دیکھ کر نرمی سے گویا ہوئیں۔
''وقت سب سے بڑا استاد ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کبھی اس کی مہر میں، میں بھی بدل کر وہ کچھ سیکھ جاؤں جو اس کا تقاضا ہے۔''
''تجھ کو سمجھانا ایسا ہی ہے جیسے بین کے آگے بھینس بجانا...... چل چھوڑ اس قصے کو۔ یہ پکا کیا رہی ہے؟''
''گاجر، میتھی، آلو مٹر پسند ہیں نا اماں تمہیں بہت۔'' وہ سرخ سرخ گاجریں چھیلتے ہوئے مسکرا کر گویا ہوئی۔
''میرے لئے اتنی محنت مت کیا کر......'' ان کے لبوں پر ممتا بھری مسکراہٹ تھی۔
''میتھی میں نے رات کو ہی صاف کر کے رکھ دی تھی۔ مٹر کے دانے تم نکال لو، میں اتنے میں گاجر اور آلو صاف کر کے آٹا گوندھ لوں۔ پھر سبزی اور پراٹھے ساتھ تیار کر لوں گی۔''
''گاجر ابال کر ڈالنا۔''
''کیوں؟''
''گاجر بغیر ابالے ڈالو گی تو تمام سبزی میٹھی ہو جائے گی۔ جس سے ذائقہ تبدیل ہو جائے گا اور ابالتے وقت آدھا چمچ نمک ڈالنا نہ بھولنا۔ ہاں ٹماٹر زیادہ ڈالنا۔ سردیوں میں سبزیاں بہت آتی ہیں اس لئے مجھے یہ موسم بے حد پسند ہے۔ کھانا بھی دل سے کھایا جاتا ہے اور نیند بھی بڑی اچھی آتی ہے۔'' وہ مٹر کے دانے نکالتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔
''گردے کی درد کی وجہ سے ٹماٹر کا استعمال میں نے ترک کر دیا۔''
''ارے کچھ نہیں ہوتا...... ٹماٹر ضرور ڈالنا سبزیوں میں۔ دہی کا استعمال مجھے قطعی گوارا نہیں۔ پھر آج کل تو مولی خوب آ رہی ہے۔ گردے کے درد میں اس کا استعمال فائدے مند ہے۔ درد سے نجات مل جاتی ہے۔''

□●□

''حرا! فٹافٹ پیکنگ کریں...... ہم فارن ٹور پر جا رہے ہیں۔ صرف چند سوٹس پیک کرنا، شاپنگ آپ کو وہیں سے کرواؤں گا۔'' خرم نے آفس سے آتے ہی اس سے کہا۔ اس وقت وہ بے حد خوش و پُرجوش نظر آ رہے تھے۔
''فارن ٹور پر...... مگر کہاں......؟'' حرا ان کے ہاتھ سے کوٹ لے کر ہینگ کرتی ہوئی حیرانی سے استفسار کرنے لگی۔
''بہت ساری کنٹریز میں۔ دراصل ہے تو بزنس ٹور ہی، اس میں، میں نے کچھ گنجائش نکال لی ہے۔ مجھے احساس ہے۔'' انہوں نے بہت پیار سے اس کے شانوں پر بازو

رکھتے ہوئے مدھ بھرے لہجے میں کہا۔ ''ہماری شادی کو چھ ماہ ہو چکے ہیں اور میں بزنس مصروفیات کے باعث آپ کو کہیں لے جا ہی نہ سکا۔ بہرحال اب میں نے پروگرام سیٹ کرلیا ہے۔'' ان کی نگاہوں میں والہانہ پن تھا۔ چہرے پر فرطِ مسرت سے چمک تھی جو ان کی محبت والوہی جذبوں کی گواہ تھی۔

حرا یکدم لجا کر رہ گئی۔ اس کی کیفیت کو وہ بھی بھانپ گئے۔ ہلکا سا قہقہہ لگا کر اسے انہوں نے اپنی بانہوں سے آزاد کردیا۔

''سچ پوچھو تو آپ کی اس شرمانے گھبرانے والی ادا نے ہی ہمیں تمہارا اسیر بنا ڈالا ہے جو ہم آفس میں شدت سے ٹائم دیکھتے رہتے ہیں کہ کب قید ختم ہو اور ہم آپ کے حضور حاضر ہوں۔''

''آپ بھی بس...... چائے لاؤں آپ کے لئے؟''

''کچھ دیر بعد لے آنا...... لیکن ایک بات بتاؤ، ٹور پر جانے کی تمہیں کوئی خوشی نہیں ہوئی؟ تم باہر جانا نہیں چاہتیں؟''

ان کی زیرک نگاہوں سے اس کی الجھن و بیگانگی چھپ نہ سکی۔ از حد چاہنے لگے تھے اس کو اس چھ ماہ کے قلیل عرصے میں۔ حالانکہ نائلہ ان کی پہلی بیوی تھیں، حسین و طرح دار جوان کی سوسائٹی میں موو کرتی تھیں۔ ان کی رفاقت میں زندگی کے اُنیس سال گزارنے کے باوجود انہوں نے کبھی ایسی دیوانگی و سرخوشی محسوس نہ کی تھی جو حرا کی سنگت میں وہ محسوس کرنے لگے تھے۔ عجیب ہی پُرکیف و نشاط آور احساسات ان کے اندر موجزن ہونے لگے کہ دل چاہتا تھا ہر پل، ہر ساعت وہ حرا کی من موہنی صورت دیکھتے رہیں۔

''کوئی پریشانی ہے تو مجھے بتاؤ...... کیا کوئی مسئلہ ہے؟'' وہ اس کے مقابل بیٹھ کر سنجیدگی سے گویا ہوئے۔

''نہیں مسئلہ تو کوئی نہیں مگر......'' وہ متذبذب کا شکار تھیں۔

''یہ اگر مگر مجھے پسند نہیں کلیئر بات کرو۔''

''میں...... میں سوچ رہی ہوں اگر ہم چلے جائیں گے تو امی حضور کا خیال کون رکھے گا؟ کیا ایسا نہیں ہو سکتا ہم انہیں بھی ساتھ لے جائیں۔ ہمارے پیچھے وہ تنہا رہ جائیں گی اور......''

''اسٹاپ اٹ...... میں تمہیں مڈل کلاس انوائرمنٹ سے نکالنا چاہتا ہوں لیکن تم مجھے کامیاب ہونے نہیں دیتیں۔ کتنی بار سمجھایا ہے یہ چھوٹے چھوٹے مسئلے ہی ہماری کلاس میں نہیں ہوتے۔ امی حضور کی دیکھ بھال کے لئے ڈھیروں ملازم ہیں اور وہ عادی ہیں ایسے ٹورز کی۔ مت عادت بگاڑو ان کی۔'' ان کا موڈ بری طرح آف ہو گیا تھا۔

''عادت بگاڑنے کی کیا بات ہے خرم! ماں تو ماں ہی ہوتی ہے خواہ وہ کسی بھی کلاس سے تعلق رکھتی ہوں۔'' اس نے رسانیت سے سمجھایا۔

''نہیں...... تم ابھی ہماری کلاس کی خرابیوں سے ناواقف ہو۔ یہاں ایک چہرے پر بہت سارے ماسک چڑھے ہوتے ہیں۔ بہتر یہی ہوگا کہ دوسروں کی فکر کرنے کی بجائے خود کو اتنا پاورفل بناؤ کہ لوگ تمہارا موڈ دیکھ کر بات کریں نہ کہ تم ان کی خوشامد میں لگی رہو۔'' وہ غصے سے تن فن کرتے باتھ روم کی طرف بڑھ گئے۔

□●□

شاہ ویز نے پاپا سے ملوانے کی یقین دہانی کروا کر گویا مردہ تن میں نئی روح پھونک دی تھی۔ وہ اتنی خوش تھی کہ ان سے ملنے کی آس میں ہر وہ کام کرنے کو تیار تھی جو عام حالات میں کبھی بھی ممکن نہ تھا۔ شاہ ویز پر اس کی مسرت و لگن نے خاصا اثر ڈالا تھا۔ اس کا رویہ بھی آہستہ آہستہ چینج ہو رہا تھا۔

ہر وقت ناک پر دھرا رہنے والا غصہ کبھی کبھار عود کر آتا تھا مگر طنز کے تیر چلانا نہیں بھولا تھا۔ جب بھی موقع ملتا تاک کر نشانہ مارتا کہ وہ تلملا کر رہ جاتی تھی۔

''ارے یہ کیا حلیہ بنایا ہوا ہے؟'' وہ آفس سے آیا تو اسے دیکھ کر حیرانی سے چیخ اٹھا تھا کہ اس وقت اس کا حلیہ تھا ہی خاصا مضحکہ خیز۔ شاہ ویز کے بلیک ٹراؤزر اور پنک ٹی شرٹ میں وہ باتھ روم سے برآمد ہوئی تھی۔ ٹی شرٹ اس کے بدن پر کافی ڈھیلی تھی اور ٹراؤزر کے پائنچے کافی فولڈ کرنے کے باوجود پاؤں میں آرہے تھے۔

''ایک ہی ڈریس میں، میں ساری زندگی نہیں گزار سکتی۔ اس ڈریس کو دو ہفتے گزرنے کے باوجود میں نے مجبوراً پہنے رکھا تھا مگر کچھ دیر قبل میری شرٹ ریک میں پھنس گئی۔ میں نے کھینچی تو وہ پھٹ گئی اور پھٹی ہوئی شرٹ میں کس طرح پہن سکتی تھی؟'' اپنے حلیے پر وہ خود بھی خفت کا شکار تھی مستزاد اس پر شاہ ویز کے انداز نے اسے پزل کر ڈالا تھا۔ وہ خاصی دلچسپ و گہری نگاہوں سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ نہا کر نکلی تھی۔ گلابی شرٹ میں اس کی دودھیا رنگت دمک رہی تھی۔ گولڈن سرخی مائل بال شانوں پر پھیلے ہوئے تھے جن سے قطرہ قطرہ پانی موتیوں کی صورت میں ٹپک رہا تھا۔

شرمندہ شرمندہ سی وہ دلفریب لگ رہی تھی۔

اس کا انداز بناوٹ و ریا سے پاک تھا۔ شاہ ویز کے لبوں پر جاندار مسکراہٹ ابھری تھی۔

''آئی ایم سوری...... تمہیں مجھے بتانا چاہئے تھا کہ تمہیں کپڑوں کی ضرورت ہے۔''

''کیوں...... تم خود تو ایک دن میں کئی کئی ڈریس چینج کرتے ہو اور میں تمہیں ایک ہی ڈریس میں نظر نہیں آتی؟''

''تم نے مجھے ایسی نظر سے دیکھنے کا اختیار ہی کب دیا ہے۔ میں تو خاصا بے اختیار سا بندہ ہوں۔'' اس کا دھیما لہجہ سلگتا ہوا تھا۔ مشعل نے بے ساختہ اس کی جانب نظر اٹھا کر دیکھا تھا۔ وہ بھی اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔ نامعلوم کیا تھا ان نگاہوں میں کہ اس جیسی بولڈ اور نڈر لڑکی بے اختیار رخ پھیرنے پر مجبور ہو گئی۔

''او کے، آج کام چلا لو۔ کل تمہارے لئے ڈریسز لے آؤں گا۔ میں چینج کرکے آرہا ہوں تب تک تم چائے بنا کر لاؤ۔'' وہ واش روم کی جانب بڑھتا ہوا بولا تو وہ کچن میں چلی آئی کل کی نسبت آج کچن بالکل الٹا پڑا تھا۔

کوئی شے اپنی جگہ پر موجود نہ تھی۔ سنک چھوٹے برتنوں سے بھرا تھا۔ کاؤنٹر پر تمام سامان پھیلا ہوا تھا۔

نیچے فرش پر انڈوں کے چھلکے پڑے تھے۔ ڈسٹ بن کے پاس رات شاہ ویز کے لائے ہوئے پھلوں کے چھلکے بکھرے ہوئے تھے۔

یہ سب اس کا ہی پھیلایا ہوا تھا مگر ابتر حالت میں۔ اسے خود یہاں بھی الجھن ہونے لگی اور دل چاہ رہا تھا الٹے قدموں بھاگ جائے مگر معاہدے کی رو سے اسے شاہ ویز کو چائے بھی بنا کر دینی لازمی تھی اگر وہ ایسا نہ کرتی تو یہ سمجھوتے کی خلاف ورزی تھی اور خلاف ورزی کا مطلب تھا وہ مقصد سے ہٹ رہی تھی۔

اور مقصد تھا پاپا کا ہمیشہ کا ساتھ۔

ان کا ساتھ وہ کسی طور چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔

یہی آرزو......

یہی خواہش......

یہی لگن

اسے سمجھوتے کی راہ دکھا رہی تھی۔ پھر وہ نہ چاہتے ہوئے بھی کچن میں داخل ہو گئی۔ کیتلی میں چائے کا پانی رکھا اور سوئچ آن کرکے پتی کی تلاش میں کیبنز دیکھ رہی تھی کہ بے دھیانی میں اس کا پاؤں کیلے کے چھلکوں پر پڑا تھا، وہ سنبھلتے سنبھلتے بھی پھسلتی چلی گئی

کیتلی پر اس کا ہاتھ لگا تھا، وہ ایک زوردار آواز سے نیچے گری تھی۔ کھولتا ہوا پانی اس کے پاؤں پر گرا تھا۔

شدت تکلیف سے اس کی چیخ نکل گئی تھی۔

شاہ ویز جو ابھی ڈریس چینج کرنے کے بعد بال بنا کر فارغ ہوا تھا اس کی چیخ کی آواز سن کر کچن کی طرف تیزی سے بڑھا تھا۔ سامنے ہی وہ پاؤں پکڑے فرش پر بیٹھی ہوئی چھکوں پھکوں رونے میں مصروف تھی۔

''کیا ہوا؟'' اس نے کچن کی حالت کو نظر انداز کرکے اس کے قریب بیٹھ کر پوچھا۔

''گرم پانی گر گیا ہے۔'' اس نے آنسوؤں کے درمیان بتایا۔

''ایک معمولی سا بھی کام تم سے نہیں ہوتا۔ کچن کی حالت کیا بنا رکھی ہے تم نے؟ صبح تک صاف ستھرا چھوڑ کر گیا تھا۔''

وہ نرم لہجے میں سرزنش کر رہا تھا۔ جب کہ وہ درد سے بے دم ہو رہی تھی۔ اپنی صفائی میں وہ کچھ نہ بولی۔ صرف آنسوؤں کی روانی میں تیزی آتی گئی۔ وہ اسے سہارا دے کر کچن سے کمرے میں لے آیا۔ بیڈ پر بٹھا کر کوئی کریم اس کے پاؤں پر لگائی جس کے لگانے سے جلن میں کچھ کمی ہوئی تھی مگر تھوڑی تکلیف ہی اس کو بے چین کرنے کے لئے کافی تھی۔

''بہت تکلیف ہو رہی ہے؟'' اسے مسلسل روتا دیکھ کر شاہ ویز اس کے قریب بیٹھ گیا۔ اس کا پاؤں بے تحاشا سرخ ہو رہا تھا۔ شدت تکلیف سے وہ دھیرے دھیرے کانپ رہی تھی۔

''ہاں...... مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا...... میں مر جاؤں گی۔''

''اتنی معمولی سی تکلیف میں مرنے کا سوچ رہی ہو؟''

''یہ معمولی تکلیف نہیں ہے...... یہ جان نکال رہی ہے۔''

''ٹھیک ہو جائے گا...... آنکھیں بند کرو۔ کچھ دیر سو جاؤ گی تو آرام محسوس کرو گی۔ شاباش، سونے کی کوشش کرو۔'' اس وقت اس کی حالت کچھ ایسی ہی مظلوم و مسکین سی تھی کہ اس کی ہمدرد طبیعت پوری طرح اس کی طرف راغب ہو گئی تھی۔

آگے بڑھ کر اسے لیٹنے میں مدد دی تھی۔

وہ لیٹ گئی تو دھیرے دھیرے اس کے سلکی بالوں میں انگلیاں چلانے لگا۔ اس کا یہ عمل بالکل غیر ارادی و بے اختیار تھا۔ مشعل کے روانی سے بہتے آنسو اور شدید ترین تکلیف اور اضطرابی کیفیت میں مبتلا وجود نے اسے بے خود کر ڈالا تھا۔ جذبے خلوص و مروت سے مربوط ہوں تو زخموں کے لئے مرہم بن جایا کرتے ہیں۔ اس وقت بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ اس کی بے غرض مروت اثر پذیر ہوئی تھی۔ وہ جو تکلیف سے نڈھال ہو رہی تھی یکدم ہی جیسے جلن میں ٹھنڈی پھوار پڑنے لگی تھی۔ ذہن سکے چلتی

ہوئی ہوا کی مانند ہو گیا تھا۔
دھیرے دھیرے حرکت کرتی ہوئی اس کی انگلیاں طمانیت بخشنے لگی تھیں۔خمار اس کی رگ رگ میں سرور بن کر اترنے لگا۔اس کی آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہوتی گئیں۔
کچھ دیر بعد وہ بے خبر سو رہی تھی۔شاہ ویز طویل سانس لے کر اس کے قریب سے اٹھ گیا۔تمام بکھیڑا اسے خود ہی سمیٹنا تھا۔

□●□

''بہن جی! آپ نے شاہ ویز سے بات کی؟'' حسن بیگ کھانے سے فارغ ہوئے تو کافی کے مگ اندر لاتی ہوئیں بے جی سے مخاطب ہوئے۔ان کے لہجے میں بے چینی و اضطراب تھا۔
''جی بھائی صاحب! میں نے کہا تھا اس سے۔پہلے تو وہ مانا نہیں۔مجھے چھوڑ کر اور مشعل کو ساتھ لے جانے پر تو قطعی رضامند نہ تھا۔'' انہوں نے کافی کا مگ انہیں پکڑاتے ہوئے نرمی سے کہا۔
''پھر اب کیا ہو گا؟'' وہ ازحد متفکر ہو گئے۔
''آپ اتنی جلدی پریشان مت ہو جایا کریں بھائی صاحب۔میں نے شاہ ویز کی پرورش اس وقت سے کی ہے جب یہ چھ ماہ کا تھا۔شاہ ویز کے والد میرے خالہ زاد بھائی تھے لیکن ہمارے اندر محبت سگے بہن بھائی جیسی تھی۔کیونکہ میرے والدین فوت ہو جانے کے بعد میری خالہ یعنی شاہ ویز کی نانی مجھے اپنے گھر ہی لے آئی تھیں اور خالہ خالو نے مجھے ماں باپ کی محبت دی اور بیٹی کی طرح ہی بہت دھوم دھام سے میری رخصتی کی تھی۔میرے نصیب میں دوبارہ اس گھر میں آنا لکھا تھا اور میں شادی کے چھ سال بعد ہی بیوہ ہو کر دوبارہ اس دہلیز پر آ گئی۔شاہ ویز کی ماں شاہ ویز کی پیدائش کے بعد اللہ کو پیاری ہو گئی تھی۔اس کی پرورش دادی دادا اور باپ کر رہے تھے اور حادثے میں اس کا باپ بھی اس کا ساتھ چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے چلا گیا تو اس کے دادا دادی تو گویا نیم مردہ ہو گئے۔ایسے میں، میں نے آگے بڑھ کر ان کو سنبھالا۔ننھا شاہ ویز خود بخود ہی میری گود میں آ گیا۔شاید اسی لئے میری گود برسوں سے سونی رہی تھی۔شاہ ویز میری گود میں کیا آیا میری روتی تڑپتی ممتا کو قرار آ گیا۔اسے پا کر میں خود کو مکمل محسوس کرنے لگی۔میری تشنگی، میری آزردگی، محرومی مٹ گئی۔خالہ خالو کو جوان بیٹے کی موت کا غم دیمک بن کر چمٹ گیا جس نے ایک سال کے عرصے میں یکے بعد دیگرے ان کی جان لے لی۔میں اور شاہ ویز ایک دوسرے کے سہارے زندہ رہ گئے اور یہیں سے ہم ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم بن گئے۔
شاہ ویز بچپن سے ہی بہت حساس، ذہین اور کم گو بچہ تھا۔جب بڑا ہوا تو میرے لئے سایہ دار درخت کی طرح بن گیا۔ایک مضبوط قلعے کی مانند۔یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں اس کی ماں نہیں پھپھو ہوں، اس کی محبت، یگانگت، عزت و احترام میں کوئی کمی نہیں آئی۔میری کوئی خواہش وہ رد نہیں کرتا، کوئی بات نہیں ٹالتا۔میں اس کے مزاج کے ہر رنگ، ہر روپ سے آگاہ ہوں...... بات منوانے کا ہنر جانتی ہوں۔میں نے اسے راضی کر لیا ہے مشعل کو ساتھ لے جانے کے لئے۔'' بے جی نے دھیمی سی مسکراہٹ لبوں پر سجاتے ہوئے ڈرامائی انداز میں کہا تو حسن بیگ صاحب جو کو مگو کی کیفیت میں بیٹھے ہوئے تھے بے جی کے آخری جملوں نے ان کے چہرے پر بشاشت بھری مسکراہٹ بکھیر دی تھی۔ان کے چہرے سے تفکرات کی سیاہ گھٹائیں چھٹ گئی تھیں۔ازحد طمانیت بھری مسکراہٹ چہرے کو روشن کرنے لگی۔
''تھینکس گاڈ! یہ تو آپ نے بہت اچھی خبر سنائی ہے بہن جی۔پھر کب روانہ ہوں گے وہ دونوں؟''
''کل سہ پہر تک۔شاہ ویز کافی دیر تک آپ کا انتظار کر کے گیا ہے۔اسے تیاری کرنی تھی اس لئے مزید انتظار نہ کر سکا۔''
''کاروباری معاملات وہ مجھے پہلے ہی سمجھا چکے ہیں۔میرے لئے کوئی مسئلہ نہ ہو گا۔ہاں آپ نے انہیں فارم ہاؤس وغیرہ کے بارے میں سمجھا دیا تھا؟''
''جی ہاں...... ابھی یا جانے سے قبل شاہ ویز آپ سے رابطہ ضرور کرے گا آپ سمجھا دیجئے گا۔'' بے جی کافی کے مگ اٹھاتے ہوئے گویا ہوئیں تو حسن بیگ نے جواب دیا۔
''جی ضرور...... وہاں انہیں کوئی پریشانی نہ ہو گی۔میں نے وہاں موجود اپنے ملازموں کو پہلے ہی حکم دے دیا ہے۔''

□●□

کسی نظر کو تیرا انتظار آج بھی ہے
بے جان جسم کو روح کی تلاش آج بھی ہے
کوئی تو پوچھے میرے دل سے حال میرا
یہ کیا مذاق ہوا ہے میرے مقدر سے
اسی نے زہر پلایا جو تھا مسیحا میرا
کسی نظر کو تیرا انتظار آج بھی ہے
بے جان جسم کو روح کی تلاش آج بھی ہے!

رشتوں کے درمیان حائل فاصلوں کو سمیٹنے کی سعی نہ کی جائے تو فاصلے بڑھ کر حیات سے تمام رنگ و روپ چھین کر انتظار لاحاصل بن جاتے ہیں۔فاصلوں کو قربتوں میں بدلنے کی سعی دونوں جانب سے ہو تو کامیاب ہوتی ہے لیکن جہاں ایک فرد کو فاصلے مٹانے کی جستجو ہو اور دوسری جانب سے خود غرضی و لاتعلقی کا رویہ برقرار رہے تو فاصلے مٹنے کی بجائے صدیوں پر محیط ہو جاتے ہیں۔
رشتے بلاغرض ہوں تو نبھائے جا سکتے ہیں۔
تعلق پُرخلوص ہوں تو روابط کبھی نہیں منقطع ہوتے۔
اگر ان تعلقات میں لالچ، غرض، کھوٹ و دغا شامل ہو جائیں تو پھر ان تعلقات کی بنیاد کمزور ہو جاتی ہے۔دیواریں کھوکھلی ہو کر گرنے لگتی ہیں۔رشتے گھائل ہو کر دم توڑ دیتے ہیں۔
یہ سب اس کے ساتھ ہو رہا تھا۔
باقر نے ابھی کچھ دیر قبل فون کر کے دھمکی دی تھی یا اطلاع وہ سمجھ نہ سکی تھی۔اسے صرف یہ یاد تھا کہ وہ پرسوں تک اس کی مطلوبہ رقم لے کر گھر نہ پہنچی تو باقر نہ صرف دوسری شادی کر لے گا بلکہ ساتھ ہی اسے طلاق بھی دے گا اور طلاق کا لفظ اس کے ہوش و حواس گم کر گیا تھا۔اس سے قبل بھی طلاق کے مکروہ لفظ کو وہ کئی بار بطور ہتھیار استعمال کر چکا تھا۔
وہ ہر بار اس گالی کے خوف سے ہاتھ پھیلانے آ جاتی تھی۔
طلاق ایک گالی ہی تو ہے عورت کے لئے...... خواہ اس میں عورت قصوروار ہو یا بے قصور، سزا دونوں کو ایک ہی ملتی ہے۔
لوگوں کے طنزیہ اور کاٹ دار جملے، تمسخرانہ نگاہیں، تضحیک آمیز رویہ، مطلقہ عورت کا نصیب اس کا مستقبل بن جایا کرتے ہیں۔
کوئی گہرائی میں نہیں جاتا۔سطحی ذہنیت والے سطح کا ہی جائزہ لیتے ہیں۔ان کے لئے زبان اور نگاہوں سے سنگسار کرنے کے لئے یہ جواز ہی کافی ہوتا ہے کہ ایک عورت کو اس لئے علیحدہ کیا گیا کہ مرد کے لئے ناقابل قبول، ناقابل برداشت تھی۔
بات سچ ہو یا جھوٹ، فسانے ہزاروں تراشے جاتے ہیں اور وہ ایسے کسی فسانے کا کردار بننا نہیں چاہتی تھی۔
''ارے دیکھا پیاری خالہ کو، بالوں کے ساتھ ساتھ ان کا تو خون بھی سفید ہو گیا۔دو پیسے کیا آ گئے اپنوں کو ہی بھول گئیں۔'' زرینہ گھر میں داخل ہوتے ہوئے حسب عادت تیز تیز لہجے میں بول رہی تھیں۔
''کیا ہوا اماں...... پیاری خالہ آپ کو کہاں مل گئیں؟'' سائرہ مصروف انداز میں گویا ہوئی تھی۔
''وہیں آئی ہوئی تھیں اچھے میاں کے ہاں...... پہلے تو مجھے دیکھ کر ایسی بن گئیں جیسے دیکھا نہ ہو۔میں نے قریب جا کر کہا خالہ مجھے پہچانا نہیں؟ تو کہنے لگیں میری دور کی نگاہ کمزور ہے۔حالانکہ نگاہوں پر ایسے موٹے شیشوں کا عینک لگا رکھا تھا کہ وہ عورت کی بجائے بھینس کی آنکھیں لگ رہی تھیں۔میں نے کہا خالہ سنا ہے تم نے محل جیسا گھر بنایا ہے، بڑے چرچے ہو رہے ہیں برادری میں تمہارے گھر کے، میں دیکھنے آؤں گی۔تو پتہ ہے کیا کہنے لگیں؟''
''کیا؟''
''کہنے لگیں ابھی تو ہمارے پاس فرصت نہیں ہے۔جب بھی فرصت ہو گی تو آ جانا مگر اطلاع کر کے آنا۔جہاں ہم رہ رہے ہیں وہاں یہ رواج نہیں ہے کہ جب جس کے ہاں چاہا منہ اٹھا کر چل دیئے۔وہاں آنے سے پہلے خبر کی جاتی ہے کہ ہم آ رہے ہیں تاکہ کوفت و پریشانی سے بچا جائے اور صاف بات یہ ہے کہ میرے بیٹوں کو پرانے ملنے جلنے والے رشتے داروں سے ملنا پسند نہیں ہے۔ایک بار گھر دیکھنے آتے ہیں دوسری بار پیسہ مانگنے۔''
''ارے اماں! پیاری خالہ تو بہت ملنسار و ہمدرد طبیعت کی مالک تھیں۔ایک دم سے اتنی بے مروت و بد لحاظ کس طرح بن گئیں؟''
''یہ سب اس نگوڑے پیسے کی پٹی ہے جو ان کی آنکھوں پر بندھ گئی ہے۔خیر میں نے بھی کون سی کسر چھوڑی۔وہ اگلی پچھلی کھولی کہ اسے اپنی اوقات یاد آ گئی۔''
''کیا ضرورت تھی اماں فضول میں کسی کے منہ لگنے کی؟''
''میں کیوں کسی کے منہ لگنے لگی۔وہ جو بدلحاظی منہ در منہ بکواس کر رہی تھی۔کل ہمارے برابر پڑوس میں رہ رہی تھی تو ہم بڑے اچھے لگ رہے تھے۔رات دن کچھ نہ کچھ مانگنے چلی آتی تھی بلکہ اکثر میں یا اصغر اس کا راشن بھرواتے تھے۔''
''ہائے اللہ اماں...... تم نے ایسی باتیں بھی بول دیں؟'' سائرہ کا انداز استعجابیہ تھا۔
زرینہ فخر سے گویا ہوئیں۔''ارے باتیں؟ میں نے ایسے ایسے طعنے دیئے کہ چھپنے کے لئے شرم سے جگہ بھی نہ ملی۔بڑی بڑی باتیں بگھار رہی تھیں۔جس پڑوسن کو فخر سے

ساتھ لے کر آئی تھیں، ان کی اصلیت سن کر وہ بھی دنگ رہ گئی۔ اب دیکھنا امیروں کے محلے میں اس نے خود کو خاندانی امیر بتایا تھا کل تک دیکھنا سب کو ان کی اصلیت معلوم ہو جائے گی۔ عورتیں امیر گھرانے کی ہوں یا غریب گھرانے کی عادت سب میں مشترکہ ہوتی ہے۔ چغلی کھانے کی، گھر گھریات پھیلانے کی۔"

"بہت برا ہوا...... تمہیں اس طرح نہیں کرنا چاہئے تھا اماں! ایک تو تم ان کی رازکی باتیں بتا کر گناہ گار ہوئیں۔ پھر ان پر کئے گئے احسانات گنوا کر وہ نیکیاں بھی ضائع کر ڈالیں جو احسان کے بدلے میں ملی تھیں۔"

"ارے چھوڑو تم تو بس مجھے ہی سمجھاتی رہا کرو۔ ہائے یہ کیا یہ تمہارا بیگ کیوں تیار رکھا ہوا ہے؟ کہاں جارہی ہو؟" باتیں کرتے کرتے معاً ان کی نگاہ کمرے کے وسط میں رکھے سیاہ چرمی بیگ پر پڑی تو وہ استعجابیہ انداز میں اس کی طرف دیکھ کر گویا ہوئیں۔

"میں جارہی ہوں اماں!"

"تم جارہی ہو...... مگر کہاں؟"

"جہاں سے آئی تھی، باقر کے ہاں۔" اسے اپنی آواز خود ہی ازحد دھیمی کھوکھلی لگی۔ جب کے زرینہ سٹپٹا کر گویا ہوئیں۔

"دماغ تو نہیں خراب ہو گیا تیرا؟ میں تجھے جانے نہیں دوں گی۔"

"مجھے مت روکو اماں!" وہ اٹھ کر ان کے سینے سے لگ کر رو دی۔

"باقر کا فون آیا تھا۔ وہ کہہ رہے ہیں پرسوں تک میں رقم لے کر ان کے پاس نہ پہنچی تو وہ...... مجھے...... طلاق دے دیں گے...... اور دوسری شادی کرلیں گے۔"

"آسان کام ہے کیا طلاق دینا؟ اور کون اس کے کرتوت دیکھ کر اپنی بیٹی دے گا؟ یہ تو میں ہی عقل کی اندھی تھی جو اپنی بیٹی بلا کسی چھان پھٹک کے ان حریص لوگوں کو دے دی۔"

"اس دور میں ہر کسی کو لڑکیاں مل جاتی ہیں خواہ وہ چور ہو، قاتل ہو یا ڈاکو اسمگلر، رشتوں کی قلت، عدم دستیابی کے باعث ماں باپ وقتی طور پر آنکھوں پر پٹی اور ہونٹوں پر قفل ڈال لیتے ہیں۔ انہیں جلد از جلد اس فرض سے سبکدوش ہونا ہوتا ہے خواہ بعد میں وہ بوجھ مزید وزنی ہو کر دوبارہ ان کے سینوں پر ہمیشہ کے لئے جم جائے۔

یہ اس معاشرے کی بدنصیب بیٹیوں کا المیہ ہے۔

باقر کے متعلق سب جانتے ہیں، ان کی بدحرام اور کاہل فطرت کو جاننے کے باوجود ان کے سگے چچا اپنی بیٹی دے رہے ہیں جو رشتوں کی آس میں انتظار کرتے کرتے چالیس کے ہندسے عبور کر چکی ہے اور باقر سے سات سال بڑی ہے۔"

"چالیس سال کی بڑھیا سے شادی کرے گا؟"

"وہ چالیس لاکھ بھی تو لائے گی جہیز میں ساتھ۔"

"ارے لعنت ہو ایسے جہیز اور دولت پر۔ لو بھلا اپنی ماں کی عمر کی عورت سے شادی کرے گا وہ بدبخت۔ میرا دل نہیں مانتا۔ یہ اس کی چال ہے۔ میں تمہیں نہیں جانے دوں گی۔" وہ جوش و غصے سے اٹھی تھیں اور اس کا بیگ اٹھا کر اسٹور میں رکھ آئی تھیں۔

□●□

کس قدر اذیت ناک ہوتا ہے اپنی ذات کی نفی کرنا، خلاف سرشت وہ کام کرنا جس کو دل نہ مانتا ہو۔ ایک ایسے شخص کی ہمراہی قبول کرنا جس سے کوئی قلبی وابستگی نہ ہو لیکن جو حیات کا مالک بن بیٹھا ہو۔

کار تیزی سے سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ سڑک کے ایک طرف کھیتوں کا سلسلہ تھا اور دوسری جانب میدان، ٹوٹی چھوٹی پہاڑیاں یا جھونپڑیاں تھیں۔ دوسری جانب منظر بدل رہے تھے۔ ایک طرف مسلسل کھیتوں کا سلسلہ جاری تھا۔ ہر سو خاموشی و گمبھیر اداسی چھائی ہوئی تھی۔

ایسی بے معنی خاموشی و بے نام اداسی خواہ مخواہ ہی من کو بوجھل، طبیعت کو بےکل کر ڈالتے ہیں۔ وہ بھی اس کی لپیٹ میں آ گئی تھی۔ گزرا ہوا وقت تیزی سے نگاہوں میں گھومنے لگا تھا۔

پاپا کی بے مثال محبت، چاہت کے بے شمار مناظر اس کی نگاہوں میں گھومنے لگے تھے۔

جوجو کی بے قراریاں، جنوں، عشق، اسے پالینے کی تدبیریں، رافعہ آنٹی کی محبت، اس کے ناز اٹھانے کے انداز، منظر نگاہوں میں اس طرح ہی بدل رہے تھے جیسے ٹی وی اسکرین پر ایک کے بعد ایک منظر بدلتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں دھواں بھرنے لگا۔ یادوں کا۔ ان کے قریب تھی تو اسے ان سے بہت ساری شکایتیں بھی تھیں۔ کئی موقعوں پر وہ پاپا سے خفا ہوئی تھی۔

جوجو سے اکثر لڑائی ہو جاتی تھی۔ اپنی غلطی نہ ہونے کے باوجود وہ اسے منایا کرتا تھا۔ وہ بہت پرواہ کرتا تھا اس کی۔ ازحد خیال رکھتا تھا، بے حساب چاہت لٹاتا تھا۔

رافعہ آنٹی بھی بہت چاہتی تھیں حالانکہ اس نے کافی بدتمیزی ان سے کی اور کئی بار کی۔ وقتی طور پر انہوں نے بھی کوئی لحاظ مروت نہ برتی تھی لیکن اب وہ جس والہانہ محبت سے ملی تھیں اور اسے کھو کر جس ندامت و گہرے دکھ کا اظہار انہوں نے کیا تھا ان احساسات نے اس کے دل پر چھائی تمام کدورت و بے اعتنائی کی دھند صاف کر ڈالی تھی۔ وہ اس کے لئے وہی پہلی والی آنٹی بن گئی تھیں۔ کبھی کبھی پرانی یادیں اتنی اچھی لگتی ہیں جیسے سخت حبس کے موسم میں یکدم ہی ٹھنڈی عطر بیز ہوائیں گنگنانے لگیں۔

یادوں میں اتنا سوز کیوں ہوتا ہے؟

جو چھن جاتا ہے وہ متاع حیات کیوں محسوس ہونے لگتا ہے؟

جو پڑاؤ ہم چھوڑ آتے ہیں، زندگی پلٹ کر اس جانب کیوں جانا چاہتی ہے؟

محبت اگر شمار کرنا تو عداوتیں بھی شمار کرنا

جو میرے خلاف کی گئیں وہ سازشیں بھی شمار کرنا

تم اپنی مجبوریوں کے قصے بھی ضرور لکھنا وضاحتوں سے

جو میری آنکھوں میں جل بجھی ہیں

وہ حسرتیں بھی شمار کرنا

شاہ ویز نے کار ڈرائیو کرتے ہوئے کئی بار اس کی جانب اچٹتی نگاہ سے دیکھا اور محسوس کیا وہ یہاں ہوتے ہوئے بھی موجود نہیں تھی۔

"تم اس وقت یہی سوچ رہی ہو میری جگہ جوجو ہوتا تو یہ سفر کس قدر حسین اور خوشگوار ہوتا...... ہے نا؟" اس کی سنجیدہ آواز مشعل کو سوچوں کے بھنور سے کھینچ لائی۔ اس نے چونک کر اس کی جانب دیکھا تھا۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا جیسے اس نے کوئی اچھی بات کہی ہو مگر اس کے ٹھنڈے لہجے میں ایسی ہی آگ تھی جس طرح سمندر میں شعلے بھڑک رہے ہوں۔ پانی اور آگ کا ملاپ ہر ذی روح، ذی شعور کو چونکا ڈالتا ہے۔ مشعل بھی متحیر زدہ تھی۔

وہ کس طرح اس کی سوچوں تک رسائی پا جاتا ہے؟

گو کہ جوجو کا ساتھ وہ اس وقت نہیں چاہ رہی تھی پھر بھی سوچیں ان لوگوں کے اردگرد ہی گھوم رہی تھیں۔

شاہ ویز نے اس کی جانب دیکھا۔ مشعل نے اس کے طنز کا کوئی جواب نہیں دیا تھا مگر اس کے رنگ بدلتے چہرے نے اس کے لبوں پر تمسخرانہ مسکراہٹ سی نمودار کی تھی۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر کیسٹ پلیئر آن کر دیا۔

اقبال بانو کی پُرسوز آواز جادو پھیلانے لگی۔

دشت تنہائی میں اے جان جہاں

لرزاں ہیں تیری پلکوں کے بھیگے ہوئے رخسار

دشت تنہائی میں......

مشعل نے گھبرا کر شاہ ویز کی جانب دیکھا تھا۔ وہ بھی اس وقت اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔ دونوں کی نگاہیں ٹکرائیں۔ ازحد پُرسکون چہرے پر بے حد چمکتی روشن براؤن آنکھوں میں کوئی البیلا، انجانا، ان دیکھا جذبہ پنہاں تھا۔ دھیمی سرخی نمایاں تھی۔

اس سرد مزاج، کم سخن شخص کی بولتی آنکھیں عجیب سا سوز، ان کہا سا دکھ لئے ہوئے تھیں۔ اور بھی بہت کچھ تھا ان نگاہوں میں۔ مشعل نے گھبرا کر نہ صرف آنکھیں جھکائیں بلکہ تیزی سے رخ بھی موڑ لیا تھا۔

اٹھ رہی ہے کہیں قربت سے تیری سانسوں کی آنچ

اپنی خوشبو میں سلگتی ہوئی مدھم مدھم

دور افق پار چمکتی ہوئی قطرہ قطرہ

گر رہی ہے تیری بے داغ نظر کی شبنم

دل بری طرح دھڑکے جا رہا تھا۔ ایسا پہلی بار تو نہیں ہوا تھا کہ اس نے صنف مخالف سے آنکھیں چار کی ہوں۔ شادی سے قبل وہ سب سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کی عادی تھی۔

جوجو، مائیکل، سیفی، اے جے، ابرار، پیٹر، راجیش...... اس کے دوستوں کی فہرست طویل تھی۔

لڑکیوں سے وہ فرینڈشپ کرنے کی عادی نہ تھی۔ جوجو کا ساتھ زیادہ رہا تھا اور اس کی سنگت میں بھی ایسا کوئی لمحہ نہ آیا تھا جس نے اس کا دل دھڑکا ڈالا ہو بلکہ کسی بات پر وہ ہی جوجو یا کسی فرینڈز کو گھورتی تو وہ گڑبڑا کر نگاہیں چرا لیتے تھے۔

دشت تنہائی میں اے جان جہاں
کس قدر پیار سے اے جان جہاں رکھا ہے
دل کے رخسار پر......

اس نے ہاتھ بڑھا کر کھٹاک سے کیسٹ پلیئر بند کر دیا۔
ماحول میں پھیلی ہوئی اداسی و ویرانی پہلے ہی اسے ڈسٹرب کیے ہوئے تھی۔ مستزاد غزل نے اداسیوں کو مزید سوا کر ڈالا تھا۔
اس نے وحشتوں سے گھبرا کر ٹیپ آف کر دیا تھا۔
''کیا ہوا......؟'' شاہ ویز نے استعجابیہ لہجے میں دریافت کیا۔
''مجھے پسند نہیں ہے اس طرح کی میوزک۔'' اپنے دل کی حالت کس طرح عیاں کرتی۔
''اوہ...... تمہیں تو وہ کان پھاڑ دینے والی، دل دہلا دینے والی میوزک پسند ہے جس کے سارے سُر بے سُرے ہوتے ہیں بلکہ سُر ہی نہیں ہوتے۔''
''میں سُر اور سنگیت نہیں جانتی۔ صرف اتنا کہہ سکتی ہوں کہ ایسی میوزک مجھے پسند نہیں جو موڈ فریش کرنے کے بجائے پزل کر دے۔'' بہت دھیمے، بہت آہستگی سے اس نے وضاحت کی تھی۔ ورنہ وہ چھ کے لگائے جاتا۔
''میں اس فقرے پر یقین نہیں رکھتا کہ موسیقی روح کی غذا ہے، بلکہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے میں اتنا کہوں گا کہ تلاوت قرآن روح کی غذا ہے اور ہماری زندگی کے لیے سکون و اطمینان بھی۔ البتہ کبھی کبھی لائٹ میوزک اچھی لگتی ہے۔ اگر شاعری اچھی ہو تو سماعت پر خوشگوار اثر پڑتا ہے۔ بعض اوقات تو ایسا بھی محسوس ہوتا ہے جیسے ہمارے دل کی آواز شعروں میں ڈھل رہی ہے۔ پھر ہم اس سحر میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔''
''ابھی کتنی دور کا راستہ باقی ہے؟'' اس کے لہجے میں تھکن تھی۔
''تین چار گھنٹے تو لگیں گے۔''
''اوہ...... کوئی شارٹ کٹ وے نہیں ہے؟''
''ہاں ہے...... مگر وہاں جرائم پیشہ افراد گھات لگائے بیٹھے رہتے ہیں جو موقع ملتے ہی مسافروں کو لوٹ لیتے ہیں اور اگر کوئی ٹھیک ٹھاک لوگ مل جائیں تو اغوا کر لیتے ہیں اور تاوان لے کر چھوڑتے ہیں۔ اگر کہو تو وہاں لے چلوں؟''
''نن...... نہیں...... مجھے ڈاکو، چوروں سے بڑا ڈر لگتا ہے۔ ہم اسی راستے سے چلیں گے، خواہ زیادہ ٹائم لگ جائے۔'' وہ خوف سے جھرجھری لے کر گویا ہوئی۔ شاہ ویز زیر لب مسکرا رہا تھا۔
سفر خاموشی سے جاری تھا۔
تھرماس میں کافی ختم ہو چکی تھی۔ شاہ ویز کو چائے کی طلب شدت سے ہونے لگی تو اس نے کار جھونپڑی نما ہوٹل کے سامنے روک دی تھی۔
ابھی وہ اس کا مقصد صحیح طور پر سمجھ نہ پائی تھی کہ وہ ڈرائیونگ ڈور کھول کر باہر نکل گیا۔
سفید چمکتی ہوئی لمبی کار وہاں رکتی دیکھ کر ہوٹل سے ایک نوعمر لڑکا بڑی مستعدی سے آگے بڑھا تھا اور ماتھے تک ہاتھ لے جا کر شاہ ویز کو سلام کیا تھا۔
''چائے تو لے آؤ ذرا زوردار قسم کی۔'' سلام کا جواب دینے کے بعد شاہ ویز مسکرا کر اس لڑکے سے مخاطب ہوا تھا۔
لڑکا جس تیزی سے آیا تھا اس سے بھی زیادہ پھرتی سے واپس گیا تھا۔
''چائے پیو گی نا؟'' وہ کھڑکی سے جھانک کر اس سے مخاطب ہوا تھا۔ اس کی نظریں مشعل کے چہرے پر تھیں۔
سرخ و سیاہ امتزاج کے سوٹ میں اس کی شفاف رنگت دمک رہی تھی۔ غصے، ضد، جھنجھلاہٹ، بدتمیزی، خودسری، ہٹ دھرمی، تمنفر و غرور سے پاک انداز چہرے پر اس قدر نرمی و دلکشی پھیلائے ہوئے تھا کہ وہ بلا ارادہ اسے دیکھے رہا تھا۔
''ہم...... یہاں کی چائے پئیں گے؟'' اس کے لہجے میں کراہیت تھی۔
''ہاں...... وہ جو سامنے چائے پی رہے ہیں۔'' اس نے انگلی سے ان لوگوں کی جانب اشارہ کیا جو سامنے چارپائیوں اور لکڑی کے بینچوں پر بیٹھے چائے پی رہے تھے اور جن میں سے زیادہ تر لوگوں کی نظریں ان کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ ''وہ انسان نہیں ہیں یا ہم؟'' وہ چیچھے تیتے ہوئے کاٹ دار لہجے میں بولا تو اس نے خاموشی سے ہونٹ بھینچ لیے۔
لڑکا اپنے ساتھ دوسرے لڑکے کو بھی لایا تھا جس نے سلور کا بدرنگ جگ پکڑا ہوا تھا اور ساتھ ہی چوڑے منہ والے ڈھب گلاس بھی اس بچے کے ہاتھ میں دیا ہوا تھا۔
دوسرے لڑکے کے ہاتھ میں پلاسٹک کی ٹرے میں دو پلیٹیں رکھی تھیں جن میں ایک میں کیک پیس اور دوسری میں زیرے کے بسکٹ تھے۔ ساتھ ہی دو صاف ستھرے کپ ساسر پر رکھے تھے جن میں بھاپ اڑاتی چائے تھی۔
''میں چائے نہیں پیوں گی۔''
چائے کے معمولی برتن، چائے لانے والے بچوں کا حلیہ اس کی نفاست پسندی و نازک مزاجی کبھی ہضم نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے قطعی انکار کر دیا تھا اور شاہ ویز نے بھی اصرار کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ وہیں قریب پڑی ٹوٹی پھوٹی کرسی میز پر بیٹھا اطمینان سے چائے کے ساتھ کیک پیس کھا رہا تھا۔ قریب ہی وہ دونوں بچے کچھ شرما کر، مسکرا کر باتیں کر رہے تھے۔ یقیناً ان سے وہ انٹرویو لے رہا تھا اور اس سے اس کی مسکراہٹ ہونٹوں پر گویا چپک کر رہ گئی تھی اور چہرے پر بھی بڑی نرم و روشن مسکراہٹ تھی۔ بہت دوستانہ تھا اس کا انداز۔ مشعل کار کی فرنٹ سیٹ پر بیٹھی دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی۔
''کتنی سوٹ کرتی ہے اس پر یہ نرم مزاجی و خوش دلی۔ کیسا روشن روشن ہو جاتا ہے سراپا۔ کوئی اس شخص کا وہ روپ دیکھے تو یقین نہ کرے کہ اتنا مہذب و خوش مزاج شخص اس قدر بددماغ، منہ زور اور ہاتھ چھوٹ بھی ہو سکتا ہے۔''
اس کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ سامنے وہ اس کی سوچوں سے بے خبر مگن بیٹھا چائے پی رہا تھا۔
آدھا گھنٹہ ہو چکا تھا اسے اندر بیٹھے انتظار کرتے ہوئے جب کہ شاہ ویز بڑی بے فکری سے اندر ہوٹل میں چلا گیا تھا اور وہاں لوگوں سے باتیں کرتا ہوا صاف دکھائی دے رہا تھا۔ آدھا گھنٹہ گزر جانے کے باوجود بھی وہ نہ آیا تو اس کا صبر جواب دے گیا۔ اس نے دو مرتبہ ہارن بجانے کے بعد تیسری مرتبہ ہاتھ نہ ہٹایا۔
''دماغ خراب ہو گیا ہے کیا تمہارا؟ ہاتھ ہٹاؤ۔'' وہ آتے ہی غرایا تھا۔
''مجھے یہاں بٹھا کر وہاں آرام سے بیٹھے باتیں بنا رہے ہو۔ ابھی نہ معلوم کتنا سفر باقی ہے اور تمہیں کوئی فکر ہی نہیں۔ ہر جگہ تمہیں اپنی کیٹگری کے لوگ مل جاتے ہیں۔'' کار کے ساتھ ساتھ اس کی بڑبڑاہٹ بھی شروع ہو گئی تھی۔
''انسان ہوں، انسانوں سے ہی روابط بڑھانے میں سکون محسوس کرتا ہوں۔ کیٹگری کبھی میرا کمپلیکس نہیں رہی۔ جو چاہتوں کے اسیر ہوتے ہیں وہ مادیت پسند نہیں ہوتے۔ کیا ملتا ہے انسان کو زر، زمین، جائیداد حاصل کر کے؟ سب یہیں رہ جاتا ہے۔ کچھ بھی تو ساتھ نہیں جاتا۔ پھر کیوں یہ کیٹگریاں بنائی جاتی ہیں، میری سمجھ میں نہیں آتا۔''
''اس شخص سے کچھ کہنا ہی فضول ہے...... فوراً تقریر شروع کر دیتا ہے۔'' اس نے جل کر سوچا تھا اور خاموشی میں ہی عافیت جانی تھی۔

□●□

خرم کا بیٹا عرفان آج کل آیا ہوا تھا۔ اس دن خرم گھر میں تھے۔ وہ سارا دن بیٹے کا انتظار کرتے رہے کہ وہ ان سے ملنے آئے گا۔ ان کی شادی کو چھ ماہ ہو چکے تھے اور وہ اس سے بھی کئی ماہ قبل ملے تھے اور ان کی شادی کے بعد تو انہوں نے احتجاجاً اس سے فون پر بات کرنی بھی چھوڑ دی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ ان کے باپ نے دوسری شادی کر کے نہ صرف ان کی معاشرے میں بے عزتی کی ہے بلکہ ان کی مری ہوئی ماں سے بھی بے وفائی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ تیسری اور اہم بات جو انہیں مشتعل کر گئی وہ یہ تھی کہ ان بہن اور بھائی کی جائیداد میں تیسری ہستی شامل ہو گئی تھیں جو زیادہ گراں ثابت ہوئی تھی۔
ابھی بھی ان کی یہی شرط تھی کہ وہ حرا کو طلاق دے دیں تو وہ اپنی ناراضگی بھلا کر ان سے ملنے لگیں گے ورنہ وہ ان سے نہیں ملیں گے۔ خرم صاحب کو پہلے ہی بچوں کی خود غرضی و بے حسی سے شکایت تھی اور اب تو وہ ان کا بدلحاظ و بے ادب روپ خوب اچھی طرح دیکھ چکے تھے لہٰذا انہوں نے بھی ان کی فکر کرنا چھوڑ دی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ عرفان کی آمد کی خبر سن کر دل میں باپ ہونے کے ناتے ایک موہوم سی امید کی کرن جاگی تھی کہ شاید اتنے عرصے کی جدائی ان کے اندر کوئی محبت کی تڑپ جگا دے مگر سارا دن اپنے کمرے میں انتظار کرنے کے بعد انہوں نے بھی کوشش نہ کی باہر نکل کر اس سے ملنے کی۔
وہ ازحد خوددار، ضدی و باوقار اور با اصول انسان تھے۔ بے تحاشا دولت نے انہیں لاپرواہ اور کسی کو خاطر میں نہ لانے والا بنا ڈالا تھا۔
بزنس کے سلسلے میں ایک ہفتے کے لیے انہیں نیپال جانا تھا اور جانے سے قبل انہوں نے بہت سوچا کہ وہ بھی ساتھ چلی جائیں مگر وہ امی حضور کو چھوڑ کر جانے کے لیے راضی نہ تھیں۔ سو وہ بے دلی سے انہیں یہیں چھوڑ گئے تھے اور جاتے جاتے سمجھا گئے تھے کہ وہ عرفان سے بالکل گفتگو نہ کریں، جب اسے توفیق نہ ہوئی کہ سوتیلی ہی سہی ماں سمجھ کر سلام کرنے آ جاتا حالانکہ اسی گھر میں رہ رہا تھا۔ امی حضور کی بیماری کے دنوں میں ان کی تیمارداری کرنے سے وہ اور اس کی بیوی صاف انکار کر چکے تھے۔ اب امی حضور سے خوب خاطریں کروا رہا تھا۔
وہ جواب میں خاموش رہی تھی۔ خرم چلے گئے۔ وہ تنہا ہو گئی اور موقع دیکھ کر امی حضور کے کمرے میں آ گئی۔ اسے دیکھتے ہی وہ شکایتی لہجے میں گویا ہوئیں۔
''خوب رہی بہو بیگم...... کوئی مہمان بن کر تمہارے گھر آئے اور تم اتنی مصروف کہ مہمان داری تو ایک طرف، رواداری نبھانا بھی گوارا نہ کرو۔''
''مجھے احساس ہے امی حضور! لیکن خرم کی اجازت نہیں ہے۔ وہ بہت خفا ہیں عرفان سے کہ اتنے عرصے بعد آنے کے باوجود بھی وہ ان سے ملنے نہیں آئے۔ کتنا انتظار کیا

تھا۔'' ان کے قریب بیٹھتے ہوئے وہ لجاجت بھرے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

''کوئی انہونی بات تو نہیں ہوئی۔ اگر عرفان ملنے نہیں گیا تھا تو خرم خود آجاتے بیٹے سے ملنے۔ آخر بیٹا دوسرے شہر سے طویل عرصے بعد آیا ہے۔''

''امی حضور! یہی بات آپ عرفان کو سمجھاتیں تو زیادہ مناسب ہوتا۔''

''آخر آگئی نہ وہی سوتیلے اور سگے والی بات۔ سوتیلی ماں ہونا، کس طرح سوتیلے بیٹے کی طرف داری کرسکتی ہو۔ خاوند کو سمجھایا نہ گیا کہ ذرا ناک نیچی کرکے بیٹے کو منائے۔ کیا باپ آکر بیٹے کا ہاتھ پکڑتا تو بیٹا باپ سے ملتا نہیں؟ وہی بات ہوئی کہ باپ کو پرواہ کہاں ہے، انہیں بیوی مل گئی اب کسی اور کی انہیں کیا ضرورت ہے؟'' آج تو ان کے تیور ہی بدلے ہوئے تھے۔ جن لبوں سے پھول جھڑا کرتے تھے ان سے انگارے نکل رہے تھے۔ وہ دم بخود سی بیٹھی تھی۔

''اگر تم چاہتیں تو وہ عرفان سے مل سکتا تھا۔ مرد تو ایسے ہی لاپرواہ و بے نیاز ہوتے ہیں۔ یہ عورت کا کام ہوتا ہے کہ اپنے مرد کو رشتوں کی سمجھ بوجھ دے۔ مرد عورت سے رشتوں، ناتوں کے بارے میں جانتا ہے۔'' آج تو ان کی جون ہی بدلی ہوئی تھی۔

وہ ہونقوں کی طرح امی کی شکل دیکھ رہی تھی۔ انسان تو وقت سے بھی زیادہ تیزی سے بدلتا ہے۔ ان کی منطق لڑائی و فلسفہ بعید از عقل تھا۔

عورت ہو یا مرد، اس کی پہلی درس گاہ ماں کی آغوش ہوتی ہے۔ وہیں سے وہ اچھے برے کی تمیز، اخلاق و آداب کو سمجھتا ہے، اپنے پرائے کا فرق جانتا ہے۔ دور اور قریب کے رشتوں سے واقفیت و انسیت حاصل کرتا ہے۔ اس کی شخصیت کی بنیاد ماں کی پرورش رکھتی ہے۔ وہاں سے ہی ماں کے، ایک عورت کے، ایک مستقبل کے مثبت و منفی رویوں کا آغاز ہوتا ہے جو آگے چل کر اس کی شناخت بنتا ہے۔

عورت کا کام مرد کو رشتوں سے باور کرانا نہیں ہوتا بلکہ ہر ماں کی یہ ذمہ داری ہے اسے ہی ایک نسل کو پروان چڑھانا ہوتا ہے۔ وہ جس نہج کی ہوگی، وہی تربیت بچوں کو دے گی۔ پھر وہ جس کو خرم کی زندگی میں داخل ہوئے ایک سال بھی نہ ہوا تھا، ابھی وہ ان کی مزاج کی باریکیوں سے ناواقف تھی۔ صرف ان کے ماننے کی مجاز تھی۔ کس طرح ان کی ذہنی رو بدل سکتی تھی۔ وہ کسی کو خاطر میں لانے والے بھی نہ تھے اور اس سے زیادہ باپ و اولاد کا رشتہ سمجھنے والے تھے۔ ازحد کروفر و دبدبہ تھا ان کی شخصیت میں۔ وہ خود بہت سنبھل کر گفتگو کرتی تھی۔ مبادا ان کا موڈ خراب نہ ہو جائے۔ ان کو سمجھانے یا بتانے کی پوزیشن میں ابھی کہاں، کبھی نہیں ہوسکتی تھی۔ وہ امی حضور کے تلخ رویے سے خائف ہوگئی تھی۔ ان کی ہر بے تکی بات و بے جا اعتراض کا منہ توڑ جواب دینے کی صلاحیت رکھتی تھی مگر ان کی عزت دل سے کرتی تھی۔ اسی لئے خاموش بیٹھی تھی۔

''آپ ملول نہ ہوں امی حضور! کوتاہی ہوگئی مجھ سے...... معاف کردیجئے۔'' اس نے انہیں راضی کرنے کے لئے سچ مچ ہاتھ جوڑ دیئے تو ان کا موڈ بہتر ہوا۔

''میں نے جو کچھ کہا تمہیں برا ضرور لگا ہوگا۔''

''نہیں نہیں امی حضور! آپ میری بڑی ہیں...... میری بزرگ ہیں...... بھلا میں آپ کی بات کا برا کیسے مانوں گی؟'' اس کے شفاف لہجے میں سچ چمک رہا تھا۔

''میں تمہارا برا نہیں چاہتی اور چاہتی ہوں کہ اس گھر میں اچھی طرح اپنے قدم جمالو تو بہتر ہے۔ کیونکہ تمہاری حیثیت سوتیلی ماں ہونے کی وجہ سے بڑی نازک ہے۔ اگر تم خرم کی پہلی بیوی بن کر آتیں تو کوئی مسئلہ نہ تھا۔ وہ تمہارا ہم عمر ہوتا اور بچے بھی سگے ہوتے تو تمہیں اس گھر سے کوئی بے دخل کرنے کی جرأت نہ کرتا۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ خرم نے اس عمر میں شادی کی ہے۔ کب اس کا مزاج بدل جائے بھروسہ نہیں ہے۔ پھر اولاد کا دباؤ اس پر مسلسل ہے کہ وہ تمہیں طلاق دے گا تو وہ باپ سے ملیں گے ورنہ نہیں۔ اب وہ تمہارے اور اولاد کے درمیان میں رسہ کشی کا شکار ہوگیا ہے اور جہاں تک میرا خیال ہے اس عمر میں وہ تمہاری خاطر اولاد کو نہیں چھوڑ سکتا۔''

''یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟'' طلاق کا نام حرا کے ہوش و حواس درہم برہم کرگیا۔

''جو سچ ہے تم نے دیکھا نہیں۔ ایک گھر میں رہتے ہوئے خرم نہ عرفان سے ملنے آیا اور نہ ہی عرفان باپ کے پاس گیا۔ کچھ تو چل رہا ہے نا ان کے درمیان۔ ابھی خرم تم کو اہمیت دے رہا ہے مگر اس عمر کی محبت ڈھلتی دھوپ کی مانند ہوتی ہے

قبل اس کے کہ سب کچھ ختم ہو جائے، تمہیں سمجھ داری سے کام لینا ہوگا۔'' وہ گاؤ تکیوں سے ٹیک لگائے دھیمے لہجے میں اُسے سمجھا رہی تھیں۔ حرا نے ایسی دل دہلانے والی باتیں سن کر رونا شروع کردیا تھا۔

''ان بچوں سے راہ و رسم بڑھاؤ، انہیں اپنا سمجھو، ایسی آؤ بھگت کرو کہ وہ تمہارے عادی ہو جائیں۔ ایک طریقہ تحفے تحائف کے ذریعے محبت پیدا کرنا ہے، دوسرا خدمت، ملنساری۔ خیال رکھنا، آگے بڑھ کر ملنا سب کو ہی گرویدہ بنا ڈالتا ہے تم بھی یہی گر اپنا لو۔ ایک دفعہ بچوں کے دل میں جگہ بن گئی تو پھر کوئی مسئلہ نہ ہوگا۔''

''خرم ناراض ہوں گے۔'' وہ خود کو بھنور میں پھنسا ہوا محسوس کررہی تھی۔ امی حضور کی باتیں غلط نہیں تھیں۔ خرم اور عرفان کی اجنبیت و بیگانگی نے اسے بھی یہ سوچنے پر مجبور کردیا تھا کہ ان دونوں کے درمیان کوئی دیوار ہے اور اب معلوم ہوا وہ دیوار خود اس کی ذات ہے۔ اسے اپنا وجود اس طرح لگنے لگا جیسے ممنوع جگہ کار پارک کردی جائے۔ نو انٹری میں انٹری دے دی جائے یا کسی فٹ پاتھ پر ناجائز جگہ تعمیر کردی گئی ہو اور اب جس کے گرائے جانے کا خطرہ ہر دم بڑھتا جارہا ہو۔

وہ سمجھ نہیں رہی تھی خرم کی بات کا احترام کرے...... جو عرفان سے ملنے سے منع کرگئے تھے یا امی حضور کی ہدایتوں پر عمل پیرا ہو جن کی باتیں بھی غلط ہرگز نہ تھیں۔

''خرم کی ناراضگی کا خیال کرو یا اپنے گھر کا، فیصلہ تمہیں ہی کرنا ہے۔'' وہ کہہ کر اطمینان سے لیٹ گئیں۔ حرا نے پریشان نظروں سے ان کی طرف دیکھا تھا۔

❑●❑

''خالہ جان! السلام علیکم۔ اتنے عرصے بعد آئی ہیں۔'' سائرہ بے جی کو گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر خوشی سے دوڑ کر ان سے لپٹ کر گویا ہوئی۔

''بکھیڑوں نے ہی کچھ اس طریقے سے اپنی گرفت میں لے رکھا ہے کہ وقت ہی نہیں ملتا۔ ایک دوسرے کے پیچھے دن گزرتے چلے جاتے ہیں اور میں یہی سوچتی ہوں کہ کل چلی جاؤں گی۔ لیکن آج تو میں نے پکا ارادہ کرلیا کہ ہر حال میں یہاں آؤں گی اور دیکھ لو تمہارے سامنے کھڑی ہوں۔ دراصل ہم سوچتے ہیں وقت ہمارے اختیار میں نہیں رہا اور یہ صرف غلط فہمی ہے۔ ارادے کی مضبوطی، فیصلے کی طاقت ہم کو کبھی بھی شکست سے دوچار نہیں کرسکتی۔'' وہ اس کے ساتھ ہی پلنگ پر بیٹھ گئیں۔

''ارے یہ سورج آج کس سمت سے نکل آیا؟ ہم پر مہربانی کا خیال کیونکر ہوا؟ ہم غریب تمہیں کس طرح یاد آگئے...... تم تو ایسی بدل گئیں آپا کہ ہم تو تمہیں یاد ہی نہیں۔ گویا ہمیں صبر کرکے بیٹھ گئی ہو۔'' زرینہ باتھ روم سے غسل سے فارغ ہو کر نکلی تھیں اور بہن سے شکوے شروع کردیئے تھے۔

''اللہ کی پناہ زرینہ! تمہاری زبان کی رفتار نے تو درزی کی قینچی کو بھی مات کردیا ہے۔ بلا سوچے سمجھے جو منہ میں آتا ہے کہے چلی جاتی ہو۔ سوچتی سمجھتی کچھ نہیں ہو۔ اللہ تعالیٰ تمہیں درازی عمر دے، ایمان کے ساتھ۔'' بے جی نے خفگی سے انہیں ڈانٹا تھا۔

''آپا! جب دل جلتا ہے تو سمجھو عقل گھاس چرنے چلی جاتی ہے اور خیال اپنوں کا ہی آتا ہے۔ شکوہ غیروں سے نہیں کیا جاتا، سگوں سے ہی شکایت کی جاتی ہے۔'' تولیے سے بال خشک کرتی ہوئی وہ ناراض لہجے میں کہہ رہی تھیں۔

''شکوہ، شکایت کرو، برا بھلا کہو، مجھے اعتراض نہیں ہے۔ مگر اپنے لئے تو ایسے الفاظ استعمال نہ کرو جو مجھے تکلیف پہنچائیں۔''

''ارے آپا! تمہیں کون بد بخت برا بھلا کہہ سکتا ہے بلکہ برا کہے بھی تو تم ہی زیادہ باہمت اور صبر والی ہو، نہ معلوم اللہ نے مجھے تمہارے جیسی کیوں نہیں بنایا۔ تم بے اولاد تھیں سب سے زیادہ دکھ مجھے ہی تھا کہ میری بہن کی گود سونی ہے، اس کی کوئی اولاد نہیں، کوئی ماں کہنے والا نہیں۔ تم صابر تھیں، کبھی کوئی شکوہ تمہارے لبوں پر نہیں آیا۔ اور دیکھو اللہ نے تمہارے بند لبوں کی کیسی سنی، جیتا جاگتا ہونہار فرمانبردار بیٹا تمہاری جھولی میں ڈال دیا۔ بے شک تم نے اسے اپنی کوکھ سے جنم نہیں دیا لیکن تمہارا اور شاہ ویز کا رشتہ کس قدر مضبوط ہے، کتنا احترام کرتا ہے تمہارا، کس قدر محبت کرتا ہے، کتنا خیال رکھتا ہے۔ اور ایک ماں کو ان محبتوں کے علاوہ کیا چاہئے۔ ایسے جاں نثار رویوں کی توقعات تو ہوتی ہیں۔ اب میں اتنی ہی خوش ہوں تمہارے بے اولاد ہونے پر، دوسروں کا خون تمہیں اپنے بچے سے بڑھ کر محبت دے رہا ہے، بہت خوشی کی بات ہے۔ ورنہ اولاد والی آج کل کے دور میں اولاد کی بے اعتنائی و بے رخی کی دردناک مار سہہ رہی ہے۔ مجھے ہی دیکھ لو، بیٹیاں ہیں، ان کی طرف سے بھی کبھی کوئی نہ کوئی فکر پریشانی گھیرے رکھتی ہے۔ کبھی بڑی کے ساتھ کوئی مسئلہ، چھوٹی کے ساتھ کوئی الجھن، منجھلی کے لئے کوئی تردد۔ ان جھمیلوں سے فارغ بھی نہیں ہوتی ہوں کہ اکلوتے بیٹے کی طرف سے جلن لگی رہتی ہے۔ وہ ایک گھر میں رہتے ہوئے بھی نہ رہنے کے برابر ہے۔''

وہ بال سلجھا کر چوٹی باندھ کر ان کے قریب ہی بیٹھ گئی تھیں جبکہ سائرہ باورچی خانے میں چلی گئی تھی دوپہر کے کھانے کا انتظام کرنے۔

''تم دل چھوٹا نہیں کرو زرینہ! سب صحیح ہو جائے گا۔''

''میرا تو بہت ہی دل دکھی ہے آپا! بہو کی حرکتوں کی تمہیں سب خبر ہے اور اصغر کے کرتوت بھی میں نے تم سے چھپا کر نہیں رکھے کہ کس طرح بیوی اور سسرال والوں کو ماں کے مقابلے میں اہمیت دیتا ہے انہیں۔ الٹے سیدھے چکروں میں پڑ کر بیٹا کھو دیا ہے۔ عقل ابھی بھی نہیں آئی۔ اللہ لاٹھی لے کر تھوڑی مارتا ہے۔ اس کی مار تو ایسی ہی ہوتی ہے۔ انہوں نے میرا دل دکھایا ہے، اللہ نے میرا بدلہ لیا مگر ابھی بھی اپنی ہٹ دھرمی پر قائم ہیں۔ اصغر چپکے چپکے سائرہ سے کہتا ہے اماں کو راضی کرو کہ وہ جا کر فرح کو لے آئیں۔ وہ ضد باندھے بیٹھی ہے کہ جب تک اماں مجھے لینے نہیں آئیں گی میں نہیں جاؤں گی۔ میں بھی چپکے چپکے سنتی ہوں اور یہ سمجھتے ہیں میں انجان ہوں۔ سائرہ تو ہے ہی بدھو، فوراً اس کی باتوں میں آکر میرے پیچھے لگی رہتی ہے کہ اماں، بھابی کو لے آؤ، بھائی پریشان ہیں۔ گھر ایسا لگ رہا ہے، گھر ویسا لگ رہا ہے۔ اس کی جگہ کوئی تیز و طرار لڑکی ہوتی تو فوراً ہی بھائی کا گریبان پکڑ کر پوچھتی کہ بھابی کیا اماں کی اجازت سے گئی تھیں یا اماں نے اس کو گھر سے نکالا ہے جو اماں کے ساتھ واپس آئیں گی؟''

''خوب...... اب تم بہن سے بھائی کا گریبان پکڑواؤ گی؟ کچھ عقل کو ہاتھ لگاؤ۔'' بے جی نے سخت لہجے میں سرزنش کی۔

''ہائے آپا! زبان ہے، پھسل جاتی ہے۔'' انہیں خود اپنے جملے کا احساس ہوا تو خجل ہوگئیں۔ ''میرا منصوبہ ہے کہ اگر وہ مجھے کہے کہ اماں چلو فرح کو لے کر آئیں تو کیا میں اسے انکار کردوں گی؟ کیا مجھے احساس نہیں ہے بیٹے کی زندگی کی بے رونقی کا؟''

''تم ماں ہو، جتنا اچھا و بہتر تم اپنے بچوں کے لئے سوچ سکتی ہو ایسا کوئی بھی نہیں سوچ سکتا۔ ماں کے قدموں تلے جنت ایسے ہی تو نہیں رکھی گئی۔ بات ساری ہمارے گھریلو بنائے گئے ماحول کی ہوتی ہے، ذہنی قربت و اعتماد کی ہوتی ہے۔ بچوں سے ہمیں دوستی بھی رکھنی چاہئے، انہیں کہنے اور سننے کا موقع بھی دینا چاہئے تاکہ وہ اپنی چھوٹی بڑی ہر بات بلا جھجک ماں باپ سے کرسکیں، اپنی خوشی اور پریشانی بتا سکیں۔ ماں صرف ماں نہیں ہوتی، بہت سارے رشتے اس کی ذات سے وابستہ ہوتے ہیں۔

وقت پڑنے پر اسے یہ سارے رشتے نبھانے پڑتے ہیں اور پرسکون زندگی کا راز یہی ہے۔ اور تم نے اصغر کو بہت محبت دی، بے حد خیال رکھا لیکن ایک سخت مزاج ماں کی طرح۔ اگر تم کچھ دوستی کا رنگ بھی بھرتیں تو اسے تم سے چھپ کر تمہارے ہی لئے سائرہ سے سفارش نہیں کرنی پڑتی اور نہ ہی فرح کی ہمت ہوتی اس کے کان بھرنے کی۔ فی الحال جو کچھ ہوا اس سے سبق حاصل کرو، اپنے اندر تبدیلی لاؤ، عاجزی وانکساری، اچھے لہجے کی مٹھاس اور زبان کی شیرینی دشمنوں کو بھی دوست بنا ڈالتی ہے۔ پھر یہ تو تمہاری اولاد ہے۔ ان کا سلوک و رویہ بہت جلد بدلے گا۔"

"سوچوں گی ابھی میں۔ تم تو آپا ایسی ہی باتیں کرتی ہو ہمیشہ سے۔"

"بس اب اٹھ جاؤ، اب سوچنے کا وقت گزر گیا، عمل پیرا ہونے کا وقت ہے اور نیک کام میں دیر نہیں کرنی چاہئے۔ چلو، ہم بڑے ہیں اور بزرگی کا تقاضا یہ ہے کہ چھوٹوں کی غلطیوں کو معاف کر کے اپنے بڑے پن کا ثبوت دیا جائے۔ فرح کو لینے چلو میرے ساتھ۔"

انہوں نے گویا دھما کا کیا تھا۔ زرینہ اچھل کر کھڑی ہو گئیں۔

"میں اور اس کلموہی کو لینے جاؤں! کیسی باتیں کر رہی ہو؟"

"ہاں ...... اور میں اب کوئی بکواس نہیں سنوں گی تمہاری۔ نہ معلوم کیسا دماغ لے کر آئی ہو، کتنا سمجھا لو مگر سمجھ میں نہیں آتا تمہارے۔ بدعقل لوگوں کی طرح اپنی ضد پر اڑی رہتی ہو۔ ایسے لوگوں کو دشمن بنانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ خود اپنے دشمن ہوتے ہیں۔" بے جی کبھی کبھار ہی غصہ ہوتی تھیں اور ایسے میں کسی کی جرأت نہیں ہوتی تھی کہ ان کی بات سے روگردانی کر جائے۔ اس وقت بھی زرینہ جو بہت کچھ کہنے کا ارادہ رکھتی تھیں، خاموش ہو گئیں۔

"خالہ جان! بالکل صحیح کہہ رہی ہیں آپ ...... بھائی اور بھابھی کے بغیر اماں کون سی خوش رہتی ہیں۔ اکثر کسی نہ کسی بات میں اماں بھابھی کا ذکر ضرور کرتی ہیں۔ بھائی سے خواہ زیادہ بات نہیں کرتی مگر ان کی ہر ضرورت کا، کھانے میں ان کی پسند کا، ان کے آرام کا خیال انہیں رہتا ہے۔ اس کا یہی مطلب ہوا کہ یہ انہیں بہت چاہتی ہیں۔ بظاہر ناراضگی کی خشکی ہے مگر دل میں محبت کے چشمے اُبل رہے ہیں۔" سائرہ نے روٹی پکاتے پکاتے کچن کی کھڑکی سے جھانک کر ہنستے ہوئے کہا تو بے جی مسکرا کر بولیں۔

"میں جانتی ہوں، یہ دل کی بہت نرم اور اچھی ہے۔ بس تھوڑا زبان پر اختیار نہیں ہے ورنہ لاکھوں میں ایک ہے میری بہن۔"

"آپا! اب مجھے مکھن مت لگاؤ۔ ڈاکٹر نے چکنی چیزوں سے منع کیا ہے بلڈ پریشر کی وجہ سے۔ چل رہی ہوں فرح کو لینے آپ کے ساتھ۔" وہ روٹھی روٹھی مسکرائیں۔

"تم نہیں سدھرنا زرینہ!" بے جی بے ساختہ ہنس پڑی تھیں۔

"اب آخری وقت میں سدھر کر کروں گی بھی کیا۔ چل او سائرہ! جلدی سے میرا کوئی ڈھنگ کا سوٹ نکال کر استری کر دے۔ ہم کھانا کھاتے ہی نکلیں گے۔"

"اماں! میری نظروں میں تمہارا کوئی ڈھنگ کا سوٹ نہیں ہے۔ ایسا کرو بھابھی کے ولیمے کا شرارہ سوٹ یا شادی والے دن کا غرارہ سوٹ پہن جاؤ۔" ماں کو اپنی ضد توڑتے دیکھ کر سائرہ خوش ہو گئی تھی، سو شرارت سے گویا ہوئی۔

"مت ماری گئی ہے کیا تیری۔ تیری بھاوج کو لینے جا رہی ہوں کوئی تیرے لئے نیا باپ لانے نہیں جا رہی جو ایسی سج دھج کر جاؤں گی۔ سفید چکن کا سوٹ نکال دے۔"

انہوں نے تپ کر جواب دیا تھا اور سائرہ قہقہے لگانے لگی تھی۔

"زرینہ! تمہیں کبھی سوچ سمجھ کر بولنا نہیں آئے گا۔" بے جی نے سر پکڑ کر کہا۔

❐●❐

سفر طویل ترین ثابت ہوا تھا اور جب رات کے ڈیڑھ بجے وہ مطلوبہ جگہ پر پہنچے تو ملازم ان کے انتظار میں جاگ رہے تھے۔ ان کی کار دیکھتے ہی لوہے کا بڑا گیٹ کھولا گیا تھا اور کئی ملازم اور ملازمائیں ان کے سواگت کو آگے بڑھی تھیں۔

مشعل کا طویل سفر کی تھکان سے برا حال تھا۔ نیند سے بوجھل آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں۔ ایسے میں وہ ذرا بھی خوش اخلاقی کا مظاہرہ نہیں کر سکتی تھی۔ ایسے میں اس کی پہلی اور آخری خواہش نرم گرم بستر کی تھی۔

زندگی میں پہلی بار اس نے اتنا طویل سفر بذریعہ کار کیا تھا اور اس کے بدن کا جوڑ جوڑ شدید تکلیف کا شکار تھا۔ ایسے میں اس کا موڈ بہتر ہونے کا تو سوال ہی نہ تھا۔ شاہ ویز بہت اخلاق سے ان سے مل رہا تھا۔ وہ منہ بنائے کھڑی تھی۔

"ان سے بیڈ روم معلوم کرو...... مجھے شدید نیند آ رہی ہے۔ کھڑا نہیں ہوا جا رہا مجھ سے۔"

اسے حسب عادت باتوں میں مگن دیکھ کر مشعل کو کہنا پڑا تھا۔

"پہلے آپ کھانا کھا لیں۔ آپ کا بیڈ روم میں نے صاف کر دیا ہے۔" ان میں سے ایک عورت نہایت ادب سے گویا ہوئی تھی۔

اگر اس وقت اس کے ہمراہ شاہ ویز نہ ہوتا تو وہ اس کو خود سے براہ راست مخاطب ہونے پر مزہ چکھا دیتی۔ وہ ملازموں کو منہ لگانے کے قابل ہی نہ سمجھتی تھی۔ اس وقت وہ کسی بدمزگی کے خیال سے برداشت کر گئی اور ملازمہ کو اگنور کر کے شاہ ویز سے بولی

"میں کھانا نہیں کھاؤں گی۔ سینڈوچ جو راستے میں کھائے تھے، وہ ابھی تک ہضم نہیں ہوئے مجھے۔ صرف سونا چاہتی ہوں۔"

"اوکے، ایز یو وش۔ میں تو ابھی نہاؤں گا، کھانا کھاؤں گا پھر سوؤں گا۔" اس نے اطمینان سے کہا اور ملازمہ سے کہا کہ وہ اسے بیڈ روم میں لے جائے۔

وہ اس بری طرح تھکی ہوئی تھی کہ اس نے کمرے کا جائزہ لینا بھی گوارا نہ کیا۔ کمرے کے وسط میں ڈبل بیڈ پر پنک کلر بے شکن چادر بچھی تھی اور دونوں سائیڈ ٹیبلز پر تازہ گلاب کے پھول کرسٹل کے چمکتے گلدانوں میں مہک رہے تھے جس سے کمرے میں مسحور کن بھینی بھینی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔

اس نے ایک جھٹکے سے سینڈل سے پاؤں آزاد کئے تھے، پرس بیڈ پر اچھالا تھا اور ایک انگڑائی لے کر بیڈ پر لیٹی تھی اور سر سے منہ تک رضائی اوڑھنے کے بعد چند لمحوں میں ہی دنیا و مافیہا سے غافل ہو گئی تھی۔

ملازمہ اس کے کمرے میں ان کا سامان لے کر آئی تو وہ بے خبر سو رہی تھی۔ اس نے بغیر کوئی آواز نکالے سامان رکھا تھا، دائیں بائیں پڑے سینڈلز اٹھا کر بیڈ کے نیچے رکھے اور باہر نکل گئی۔

خوب نیند بھرنے کے بعد اس کی آنکھ خود بخود کھل گئی تھی۔

کسی خیال کے تحت اس نے گردن گھما کر دیکھا۔ اس سے کچھ فاصلے پر شاہ ویز بے خبر سو رہا تھا۔ وہ فوراً اٹھ گئی اور بیڈ سے نیچے اتر گئی۔

باتھ روم میں اس کے سوٹ کے ساتھ ہر شے ٹھکانے پر موجود تھی۔

ناشتے کی ٹیبل پر اس کی پسند کی تمام اشیاء تھیں جنہیں دیکھ کر اسے حیرت آمیز مسرت ہوئی تھی۔

"تمہیں کیسے معلوم ہوا میری پسندیدہ ڈشز کا؟" ڈونگے میں سے دلیہ پیالے میں نکالتی ہوئی وہ قریب کھڑی ملازمہ سے مخاطب ہوئی تھی۔

"بیگم صاحب جی، ہمیں صاحب نے سب سمجھا دیا ہے آپ کی پسند اور ناپسند کے بارے میں۔ رات میں آپ نے کچھ کھایا نہیں تھا اس لئے میں نے دوسری چیزوں کے ساتھ دلیہ بھی بنا لیا تھا اور انڈے بھی دو تین طرح بنا لئے تھے کہ جو آپ کو پسند آئے وہ کھا لیں۔" نوعمر لڑکی خاصی پُراعتماد تھی مگر اس سے باتیں کرتے وقت اس کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں اور انداز بھی خاصا مؤدب تھا۔

مشعل کو کم رتبے والے لوگوں کی ایسی ہی تابعداری و فرمانبرداری بھاتی تھی جو اس کے مغرور ذہن کو تقویت پہنچاتی تھی کہ وہ ان سے اعلیٰ و ارفع ہستی ہے۔

"شاہ ویز نے ناشتہ کر لیا ہے؟" دلیے میں دودھ شامل کرتے کھاتے ہوئے گویا ہوئی۔

"جی ...... وہ تو خاصی صبح بیدار ہو گئے تھے، بابا کے ساتھ چہل قدمی کو بھی گئے تھے۔ وہاں سے آ کر انہوں نے ورزش کرنے کے بعد ناشتہ کیا تھا اور آپ کے ناشتے کا حکم دے کر سونے چلے گئے تھے۔"

"اچھا تم جاؤ ...... مجھے ضرورت پڑے گی تو پکار لوں گی۔ نام کیا ہے تمہارا؟"

"جی فریدہ نام ہے میرا ...... میں کمرے کے باہر کھڑی ہوں۔" وہ کہہ کر وہاں سے چلی گئی۔

وہ ناشتہ کرتے ہوئے سوچ رہی تھی، شاہ ویز کو اس کا اتنا خیال کس طرح آ گیا کہ اس نے ملازماؤں کو اس کے بارے میں، اس کی پسند ناپسند کا خیال رکھنے کی ہدایت دی ہے۔ آخر اس کے پیچھے اس کا کیا مقصد ہو سکتا ہے؟ یہ کون سی نئی سازش ہے اس کی؟" وہ سوچ رہی تھی اور بے حد سوچنے کے باوجود بھی جب وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچی تو شانے جھٹک کر پوری توجہ ناشتے کی طرف لگا دی۔

وہ جن مہربانیوں کو شاہ ویز کی کرم نوازی سمجھ رہی تھی، درحقیقت یہ تمام احکامات شاہ ویز نے نہیں بلکہ حسن بیگ صاحب کے تھے، جنہوں نے چوکیدار رب نواز اور اس کی بیوی بتول کو دیئے تھے۔ وہ دونوں میاں بیوی حسن بیگ کے پرانے نمک خوار تھے۔ پہلے شہر کی کوٹھی میں کام کرتے تھے مگر جب حسن بیگ صاحب نے یہاں زمین خریدی تو انہیں یہاں بھیج دیا تھا۔ وہ پچھلے تیس سال سے یہیں مقیم تھے۔ شادی کے کچھ دنوں بعد وہ دونوں میاں بیوی یہاں آ گئے تھے اور اب ان کے بچے بھی جوان ہو گئے تھے اور ان کی وفاداریاں بھی مضبوط و قابل بھروسہ تھیں۔

اُن میاں بیوی کو صورتحال معلوم تھی ماسوائے ان کی تینوں بیٹیوں کے جو ماں باپ کے صاحب کہنے پر شاہ ویز کو ہی بڑے صاحب سمجھتی تھیں۔

وہ ناشتہ کر کے کھڑی ہوئی تھی کہ فریدہ کسی جن کی طرح حاضر ہوئی تھی۔

"بیگم صاحبہ! دوپہر کو آپ کھانے میں کیا کھائیں گی؟"

"جو دل چاہے بنا لینا۔ تم نے ناشتہ اتنا اچھا بنایا ہے تو یقیناً کھانا بھی مزیدار بناؤ گی۔ بہت دنوں بعد مجھے ناشتہ کرنے میں مزہ آیا ہے۔ مرچیں کم ڈالنا۔" وہ جس طرح کسی کی بے عزتی کرنے میں کوئی تامل نہ برتتی تھی، اسی طرح جو عمل قابل تعریف ہوتا اس کی تعریف کرنے میں قطعی کنجوسی نہ برتتی تھی۔

فریدہ اپنی مغرور و بد مزاج نظر آنے والی نئی مالکن کے منہ سے اپنی تعریف سن کر مسرت سے جھوم اٹھی تھی۔

وہ بھرپور نیند لے کر اٹھی تھی، اس لئے طبیعت بھی بہت تروتازہ تھی یا پھر کئی ہفتے قید جیسی زندگی گزارنے کے بعد یہ آزادی، کھلی فضا اور کسی قسم کے بلا روک ٹوک کے لمحوں میں وہ بہت اطمینان و سکون محسوس کر رہی تھی۔

وہ کسی آزاد پنچھی کی طرح پورا بنگلہ دیکھتی پھر رہی تھی۔ کشادہ کمروں، کھلے دالانوں، وسیع برآمدوں، سرخ اینٹوں والا بنگلہ سبزے میں گھرا بہت خوب صورت تھا۔

وہ لان میں چلی آئی جہاں گہری سبز گھاس پر بے شمار پھل دار درخت پھلوں سے لدے کھڑے تھے۔ پھولوں کے پودوں کی بہتات بھی چاروں سمت بہار دکھا رہی تھی۔

طویل و عریض لان کے مشرقی حصے میں مصنوعی آبشار بنا ہوا تھا جس کا پانی جھاگ اڑاتا ہوا پتھروں سے نیچے گر رہا تھا اور یہ منظر اس قدر خوب صورت تھا کہ وہ کئی لمحے مبہوت نگاہوں سے اس منظر کو دیکھتی رہی تھی۔

''واچ مین! اس آبشار کے لئے واٹر پلانٹ کی ارینجمنٹ کرنی پڑی ہوگی۔'' قریب سے گزرتے چوکیدار سے وہ مخاطب ہوئی تو وہ رک کر مؤدب لہجے میں بتانے لگا۔

''نہیں بی بی جی! باہر پیچھے ہی جھیل بہہ رہی ہے۔ وہاں سے کچھ انجینئروں نے کام کر کے جھیل کے پانی کو اس طرح ایک حصے سے کاٹا کہ وہاں سے پانی کٹاؤ کی صورت میں اس آبشار میں داخل ہو کر دوسرے راستے سے نکل کر واپس جھیل میں گرتا ہے۔''

''اوہ، کتنا سمپل اور زبردست آئیڈیا ہے..... جھیل کہاں ہے، میں دیکھوں گی۔''

''جھیل بنگلے کے پیچھے ہے۔ میں آپ کو وہاں لے چلتا ہوں۔''

''نہیں..... میں چلی جاؤں گی تم اپنا کام کرو۔'' وہ قطعی انداز میں بولی۔

''بی بی جی! آپ کا وہاں تنہا جانا مناسب نہیں ہوگا اور موسم بھی ٹھیک نہیں لگ رہا۔'' چوکیدار ڈرتا ڈرتا گویا ہوا تھا۔ وہ غصے سے بولی۔

''آئندہ مجھے ایڈوائز کرنے کی کوشش مت کرنا ورنہ بہت برا حشر کروں گی، سمجھے۔'' وہ غصے سے بولتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ چوکیدار ہکا بکا کھڑا رہ گیا۔

موسم ابر آلود تھا، فضا میں خوشگوار خنکی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ گیٹ سے باہر نکل آئی تھی۔ ایک پراسرار خاموشی و سکوت ہر سمت پھیلا ہوا تھا۔ اِدھر اُدھر گاؤں دلکش سبزی کی طرح پھیلا ہوا تھا۔

اسے کبھی بھی ایسے نظاروں سے دلچسپی نہیں رہی تھی۔ وہ تو روشنیوں، ہنگاموں، پارٹیز کی دلدادہ رہی تھی۔ اپنے حُسن کا اسے اتنا زعم تھا کہ کبھی اس نے فطرت کے روپ، قدرت کے حُسن کی پرواہ ہی نہ کی تھی۔

اور آج جبکہ وہ اس ماحول کا حصہ نہ رہی تھی، اپنے حُسن کی شوخیوں سے لاپرواہ ہوئی تو قدرت کے حُسن سے متعارف ہوئی اور اسے بے اختیار دنیا کے رنگ دلکش و حسین لگنے لگے۔

وہ بنگلے کے دوسری طرف آ گئی جہاں جھیل کا پانی ایک چھوٹی ندی کی صورت میں دور تک بہتا ہوا جا رہا تھا۔ ہر سُو پھیلے ہوئے جنگلی پیڑ پودوں نے ایک گھنے جنگل کی صورت اختیار کر لی تھی۔ فضا پرندوں کی چہکاروں سے گونج رہی تھی۔ وہ دونوں ہاتھ سینے پر باندھے رنگ برنگے پھولوں کو توڑ کر مسلتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔

معاً خاموش فضا فائر کی زوردار آواز سے لرز اٹھی۔ وہ ٹھٹھک کر اپنی جگہ رک گئی۔

''آج تو بہت ہی بیڈ لک ہے یار! صبح سے دوپہر ہونے کو آئی ہے مگر تیتر تو ایک طرف ہم کو ایک چڑیا تک شکار کرنے کا موقع نہیں ملا۔ ایسا لگتا ہے جیسے کسی نے پرندوں سے ہماری مخبری کر دی ہے اور وہ ہماری آمد سے قبل ہی چھپ کر بیٹھ گئے ہیں۔'' ایک، دوسرے سے بولا تو دوسرے نے بھی گردن ہلا کر تائید کی۔ وہ دونوں جن کے ہاتھ میں لمبی لمبی شکاری بندوقیں تھیں، لباس بہت چست تھے، سر پر ہیٹ جمائے ایک پتھر پر بیٹھ گئے تھے۔ ان کی اٹھی ہوئی گردنیں درختوں میں چھپے پرندوں کو ڈھونڈ رہی تھیں جن کی آوازیں تو مسلسل آ رہی تھیں مگر وہ نظروں سے اوجھل تھے۔

''کیا کھائیں گے یار اب۔ جو کچھ راستے سے خریدا تھا، وہ وقفے وقفے سے چٹ کر چکے ہیں۔ اب کھانے کے لئے گھاس اور پتے ہیں اور پینے کے لئے یہ جھیل کا پانی۔'' پہلے والے نے کہتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر پانی اس کی طرف اچھالا تو دوسرا ہنسا کر رہ گیا۔

''مذاق نہیں کرو، جو کچھ کھایا ہے تم نے تنہا ہی ہڑپ کیا ہے۔ اب تو مجھے بہت ہی بھوک لگی ہے۔ تیتر اور مرغابی کا روسٹ کھانے کے خیال سے میں نے ناشتہ بھی پیٹ بھر کر نہیں کیا تھا اور یہاں روسٹ تو کیا ہوتا پرندے دیکھنے کو بھی نہ ملے۔'' دوسرا کپڑے جھاڑتا ہوا بڑبڑا رہا تھا۔ پہلا ہنستا ہوا اسے دیکھ رہا تھا کہ ان کی نگاہ سامنے سے آتی مشعل پر پڑی۔ وہ چونک کر کھڑے ہو گئے۔ وہ بڑے غور سے اس سمت دیکھ رہے تھے۔

''یار بیڈ لک نہیں، گڈ لک۔ ہم شکار کے لئے مارے مارے گھوم رہے ہیں، شکار خود ہمارے پاس چل کر آ رہا ہے۔'' دوسرا مشعل کو اپنی جانب آتے دیکھ کر پُرجوش لہجے میں گویا ہوا۔

مشعل ان کے قریب پہنچ گئی۔ وہ جو نگاہیں اٹھائے اسے گھور رہے تھے فوراً ہی مؤدب سے بن گئے۔

''مس! آپ یہاں تنہا..... کیا راستہ بھٹک گئی ہیں؟''

''نہیں..... فائر تم نے کیا تھا ابھی؟'' ان کے ہاتھوں میں پکڑی رائفلز دیکھتی ہوئی پُراشتیاق لہجے میں مخاطب ہوئی تھی۔

''ہاں..... ہم یہاں شکار کرنے آئے ہیں۔'' وہ گہری نگاہوں سے اس کا جائزہ لے رہے تھے۔

''کیا شکار کیا ہے..... مجھے دکھاؤ۔'' اس کی دوستی بچپن سے لڑکوں سے رہی تھی، عام لڑکیوں کی طرح لڑکوں کی موجودگی اسے کسی قسم کی گھبراہٹ و شرم سے دوچار نہ کرتی تھی۔ وہ لڑکوں سے اسی طرح سکون و اطمینان سے بات کرتی تھی جس طرح لڑکیاں لڑکیوں سے کرتی ہیں۔ اس وقت بھی وہ بہت آرام سے دو اجنبی لڑکوں سے اس ویرانے میں کھڑی گفتگو کر رہی تھی۔ اس کی جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو کب کی اجنبیوں کو دیکھ کر بھاگ چکی ہوتی۔ لیکن وہ بے فکری سے کھڑی تھی۔

وہ دونوں لڑکے بھی بر گر فیملی کے بگڑے ہوئے اوباش نوجوان تھے۔ مشعل کو تنہا دیکھ کر پہلے ہی ان کی نیت خراب ہو چکی تھی۔ اس پر اس کی بے تکلفی سے گفتگو سے وہ اپنے مطلب کی لڑکی لگی تھی۔ ان کے لبوں پر مکروہ مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

''میں اپنے پاپا کے ساتھ بہت دفعہ شکار پر گئی ہوں۔ مجھے رائفل چلانا آتی ہے۔ ایک گولی سے میں کئی پرندوں کا شکار کر سکتی ہوں۔''

''تمہیں گولی مارنے کی کیا ضرورت ہے ڈیئر! صرف آنکھ مار دیا کرو۔ دیکھنا جنگل کے سارے چرند پرند، نازنین سمیت تمہارے قدموں میں ڈھیر ہو جائیں گے۔'' پہلے نے خاصے بے ہنگم انداز میں کہتے ہوئے قہقہہ لگایا تو دوسرے نے بھی ساتھ دیا تھا۔

''وہاٹ یو مین مسٹر؟'' وہ جھٹکا کھا کر دور ہو کر پھنکاری تھی۔

''ارے اتنا غصہ کیوں کر رہی ہو؟ تم ہم سے کمپنی لینے آئی تھیں، ہم دینے کو تیار ہیں۔ خوب بنے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے تین۔''

''شٹ اپ..... مجھے کیا سمجھ رہے ہو تم۔ ذرا آگے بڑھ کر بات کیا کر لی تم اپنی اوقات دکھانے لگے۔ ہٹو میرے راستے سے ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔'' ان کے بدلتے تیور اسے احساس دلانے لگے کہ وہ غلط لوگوں کی طرف بڑھ آئی ہے اور ان سے جلد دور ہونا ہی بہتر ہے۔''

''سنو میڈم! نازنخرے ہم دیکھنے کے عادی نہیں ہیں۔''

''بکواس مت کرو..... دفع ہو جاؤ یہاں سے۔'' ان دونوں کو آگے بڑھتے دیکھ کر وہ چیخی تھی۔

''میرا نام سمیر ہے..... ہاتھ لگا مال کبھی جانے نہیں دیتا۔''

''اور میرا نام امین ہے۔ مگر یار لوگ پیار سے کمین کہتے ہیں۔ میں ہاتھ آئی دولت چھوڑ سکتا ہوں مگر لڑکی نہیں اور لڑکی بھی تم جیسی جو کسی پکے ہوئے پھل کی طرح جھولی میں خود ہی آن گری ہو۔'' انسان پر جب شیطان سوار ہو جائے تو وہ مکمل اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے۔ وہ دونوں بھی اس وقت شیطان بن گئے تھے۔

وہ جو خود کو ناقابل تسخیر سمجھتی تھی..... اسے خود پر زعم تھا کہ کوئی مرد اسے اس کی مرضی کے بنا چھو بھی نہیں سکتا، سب خیال ریت کے گھروندے ثابت ہوئے تھے۔

وہ کافی دیر تک ان کی گرفت سے بچنے کے لئے پارے کی طرح اِدھر اُدھر دوڑتی رہی تھی لیکن وہ دونوں بھی گھاگ شکاری تھے، جان بوجھ کر اسے اتنا دوڑا رہے تھے کہ وہ تھک کر خود ان کے قابو میں آئے گی۔ اور وہی بات ہوئی۔ بھاگ بھاگ کر اس کی سانسیں اکھڑنے لگیں، دل بند ہونے لگا تو وہ گر پڑی۔

''خبردار..... آگے ایک قدم بھی نہ بڑھانا۔'' شاہ ویز نے قریبی جھاڑیوں سے نکلتے ہوئے ان دونوں کو للکارا تو وہ ٹھٹھک کر رہ گئے جبکہ مشعل کی جان میں جان آئی۔ وہ ہانپتی ہوئی اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''کون ہوتا ہے تُو ہمیں روکنے والا؟'' سمیر نامی لڑکا سینہ تان کر گویا ہوا۔

شاہ ویز نے گویا اس کی بات سنی ہی نہ تھی، اس کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔ اس نے ایک نظر مشعل کی ابتر حالت پر ڈالی تھی اور قہر بن کر ان پر پلٹا تھا۔ وہ دونوں صحت میں اس سے کافی تندرست و توانا تھے مگر غصہ، جنون اور رگوں میں مارے غیرت کے لاوے کی طرح کھولتے خون نے اسے فولاد بنا ڈالا تھا۔ وہ ان دونوں سے بری طرح گتھم گتھا تھا۔

مشعل کھڑی ہو چکی تھی۔ خوف و دہشت سے وہ کانپنے لگی تھی۔

مردوں سے تعلقات پہلے بھی تھے لیکن کسی نے ایک نگاہ غلط نہ ڈالی تھی۔ ان کے درمیان گہری فرینڈشپ تھی۔ وہ ساتھ بیٹھتے تھے، رہتے تھے، مستی مذاق، چھیڑ چھاڑ، سب کچھ ہوتا تھا مگر اس طرح کسی نے وحشی پن کا مظاہرہ نہ کیا تھا۔ سب سے بڑھ کر شاہ ویز جسے تمام حقوق حاصل تھے، اس نے کبھی اپنے حق کا معمولی سا بھی اظہار نہ کیا تھا۔

کئی پردے تھے جو ایک کے بعد ایک اس کی نگاہوں سے اٹھ رہے تھے۔

شعور کی دستک

فہم وادراک کی آمد

ذہن کے مقفل دریچے کھل رہے تھے۔

وہ لڑ رہا تھا اُس کی خاطر۔ اس کا جنون، اس کی وحشت، اس کی دیوانگی سب اس کے لیے تھی جس نے کبھی اسے در خورِ اعتنا نہ جانا تھا۔

جو ہمیشہ اس کی تذلیل وتوہین کا شکار رہا تھا، جس نے کسی لمحے اسے اپنائیت کا احساس نہ بخشا تھا، وہ اس کی خاطر لڑ رہا تھا۔

ان دونوں میں سے ایک تو بری طرح گھائل ہو گیا۔ اس کے سر اور ناک سے خون بہنے لگا تھا۔ شاہ ویز کے مکوں اور ٹکروں نے اس کے اوسان خطا کر ڈالے تھے۔ دوسرے کا حال بھی ایسا ہی تھا۔ شاہ ویز کے تابڑ توڑ حملوں نے اس کی قوتِ مدافعت توڑ کر رکھ دی تھی جبکہ زخمی وہ بھی ہوا تھا مگر اس کی وحشت ہر جذبے پر حاوی تھی۔ نیکی و بدی کی جنگ میں ہمیشہ جیت نیکی کی ہوتی ہے، وہ بھی جیت گیا تھا۔ وہ دونوں گرتے پڑتے وہاں سے بھاگ گئے تھے۔ شاہ ویز نے ان کے پیچھے جانا چاہا تو مشعل نے آگے بڑھ کر اس کا بازو تھام لیا۔

''تم زخمی ہو، بھاگنے دو انہیں۔ اتنی مار لگائی ہے ان کو کہ کبھی اس علاقے میں ہی قدم رکھنے کی کوشش نہ کریں گے۔'' اس نے شاہ ویز کا بازو مضبوطی سے پکڑ کر کہا۔

''اس احمقانہ حرکت کی کیا ضرورت تھی؟ جب تمہیں چوکیدار نے تنہا باہر نکلنے سے منع کیا تھا تو کیوں ادھر آئی تھیں؟ یہ علاقہ شکاریوں کا پسندیدہ علاقہ ہے اور وہ پرندوں کے علاوہ تم جیسی بے وقوف لڑکیوں کا بھی شکار کر لیتے ہیں۔ اگر چوکیدار مجھے اسی وقت آ کر اطلاع نہ دیتا اس طرح تمہارے یہاں تنہا آنے کی تو سوچو کیا ہوتا؟ میں آرام سے سکون کی نیند سو رہا ہوتا اور تمہاری ہستی کا یہاں نام ونشان مٹ چکا ہوتا۔'' وہ بگڑے تیوروں سے اسے ڈانٹ رہا تھا۔

مشعل خود اس صورتِ حال سے بری طرح سہم چکی تھی۔ اس وقت شاہ ویز کی ڈانٹ میں اپنائیت واضطراب محسوس کر کے وہ خود پر قابو نہ پا سکی تھی اور اس کے شانے پر سر رکھ کر رو پڑی تھی اور خاصی دیر تک روتی رہی تھی۔

شاہ ویز نے اسے رونے دیا۔ وہ اس کی اندرونی کیفیت سمجھ رہا تھا کہ وہ اس وقت کس خلفشار میں مبتلا ہے۔ ایسے میں اس کے دل کا غبار نکلنا بہتر تھا۔

''آئی ایم سوری، میں نہیں سمجھی تھی کہ وہ لوگ حیوان صفت ہوں گے۔'' وہ ہتھیلیوں سے آنسو صاف کرتی ہوئی ندامت سے گویا ہوئی۔

''تمہاری نگاہ میں سب اچھے ہوتے ہیں سوائے میرے۔ خیر، آج ایسی بے وقوفی کر چکی ہو مگر آئندہ خیال رکھنا، قسمت بار بار ساتھ نہیں دیتی۔'' اس کے چہرے پر وہی سکون واطمینان چھا گیا جو اس کی ذات کی پہچان تھی۔ کون کہہ سکتا تھا کہ کچھ دیر پہلے اس شخص کے چہرے سے شعلے نکلتے دکھائی دے رہے تھے، جو جنون ووحشت کی مجسم تصویر دکھائی دے رہا تھا۔

''اب کس کی آمد کا انتظار ہے جو آگے نہیں بڑھ رہی ہو؟'' اسے اسی جگہ پر اجمان دیکھ کر وہ غصے سے مخاطب ہوا تو وہ سٹپٹا کر اس کے ساتھ چلنے لگی۔

''نامعلوم تم کس مٹی کی بنی ہو جو ذرا بھی عقل وشعور نہیں رکھتیں۔ اُن الو کے پٹھوں سے زیادہ مجھے تمہاری بیوقوفی پر غصہ آ رہا ہے۔ بھلا کس نے کہا تھا کہ......''

''پلیز، میں نے کہا تو جو ہوا برا ہوا اور بری باتوں کو دہرانے سے دکھ بھی ملتے ہیں۔ میں آئندہ کبھی اس طرح نہیں نکلوں گی۔ بعض لوگ دنیا میں دوسرے کو گرتے دیکھ کر سنبھل جاتے ہیں مگر مجھ جیسے ٹھوکر کھا کر ہی سنبھلتے ہیں۔''

شاہ ویز سخت حیرانی کی لپیٹ میں تھا۔

مشعل کا طرزِ گفتگو، سوچنے کا انداز، پشیمانیوں وندامتوں میں ڈوبا لہجہ حیران کن بات تھی۔ وہ لڑکی جس نے جھکنا اور کسی سے مرعوب ہونا سیکھا ہی نہ تھا۔

ان لمحوں میں کتنی کمزور، بے بس وبے اختیار لگ رہی تھی۔

پہلی ٹھوکر ہی اُس کے لیے آخری ثابت ہوئی؟

لگتا تو نہیں کہ وہ سنبھل گئی ہو گی۔ اس نے سوچا۔

راستہ خوب صورت تھا۔

ماحول پُرسکون۔

ہوائیں خوشبوئیں لٹاتی ہوئی لگ رہی تھیں۔

موسم خوشگوار تھا، صبح سے ابر نے آسمان کو ڈھانپ رکھا تھا۔

اب ابر چھٹ گیا تھا۔ نیلے وسفید شفاف بادلوں سے آسمان دلکش لگ رہا تھا۔

سورج کی چمکتی روشنی ہر سُو پھیلی ہوئی تھی اور جھیل کے بہتے ہوئے پانی میں جب سورج کی کرنیں چمکتیں تو نگاہوں کو ان کا حُسن خیرہ کرنے لگتا تھا۔

وہ ساتھ ساتھ جا رہے تھے مگر سوچیں الگ الگ تھیں۔

مشعل پر اس حادثے نے گہرا اثر ڈالا تھا، جہاں وہ اپنی عزت بچ جانے پر شکر ادا کرتی وہیں شاہ ویز کے سامنے خود کو نگاہ اٹھانے کے قابل نہ پاتی تھی۔ وہ اس کے سامنے کس قدر اکڑتی تھی، بہادری وخودسری کے مظاہرے کرتی مگر وہ درحقیقت کیا تھی؟

معمولی وکمزور لڑکی۔

جو وقت پڑنے پر اپنا دفاع بھی نہ کر سکتی تھی۔

وہ کتنا عظیم تھا۔

بلند حوصلہ، جرأت مند، بہادر ہونے کے ساتھ غیرت مند بھی بلا کا تھا۔

ایسا مرد ہر لڑکی کی چوائس وآئیڈیل ہوتا ہے۔

دھیرے دھیرے اس کی دنیا میں ہلچل پیدا ہو رہی تھی۔ دل کی دنیا میں حشر برپا تھا اور کانوں میں کوئی سرگوشیاں کر رہا تھا۔

خوشبو کی پوشاک پہن کر کون گلی میں آیا ہے

کیسا یہ پیغام رساں ہے

کیا کیا خبریں لایا ہے

کھڑکی کھول کر باہر دیکھو

موسم میرے دل کی باتیں تم سے کہنے آیا ہے

□●□

فرح کے گھر میں زرینہ اور بے جی کا استقبال ازحد سرد مہری وبیگانگی سے کیا گیا تھا۔ فرح ان کے سامنے نہیں آئی تھی۔ اس کی ماں اور بہنیں کمرے میں موجود رہی تھیں۔ فرح کی والدہ بے جی کی عمر کی تھیں مگر بالکل جوانوں کی طرح فیشن ایبل تھیں۔ بے جی نے سلام کیا تو منہ ٹیڑھا کر کے انہوں نے جواب دیا تھا۔ خود بیٹھی تھیں مگر اخلاقاً بھی انہیں بیٹھنے کو نہیں کہا تھا۔

دونوں اُن کی بیٹیاں بھی اسی بے حسی سے بیٹھی رہی تھیں۔

''تمیز طریقہ تو تمہارا پہلے ہی نیست ونابود ہو گیا تھا۔ اب کیا میزبانی بھی بھول گئیں؟ گھر میں آنے والے غیروں کو بھی بیٹھنے کو کہا جاتا ہے پھر ہم تو تمہارے جان پہچان والے ہیں۔ ایسی بھی کیا بے مروتی کہ بیٹھنے کو بھی نہ بول رہی ہو۔''

زرینہ کو ان کی بے التفاتی ذرا نہ بھائی۔ وہ دہک کر بولیں۔

''آؤ بیٹھ جاؤ۔ اب بیٹھنے کے لیے بھی تمہیں کیا دعوتی کارڈ دینا ہو گا؟'' فرح کی ماں تیوریاں چڑھا کر بولیں اور قبل اس کے کہ زرینہ بھی بڑھ کر جوابی حملہ کرتیں، بے جی نے ان کا ہاتھ پکڑا اور صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہنے لگیں۔

''نہیں...... کارڈ کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارا اپنا گھر ہے، خود ہی بیٹھ جائیں گے۔''

بے جی اور زرینہ کو بیٹھے کافی دیر گزر گئی مگر ان کے درمیان بالکل خاموشی تھی۔ پہل کرنے کو وہ تیار نظر نہ آ رہی تھیں تو زرینہ بھی خاموش تھیں۔

اس الجھن زدہ صورتِ حال سے بے جی کو بے چینی ہونے لگی تھی۔ وہ یہاں کام سنوارنے آئی تھیں۔ وہ زرینہ کی نگاہوں کو نظر انداز کر کے فرح کی ماں سے استفسار کرنے لگیں۔

''زبیدہ! فرح کو بلاؤ۔ ہم اسے لینے آئے ہیں۔''

''اب کیسے یاد آ گئی فرح کی؟ میری بچی موت کے منہ سے واپس آئی ہے۔ میں اسے نہیں بھیجوں گی۔ تکلیف کی حالت میں کسی نے آ کر جھانکا نہیں۔ اب وہ تندرست ہوئی ہے تو خدمت کروانے کے لیے لینے چلی آئیں۔'' زبیدہ بھری بیٹھی تھیں۔ ذرا سی بات سے ہی وہ پھٹ پڑی تھیں۔

''موت کے منہ میں بھی تو تم ہی لے کر گئی تھیں اسے۔ ماں اور ساس دونوں خود ہی بن بیٹھی تھیں۔ مجھے تو ایسے دور کیا تھا جیسے دودھ میں گری مکھی کو نکال کر پھینکتے ہیں۔ اور خدمت کی بھی تم نے خوب کہی۔ بی بی! کسی خوش گمانی میں رہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم نے بیٹی کی تربیت خدمت کرنے کے لیے نہیں، لینے کی، کی ہے۔ وہ کیا خدمت کرے گی، خدمت کروانے والی ہے۔'' زرینہ غصے سے بلند لہجے میں بولیں۔

''اگر ہماری آپی خدمت کروانے والی ہوتیں تو ان کا ایسا حال نہ ہوتا۔ جو تکلیف انہوں نے اٹھائی ہے ہم جانتے ہیں۔ وہ تو اپنے بچے سے بھی ہاتھ دھو بیٹھیں۔'' فرح کی چھوٹی بہن منہ بنا کر کہنے لگی۔

''اے بی! تمہیں کسی نے یہ نہیں بتایا کہ جب بڑے بات کر رہے ہوں تو چھوٹوں کو نہیں بولنا چاہئے۔ تم ابھی کنواری ہو، ایسی باتیں تمہیں زیب نہیں دیتیں۔''

''گئے وہ وقت جب بچیاں منہ میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھی رہتی تھیں۔ لیکن اب وہ وقت نہیں رہا۔ بچیاں جو دیکھیں گی وہ کہیں گی۔''

''تب ہی تو ان کی صورتوں پر پھٹکار بھی برس رہی ہے۔ کنواری ہیں مگر کئی کئی بچوں کی مائیں لگ رہی ہیں۔'' زرینہ نے اس انداز میں کہا کہ ان ماں بیٹیوں کے پتنگے لگ گئے اور وہ تینوں تیز تیز بولنے لگیں۔

زرینہ بھی شروع ہو گئیں اور لڑائی کا ماحول بن گیا۔ وہ تینوں ماں بیٹیاں شروع تھیں۔ غضب کے طعنے تشنے میزائل کی طرح ایک دوسرے پر داغے جا رہے تھے۔ زبانی گولہ باری کرنے میں زرینہ کا بھی کوئی ثانی نہ تھا۔

خوب ایک دوسرے پر زبانی حملے بڑھ بڑھ کر کیے جا رہے تھے۔ بے جی نے پہلے تو انہیں منع کرنے، روکنے کی بہت کوشش کی مگر دونوں طرف سے ہی کوئی ماننے کو آمادہ نہ ہوا تو وہ یہ سوچ کر خاموش ہو گئیں کہ اچھا ہے دونوں کے دلوں میں بھری غلط فہمیاں رفع ہو جائیں تو ٹھیک بات ہو گی۔''

بالآخر ایک دوسرے کو خوب کہنے سننے کے بعد دل کی بھڑاس نکل گئی تو وہ خاموش ہو گئیں۔ زرینہ غصے سے اکھڑ گئیں۔

''آپا! کیسے اطمینان سے بیٹھی ہو اتنی بے عزتی ہونے کے باوجود۔ چلو۔''

''بیٹھ جاؤ...... کوئی بے عزتی نہیں ہوئی۔ تم نے بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔''

''آپا! یہ تم کہہ رہی ہو...... ارے تم میری بہن ہو یا ان کی؟''

''تمہاری بہن ہوں تو غیر زبیدہ کے لیے بھی نہیں ہوں، سگی خالہ کی بیٹی ہے۔ اور اصغر کا رشتہ بھی اسی وجہ سے کیا گیا تھا کہ مضبوط ہو گا رشتہ مزید۔ لیکن لگتا ہے تم دونوں عقل فروخت کر کے بیٹھی ہو۔ ابھی جو تمہارے درمیان باتیں ہوئی ہیں بالکل بے بنیاد اور فضول ہیں۔ نہ زرینہ تمہاری بیٹی کی دشمن ہے اور نہ زبیدہ۔ تم اصغر کو سکھا پڑھا کر زرینہ کے خلاف کر رہی ہو۔''

''بہن! میں بھی یہی کہتی ہوں۔ مگر نہ جانے کیوں زرینہ کو سمجھ نہیں آتی۔ نہ معلوم کیوں یہ ایسی باتیں کرتی ہے۔ کون سکھاتا ہے اس کو میرے خلاف۔'' زبیدہ کے دل کی بھڑاس نکل چکی تھی۔ پھر بے جی کے بات کرنے کا انداز، لہجے کی شیرینی اور سچے خلوص کے مظاہرے کچھ ایسے ہی ہوتے تھے کہ بڑے سے بڑے مزاج والوں کے دل بدل جایا کرتے تھے۔ پھر یہ تو رشتہ ایسا تھا کہ وہ موم بن گئی تھیں۔

''لو یہ بھی خوب کہی، مجھے کون سکھائے گا، میں نا سمجھ ہوں کیا؟''

''ہاں، مجھے معلوم ہے۔ تم بہت سمجھدار ہو۔ لیکن اب خاموش بیٹھی رہو، میں فرح کو لینے آئی ہوں۔ تم کیا کہتی ہو زبیدہ! اگر ابھی بھی کوئی گلہ شکوہ باقی رہ گیا ہو تو کر لو مگر فرح کو میں ہر حال میں لے کر جاؤں گی۔'' زرینہ کو ڈپٹ کر وہ زبیدہ سے مخاطب ہوئی تھیں۔

''اے بہن! بیٹی کو کون اپنی چھاتی پر بٹھانا پسند کرتا ہے۔ اگر مجھے اپنے گھر ہی بٹھانا ہوتا تو شادی ہی کیوں کرتی۔ اگر زرینہ پہلے آ جاتی تو میں بھیج دیتی۔''

''آج سے سارے گلے شکوے ختم ہو گئے ہیں۔ آئندہ چھوٹی چھوٹی باتیں ایک دوسرے سے کہہ کر غلط فہمی دور کر لیا کرنا۔ بات کچھ نہیں ہوتی اور جھگڑے کھڑے ہو جاتے ہیں۔'' بے جی نے اٹھ کر انہیں ایک دوسرے سے گلے ملوایا تھا۔

□●□

مشعل نے مرد کی ہوس ناک نظریں پہلی مرتبہ دیکھی تھیں اور اس کی دنیا بدل گئی تھی۔ وہ جو شاہ ویز کی پرچھائیں سے بھی دور رہنا چاہتی تھی اب ہمہ وقت اس کا سایہ بنی رہنا چاہتی تھی۔

بے پناہ خوف و وہم اس کے دل میں بیٹھ گیا تھا۔

''کہاں جا رہے ہو؟'' اسے تیار ہوتے دیکھ کر وہ بولی تھی۔

''کیوں...... اب تمہیں بتا کر جانا ہو گا؟'' اس نے بال بناتے ہوئے ڈریسنگ ٹیبل کے مرر میں اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں بھی ساتھ چلوں گی۔''

''ہمارے درمیان معاہدہ نہیں ہوا تھا۔''

''کیسا؟''

''کہ تم ہر جگہ میرے ساتھ جاؤ گی۔'' وہ ہیئر برش رکھ کر اس کے مقابل کھڑا ہو گیا۔

''معاہدے کی بات نہیں۔ میں تمہارے ساتھ ضرور چلوں گی۔'' وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی تھی۔ عجیب بے نام سی گھبراہٹ و الجھن سی ہونے لگی تھی۔

وہ جو بے خوفی سے اس کا مقابلہ کرتی تھی، اب نگاہ ملا کر بات کرنا تو در کنار اس کے قریب بھی کھڑا نہ ہوا جاتا تھا۔

''میرے ساتھ؟ یہ میرا ساتھ تمہیں کب سے بھانے لگا؟ میں تو وہی بے مایہ، لٹیرا شخص ہوں جو تمہارے پاپا کی دولت پر قبضہ کر کے بیٹھ گیا ہوں۔'' اس کا رویہ خواہ مخواہ ہی تلخ ہوا جا رہا تھا۔

''ضروری نہیں پرانی باتیں دہرائی جاتی رہیں۔''

''ہاں ضروری نہیں ہے مگر میں تمہیں اپنے ساتھ لے کر نہیں جا سکتا۔''

''لیکن کیوں؟...... کیا میں تمہارے ساتھ چلنے کے قابل نہیں؟ بدصورت ہوں، اپاہج ہوں، آخر کیا برائی ہے مجھ میں؟'' وہ اس کی مسلسل انکار کی تکرار سے زچ آ کر بولی۔

''بدصورت؟ تمہیں ابھی تک اپنے حسن پر ناز ہے؟'' وہ اس کے دلکش چہرے کو بغور دیکھتا ہوا استہزائیہ لہجے میں گویا ہوا۔

وہ ہونٹ بھینچ کر خاموش ہی رہی کہ کیا کہتی۔ اس کو دوبدو جواب دینے کا مطلب تھا اپنے پیروں پر خود ہی کلہاڑی مارنا، جو وہ چاہتی نہ تھی۔

''حالانکہ ہمارے ہاں خوب صورت اسی کو کہتے ہیں جو پیا من بھا جائے۔'' اس کی زبان رواں ہو گئی تھی۔

اسی دم رشیدہ صفائی کے لیے کمرے میں آئی تو وہ اس سے مخاطب ہوا۔

''رشیدہ! تمہاری مالکن بہت خوب صورت ہے؟''

''ہاں صاحب جی! بہت خوب صورت ہیں۔ بالکل پری کی طرح۔'' وہ مشعل کو دیکھ کر شائستہ لہجے میں گویا ہوئی تھی۔

''پری کی طرح۔ تم نے کبھی پری دیکھی ہے؟'' وہ استہزائیہ انداز میں ہنس کر بولا تو مشعل کا ملازمہ کے ساتھ خود کو ڈسکس کرنا مستزاد مضحکہ اڑانا وہ بل کھا کر رہ گئی مگر خاموش رہی۔

''دیکھا تو نہیں ہے مگر بے بے بتاتی ہے پری بہت خوب صورت ہوتی ہے۔ تو بیگم صاحبہ بھی اتنی ہی خوب صورت ہیں تو پری کی طرح ہی ہوئیں۔'' رشیدہ نے پوری طرح وضاحت کر دی تھی۔

''اگر پری کو معلوم ہو گیا تو وہ برا مان جائے گی اپنی انسلٹ پر۔'' وہ قہقہہ لگا کر بولا اور رشیدہ سمجھ نہ سکی۔

''صفائی تھوڑی دیر میں کرنا۔'' مشعل گویا ہوئی۔

''نہیں ابھی ہی کرنے دو۔ تم تو میرے ساتھ چل رہی ہو نا؟''

''کہاں؟''

''فش پوائنٹ ہے یہاں پر۔ وہیں چلنا ہے۔''

''مگر مجھے مچھلیوں کی بو سے چڑ ہے۔''

''لیکن میری مرغوب غذا مچھلیاں ہی ہیں اور میں نے آج ڈش بھی فش فرائی بنوائی ہے۔'' اس نے معلومات فراہم کی تھیں۔

''میں کچھ اور کھا لوں گی۔''

''ہر چیز بندے کو کھانے کی عادت ہونی چاہئے سب اللہ کی بنائی ہوئی ہیں۔''

''میں نے اعتراض تو نہیں کیا، صرف اپنی پسند بتائی ہے۔''

''او کے، چلو وہاں میں تمہیں خالص گاؤں کی ڈش مکئی کی روٹی اور سرسوں کا ساگ کھلاتا ہوں، بڑی مزے دار ڈش ہوتی ہے۔'' اس کا موڈ بھی بہتر ہو گیا تھا۔

مشعل نے نیٹ کا ٹیسٹ سوٹ پہنا تھا۔

وہ تیار ہو کر باہر آئی تو کار کے پاس اس کے انتظار میں کھڑا شاہ ویز اسے دیکھتا رہ گیا۔

مشعل بڑے مطمئن انداز میں گیٹ کی طرف بڑھ رہی تھی۔

بلیک نیٹ کی شرٹ، بلیک ویلوٹ کے ٹراؤزر میں نک سک سے تیار ہوئی بے حد حسین لگ رہی تھی۔ سنہرے سرخی مائل بال ریشم کے لچھوں کی طرح پشت پر بکھرے ہوئے تھے۔ بلیک اسٹون کی جیولری اس کے تیکھے نقوش کو مزید اجاگر کر رہی تھی۔ چہرہ بالکل سادہ ہر زیبائش سے پاک ہونے کے باوجود ایک ملکوتی حسن، ایک پرکشش جاذبیت لیے ہوئے تھا۔ وہ خراماں خراماں بہار کے سبک جھونکے کی مانند معطر معطر چلی آ رہی تھی۔ معاً اس کی نگاہ کار کے قریب ایستادہ شاہ ویز پر پڑی۔ وہ اسے دیکھ رہا تھا۔ بنا پلکیں جھپکائے یک ٹک، مسلسل۔ اس نے بھی اس کی جانب دیکھا اور دل پوری شدت سے دھڑک اٹھا۔

سانسیں جیسے تھمنے لگی تھیں۔

قدم وہیں منجمد سے ہو گئے۔

شاہ ویز کی نگاہوں میں والہانہ پن یا پسندیدگی کے خوب صورت رنگ نہ تھے بلکہ اس کی نگاہوں میں ناپسندیدگی وناگواری کی سرخی چھا رہی تھی۔

کشادہ پیشانی پر شکنوں کا جال بن چکا تھا۔

چہرے پر کدورت و بے زاری پھیلنے لگی تھی۔

ہونٹ غصے سے بھینچ کر رہ گئے تھے۔

''کیا ہوا...... ایسے کیوں دیکھ رہے ہو؟''

وہ اسے وہیں ہراساں کھڑی دیکھ کر قریب چلا آیا تھا اور بڑے ناگوار انداز میں اسے گھورنے لگا تو مشعل خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے استفسار کر بیٹھی۔

''میں سمجھا تھا اتنے دن میری معیت میں گزارنے کے بعد تم میری پسند، ناپسند سے واقف ہو چکی ہو گی۔ مجھے، میرے مزاج کو سمجھنے لگی ہو گی۔ مگر تم نے میری تمام خوش فہمی، خوش گمانی کو ملیامیٹ کر ڈالا۔'' اس کی نگاہوں کے ساتھ ساتھ زبان بھی انگارے برسانے لگی تھی اور وہ بری طرح بوکھلا اٹھی تھی۔

''لیکن میں نے کیا کیا ہے؟''

''تم نے کیا کیا ہے؟ آؤ میرے ساتھ۔'' وہ اسے بری طرح گھسیٹتا ہوا اندر بیڈ روم میں لے گیا اور ڈریسنگ کے قد آور آئینے کے سامنے لے جا کر کھڑا کیا تو ان دونوں کا عکس ساتھ ساتھ تھا۔

لائٹ بلیو کلف شدہ شلوار سوٹ میں نکھرا نکھرا وہ ازحد جاذب نگاہ لگ رہا تھا۔ اس لمحے وہ اسے اپنے برابر میں کھڑا ابہت مکمل لگا۔ اس کی دھڑکنوں میں نامانوس ہلچل مچی تھی اور ایک نامعلوم احساس کے تحت نگاہ ازخود جھک گئی تھی۔ اپنے ان احساسات کو، دل کی دھڑکنوں کو کوئی عنوان نہ دے پائی تھی اور یہ بھی نہ جان پائی تھی کہ وہ اسے اس وحشی پن سے گھسیٹ کر اندر کیوں لایا تھا اور آئینے میں عکس دکھانے کا کیا مقصد ہے کہ وہ بول اٹھا۔

''عورت کا لباس محض اس کی شخصیت کی چارمنگ کے لئے نہیں ہوتا بلکہ اس کی ناموس کا محافظ اور حیا و اعتبار کی پاسداری کا ضامن بھی ہوتا ہے۔ عورت جس قدر مکمل پردے میں نظر آتی ہے اتنی ہی نامکمل بے پردگی میں دکھائی دیتی ہے۔'' وہ اس سے دور ہو گیا تھا۔ ''پردہ عورت کو حسن و جمال بخشتا ہے، اس کی عزت و توقیر بڑھاتا ہے اور گندی نگاہوں کی غلاظتوں، بری نیت کی ہوس سے بچاتا ہے۔ عورت جس قدر حسین و پُرکشش پردے کے حصار یعنی پاکیزگی کے حصار میں دکھائی دیتی ہے اتنی اس بے حیائی و بے ہودگی کے لباس میں نہیں۔''

شاہ ویز لفظ چبا چبا کر ادا کر رہا تھا۔ اس کی نگاہیں بے اختیار اپنے لباس پر گئی تھیں۔ سیاہ نیٹ کی شرٹ کی سلیولیس فل تھیں مگر نیچے امتر نہ ہونے کے باعث ان کے سفید سڈول بازو اس طرح چمک رہے تھے گویا سیاہ بادلوں میں چاند پوری آب و تاب سے اپنی چاندنی لٹا رہا ہو۔ پیٹ کا نچلا حصہ بھی اسی طرح جھلک رہا تھا۔ اس کے لئے یہ کوئی نئی بات یا تعجب خیز امر نہیں تھا۔ وہ ایسے ملبوسات زیب تن کرنے کی عادی تھی۔

جس سوسائٹی سے اس کا تعلق تھا، جس ماحول میں اس نے پرورش پائی تھی وہاں ایسی باتیں معیوب نہیں سمجھی جاتیں بلکہ دقیانوسی اور جہالت کہہ کر مذاق اڑایا جاتا تھا۔ وہاں حسن کا معیار ہی بے پردگی و بے حیائی سمجھا جاتا تھا۔ اس کی ایک امریکن کورنس نے سمجھایا تھا۔

''بے بی! اگر خود کو سدا جوان رکھنا چاہتی ہو تو خود کو ایسی شمع بنا لو جس کی خاطر پروانے اپنی جان گنواتے رہیں۔ اپنے حسن میں ایسی آگ پیدا کرو جو صرف راکھ بنانا جانتی ہو۔'' اور وہ اس جیسی بے شمار کورنسز کی زیر تربیت پروان چڑھتی رہی تھی۔

پھر اس کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی کہ اپنے حسن کی داد حاصل کرنا اس کا حق ہے اور لباس ایسا ہی پہننا چاہئے جو اس کے حسن کی رعنائیوں کو اجاگر کر کے دیکھنے والی آنکھوں کو خیرہ کر ڈالے۔ زندگی ان چیزوں، ایسے رہن سہن کی اتنی عادی ہو گئی تھی کہ عجب نہیں لگتا تھا مگر اس لمحے شاہ ویز کی باتیں، اس کا غصہ، شعلے برساتی نگاہیں، کاٹ دار لہجہ اس کے ہوش و حواس سلب کئے دے رہے تھے۔ وہ کچھ کہنا چاہ رہی تھی مگر لفظ گویائی سے محروم ہو چکے تھے۔ اسی شش و پنج میں وہ گردن جھکا کر کھڑی ہو گئی۔

''ایسا لباس پہننے کا فائدہ ہی کیا جو انسان کو بے لباس ظاہر کرے۔ اور ہمارے نبی ﷺ نے بھی ایسے باریک لباس پہننے والی عورتوں پر لعنت فرمائی ہے۔'' اسے گھبرائے، بوکھلائے دیکھ کر اس کا لہجہ نرم پڑ گیا تھا۔

''سوری، مجھے دھیان نہیں رہا۔'' اس کا دھیما لہجہ خجالت آمیز تھا۔

''موسٹ ویلکم۔ اس گاؤں کی آب و ہوا واقعی خاصی تازہ و زود اثر ہے۔ انسان پر کافی تیزی سے اثر انداز ہوتی ہے۔ مجھے ازحد خوشی ہے کہ یہاں کے دو دن کے قیام نے تمہیں نہ صرف اپنی غلطی کا احساس بخشا ہے بلکہ معذرت کرنا بھی سکھا دیا۔''

''پاپا کہتے تھے بہادری وہ نہیں جو آپ شیر کا شکار کر کے اس کے مُردہ سر پر پاؤں رکھ کر ظاہر کریں بلکہ اصل بہادری یہ ہے کہ آپ اگر غلطی کریں تو احساس ہو جانے پر اپنی غلطی کا اعتراف کرنا اصل بہادری ہوتا ہے۔''

''گڈ...... ویری گڈ...... بیگ صاحب کی بہادری و عظمت کا میں پہلے سے قائل ہوں۔ بہر حال اس لباس کو تبدیل کرو اور ڈھنگ کا لباس زیب تن کرو۔ میں جا رہا ہوں۔'' وہ بال بنا کر کمرے سے نکل گیا۔ اس نے مشعل کو اب ساتھ چلنے کو کہا نہ مشعل نے ساتھ جانے کو کہا۔ وہ لباس و بے لباسی کے فلسفے میں مستغرق تھی۔

وہی دن اچھے تھے
جب ہم بچے تھے
مٹی کے گھر بناتے تھے
جو ہوتے بہت ہی کچے تھے
باتوں باتوں میں لڑتے تھے
پھر بھی جذبے سچے تھے
اب تو وہ دور ہے کہ
سوچتی ہوں بیگانے اچھے تھے

□●□

فریحہ ان کے ساتھ گھر آ چکی تھی۔

بے جی ایک دن رک کر گھر روانہ ہو گئی تھیں۔ زرینہ بیگم کا رویہ گھر آتے ہی فریحہ کے ساتھ ناراض ناراض، اپنائیت سے خالی رہا تھا۔ وہ بات کرتی تو مختصر سا جواب دیتیں، خود مخاطب نہ کرتی تھیں اور اسی طرح کے کئی رویے انہوں نے غیریت عیاں کرنے والے اپنائے تھے۔

فریحہ نے سائرہ سے مشورہ کیا کہ وہ کس طرح ان کو منائے۔ اس وقت زرینہ پڑوس میں گئی ہوئی تھیں۔ وہ دونوں کھانے سے فارغ ہو کر دوپہر کے وقت لیٹی تھیں۔

''اماں چند دنوں میں خود ہی ٹھیک ہو جائیں گی۔ ان کا غصہ وقتی ہوتا ہے۔'' ایک تکیہ اس کی طرف بڑھانے کے بعد دوسرا تکیہ اپنی طرف کھسکاتے ہوئے سائرہ اطمینان سے گویا ہوئی تھی۔

''یہ مجھے معلوم ہے مگر میں چاہتی ہوں میں خود ان سے معافی مانگوں۔ نادانستگی میں، میں نے انہیں بہت تکلیف پہنچائی ہے، بے حد زیادتی کی ہے۔ جب بیٹی تھی، بہو تھی، ان احساسات کا ادراک نہیں رکھتی تھی، اب ماں بننے کے بعد ان جذبوں سے روشناس ہوئی ہوں تو مجھے اپنی ہر اس غلطی کا احساس ہو رہا ہے جو میں نے اصغر کے حوالے سے ان کے ساتھ کی۔ نامعلوم کیا ہو گیا تھا مجھے جو میں ازحد خود غرض و خود پسند ہو گئی تھی جو اصغر کو صرف اپنا دیکھنا چاہتی تھی، اپنے علاوہ کسی اور کا نام بھی مجھے ان کے منہ سے سننا گوارہ نہیں تھا حتیٰ کہ اماں تک کو برداشت کرنا گوارا نہ تھا۔ عورت کی دشمن عورت ہوتی ہے، خواہ وہ کسی بھی روپ میں ہو وہ اپنی ہی جنس کو ڈستی ہے۔ خود کو ہی چھرے لگاتی ہے اور نمک چھڑک کر تماشہ دیکھتی ہے۔ مردوں کی ذات میں یہ کینہ پروری نہیں ہوتی۔ ایک مرد کبھی بھی دوسرے مرد کا گھر نہیں اجڑواتا، کبھی اپنے بیٹے کی غلط سمت میں رہنمائی نہیں کرتا اور شاید اسی وجہ سے وہ کامیاب و معتبر کہلاتا ہے، اسی وجہ سے خصوصی پروٹوکول ملتا ہے، خواہ وہ باپ کے رتبے پر فائز ہو، بھائی، بیٹا، داماد ہر رشتے میں مردوں کے لئے ریلیف ہوتا ہے۔''

''اللہ تعالیٰ نے مردوں کو حاکم کا رتبہ دے کر پیدا کیا ہے۔ یہ ان کی سرشت میں شامل ہوتا ہے کسی میں کم کسی میں زیادہ، کوئی بھی ان حاکمانہ رویوں سے خالی نہیں ہوتا اور جہاں بات عورتوں کی حوصلہ افزائی کی آ جائے تو وہاں تو سونے پر سہاگہ والی مثال پوری ہو جاتی ہے۔ تم فکر مت کرو، اماں زبان کی جتنی تیز ہیں دل کی اتنی نرم و شیریں ہیں۔''

''میں معافی مانگ لوں گی ان سے، کہہ دوں گی گزشتہ باتیں سب بھول جائیں، یوں سمجھیں ہم ابھی ملے ہیں۔ کل ہمارے درمیان میں آیا ہی نہیں۔ ہم آج ملے ہیں، ہماری خوشگوار زندگی کی ابتدا آج سے ہوئی ہے۔'' فریحہ ندامت بھرے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

''ایسی باتیں ہر گھر میں ہو جاتی ہیں۔ اگر ہم اپنے ذہنوں میں لگے خود غرضی و ناعاقبت اندیشی کے جالوں سے پاک صاف ہو جائیں تو ہمارے دل و دماغ ہی نہیں گھر اور چہرے بھی خوب صورت اجالوں سے جگمگانے لگیں گے۔ مال و دولت وہ مسرتیں، وہ الوہی خوشیاں فراہم نہیں کرتی جو سچی محبت اور بے لوث چاہتیں ہمیں بخش دیتی ہیں۔ جن سے ہمارے دل ہی نہیں روحیں بھی سرشار و مسرور ہو جاتی ہیں۔ انسان کے وجود کی تخلیق کا پہلا مطلب عبادت ہے اور دوسرا محبت۔ عبادت، محبت انسان کی اصل شناخت ہے۔ انسان کی تکمیل ہیں اور جو ذی روح اپنی شناخت، اپنی بنیاد کو بھول جائے گا وہ خود کو قائم کس طرح رکھ سکتا ہے؟ اللہ کی عبادت اور اللہ کی محبت کی خاطر اللہ کے بندوں سے محبت کرنا، آج ہم ان احکامات سے غافل، بے پرواہ، بے نیاز ہوتے جا رہے ہیں۔ اسی طرح تو اتنے سے مسائل و دو مسائل، پریشانیاں و پریشانیاں ہمارا

مقدر بنتی جا رہی ہیں۔ ہمارے اعمال میں نمود و نمائش آ گئی ہے۔ ہم کسی تنگ دست کی مدد کرتے ہیں تو اللہ کی خوشی مدنظر نہیں ہوتی بلکہ خودنمائی ملحوظ خاطر رکھی جاتی ہے۔
جب تک ہم سچے دل سے، پوری نیک نیتی سے اللہ سے معافی نہیں مانگیں گے، اس کے حضور خود کو بدلنے، نیک بننے بلکہ اس کے لئے پسندیدہ بندے بنانے کی دعائیں کریں گے تو وہ مالک و مولیٰ ہماری گناہ آلود زندگیوں کو بدل سکتا ہے۔ ہماری دعاؤں میں یہ دعا بھی لازمی ہونی چاہئے کہ یا اللہ! آپ ہمیں ایسا ہی بننے کی توفیق عطا فرمایئے جیسا آپ ہمیں دیکھنا چاہتے ہیں۔''
''حارہ، یہ تو ہے۔ دعائیں بھی ہمارے دل کی خواہشوں کا حصہ ہوتی ہیں اور دل کا تعلق سیدھا رب العالمین سے جڑا ہوا ہوتا ہے۔ جتنی ہماری دعاؤں میں تاثیر ہوگی اتنی ہی شدت سے دعائیں مستجاب ہوتی ہیں۔ میں پچھلے دنوں سے دعا مانگ رہی تھی کہ بے جی اور اماں مجھے لینے آئیں اور دیکھو وہ دونوں ہی مجھے لینے آ گئی تھیں۔'' فریحہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

□●□

عورت جب قربانی دینے پر تیار ہو جائے تو بڑی سے بڑی، عزیز سے عزیز تر چیز قربان کر ڈالتی ہے اور معمولی سے دکھ و افسردگی کا احساس تک نہیں ہوتا۔ یہی حال حرا کا تھا۔ امی حضور نے کچھ اس انداز میں اپنے خدشات کا اظہار کیا تھا کہ وہ جو خرم کی از حد محبت اور بھرپور توجہ پا کر خود کو ان کے بغیر ادھورا و نامکمل سمجھنے لگی تھی، ان کی بے لوث چاہتوں کی ایسی اسیر ہوئی تھی کہ تصور میں بھی ان سے جدائی برداشت نہ تھی۔ ان کی محبت، چاہت، رفاقت اسے ہر قیمتی شے سے عزیز تھی۔ وہ صرف ان کی قربت کی خواہش مند تھی۔ اسے فقط ان کی الفت کی کرم نوازیاں مطلوب تھیں۔ وہ ان سے منسوب تھی اور انہیں تا حیات خود سے وابستہ رکھنا چاہتی تھی۔ ان جذبات سے سرشار اس نے وہی کیا جو امی حضور نے اسے مشورے دیئے تھے۔
خرم اس کے لئے اعلیٰ سے اعلیٰ ترین ملبوسات خریدتے تھے۔ مہنگی جیولری اس کے پاس موجود تھی۔ امپورٹڈ میک اپ اور پرفیومز اس کے پاس بے حساب موجود تھا جو ایسے ہی پیک شدہ رکھا تھا۔ میک اپ کی وہ عادی نہ تھی سو خرم کے از حد اصرار پر چند لپ اسٹکس، پاؤڈرز اور پرفیومز کے علاوہ کسی اور سامان کی اس نے پیکنگ تک نہ چھوئی تھی۔ وہ اسی طرح محفوظ رکھا ہوا تھا۔
اس کے لباس میں جارجٹ، سلک اور بنارسی ساڑیوں کے علاوہ جاپانی کپڑے کے شلوار سوٹ و پاجامے کے علاوہ بے شمار سوٹ موجود تھے جن پر نفیس اور فیشن کے لحاظ سے کڑھائی کے علاوہ جدید فینسی ورک جھلملا رہا تھا۔ وہ سادگی پسند تھی، پھر بچپن سے بہت معمولی و سادہ ملبوسات زیب تن کرنے کی عادی تھی اور کچھ فطرتاً بھی چمک دمک و شو شا پسند نہیں کرتی تھی۔ خرم کے اصرار کے باوجود وہ ایسے بھاری ملبوسات کو استعمال نہ کر سکی تھی جو ایسے ہی رکھے تھے اور یہی حال زیورات کا تھا۔ خرم نے سونے، چاندی، ہیروں کے علاوہ نایاب و قیمتی پتھر و موتیوں سے آراستہ زیورات کے ڈھیر لگا رکھے تھے جن میں سے وہ ہلکے سے کام والا سونے کا سیٹ پہنے رہتی تھی جو لاکٹ اور نازک سی بالیوں پر مشتمل تھا۔ البتہ دونوں ہاتھوں میں سونے کی چوڑیاں کڑوں کے ہمراہ بڑے شوق سے پہنتی تھی۔ ان کے علاوہ اسے کسی اور چیز سے لگاؤ نہ تھا۔ لیکن خرم اپنی لائی چیزوں کا بڑا خیال رکھتے تھے اور وقتاً فوقتاً سمجھاتے رہتے تھے کہ وہ ان کی لائی ہوئی چیزوں کو حفاظت سے رکھے اور ان کا ذکر امی حضور سے بھی کرنے سے منع کر چکے تھے۔
اسے ان کی اسی بات سے اختلاف تھا کہ وہ ماں کی بالکل بھی عزت نہیں کرتے بلکہ چیزوں کو حفاظت سے رکھنے کی تاکید کر کے انہیں بے اعتبار بھی ظاہر کر دیا تھا۔ اس نے اسی وقت خفگی سے کہا تھا۔
''مجھے آپ کی یہی بات سخت ناپسند ہے کہ آپ امی حضور کو وہ عزت، وہ رتبہ نہیں دیتے جس کی وہ حقدار ہیں۔ اب بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ ان سے میں یہ سامان چھپا کر رکھوں۔''
''مائی ڈیئر! تم نہیں سمجھ سکتیں ابھی ہماری سوسائٹی کی مدرز کو وقت کے ساتھ ساتھ سب جان جاؤ گی۔ میری بات بھی، میرے جذبات بھی۔ فی الحال اس وقت سمجھانا تمہیں ایسا ہی ہے جیسے تپتی ہوئی دھوپ میں تم سے کہوں کہ چھتری کھول کر کھڑی ہو جاؤ تیز بارش ہونے والی ہے تو تم مجھے دیوانہ ہی سمجھو گی۔''
اپنی نگرانی میں سب سامان انہوں نے حفاظت سے رکھوایا تھا۔ نامعلوم وہ کیا چاہتے تھے، کیا سمجھ رہے تھے۔ وہ اس وقت ان کی ہر سوچ ہر سمجھ سے لاپرواہ تیزی سے کچھ سوٹ، زیور لے کر امی کے پاس آ گئی تھی۔ وہ دیکھتے ہی گویا ہوئیں۔
''یہ دو کوڑی کے کپڑے اور زیور میرے بچے استعمال نہیں کرتے۔ کسی کے دل جیتنے کے لئے اپنا دل دینا پڑتا ہے۔ ایسے سستے سوٹ دو گی تو کون تمہیں سر آنکھوں پر بٹھائے گا؟'' ان کا لہجہ دھوپ چھاؤں کی طرح طنز و چاشنی کی متضاد کیفیت میں ڈوبا حرا کو ہونق بنا گیا تھا۔
وہ اپنی ذات کی نفی کی اس حد تک عادی ہو گئی تھی کہ خواہشات و آرزوئیں اپنا وجود بھی کھو چکی تھیں لیکن دوسروں کے لئے اس کا دل از حد وسیع تھا۔ بہت فراخدلی سے اپنی چیزیں دوسروں میں بانٹ دینے میں خوشی محسوس کرتی تھی۔ اور یہاں تو معاملہ بھی از حد خاص تھا اور جذبات بھی خصوصی تھے۔ ان سب کو مدنظر رکھتے ہوئے وہ اعلیٰ ترین چیزوں کا ہی انتخاب کر کے لائی تھی مگر امی حضور کے لہجے نے سب جوش و خروش ماند کر ڈالا تھا۔
''یہ سونے کے سیٹ خرم بنا رہے تھے، بہت قیمتی ہیں اور یہ کپڑے بھی تمام غیر ملکی بازاروں سے خرید کر لائے تھے، دیکھیں اس ساڑی پر سچے موتیوں کے ہمراہ اصلی سونے کے تار سے کام بنایا گیا ہے۔'' اس نے ڈارک بلیو ساڑھی ان کی جانب بڑھائی جو گولڈن فینسی کام سے جھلملا رہی تھی۔ ''یہ پچ پنٹی کا غرارہ سوٹ، اس پر مقیش کا کام کیسی بہار دکھا رہا ہے اور یہ تنگ پاجامہ کرتا، سلمہ ستارے سے چمکتا ہوا ایسے لگ رہا ہے جیسے چمکتا دمکتا آسمان ہمارے ہاتھوں میں اتر آیا ہو۔ اور یہ جارجٹ کی.......''
''ہاں ہاں، میں دیکھ رہی ہوں۔ مگر مجھے وہ بھی تو دکھاؤ جو خرم میاں لاتے رہے ہیں، سب دیکھ کر ہی فیصلہ ہوگا کہ کون سے دیئے جائیں اور کون سے نہیں۔ مجھے غلط تو سمجھنا مت، یہ سب میں تمہاری بھلائی و بہتری کی خاطر کہہ رہی ہوں کہ تمہاری سرخروئی چاہتی ہوں ورنہ مجھے ان چیزوں سے اس عمر میں کیا سروکار۔ اپنی چیزیں ہی برتنے کی رغبت نہ رہی۔''
''میں سمجھ رہی ہوں امی حضور! بخدا مجھے آپ کی نیت، آپ کے خلوص پر بھروسہ ہے۔ میں جانتی ہوں آپ میری خیر خواہ ہیں۔ چلیں آئیں، آپ خود اپنے ہاتھوں سے جو مناسب سمجھیں منتخب کریں۔ میں آپ کو ٹرنک کی چابی دے دیتی ہوں۔''
خرم کی ہر ہدایت کو فراموش کر کے وہ ٹرنک اور وارڈ روب میں رکھی تمام اشیاء ان کے حوالے کر چکی تھی۔
امی حضور کی رشک سے آنکھیں پھٹ گئی تھیں۔ ایسا نادر و قیمتی سامان دیکھ کر ان کے اندر کی حاسد و تیز مزاج کی روایتی ساس انگڑائی لے کر بیدار ہو گئی تھی۔ انہوں نے بہت سرعت سے کافی سارا مہنگا سامان اپنے تصرف میں لے لیا تھا۔ دل میں بے حد خوش ہونے کے باوجود بظاہر بے نیازی و لاپروائی کا اظہار کرتے ہوئے گویا ہوئیں۔
''بس یہی سامان لے رہی ہوں، تمہارے نام سے بھیجوں گی تو بچے کچھ تو تمہاری طرف سے دل صاف کریں گے۔ پھر تمہارے تحفے انہیں ملتے رہیں گے تو ایک دن ان کے دل بالکل صاف ہو جائیں گے اور وہ تمہیں ماں سمجھنے لگیں گے۔ اور اس دن سمجھنا تم نے اس گھر میں اپنے قدم جما لئے ہیں۔'' وہ سامان ایک گٹھڑی میں باندھتے ہوئے بے تاثر لہجے میں گویا ہوئیں۔

□●□

رات سرد تھی۔
ہر طرف گہری تاریکی چھائی ہوئی اداسی پھیلا رہی تھی۔ نامعلوم کس وقت لائٹ چلی گئی تھی اور اسی بے چینی نے اسے گہری نیند سے بیدار کیا تھا۔
موسم سرد ہونے کے باعث کمرے میں گرمی و گھٹن کی وہ فضا نہ تھی جو عموماً لائٹ فیل ہو جانے کے بعد محسوس ہوتی ہے مگر پھر بھی اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ پہلے تو خاصی دیر آنکھیں پھاڑے وہ اندھیرے سے مانوس ہونے کی کوشش کرتی رہی اور چند ثانیے بعد وہ کامیاب بھی ہو گئی۔ کمرے کی اشیاء اندھیرے میں غیر واضح تھیں بلکہ کچھ عجیب عجیب ڈراؤنی سی لگ رہی تھیں۔
نیا علاقہ۔
نیا ماحول۔
نئی جگہ۔
ایک خوف کی لہر اس کے وجود میں سرایت کر گئی۔ اسی لمحے باہر سے گیدڑوں کی آوازیں ماحول کو مزید وحشت ناک بنانے لگیں۔ ساتھ جھینگروں اور مینڈکوں کی آوازیں پہلے ہی ہر سمت سے گونج رہی تھیں۔ اس نے گھبرا کر کچھ فاصلے پر سوتے ہوئے شاہ ویز کی طرف دیکھا جو دنیا و مافیہا سے بے خبر میٹھی و پُرسکون نیند میں گم تھا۔ اندھیرے کے باعث اس کے چہرے کے خدوخال واضح نہیں تھے مگر کبھی کبھی اس کے سانسوں کی آواز سنائی دے جاتی تھی جو اس کی گہری نیند کا تاثر تھی۔ وہ چند لمحے یہ سوچ کر بیٹھی رہی کہ اس کی طرح بجلی کی غیر موجودگی اور باہر سے آتا شور سن کر وہ جاگ جائے گا اور اس کے جاگنے سے اسے بھی ڈھارس مل جائے گی لیکن اس کے تمام اندازے غلط ثابت ہوئے تھے۔
کافی دیر گزرنے کے بعد بھی اس کی پرسکون نیند میں کوئی خلل واقع نہیں ہوا تھا۔ موسم بلاشبہ سرد تھا مگر اس کی عادت تھی، گرمی سردی وہ فین چلا کر سونے کی عادی تھی۔ اے سی کی کولنگ کے باوجود فین کی ہوا اسے ضرور چاہئے ہوتی تھی۔ اب بھی بجلی بند ہو جانے کے باعث فین بند ہو گیا اور ہوا رکنے کی گھٹن سے اس کی آنکھ حسب عادت کھل گئی تھی۔ جب کہ شاہ ویز اسی اطمینان سے محو خواب تھا۔ گویا بجلی کا ہونا نہ ہونا اس کے لئے کوئی وقعت و اہمیت نہ رکھتا تھا۔
اس کے اندر شاہ ویز کے لئے رشک و ستائش کی لہر سی اٹھی تھی۔ ''کتنے مضبوط و لاپرواہ انسان ہو تم۔ جس قدر انتہا پسند ظالم نظر آتے ہو اتنی ہی مظلومیت و عاجزی تمہاری ذات میں ہے۔ خواہشات و آرزوئیں تمہاری ذات کا حصہ نہیں ہیں۔ کتنی عجیب بات ہے یہ۔ جب پہلی دفعہ تمہاری اس بے نیازی، بے رخی و فطرِ اندازی نے میرے اندر توہین و تحقیر کا غبار بھر ڈالا تھا، میں جو بڑے سے بڑے اسمارٹ، ڈیشنگ، ہینڈسم نوجوان کو نظر بھر کر دیکھنا گوارہ نہ کرتی تھی، انہیں تڑپا کر، سسکا کر، رُلا کر قہقہے لگاتی تھی

نا معلوم کس طرح تمہاری یہ بے پرواہی و بے نیازی مجھے اپنی زندگی کا سب سے بڑا چیلنج لگنے لگی اور میں جو وجیہہ سے وجیہہ تر چہرے کی جانب ایک نظر ڈالنا اپنی شان کے خلاف سمجھتی تھی۔ بے اختیار میری نگاہیں تمہارے وجود کا احاطہ کرنے لگیں۔ میری تمام سوچیں، تمام خیالات، تمام منصوبے، تمام احساسات صرف اور صرف تمہارے گرد گھومنے لگے۔

میں تمہیں اپنے حُسن کے آگے سرنگوں دیکھنا چاہتی تھی۔ اپنے تمام بوائے فرینڈز کی طرح تمہیں بھی اپنے سامنے اپنے عشق میں آہیں بھرتا دیکھنا چاہتی تھی اور اسی تمنا میں، میں ہر فیصلے، ہر خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لئے وہی کرتی گئی جو میرے دل نے مجھے کہا۔ جو میرے انتقام نے مجھے راہ دکھائی۔ سود و زیاں کا تو میں نے کبھی حساب لگایا ہی نہ تھا۔ شکست سے میں واقف ہی نہ تھی۔ فتح یاب ہونا میں اپنا مقدر سمجھتی تھی۔

اونٹ جب تک پہاڑ کے نیچے نہ آئے تب تک خود کو سب سے بلند و برتر سمجھتا ہے۔ یہی حال میرا بھی تھا۔ جب تک تم سے غیر وابستہ رہی، تمہاری سنجیدگی، بے اعتنائی و گریز کو ڈرامہ سمجھتی رہی۔ لیکن جب سے تم کو قریب از حد قریب سے سمجھا، پرکھا پڑا تب ہی سے اپنی ہر سوچ، ہر ضد پر شرمندگی و ندامت کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوا۔ تم میری سوچوں سے بالکل متضاد ہو۔ شاید ہی دنیا میں کوئی ایسا مرد ہو جو تمام اختیارات رکھتا ہو، تمام حقوق کا مالک ہو کر بھی اپنے نفس و کردار پر اتنا زبردست قابو رکھتا ہو۔‘‘

وہ سنجیدگی سے سوچ رہی تھی وہ محض اس کی خوشی کی خاطر اپنی خواہشات و اختیارات سے دستبردار تھا۔ روز و شب کے دوران تنہائی کے بے شمار مواقع ان کے درمیان آئے تھے لیکن اس نے کبھی نادانستگی میں بھی اس پر ایک نگاہِ استحقاق نہ ڈالی تھی۔

رات کے اس درمیانے پہر میں وہ مدہوش سوتے ہوئے شاہ ویز کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے اپنے آج کل کے گزرے ہوئے جذباتی و غیر جذباتی لمحات کا تجزیہ کر رہی تھی۔ شاہ ویز نے سوتے ہوئے کروٹ بدلی تھی۔ رخ اس کی جانب ہو گیا تھا اور اسی لمحے لائٹ آ گئی۔ نائٹ بلب کی نیلگوں روشنی کمرے میں پھیل گئی اور فین پوری رفتار سے ہوا دینے لگا۔ پنکھے کی آواز میں باہر سے آتی آوازیں خاصی دب گئی تھیں۔ کچھ لمحے قبل جس گھٹن و بے چینی نے اسے بیدار کر ڈالا تھا وہ اب رفع ہو گئی تھی۔

وہ لیٹ گئی۔ اس نے وال کلاک کی جانب دیکھا جہاں سوئیاں دو کا ہندسہ عبور کرنے والی تھیں۔ دل میں ابھرنے والی سوچوں کو وہ راہ نہ دینا چاہتی تھی کیونکہ چند دن سے اپنے اندر ہوتی بغاوت سے فکر مند و ہراساں تھی۔ نا معلوم کیسی تبدیلی رونما ہوئی تھی جس کو وہ جانتے ہوئے بھی انجان بنی ہوئی تھی۔ ایک آنچ تھی جو آہستہ آہستہ اس کے تن من میں سلگنے لگی تھی، عجب سرور آمیز بے کلی و بے چینی تھی جو اس کے دل میں بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

جذبوں کی بدلتی شوریدہ سری، دھڑکنوں کا تبدیل انداز اسے کسی انجانی و غیر مانوس وادیوں کی سیر کروا رہا تھا۔

اس نے نگاہیں شاہ ویز کے چہرے پر مرکوز کر دیں، دل میں خوشگوار احساس جاگزیں ہوا تھا۔ رات کے اس پہر وہ اسے از حد دل کے قریب محسوس ہوا۔ وہ اپنے اس جذبے کو کوئی نام تو نہ دے پائی ماسوائے اس احساس کے کہ دل چاہا اسے دیکھے جائے، بنا کسی جنبش کے بغیر پلکیں جھپکائے۔

اس کے چہرے کے نقوش بہت جاذب تھے۔

گندمی رنگت میں سرخیاں سی گھلی ہوئی تھیں۔

کشادہ پیشانی، اونچی ناک (جس کا اسے ہر لمحہ زعم رہتا تھا) سیاہ گھنی مونچھیں، گلابی بھرے بھرے ہونٹ، اس میں انوکھی کشش و جاذبیت تھی کہ ایک نگاہ دیکھنے والا دوسری نگاہ از خود ڈالتا تھا۔ وہ اسے دیکھے جا رہی تھی اور اندر بیدار ہوتی نئی امنگوں، نئی خواہشوں اور انہونی سرگوشیوں نے اسے بے قرار کر ڈالا تھا۔

وہ بے کل، بے کل گھبرا کر اٹھ گئی۔ بھلا یہ کس طرح ممکن تھا کہ وہ جس شخص سے پوری شدت سے نفرت کرتی آئی تھی وہی شخص اب حاصلِ حیات کیوں لگنے لگا تھا؟ شدید نفرت کا دوسرا رخ شدید ترین محبت ہوتا ہے؟

’’یہ کیا ہو رہا ہے میرے ساتھ؟ شاہ ویز مجھے اتنا عزیز کیوں محسوس ہو رہا ہے؟ دل اس کے قرب کا تمنائی کیوں ہے؟ آنکھیں اسے دیکھنے، مسلسل دیکھنے کی تمنائی کیوں ہیں؟ او گاڈ! یہ کیا ہو رہا ہے؟ ...... مجھے کیا ہو رہا ہے؟‘‘ وہ متوحش سی کمرے میں چکرانے لگی تھی۔

□●□

عرفان سے اس کی ملاقات کھانے کے دوران ہوئی تھی۔

وہ اور امی حضور کھانا کھا رہی تھیں جب وہ داخل ہوا تھا اور سیدھا وہیں آ گیا تھا۔

’’بہت بھوک لگی ہے گرینڈ مدر! ہمارا انتظار بھی نہ ہوا آپ سے؟‘‘ وہ کرسی گھسیٹ کر بیٹھتا ہوا گویا ہوا۔

حرا غیر متوقع اس کی آمد پر گھبرا سی گئی تھی۔ چاولوں کی ڈش میں سے چمچے اٹھا ہاتھ وہیں تھم گیا تھا جب کہ عرفان کی اس کی جانب اٹھی نگاہ اٹھی رہ گئی تھی۔ استعجاب، اشتیاق، تجسس و ستائش کیا کچھ نہ تھا ان نگاہوں میں۔ حرا اس کی ان نگاہوں سے ہی گھبرائی تھی۔ اس نے اسے پہلی دفعہ دیکھا تھا اور امی حضور کو گرینڈ مدر کہنے سے سمجھ گئی تھی کہ وہ عرفان ہے۔ مگر اسے مسلسل پُرشوق نگاہوں سے اپنی جانب بے باکی سے دیکھنا اسے پسند نہ آیا۔ وہ نگاہیں جھکا کر بیٹھ گئی۔

’’تم نے خود ہی تو فون پر منع کیا تھا کہ کھانا باہر ہی کھاؤ گے۔‘‘ امی حضور قیمے کی ڈش اس کی جانب بڑھاتے ہوئے وضاحت کر رہی تھیں اور ایسے پسندیدہ موقع پر وہ اردگرد سے بیگانہ ہو کر اپنی نگاہوں کو ٹیبل پر سجی ڈشز تک ہی مرکوز رکھتی تھیں۔ اس وقت بھی یہی صورت حال تھی۔ انہوں نے مروتاً بھی حرا کا تعارف کرانا گوارہ نہ کیا تھا لیکن عرفان سے صبر نہ ہو سکا۔ وہ حرا کو دیکھتے ہوئے ان سے مخاطب ہوا تھا۔

’’گرینڈ مدر! یہ اپسرا سیدھی آکاش سے اتر کر یہیں براجمان ہوئی ہیں یا ان سے آپ کی ملاقات پہلے ہو چکی ہے؟‘‘

’’ہیں ...... کون اپسرا؟‘‘ انہوں نے قریب رکھی عینک آنکھوں پر لگاتے ہوئے استعجابیہ انداز میں استفسار کیا اور پھر اس کا چہرہ حرا کی جانب دیکھ کر مسکرا کر گویا ہوئیں۔

’’یہ حرا ہے، تمہاری اسٹیپ مدر۔‘‘ وہ سرسری تعارف کرا کر دوبارہ بہاری کباب کی ڈش کی جانب متوجہ ہو چکی تھیں۔ جب کہ عرفان کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا تھا۔ جن نگاہوں میں بے باکی و شوخی کے رنگ بھرے ہوئے تھے وہاں اب بے یقینی و اضطراب کی سی کیفیت موجزن تھی۔

اس کی نگاہوں کا انداز، چہرے کے تاثرات بدلے تو حرا کو بھی حوصلہ ہوا اپنے رشتے کے حوالے سے حق ادا کرنے کا۔ گو سوتیلی ماں ہی سہی مگر ماں تھی اس کی۔

’’کھانا کھائیں آپ۔ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔‘‘ اس کے پُراعتماد لہجے میں خرم کے لہجے جیسی پُراعتمادی و وقار تمکنت تھی۔

’’جی میں کھا رہا ہوں۔ آپ بھی کھائیں۔‘‘ وہ آہستگی سے کہتا ہوا اپنی پلیٹ پر جھک گیا تھا۔

شروع شروع میں چند دنوں تک وہ اس سے خاصے جھجکتے ہوئے انداز میں ملتا رہا تھا پھر آہستہ آہستہ وہ اجنبیت و جھجک ختم ہوتی گئی۔

’’ایک بات پوچھوں آپ سے؟‘‘ اس وقت رات کے کھانے سے فارغ ہونے کے بعد وہ امی حضور کے ساتھ بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ جب امی حضور سونے کے لئے دراز ہو گئیں تو وہ بھی سونے کے لئے اپنے کمرے کی جانب بڑھنے لگی تبھی عرفان نے رک کر سوال کیا تھا۔

’’میرے خیال میں ہمارے درمیان میں کوئی غیریت والا رشتہ نہیں ہے کہ آپ کو کوئی بات پوچھنے سے قبل اجازت درکار ہو۔‘‘ وہ مشفقانہ انداز میں گویا ہوئی تھی۔

’’ایک منٹ ...... میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ ہمارے درمیان میں کوئی غیریت نہیں ہونی چاہئے۔ یہ زندگی بہت مختصر ہے، جتنا ہو سکے اسے ہنسی خوشی گزارنا چاہئے۔ لیکن میں دیکھ رہا ہوں آپ یہاں اس طرح رہتی ہیں جیسے کوئی قیدی نظر بندی کی زندگی گزار رہا ہو۔ ایسا کیوں ہے؟ کیا خرم صاحب نے پابندیاں لگائی ہیں آپ پر؟‘‘ وہ سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔

’’نہیں ...... خرم نے کوئی پابندی نہیں لگائی بلکہ میں بہت آزاد و خوشحال زندگی گزار رہی ہوں، باہر میں اس لئے نہیں نکلتی کہ عزیز کوئی ہے نہیں۔ ماموں اور ممانی تھے وہ بھی کچھ عرصہ قبل وفات پا چکے ہیں۔ ایک بڑی بہن ہیں وہ اپنے شوہر کے ساتھ دبئی میں رہائش پذیر ہیں۔ اب باہر میں کس سے ملنے جاؤں؟ ضروریاتِ زندگی کی ہر شے مجھے گھر بیٹھے ہی مل جاتی ہے۔ بلا جواز گھر سے نکلنا میں معیوب سمجھتی ہوں ورنہ ایسی کوئی بات نہیں جو آپ سمجھ رہے ہیں۔ اور ایک بات یہ کہ مجھے آپ کا خرم کو نام سے پکارنا قطعی پسند نہیں آیا۔ انسان کتنا ہی تہذیب یافتہ کہلائے، کتنا ہی ماڈرن بن جائے مگر باپ کو ان کے نام سے پکارنا کسی مہذب شخص کو زیب نہیں دیتا۔‘‘ اس کے وضاحتی لہجے میں ناگواری بھی تھی۔ خرم کو نام سے پکارنا اسے نہ بھایا تھا۔

’’ارے ...... آپ مائنڈ کر گئیں؟ سوری ...... ایکچوئیلی میرا ہرگز ارادہ آپ کی دل آزاری نہ تھا۔‘‘ اس کے لہجے میں حقیقی خجالت تھی۔

’’او کے، کوئی بات نہیں۔ بچوں سے غلطی ہو جاتی ہے مگر ماں برا نہیں مانتی۔‘‘

’’ماں ...... اور وہ بھی آپ؟‘‘ عرفان بے ساختہ کھلکھلا کر ہنسا تھا۔

’’مجھے معلوم ہے کہ میں آپ کی سگی ماں نہیں ہوں لیکن ضروری نہیں عمروں کی خلیج جذبوں کو تقویت نہ بخشے، شفقت کا تعلق جذبوں کا مرہونِ منت ہوتا ہے عمروں کا محتاج نہیں۔ آپ مجھے کچھ بھی کہیں مگر خرم کے حوالے سے آپ مجھے سگے بیٹے کی طرح عزیز ہیں۔‘‘ اس لمحے اس نوخیز حُسن رکھنے والی لڑکی کی زبان میں پختہ اور ممتا سے چور عورت کی تاثیر تھی۔ اس کے لہجے، چہرے، آنکھوں سے ایک مکمل ماں کا تقدس عیاں تھا۔

عرفان نے حیرانی اور ناپسندیدہ نگاہوں سے اس دھان پان سی شفاف رنگت والی لڑکی کو دیکھا تھا جس کا حُسن پھولوں کو شرماتا تھا۔ جس کی سیاہ بھنورا آنکھوں کی چمک کے سامنے ستارے بھی ماند نظر آتے تھے۔ جس کے حُسن کی چمک دل پر برق بن کر گرتی تھی۔ جو عمر میں اس کی چھوٹی بہن سے بھی چھوٹی تھی، وہ اسے ممتا کا درس دے رہی تھی جو اس کا ذہن کبھی قبول نہیں کر سکتا تھا۔

وہ بنا کچھ کہے وہاں سے تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

□●□

محبت ایک ایسے احساس کا نام ہے جو کسی کے ہونے سے تو نہیں ہوتا مگر کسی کے نہ ہونے سے ہوتا ہے اور انسان کو سرتاپا تبدیل کر ڈالتا ہے۔

محبت نہ ہو تو صدیاں گزر جاتی ہیں اور ہو جائے تو پل بھر میں ہو جاتی ہے۔ یہی وہ آگ ہے جو لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بجھے۔ از حد پُراسرار ہوتی ہے یہ آتشِ عشق جو تن

من جلا کر خاکستر کر ڈالتی ہے مگر نادیدہ رہتی ہے اور ستم یہ ہے اسے بھی دکھائی نہیں دیتی جس کو جلا رہی ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔
اس پر دل کی انہونی خواہش کا انکشاف کیا ہوا گویا دنیا ہی بدل کر رہ گئی اور وہ اپنی تمام تیزی، طراری، طنطنہ، غرور، اعتماد و افتخار بھول کر ایک عام سی خاموش، سادہ و سنجیدہ مزاج لڑکی بن کر رہ گئی۔
''اف کتنی عجیب بات ہے مشی ...... تم جو بہت بلندی پر پرواز کرنے کی عادی تھیں، نیچے دیکھنا تمہیں توہین محسوس ہوتا تھا۔ تم جو پیر کا جوتا تک ہائی کوالٹی کا چوائس کرتی تھیں، آج اپنے لائف پارٹنر کے طور پر ایک مف اینڈ روڈ شخص کو سلیکٹ کر رہی ہو جو کسی بھی حوالے سے تمہاری چوائس، تمہارے اسٹینڈرڈ، تمہاری سوسائٹی سے میچ نہیں ہوتا۔'' اس کے اندر کوئی فریاد کر رہا تھا۔ اسے اس راہ سے واپس لوٹ جانے کو کہہ رہا تھا جس پر وہ پاؤں رکھ چکی تھی۔
''میں نہیں جانتی میرا یہ فیصلہ درست ہے یا غلط، یہاں میں کامیاب ہوں گی یا ناکام؟ مگر میں یہ جانتی ہوں کہ مجھے اس کے ساتھ رہنا اچھا لگتا ہے، اس کے سنگ چلنے میں فخر محسوس ہوتا ہے۔ جب میں اس کے ساتھ ہوتی ہوں تو ایسا لگتا ہے جیسے کسی آہنی قلعے کے حصار میں ہوں۔ از حد محفوظ کہ گرم و سرد ہوائیں بھی اس کی اجازت کے بغیر مجھے چھو نہیں سکتیں۔
اس کی رفاقت مجھے خوشی بخشتی ہے، من کو شانتی۔ اسے پا کر مجھے محسوس ہوا اور اصل مرد ہوتا کیا ہے۔ غیرت، عزم، حوصلہ، حمیت و شرافت کا دوسرا نام مرد ہے۔ مکمل چھاؤں، سائبان اور محافظ۔''
خود سے لڑتے ہوئے سمجھاتے ہوئے اسے تین دن ہو گئے تھے۔ نہ جانے انا کی شکست تسلیم نہ ہو پا رہی تھی یا خودداری کا زعم۔ چکنا چور ہو جانے کے بعد وہ اس حقیقت سے نگاہیں چرا رہی تھی کہ شاہ ویز اپنی تمام اکھڑ مزاجی، بے اعتنائی، لاپروائی و بے رخی کے باوجود دل کے کسی خانے میں براجمان ہو گیا تھا۔
وہ متضاد کیفیت کا شکار تھی۔
کبھی دل کی چاہت کو سراہتی، مسرور ہوتی اور کبھی پژمردگی و انتشار سے بے چین و مضمحل ہونے لگتی تھی۔
یہ تین دن تین صدیاں بن کر اس پر گزر رہے تھے۔ ان دنوں وہ خود سے ہی نہیں شاہ ویز سمیت سب سے بیگانہ رہی تھی۔ سوچوں کے عمیق سمندر کی گہرائیوں میں ڈوبتی ابھرتی ناؤ کی طرح تھی۔
شاہ ویز اس کی دلی حالت سے بے خبر بہت خاموشی سے اسے الجھے الجھے، گم صم دیکھ رہا تھا اور اس کی عادت سے واقف ہونے کی وجہ سے اس کے حال پر ہی چھوڑ رکھا تھا۔ لیکن تین دن گزرنے کے باوجود بھی اسے اسی انداز میں دیکھا تو اب نظر انداز نہ کر سکا۔ قریب بیٹھتے ہوئے نرمی سے گویا ہوا۔
''اینی پرابلم؟ تین دن سے کمرہ نشین کیوں ہو گئی ہو؟'' جذبات بدلے تو احساسات خود ہی تبدیل ہو گئے۔ وہ قریب بیٹھا تو دل از خود ہی نئے انداز میں دھڑکا تھا۔ وہ غیر محسوس انداز میں کچھ سمٹ گئی۔
وہ قریب پہلی بار نہیں بیٹھا تھا۔ اکثر ایسے مواقع آتے رہتے تھے۔ لیکن اب سے قبل ایسی تفریق گھنٹیاں پہلے کبھی نہ بجتی ہوئی محسوس ہوئی تھیں۔
''ناراض ہو؟'' جواب ندارد۔
''ہوں، ناراض ہو۔ اس دن تمہیں جنگل میں ڈانٹا تھا اس لئے۔'' اس کی خاموشی کو ناراضگی پر محمول کرتا وہ کہہ رہا تھا۔
''اس معاملے میں تمہاری ناراضگی، خفگی یا خاموشی میں قطعی برداشت نہیں کروں گا کیونکہ غلط بات مجھ سے برداشت نہیں ہو سکتی۔ اور اس دن تم نے بہت غلط حرکت کی تھی بلکہ...... بلکہ اگر میں تمہاری نیچر سے واقف نہ ہوتا تو ایک سیکنڈ بھی تمہیں ساتھ رکھنا گوارا نہ کرتا۔ کیونکہ مجھ جیسا آدمی کبھی بھی اخلاق سے بے بہرہ عورت کو برداشت کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ حمیت کے معاملے انسان کو از حد تنگ ذہن بنا ڈالتے ہیں۔''
''میں خفا نہیں ہوں، بلکہ بہت گلٹی فیل کر رہی ہوں۔ اس دن جو کچھ ہوا وہ اچھا نہیں ہوا۔ ایکچوئلی میری کیئرنگ میری مما نے نہیں کی اس لئے شاید ایسی ہوں۔ ورنہ ایسے موومنٹس لائف میں کبھی نہیں آتے۔'' شاہ ویز کے گمبھیر لہجے میں ناگواری اس نے شدت سے محسوس کی تو اپنی صفائی میں بول اٹھی۔
''دیکھو، مچھلی کے بچے کو کوئی تیرنا نہیں سکھاتا اور نہ ہی چڑیا کے بچے کو اڑنا۔ تیرنا اور پرواز کرنا ان کی فطرت میں شامل ہوتا ہے اور وہ بغیر گائیڈنس کے سوئمنگ بھی کرتے ہیں اور قلابازی بھی۔ پھر ہم تو اشرف المخلوقات ہیں۔ ہمیں سوچنے، سمجھنے کے لئے عقل استعمال کرنے کی صلاحیت دی گئی ہے۔ اچھے اور برے کی تمیز دی گئی ہے اور جو اپنے بڑوں سے تمیز نہیں سیکھتے انہیں وقت از خود سکھا دیتا ہے۔'' اس نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔
''ہاں جس طرح میں سیکھ گئی ہوں۔ ورنہ لوگوں کو اپنی کسوٹی پر پرکھنے کی عادی تھی۔ کبھی کوئی لمحہ ہماری زندگی میں ایسا بھی آتا ہے ہم جو گتھی سالوں میں نہیں سلجھا پاتے وہ لمحے میں سلجھا لیتے ہیں اور میری زندگی میں بھی ایک ساتھ کئی لمحے ایسے آکر مجھے آگہی در آگہی سے ہمکنار کر گئے۔''
کھوئی کھوئی سی رندھے لہجے میں بولتی گویا وہ اس سے نہیں کسی اور سے مخاطب تھی۔ شاہ ویز نے پریشان کن انداز میں اس کی جانب دیکھا تھا۔ جامنی کاٹن کا سوٹ شکن آلود تھا، بال الجھے الجھے، وجاہت چہرے پر عجیب اداسی و بے چارگی پھیلی ہوئی تھی۔ سیاہ دراز پلکیں عارضوں پر جھکی ہوئی مخروطی انگلیوں کو ایک دوسرے میں بار بار پیوست کرتی وہ کوئی معصوم سی لڑکی لگ رہی تھی۔ شعلہ صفت و بے رحم مشعل بجھ چکی تھی۔
''یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے تم نے...... طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟'' اس نے فکر مندی سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر دریافت کیا تھا۔
نامعلوم کیا ہوا تھا اسے، اس کی مضبوط و پُرحدت انگلیوں کے لمس کا کرشمہ تھا یا کم ہمت و حوصلہ ہو گئی تھی کہ بے اختیار اس کے سینے سے لگ کر شدتوں سے رو پڑی تھی۔
شاہ ویز بھونچکا رہ گیا۔
اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس ردعمل کا اظہار کرے گی۔ وہ حیران پریشان سوچ رہا تھا کہ ایسا کیا ہو گیا؟
''مشعل! کیا ہوا ہے؟ پلیز بتاؤ، تمہیں میری کسی بات سے دکھ پہنچا ہے؟ تکلیف ہوئی ہے؟''
''نہیں، دکھ تو میں نے آپ کو دیئے ہیں، تکلیف میں نے آپ کو پہنچائی ہے اپنے ہر عمل سے، ہر طریقے سے، بہت بری ہوں میں ...... بہت بری ...... مجھے معاف کر دیں۔ پلیز مجھے معاف کر دیں ورنہ میں مر جاؤں گی۔'' وہ اس کے سینے سے لگی بچوں کے انداز میں روتے روتے کہہ رہی تھی۔
شاہ ویز پاگلوں کی طرح اپنے بازوؤں پر اس کے بکھرے کولڈن بالوں کو دیکھ رہا تھا۔ اسے اپنی سماعت پر دھوکے کا گمان ہو رہا تھا۔ ذہن میں دھماکے ہو رہے تھے، اسے یہ سب خواب لگ رہا تھا۔
''ارے مر تو میں جاؤں گا اس ناگہانی پر ...... پہلے تو مجھے شک تھا مگر اب یقین ہو چلا ہے کہ تم بیمار ہو۔ جسمانی ہی نہیں ذہنی بھی۔'' وہ مشعل کو خود سے علیحدہ کرتے ہوئے خاصے کنفیوژ انداز میں کہہ رہا تھا۔
''میں پاگل نہیں ہوئی ہوں، بلکہ آج سے قبل پاگل تھی۔''
''آج سے میں پاگل ہو جاؤں گا۔''
''میں جانتی تھی آپ کو میری باتوں کا یقین نہیں آئے گا لیکن میں سمجھتی ہوں اگر میری نیت میں کھوٹ نہیں ہے میری شرمندگی وقتی یا کسی جذبے کی مرہون منت ہے تو وہ وقت بھی ضرور آئے گا کہ جذبوں کی سچائی اپنا آپ خود عیاں کر دے گی۔'' اس کی حد درجہ بے اعتمادی عود کر آئی تھی۔ وہ آنسو صاف کرتے ہوئے پُرعزم لہجے میں کہہ رہی تھی۔
اس سے بدتمیزی کرتے وقت کبھی بھی اس کی زبان نہیں لڑکھڑائی تھی تو اس لمحے اقرار وفا کرتے وقت بھی اس کا لہجہ پُراعتماد و بے جھجک تھا۔ شاہ ویز کو اس کا یہ وفاداری، جاں نثاری و تابعداری کا انداز بالکل پسند نہیں آیا تھا۔ اس کے خیال میں عورت اپنے منہ سے اظہار جذبات کرتی اپنی پاکیزگی، نسوانیت و حیا کو نیست و نابود کر دیتی ہے۔ اپنا احترام کھو دیتی ہے۔
ایسے نازک و خوب صورت جذبوں کا اظہار تو صرف مردوں پر جچتا ہے۔ عورت شرم و حیا کی چادر میں ملفوف ہی شاندار و پُروقار لگتی ہے۔
اس کی پہل نے اسے مسرور و شاداں کرنے کی بجائے مزید بدظن و نالاں کر دیا تھا۔ وہ کچھ کہنے کو آمادہ نہیں تھا۔
مشعل نے ذرا کی ذرا اس کی جانب نگاہیں اٹھائی تھیں اور اس کے چہرے پر رقم ناپسندیدگی و ناگواری کی شکنوں نے اس کے کومل کومل جذبوں کو پتی پتی کر ڈالا تھا۔ اس کی یہ اجنبیت و بیگانگی اسے متوحش کر گئی۔
شاہ ویز بیڈ پر بیٹھا تھا۔ وہ کارپٹ پر اس کے قدموں کے قریب گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی اور رقت آمیز لہجے میں گویا ہوئی۔
''مجھے اب اس وقت تک سکون نہیں ملے گا جب تک آپ مجھے معاف نہیں کر دیں گے۔ میں کسی بھٹکی ہوئی روح کی طرح بے چین و بے قرار رہوں گی۔''
''اٹھو...... یہ کیا پاگل پن ہے؟'' اس نے جھک کر ہاتھ پکڑ کر اسے کارپٹ سے اٹھایا تھا، پھر بیڈ پر بٹھاتے ہوئے گویا ہوا۔
''میں تمہارے جذبات کی قدر کرتا ہوں، تمہاری فراخ دلی و بہادری کا بھی اعتراف ہے مجھے لیکن میں وہ نہیں ہوں جو تم مجھے سمجھ رہی ہو۔ نہ تو میں حاتم طائی ہوں اور نہ سندباد جو دوسروں کی زندگیوں کی خاطر اپنی زندگی کی امنگوں و خواہشوں کو کچل دے۔ میں ایک بے حد عام سا، کمزور و بے بس بندہ ہوں جو اپنی زندگی اپنے طور پر جینے کا آرزومند ہے۔ جس میں تھوڑی سی امنگیں، بڑی محدود خواہشیں، کچھ چاہنے اور چاہے جانے کے جذبات، ایک چھوٹا سا گھر جہاں پیار و محبت کے پھول سدا کھلتے ہوں، جن سے محبت و وفا کی خوشبوئیں ہر دم مہکتی ہوں۔ بس اس سے زیادہ کی خواہش نہیں ہے مجھے اور یقین ہے کبھی نہ کبھی میری یہ آرزو ضرور پوری ہو گی۔'' پہلی بار اس نے اپنے دل کی باتیں اس کے گوش گزار کی تھیں۔ وہ اسے دیکھ رہی تھی۔
اس لمحے اس کے چہرے پر پھیلی البیلی چمک عجب تھی۔
اس کے بھاری لہجے کی گمبھیرتا، آنکھوں میں آنے والے لمحوں کا عکس کرنوں کی طرح جھلملا رہا تھا۔ بظاہر سخت مزاج، سنگدل نظر آنے والا بندہ اعلیٰ ذوق کا حامل تھا جو باہر سے سخت تو تھا اندر سے اتنا ہی گداز۔

وہ بولتا بولتا بالکل خاموش ہو گیا اور ساکت وجامد بیٹھی مشعل پر ایک نظر ڈالی پھر بنا کچھ کہے باہر نکلتا چلا گیا۔
اس کی نگاہوں میں اپنا عکس نہ دیکھ کر وہ سُن بیٹھی رہ گئی۔

□●□

''ارے اللہ کی مارن موئی چڑیوں پر۔ گرمیاں آئیں اور ان کم بختوں نے گھر میں کچرا کرنا شروع کیا۔ منحوسوں کو کوئی دوسرا گھر نظر نہیں آتا۔'' زرینہ دالان کی چھت کے ایک کونے میں چڑیوں کے گھونسلے سے گرنے والے تنکوں اور پروں کو سمیٹتے ہوئے غصے سے بڑبڑا رہی تھیں۔
یہ ہر سال کا تماشا تھا۔ گرمیوں کی آمد کے ساتھ ہی چڑیاں چونچ میں دبائے تنکے لے کر آتیں جو گھونسلے کے علاوہ ہمہ وقت فرش پر پڑے اُڑتے رہتے۔ ہر بار زرینہ کی کوشش ہوتی کہ وہ اس بار چڑیوں کو کامیاب نہیں ہونے دیں گی۔ وہ ہاتھ میں جھاڑن پکڑے کبھی ہش ہش کر کے، کبھی لپک کر گالیوں، کوسنوں سے نوازتی، اڑاتی رہتیں مگر چڑیوں کو بھی گویا ان کو ستانے میں خوب مزا آتا۔ وہ پھر سے اِدھر اُدھر اُڑ کر انہیں خوب دوڑاتیں، پھر وہ ہانپتی ہوئی تھک کر بیٹھ جاتیں تو وہ دوبارہ اپنی تعمیری مصروفیات میں لگ جاتیں۔ آج صبح سے پھر انہیں چڑیوں کے گند پھیلانے پر طیش آیا ہوا تھا۔
''اماں چھوڑیں نا۔ کیوں ان بے چاریوں کے پیچھے لگی ہو، بے زبان پرندے ہیں۔'' سائرہ سلائی مشین پر کپڑے سی رہی تھی۔ ماں کو بلا وجہ ہلکان ہوتے دیکھ کر بولی۔
''میں پیچھے لگی ہوں یا یہ میرے گھر کے پیچھے لگی ہیں؟ اور بے زبانی کی بھی خوب کہی تم نے، چڑیا سے زیادہ زبان دراز کوئی اور پرندہ میں نے نہیں دیکھا۔ کیسے چیں چیں کر کے دماغ کھا جاتی ہیں کمبخت ماریاں۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم ان کی زبان نہیں سمجھتے لیکن یہ بے زبان تو نہیں ہیں۔'' ان کے صبر کا پیمانہ جلد ہی لبریز ہو جاتا تھا۔ قوتِ برداشت کی استطاعت بالکل نہ تھی۔ جو کام ان کی مرضی ومنشا کے خلاف کیا جاتا اس کی وہ اسی طرح دشمن بن جایا کرتی تھیں، خواہ وہ انسان ہو یا کوئی چرند پرند۔
''قسم سے اماں! مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے تم ان چڑیوں کی بھی ساس ہو۔'' سائرہ بے اختیار کھلکھلا کر ہنستے ہوئے بولی تھی۔ زرینہ کے پتنگے لگ گئے۔
''ہاں تو تمہارا بس چلے نا تو ان کپڑوں کی طرح میری زبان بھی سی ڈالو۔''
''ارے اللہ نہ کرے..... تمہاری زبان سے ہی تو گھر میں رونق لگتی ہے اماں۔''
''تبھی ہر وقت میرے بولنے پر ٹوکتی رہتی ہو۔''
''ایسی بات نہیں ہے اماں! جب آپ کسی کے ساتھ زیادتی کرتی ہیں تو مجھے اچھا نہیں لگتا۔ اس لئے میں آپ کو صرف سمجھاتی ہوں۔ جہاں ہم بے اختیار ہیں وہاں حجت کرنا بے مصرف ہے، ہر دفعہ چڑیوں کو گھونسلا بنانے سے روکنا چاہتی ہو مگر ناکام ہوتی ہو۔ گھر تو ہر ذی روح کی ضرورت ہے پھر مجھے تو ان چڑیوں پر بہت رشک آتا ہے۔ کتنی مشقت سے تنکا تنکا کر کے اپنا گھونسلا بناتی ہیں۔''
''تمہارا کام بھی ہے ہر کسی پر رشک کرنا، ترس کھانا اور گھر کا بیڑہ غرق کروانا۔ کل بلی کی حمایت لے رہی تھیں آج چڑیوں پر فدا ہو، کل گلی کے کتے پر نثار ہو جانا اور میری جگہ گھر میں اسے لاکر بٹھا دینا، مجھے تو لگتا ہے سب مجھ کو ہی جلانے کے لئے کوشاں ہیں۔''
زرینہ کی بات پر سائرہ نے مشکل سے ہنسی پر قابو پایا تھا۔ فرح گوشت میں آلو ڈالنے کے لئے وہیں کاٹنے کے لئے لے آئی تھی۔
''کیا بلی نے بھی اماں کے تخت کے نیچے بچے دے دیئے؟'' فرح بھی مسکراہٹ ضبط کرتی نیچے آلو کی ٹوکری، چھری اور برتن رکھتی ہوئی استفسار کرنے لگی۔
''ارے اس بار تو اس کا باپ بھی نہیں دے سکتا۔ میں نے تخت کے چاروں طرف چادریں باندھ دی ہیں اور اس بار تو میں اسے گھر میں بھی نہیں گھسنے دے رہی۔ ہر دفعہ میرے تخت کے نیچے گند پھیلا کر چلی جاتی ہے۔ اس بار میں اسے کامیاب نہیں ہونے دوں گی۔'' وہ کانوں میں بُندے پہنتی ہوئی گویا ہوئیں۔
''دیکھتے ہیں، بلی کو شکست ہوتی ہے یا تم کو۔ ویسے بلی نے میسرٹنی ہوم خوب چنا ہے۔'' سائرہ قمیض کی سلائی مکمل کرنے کے بعد مشین اس کی جگہ پر کھسکاتے ہوئے بولی۔
''تم بھی کیا فضول ٹاپک لے کر بیٹھ گئی ہو۔ تیار ہو جاؤ۔ پھوا پسی بھی آتا ہے۔'' فرح نے ساس کے تیور بگڑتے دیکھے تو موضوع بدلتے ہوئے سائرہ سے بولی تھی اور وہ بھی ہاتھ میں پکڑی ہوئی قمیض لے کر تیزی سے آئرن اسٹینڈ کی جانب بڑھی تھی۔ میچنگ کا دوپٹہ اور شلوار سرمئی وسیاہ پرنٹ کے رکھے تھے۔
''تم نہانے جاؤ میں اتنی دیر میں کپڑے پریس کر دوں گی بے جی انتظار کر رہی ہوں گی۔'' وہ اس کے ہاتھ سے قمیض لے کر استری کرنے چلی گئی۔
''دیکھا؟ چند مہینوں میں ہی تمام کس بل نکل گئے ناسیکے میں رہ کر۔ اب کس طرح بھاگ بھاگ کر خود بخود کام کرتی ہے۔'' وہ فرح کے دور جاتے ہی اس سے سرگوشی میں گویا ہوئی تھیں۔ اس وقت ان کے چہرے پر تمسخرانہ مسکراہٹ تھی۔ سائرہ طویل سانس لے کر رہ گئی۔

□●□

میں نے کہا
ابھی مجھے اپنے پاگل سے گلے ملنا ہے
ابھی سینے میں وحشت سرد نہیں ہوئی
میں نے کہا
ابھی مجھے اپنی دیوانگی کو لگام نہیں ڈالنی
ابھی مجھے بہت سی بے سمتیں تلاش کرنی ہے
ابھی مجھے اپنے آپ سے دور نہیں رہنا
ابھی میری بہت سی مسافت باقی ہے
ابھی مجھے تم سے وصال مار ڈالنا ہے
ابھی مجھے خود کو زندہ رکھنا ہے
میں نے کہا
اور بس میں نے کہا، باقی سب خاموش رہے

''یہاں پر کمرے میں بند ہونے کے لئے آئی ہو؟ رشیدہ، فریدہ کی ماں بھی کئی بار پوچھ چکی ہیں کہ تمہیں کیا ہوا ہے؟ کیوں کمرے سے باہر نہیں نکلتیں؟ کیوں اس قدر خاموش واداس رہنے لگی ہو؟'' شاہ ویز سنجیدگی سے اس سے مخاطب ہوا تھا۔
''کیا ہوں؟ کس کو بتاؤں؟ آگہی سے جب تک ناواقفیت تھی تب تک زندگی جنت تھی۔ اب آگہی کا ادراک گویا عذاب کا آغاز ہوا ہے۔ ہر لمحہ، ہر ساعت ایک جہنم دہکتا ہے، پچھتاووں کا، شرمندگی وندامتوں کا اور ہر اس بھول ونادانی کا جو کبھی سرزد ہوئی تھیں۔'' اس کے اندر دھواں پھیلتا چلا گیا۔
''میں تم سے مخاطب ہوں..... کوئی دیواروں سے نہیں۔'' وہ اس کی جانب کچھ جھک کر گویا ہوا تھا۔ وہ اس کے انداز پر دھیرے سے مسکرا اٹھی تھی۔
''وقت کبھی ایک سا نہیں رہتا اور نہ ہی خواہشیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ شوق وآرزوئیں بھی بدل جایا کرتی ہیں۔ پہلے مجھے روشنیوں سے عشق تھا، ہنگاموں کا کریز تھا۔ اب مجھے تنہا رہنا پسند ہے۔''
''جوگ لینے کا ارادہ ہے کیا؟'' اس کے شوخ لہجے میں استہزا تھا۔
''مجھے نہیں معلوم یہ جوگ ووگ کیا ہوتا ہے۔'' حسبِ عادت اس کا طنزیہ لہجہ اسے چڑا گیا تھا۔ وہ تنک کر بولی۔
''جوگ وہی ہوتا ہے جو عشق میں عاشق لیتے ہیں اور پھر بھی نامراد رہتے ہیں۔''
''میں اپنے جذبوں میں امیر ہوں، اس لئے مجھے ٹینس کرنے کی ضرورت نہیں مسٹر۔'' وہ جھٹکے سے کھڑی ہو گئی۔
شاہ ویز کھلکھلا کر ہنس پڑا تھا۔ اس کے بھاری لہجے کی دلکشی، وجیہہ چہرے کی طمانیت صاف مضحکہ اڑاتی لگ رہی تھی۔
اس نے ایک نظر اس پر ڈالی۔
وہ حسبِ معمول خوش باش، مطمئن ولاپرواہ تھا۔ اس کے کسی اضطراب، لگن، جذبے اور بے سکونی کا اس پر کوئی اثر نہ تھا۔
اس کی محبت
اس کا اقرار
اس کے لئے گویا کوئی وقعت نہیں رکھتے تھے۔ اسے اس کی دل آزاری ومضحکہ خیزی کا وسیع موقع مل گیا۔ یہ احساس دل پر چوٹ بن کر لگا تھا اور اس شدید چوٹ کا درد آنکھوں سے آنسو بن کر بہنے لگا تھا۔
وہ رخ پھیر کر بہتے آنسو صاف کرنے لگی۔
''تم نے کبھی نماز پڑھی؟ نماز پڑھنے سے دل کو سکون ملتا ہے۔ روح سرشار ہو جاتی ہے۔ عشق مجازی سے عشق حقیقی زیادہ خالص وطاقت ور ہوتا ہے۔ گناہوں کا اعتراف اور سچے دل سے توبہ، بندوں کو منوں بوجھ سے آزاد کر کے راحت وسکون بخشتی ہے۔ تم بھی رب سے پوری دیانت داری کے ساتھ، مکمل سچائی سے اپنے صغیرہ وکبیرہ گناہوں سے توبہ کرو، معافی مانگو، عاجزی وانکساری کے ہمراہ۔ دیکھنا وہ کتنا شفیق ورحیم ہے۔ اس کی رحمت ایک ایسے سمندر کی مانند ہے جس کی وسعت وگہرائی کا اندازہ لگانا ناممکن ہے۔ اس کی رحمت سے ہر کوئی فیض یاب ہوا ہے خواہ وہ نافرمان ہو یا فرمانبردار، کفر وشرک کی اندھیری وادیوں کا باسی ہو یا شمع نور سے جھلملاتا ہوا صاحب ایمان، وہ منصف سب سے انصاف کرتا ہے۔''
وہ بول رہا تھا۔

ازحد دھیمے اور نرم لہجے میں۔ اس کی آواز مخصوص طنز وطعنوں سے پاک سادہ وپُراثر تھی۔

وہ اسے دیکھ رہی تھی ششدر سی۔

''کیا دیکھ رہی ہو؟ میری باتیں بری لگ رہی ہیں یا سمجھ میں نہیں آرہیں؟'' اسے بالکل گم صم وخاموش دیکھ کر وہ آہستگی سے مسکرا کر استفسار کر بیٹھا۔ مشعل کو اس کی مسکراہٹ پسند تھی۔

مسکراہٹ شاہ ویز کو اسی طرح منور کرڈالتی تھی جیسے چاندنی کو چاند۔ مشعل نے نگاہیں جھکالی تھیں اور ایک گہری سانس اس کے لبوں سے بے آواز خارج ہوئی تھی۔

اس کی روشن مسکراہٹ۔

اس کے ملبوس کی مہک۔

پرفیوم کی خوشبو یا

اس کے بے ربط وسادہ لہجے میں کوئی ایسا سحر تھا جو اس کے ذہن میں لگے بے حسی کے تالوں کو آن واحد میں توڑ بیٹھا تھا اور وہ سمجھی، نا سمجھی کی کیفیت میں چکرا گئی۔

❑●❑

ایک نہ معلوم سا احساس تھا جو اسے گہری نیند میں بھی بے کل کر بیٹھا تھا۔ اس نے غنودگی میں محسوس کیا کوئی اس کے بے حد قریب ہے۔

ناگوار بوگرم سانس کے ساتھ اس کے چہرے سے ٹکرائی تھی۔ اس کے خوابیدہ احساسات پوری طرح سے بیدار ہوگئے اور اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔

سامنے کھڑے شخص کو دیکھ کر پہلے تو اسے اپنی آنکھوں پر دھوکے کا گمان ہوا مگر اس کے ہونٹوں پر سجی عجیب مسکراہٹ وآنکھوں سے جھانکتے ناقابل فہم رنگ دیکھ کر اسے اپنی بصارت پر یقین ہوگیا تھا۔

''آ.......آ.......آپ یہاں......اس وقت؟'' بیڈ کے قریب کھڑے عرفان کو دیکھ کر وہ ہراساں سی اٹھ بیٹھی تھی۔

''خیریت تو ہے نا؟'' سرہانے رکھے دوپٹے کو پھیلا کر اوڑھتے ہوئے وہ پریشان کن لہجے میں گویا ہوئی تھی۔

''خیر، خیریت ہی تو نہیں ہے۔'' وہ بہکے بہکے انداز میں کہتا ہوا بیڈ پر بیٹھ گیا۔

حرا نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔ اس کی آنکھیں بے تحاشہ سرخ ہو رہی تھیں، ایسی ہی سرخی چہرے پر بھی چھائی ہوئی تھی۔ شرٹ کے بٹن کھلے ہوئے تھے، ایک ناگوار بُو اس کے منہ سے خارج ہو رہی تھی۔ اس کا غیر متوازن لہجہ، غیر متوازن چال ظاہر کر رہی تھی کہ وہ نشے میں ہے۔ عقل وشعور سے بے نیاز۔

حرا کو تکلیف دہ جھٹکا لگا تھا۔ اس نے سراسیمگی نظر دروازے کی طرف ڈالی۔ وہ اسی طرح لاک تھا جس طرح وہ کر کے سوئی تھی۔ البتہ وہاں سے پردہ ہٹا ہوا تھا۔ وال کلاک نصف رات ہونے کا اعلان کر رہا تھا۔

''کیا ہوا......تمہاری مٹی کیوں گم ہوگئی ہے؟'' وہ حرا کی جانب دیکھتا ہوا مکروہ مسکراہٹ سے گویا ہوا۔

''تم کمرے میں کس طرح آئے؟ میں لاک کر کے سوئی تھی۔'' حرا نے اس کے تم کو نظر انداز کر کے سخت لہجے میں پوچھا جسے سن کر چند منٹ وہ بے ہنگم انداز میں ہنستا رہا پھر بولا۔

''یہ گھر میرا ہے اور اس کے چپے چپے سے مجھے اتنی واقفیت ہے کہ میں آنکھیں بند کر کے بھی ہر گوشے میں اس طرح پہنچ جاؤں جس طرح آنکھیں کھول کر جاتے ہیں۔ اسی طرح یہاں نصب شدہ ہر دروازے کی ایکسٹرا کنجیاں میرے پاس ہوتی ہیں کہ جب جہاں جانا چاہوں با آسانی جا سکتا ہوں۔'' وہ کسی شعبدہ باز کی طرح فخریہ انداز میں کہہ رہا تھا۔

''لیکن تمہیں کیا کام تھا جو تم اس طرح بلا اجازت میرے بیڈروم میں بے وقت آئے ہو......یہ کون سی تہذیب ہے؟'' نہ چاہنے کے باوجود اس کا لہجہ ناگوار تھا۔

''صبح سے آپ کو دیکھا نہیں تھا، ناشتہ، دوپہر کا کھانا، رات کا کھانا بلکہ شام کی چائے، کسی ٹائم بھی آپ موجود نہیں تھیں۔ گرینڈ مدر سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ آپ کے سر میں درد ہے اسی وجہ سے آپ کمرے سے باہر نہیں آئیں۔ میں نے سوچا چلو چل کر آپ کا سر دبا دیتے ہیں۔ گرینڈ مدر کو صرف اپنی خاطریں کروانی آتی ہیں۔ وہ خود کسی کو خاطر میں نہیں لاتیں۔ اور اگر بیماری میں کوئی تیمارداری کرنے والا نہ ہو تو مزا نہیں آتا۔''

''نہیں، مہربانی۔ مجھے بیماری میں تیمارداری کروانے کی عادت ہرگز نہیں ہے۔ آپ اپنے کمرے میں جائیں۔'' وہ عجیب کشمکش وپیچ میں مبتلا تھی۔

''برا مت مانیں۔ پاپا ہوتے تو آپ کو اس طرح چھوڑ دیتے؟ اب وہ نہیں، میں ہی سہی۔ باپ بیٹے میں آپ فرق نہ سمجھیں، باپ نہیں ہے تو بیٹا حاضر ہے آپ کی خدمت کے لئے۔ آئیں لیٹ جائیں، میں سر دباتا ہوں آپ کا۔'' اس کی مدہوش نگاہوں نے حرا کے خوب صورت چہرے کو فوکس کئے ہوئے تھا۔

عورت اپنی جانب اٹھنے والی ہر نظر کی شناخت رکھتی ہے، نگاہوں کی زبان کا ادراک لاشعوری طور پر ہوتا ہے اور آج اسی لمحے عرفان کی بدخصلت وبدنگاہی پہلے روز ہی بھانپ لی تھی مگر پھر اس احساس کو اپنی غلط فہمی پر محمول کر کے عرفان کو ہر بار باتوں باتوں میں اندر خود ہی احساس دلاتی رہی تھی، جتاتی رہی تھی کہ وہ اس کی ماں ہے، ان کے درمیان بڑا مقدس وپاکیزہ رشتہ ہے۔ وہ اس سے عمر میں خواہ بہت کم ہی سہی مگر ان کا رتبہ ازحد معتبر وبڑا ہے۔ لیکن جب نیت میں فتور آجائے، جذبے ہوس سے پلید ہو جائیں اور رشتے اپنا احترام وتقدس کھو بیٹھیں تو پھر بربادیوں کے طوفان اٹھ کھڑے ہوتے ہیں جو ایسی تباہیاں مچاتے ہیں کہ بستیاں نیست ونابود ہو جاتی ہیں اور نسلیں تباہ۔

عرفان مجسم شیطان بنا ہوا تھا۔

وہ پہلے بہت نرمی وپیار سے حرا کو اپنی منشا پر لانے کی سعی کرتا رہا مگر جب حرا اس کی چکنی چپڑی باتوں میں نہ آئی تو وہ بزور بازو اسے زیر کرنے کی جدوجہد کرنے لگا۔ حرا بھرپور مزاحمت کر رہی تھی۔ اسی دوران عرفان نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچنا چاہا تھا اور حرا نے پوری طاقت سے اس کی گرفت سے ہاتھ چھڑا لیا تھا۔ ایک جھٹکے سے اس کا ہاتھ عرفان کے ہاتھ سے چھوٹا تھا جس کی وجہ سے وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ پائی تھی اور بے اختیار گرتے ہوئے اس کا سر دیوار سے ٹکرایا تھا۔ پوری شدت سے، پوری تکلیف سے اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا تھا۔ طبیعت تو پہلے ہی ناساز تھی اور اس شدید چوٹ نے اسے بے ہوش ہونے میں لمحہ لگایا تھا۔ دوسرے لمحے وہ دنیا ومافیہا سے بے خبر قالین پر پڑی تھی۔

عرفان نے جو اسے اس طرح بے ہوش دیکھا اور اس کے سر سے خون بہتا دیکھا تو اس کا نشہ تمام، حیوانیت ہوا ہوگئی۔ اس کے شاطر ذہن نے وہاں سے بھاگنے میں ذرا دیر نہ کی تھی۔ وہ جس خاموشی سے آیا تھا اسی آہستگی سے نکل گیا تھا۔ اسے نہ اپنی حرکت پر ندامت تھی نہ اس بات کا خوف یا فکر کہ جس تیزی سے حرا کے سر سے خون بہہ رہا تھا اس طرح اس کی جان کو خطرہ لاحق تھا۔ مگر وہ بے حسی وبے ضمیری کی سب سے بلند سیڑھی پر کھڑا تھا اور ویسے حرا کی جان کی اسے کوئی پرواہ نہ تھی کہ اگر وہ مر جاتی تو ان کی راہ صاف ہو جاتی۔ بلکہ اس کی زندگی سے زیادہ خیال اسے اپنے شیطانی ارادے کی ناکامی کا تھا۔ وہ غصے سے بل کھاتا اپنے کمرے میں پہنچا ہی تھا کہ باہر اس نے کار کی آواز سن کر کھڑکی کھول کر حیرانگی سے باہر جھانکا تو خرم صاحب کو کار سے اترتے دیکھ کر اس کی پیشانی پر لاتعداد شکنیں پڑ گئی تھیں۔

❑●❑

''ممی......ممی......مما!'' جواد نے اندر داخل ہوتے ہی رافعہ بیگم کو پکارنا شروع کیا تھا۔ اس کے لہجے میں ازحد بے قراری وبے تابی مترشح تھی۔

''مما! آپ کہاں ہیں؟'' وہ ان کے بیڈروم میں آکر چیخا تھا اور انہیں ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے چیئر پر ایزی اسٹائل میں نیم دراز دیکھ کر وہ جھنجلا گیا تھا۔

رافعہ بیگم جو چہرے پر ماسک لگائے اور آنکھوں پر کھیرے کے ٹکڑے رکھ کر ماسک ڈرائی ہونے کا انتظار کر رہی تھیں، جواد کی آوازیں وہ بتدریج سن رہی تھیں مگر اس سے زیادہ انہیں اپنی اسکن کی فکر تھی سو خاموشی سے اس کی پکار سنتی رہی تھیں۔ اس کے کمرے میں آنے پر بھی انہوں نے زبان یا چہرے کو جنبش دینے کی بجائے صرف آنکھوں سے کھیرے کے ٹکڑے ہٹا کر اس کی طرف ایسے دیکھا تھا جیسے پوچھ رہی ہوں کیا بات ہے؟

''ممی! آپ یہ سب پراہلمز میں ٹائم گزارنے کے باوجود کچھ حاصل نہیں کر پاتیں۔ صرف ٹائم ویسٹ کرتی ہیں ورنہ کچھ چینج نہیں آتا۔'' وہ ان کی جانب دیکھ کر ہنس کر بولا تو رافعہ جو اس خوف سے جواب نہیں دے رہی تھیں کہ ماسک ہٹائے بغیر بات کرنے سے جھریاں پڑنے کا احتمال رہتا ہے لیکن جواد نے ان کی بڑھتی عمر کے اثرات سے متاثر ہوتے چہرے پر طنز کر کے تمام احتیاط وخیال بھلا دیا۔

''وہاٹ یو مین اڈیٹ؟ ابھی میری عمر ہی کیا ہے۔ بہت کم عمری میں شادی کر دی گئی تھی میری۔ اور شادی کے سال سے پہلے تم وارد ہوگئے تھے۔ آج کل کے دستور کی طرح بڑھاپے میں شادی نہیں ہوئی تھی میری، ہاں ابھی بھی لوگ مجھے تمہاری ماں نہیں، بہن سمجھتے ہیں۔'' وہ آئینے میں دیکھتے ہوئے خشک شدہ ماسک اتارتے ہوئے غصے سے کہہ رہی تھیں۔ وہ بدستور مسکرا رہا تھا۔

''تھینکس گاڈ۔ لوگ پاپا کو ہسبنڈ ہی سمجھتے ہیں، فادر نہیں۔''

''کیا بات ہے......آج کچھ زیادہ ہی آپے سے باہر نظر آرہے ہو؟''

''فنٹاسٹک گڈ نیوز ہے۔''

''خوب جانتی ہوں تمہاری گڈ نیوز۔ پھر روپوں کا مطالبہ ہوگا۔ مگر میرے پاس اب تمہیں دینے کے لئے ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔ چھ ماہ سے اس کوٹھی کا بل چڑھ رہا ہے۔ کوٹھی کے مالک کو جس طرح میں نے روک رکھا ہے وہ صرف میں ہی جانتی ہوں۔ پارٹیز میں جانے کے لئے کوئی ڈھنگ کا ڈریس ہے اور نہ جیولری۔ بینک اکاؤنٹ منہ چڑا رہے ہیں، دوسرے تمام بلز دو ماہ سے نہیں بھرے جا رہے۔ احمد کا بزنس تو بھائی جان کے بزنس کے سہارے ہی چلتا تھا۔ ان کی وجہ سے ہی ہماری لائف ہائی اسٹینڈرڈ کی تھی۔ اور سب سے زیادہ سہارا ہمیں اس مشعل کی بے وقوفی نے دے رکھا تھا۔ وہ ہمارے لئے لڑکی نہیں سونے کے انڈے دینے والی چڑیا تھیں۔ وہ کیا اڑی ہمارا وقت بد سے بدتر ہی ہو رہا ہے۔'' ماسک اتارنے کے بعد وہ اپنے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے افسردگی سے کہہ رہی تھیں۔

''آپ نے میری بات سنی نہیں اور پوری تقریر کر ڈالی۔ مائی سویٹ مدر! ہمارے برے دن سمجھو ختم ہونے والے ہیں۔ ہماری زندگی پھر سے بدلنے والی ہے۔'' اس نے

ان کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پُرجوش انداز میں کہا تو وہ چونک کر گویا ہوئی تھیں۔

''پھر ڈرنک کر کے آگئے؟''

''او نو ممی! میرا یقین کریں، چڑیا اُڑ گئی تو کیا ہوا آج ہمیں اس کا گھونسلا مل گیا ہے، جو چڑیا سے زیادہ قیمتی ہے۔'' اس کا انداز تجسس زدہ تھا۔

''کیا...... کیا مطلب؟'' وہ ایک جھٹکے سے اس کی طرف گھومی تھیں۔

''آج میں نے خود ماموں جان کو سڑک پر کار میں جاتے ہوئے دیکھا تھا۔''

''سچ بول رہے ہو؟'' مسرت کے بے پایاں احساس سے وہ جھوم کر گویا ہوئیں۔

''بالکل سچ۔ پہلے تو مجھے بھی آپ کی طرح یقین نہیں آیا تھا اور اسی یقین کی تصدیق کرنے کے لئے میں آفس گیا۔ وہاں چپڑاسی سے معلوم ہوا کہ ماموں جان وہاں آ چکے ہیں اور وہ حرام خور، مشعل کو لے کر ملک سے باہر گیا ہوا ہے۔''

''اوہ...... کتنے عرصے بعد خوشی محسوس ہوئی ہے۔ چل ابھی بھائی جان کے پاس چلتے ہیں۔'' ان کے انداز میں عجلت و بے تابی تھی۔

''ابھی ٹائم ختم ہو گیا ہے۔ کل چلیں گے۔''

''آفس کا ٹائم ختم ہوا ہے، ان کے گھر کا نہیں۔''

''میں نے سب معلوم کر لیا ہے۔ وہ کہیں اور رہ رہے ہیں، کل آفس میں ہی ملاقات ہو گی۔''

''اچھا، اچھا...... ٹھیک ہے۔ جہاں اتنے دن صبر کیا ہے وہاں ایک دن مزید کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ خوش حالی نے پھر ہمارے در پر دستک دینا شروع کر دی ہے۔ میں اس خوشی میں ایسی زبردست پارٹی دوں گی کہ سب یاد رکھیں گے مدتوں۔'' مسرت و آسودگی، سکون و بے فکری انسان پر خوشگوار اثر ڈالتے ہیں۔

رافعہ جو کچھ دیر قبل بجھی بجھی و بے رونق نظر آ رہی تھیں اتنی بڑی خوشی سن کر ان کا چہرہ پھولوں کی طرح شگفتہ و تر و تازہ ہو گیا تھا۔ مہنگے سے مہنگے پالرز نے انہیں ایسی رعنائی و شگفتگی نہ بخشی تھی۔

''مما! جو ہم نے ان کے ساتھ کیا تھا اور جس کے باعث انہوں نے فوراً مشعل کی شادی اپنے ملازم سے کر دی تھی ایسی باتوں کے باوجود انکل سے ہم ملیں گے؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ ہمارا نام سنتے ہی ملازموں سے دھکے دلوا دیں۔'' معاً جواد کو وہ سب یاد آیا تو وہ متردد سے گویا ہوا۔

''ارے نہیں...... میں بھائی جان کو اچھی طرح جانتی ہوں، وہ نا معلوم کس مٹی سے بنے ہوئے ہیں۔ وہ عاجزی و انکساری کا پیکر ہیں، برا ماننا یا کسی کو برا بھلا کہنا وہ جانتے ہی نہیں ہیں۔ تب ہی تو مشعل نے انہیں اپنے اشاروں پر اس طرح نچایا ہوا تھا جیسے کوئی مداری بندر کو ڈگڈگی پر تماشے کرواتا ہے۔ تم دیکھتے جاؤ اب میں کیا کرتی ہوں۔''

ان کے لہجے میں عجیب پُراسراریت سی تھی۔ آنکھوں سے مکاری جھلکنے لگی تھی۔

''میں نے آپ کو اتنی بڑی خوش خبری سنائی ہے اب تو آپ کو بغیر مانگے ہی مجھے خوش کر دینا چاہئے۔ مجھے فرینڈز کے ساتھ کلب جانا ہے۔''

''جو جو! میں نے کہا تھا میرے پاس بالکل بھی پیسے نہیں ہیں۔ کل تمہیں دس ہزار دیئے تھے، اب بالکل بھی نہیں ہیں۔'' وہ اسے ڈانٹتی ہوئی وارڈ روب کی جانب بڑھ گئی تھیں۔ ان کے لہجے میں قطعیت محسوس کر کے وہ بگڑ اٹھا تھا مگر جانتا تھا اب ان سے بحث کرنا بے کار ہے۔ وہ اب ایک روپیہ بھی نہیں دیں گی۔ وہ ماں کو لباس سلیکٹ کرنے میں مگن دیکھ کر نیچے کارپٹ پر پڑی سونے کی چین اٹھانے میں کامیاب ہو گیا جو نا معلوم کس لمحے ان کے گلے سے گر پڑی تھی اور اس نے کمرے میں آتے ہی دیکھ لیا تھا اور بہانے سے ان کے قریب کھڑا ہوا تو پہلا قدم چین پر ہی رکھ کر اسے چھپایا تھا۔

''او کے، اینڈ وِش مما!'' بہت تیزی سے چین سائیڈ پاکٹ میں منتقل کرتا ہوا مسمسی سی صورت بنا کر بولا۔

''اب تمہارے ساتھ بھی اپنی ٹیوڈ کرنا پڑے گا ورنہ تم خراب ہو جاؤ گے۔'' وہ شیفون کی ملٹی کلر ساڑھی والا ہینگر اٹھاتی ہوئی سخت لہجے میں بولیں۔ جواد رف جو اپنی کامیابی و چالاکی پر دل ہی دل میں قہقہے لگاتا کمرے سے نکل گیا۔

□●□

دروازہ آہستگی سے کھلا تھا۔ فریدہ اندر داخل ہوئی تھی۔

''جی بیگم صاحب! آپ نے بلایا ہے مجھے؟'' وہ نگاہیں جھکا کر مؤدبانہ لہجے میں بولی۔

''کھانا تیار ہو گیا ہے؟'' وہ بیڈ پر نیم دراز رسالے کی ورق گردانی کرتے ہوئے گویا ہوئی۔

''جی۔''

''صاحب کہاں ہیں؟''

''وہ جی باہر ابا سے گوڈی کرنا سیکھ رہے ہیں۔''

''گوڈی کرنا؟ واٹ از دس؟'' وہ رسالہ ایک طرف رکھ کر حیرانگی سے بڑبڑاتی ہوئی کھڑکی کی جانب بڑھی تھی۔ پردہ ہٹا کر کھڑکی کھولی تو سامنے خاصے فاصلے پر وہ مالی کے ہمراہ کھرپی ہاتھ میں لئے کیاری پر جھکا ہوا تھا۔ مالی قریب ہی گھاس پر بیٹھا ہوا شاید اسے گائیڈ کر رہا تھا۔ بہت مستعدی سے اس کے ہاتھ زمین پر چل رہے تھے اور مٹی پھدک پھدک کر ادھر اُدھر گر رہی تھی۔

''نان سینس، اسٹوپڈ مین...... نا معلوم کب اپنے کمپلیکس سے باہر آئے گا۔'' اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی شاہ ویز کو گوڈی کرتے دیکھ کر۔

''بیگم صاحبہ! کھانا لگا دوں؟'' فریدہ اس کے بگڑتے تیور دیکھ کر حواس باختہ ہو گئی تھی۔ ویسے بھی وہ اس کے بگڑے تیوروں اور سخت رویوں کے سبب اس سے بہت خوفزدہ رہتی تھی اور اس کے احکامات کی بجا آوری کے لئے ہر لحہ چوکنا و مستعد رہتی تھی۔

''نہیں، لگاؤ گی کیا؟ تمہیں ٹائم کا نہیں معلوم؟'' پوری شدت سے وہ اس پر برس پڑی تھی۔ پہلے ہی شاہ ویز کی حرکت نے اسے مشتعل کر ڈالا تھا، مستزاد فریدہ کے معصوم سے سوال نے وہاں کا غصہ یہاں انڈیلنے کا موقع دے دیا تھا۔

''وہ...... وہ...... صاحب نے کہا تھا دیر سے کھانا لگاتے کو۔'' وہ خود پریشانی سے کانپ اٹھی تھی سو بے ربط گویا ہوئی۔

''شٹ اپ، دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ آئندہ مجھے جواب دینے کی کوشش مت کرنا ورنہ زبان کھینچ لوں گی۔ تم جیسے لوگوں کو تمہاری اوقات میں رکھنا خوب جانتی ہوں۔'' وہ اس پر گرج برس رہی تھی۔ اسی دم فریدہ سے چھوٹی رشیدہ نے کھانا لگنے کی اطلاع دی تھی۔ وہ ڈائننگ روم میں آئی تو شاہ ویز کرسی پر آرام سے براجمان اس کا منتظر تھا۔ ٹیبل پر برتن اور ڈشز سلیقے سے لگی ہوئی تھیں۔ فریدہ نے آگے بڑھ کر اس کے لئے کرسی کھینچ دی تھی۔

''کیا بات ہے...... آج موسم خاصا گرم اور گرد آلود لگ رہا ہے۔'' شاہ ویز اس کی پُرشکن پیشانی، بگڑے مزاج و سرخ چہرہ دیکھ کر شوخی سے ذومعنی لہجے میں بولا۔ اس نے جواباً کچھ نہیں کہا، خاموشی سے کھانا کھاتی رہی۔ دل و دماغ میں جنگ ہو رہی تھی۔ وہ اسے خوب برا بھلا کہنا چاہ رہی تھی مگر جانتی تھی اس نے اس وقت ایک بھی لفظ منہ سے نکال دیا تو وہ کھانا چھوڑ کر اٹھ جائے گا اور ملازماؤں کے سامنے بھی لڑنے بیٹھ جائے گا۔ بے عزتی سے بہتر تھا کہ ابھی خاموشی سے کھانا کھایا جائے۔

''کھانا کس نے بنایا ہے؟'' کھانے سے فارغ ہو کر وہ باہر نکل رہے تھے۔ باہر موجود فریدہ اور رشیدہ سے مخاطب ہوا۔

''مم...... میں نے۔'' فریدہ جو کچھ دیر قبل مشعل کی ڈانٹ سے سہمی ہوئی تھی شاہ ویز کے سنجیدگی سے پوچھنے پر وہ ہکلا کر گویا ہوئی تھی۔

''صاحب جی! کھانا اچھا نہیں بنا کیا؟'' رشیدہ نے ڈرے ڈرے لہجے میں پوچھا تھا۔

''اچھا...... اتنا اچھا کہ پیٹ بھر گیا مگر نیت نہیں بھری۔ شامی کباب اور بریانی تو بہت ہی لذیذ تھی اور فروٹ ٹرائفل کا تو جواب ہی نہیں، بہت اچھا کھانا بناتی ہو۔ کس سے سیکھا؟''

شاہ ویز کی تعریف نے اس کے فق چہرہ پھولوں کی طرح کھلا دیا تھا۔ وہ دونوں بہنیں از حد خوش نظر آ رہی تھیں۔

مشعل اس کے ساتھ کھڑی دل ہی دل میں اسے گالیوں سے نواز رہی تھی۔ وہ جانتی تھی بلکہ اب اسے اچھی طرح سمجھنے لگی تھی کہ غریب اور بے حیثیت لوگوں میں بے حد مگن، خوش و خرم رہتا ہے اور صاحب حیثیت و دولت مند لوگوں کو رتی بھر بھی اہمیت دینے کو تیار نہیں ہوتا۔ وہ جل بھن کر حسب عادت یہاں سے چلی جاتی مگر آن واحد میں ایک بالکل انجانا و نا آشنا جذبہ ابھرا تھا۔ اس کے اندر ایک نادیدہ پراسرار سی آگ تھی جو اس کے وجود کو جھلسانے لگی تھی اور اس کے قدم آگے بڑھنے کی بجائے وہیں منجمد ہو گئے تھے۔

دل کے احساسات میں تغیر آیا تھا تو نگاہوں کے زاویے بھی بدل کر رہ گئے تھے۔ فریدہ کے لئے ستائشی و توصیفی جملے، شیریں لہجے کی ملائمت اس کے اندر کسی زہریلے ناگ کی طرح لہرانے لگا اور بالکل نیا اور انوکھا جذبہ، حاسدانہ جذبہ اس کی رگ و پے میں سرایت کرتا چلا گیا۔

اپنی ملکیت کا احساس شدت سے بیدار ہوا تھا۔ بے ساختہ اس کی کھوجتی نگاہیں ان کی جانب اٹھ گئی تھیں اور خاموشی سے ان کو کھوجنے لگی تھیں۔

''باقاعدہ کسی سے نہیں سیکھا، ہاں اماں کو پکاتے ہوئے دیکھ کر سیکھتی رہی۔ خود مجھے بھی کھانا پکانے کا بے حد شوق ہے۔ جب پڑھ رہی تھی تو سہیلیوں سے بھی نت نئے کھانوں کی ترکیبیں سیکھتی رہتی تھی۔ بس اس طرح کھانا پکانا آ گیا ہے۔''

فریدہ ملازمہ تھی۔ ایسے لوگ جو خود کو دوسروں کے زر خرید سمجھتے ہیں تو اپنے مالکوں کو خوش کرنے کی خاطر ہر ظلم و زیادتی برداشت کرتے ہیں، ہر کچھ ضبط کر لیتے ہیں پھر یہاں تو ان کے مالک نے ان کی تعریف کر کے حوصلہ افزائی کی تھی اور بیگم صاحبہ کے مقابل ان کا لہجہ غرور و تکبر، اہانت و تذلیل سے پاک بہت شفیق و ملائم تھا جیسے کوئی اپنوں کو سراہتا ہے۔

وہ بے حد خوش خوش جواب دے رہی تھی۔ مشعل باریک بینی سے اس کا جائزہ لے رہی تھی۔

گندمی رنگت، بھرا بھرا چہرہ، براؤن شفاف آنکھیں، کچھ فربہ جسم، کاسنی وسیاہ پرنٹڈ سوٹ میں بڑی سی چادر سر سے پیر تک لپیٹ کر وہ بالکل عام سی شکل وصورت کی لڑکی تھی۔

لمحے بھر کو اس کے دل میں اطمینان لہریں لینے لگا کہ کہاں وہ گلاب جیسا حُسن، نوخیز پھولوں کی ملکہ، کہاں وہ مرجھائے پھول جیسی بے رونق وبے کشش فریدہ۔

بھلا کہاں وہ اس کے مقابل آسکتی تھی؟ وہ مطمئن ہوئی تھی کہ پھر کہیں سے سرگوشی ابھری، دل آجائے گدھی پر تو پری کیا چیز ہے۔ وہ پھر ایک کشش وپنج میں مبتلا ہوگئی۔

''یہ تمہارا انعام ہے۔ تمہیں بہترین کھانا پکانے پر مل رہا ہے۔ اور تم اس کی ہیلپ کرتی ہو تمہیں اس پر دے رہا ہوں۔'' اس نے والٹ سے دو سرخ نوٹ نکال کر ایک ایک دونوں کی جانب بڑھایا تھا جو تھوڑی سی پس وپیش کے بعد انہوں نے تھام لئے تھے اور خوشی خوشی ڈائننگ ہال کی طرف بڑھ گئیں برتن سمیٹنے۔

''آخر نوکروں کو اس قدر سر پر چڑھانے کی کیا ضرورت ہے؟ وہ جو کام کرتی ہیں کوئی احسان نہیں کرتیں، اپنی محنت کا دگنا معاوضہ وصول کرتی ہیں اور آج کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا جس کے لئے انہیں انعامات دیئے گئے ہیں۔ ہر ماہ ہزاروں روپے بٹورتی ہیں معمولی سے معمولی کام کے۔ اس طرح کی فیاضیاں ان لوگوں کے دماغ اور نیت خراب کرکے رکھ دیتی ہیں۔ کوئی ضرورت نہیں ہے ان کا دماغ خراب کرنے کی۔'' کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ بڑبڑانے لگی تھی۔

''سو روپے میں ان کی زندگی نہیں گزر جائے گی۔'' وہ بیڈ پر دراز ہوتے ہوئے گویا ہوا۔

''ضرورت کیا ہے ان کا دماغ خراب کرنے کی؟ سو روپے کوئی معمولی رقم بھی نہیں ہوتی جو اس طرح ضائع کی جائے۔'' وہ اپنے موقف پر قائم تھی۔

''اوہ، تم شاید یہ سوچ رہی ہو کہ تمہارے ڈیڈی کی دولت میں اس طرح ضائع کر رہا ہوں۔'' اس کے ذہن میں ایک خیال بجلی کی طرح کوندا تھا۔ ''تو...... نیور، میری سرشت میں یہ نہیں ہے کہ میں نیکیاں چوری چوری کرکے نیکیاں ہی ضائع کردوں۔ اطمینان رکھو، یہ سو فیصد میری نیک کمائی کی رقم تھی۔ کسی کے چہرے پر سچی خوشی کے انمول رنگ بکھرے ہوئے دیکھ کر انسان کو کس قدر روحانی مسرت حاصل ہوتی ہے اس کا احساس تم شاید ہی کبھی کرسکو۔ دراصل بے حس وکٹھور لوگوں کو ایسی سعادتیں وراحتیں نصیب نہیں ہوتی ہیں۔ جو لوگ کسی کا دکھ درد محسوس نہیں کرتے وہ اسی طرح حقیقی وبے ضرر محبتوں سے محروم رہتے ہیں۔ تمہیں آج محض دو سو روپے ضائع ہونے کا دکھ ہو رہا ہے لیکن میں بہت خوش ہوں اور اس بات کا دکھ بھی محسوس کر رہا ہوں کہ تم میں اتنی بری عادتیں ہونے کے ساتھ ساتھ یہ بھی برائی ہے کہ تم کنجوس بھی ہو۔ کسی غریب کی مدد کرنا تمہارے لئے پیسہ ضائع کرنا ہے اور تم جو جیولری، ڈریسز، شاپنگز، پالرز اور پارٹیز میں لاکھوں روپیہ اڑاتی ہو وہ ضائع کرنا نہیں ہوتا؟ تمہاری ایک لپ اسٹک کی قیمت بھی ان روپوں سے زیادہ ہوتی ہے۔'' اس کا موڈ بری طرح سے بگڑنے لگا تھا۔

''اوفوہ...... میرا مقصد یہ نہیں تھا۔'' وہ فوراً ہی مصالحتی لہجے میں بولی۔

''تمہارا مقصد کچھ بھی ہو مگر آئندہ تم میرے پرسنل افیئرز میں انٹرفیئر نہیں کروگی۔''

''اوکے، مجھے اس وقت کا شدت سے انتظار رہے گا جب تمہارے اور میرے پرسنل علیحدہ نہیں ایک ہوں گے اور تم اس طرح مجھ سے بات نہ کرسکو گے۔'' اس نے سوچتے سوچتے اپنے تلملاتے ذہن کو تھپکی دی تھی۔

□●□

خرم بڑے اطمینان سے اپنے کمرے میں داخل ہوئے تھے۔

ان کے ہونٹوں پر بڑی دلآویز مسکراہٹ تھی یہ سوچ کر کہ حرا انہیں بالکل اچانک بغیر اطلاع کے موجود دیکھ کر کس قدر خوش ہوگی، حیران ہوگی اور وہ اس کی حیرت آمیز خوشی سے گل رنگ چہرے کا تصور لئے اندر داخل ہوئے تھے

کمرے میں داخل ہوتے ہی حیرت انگیز جھٹکا انہیں لگا تھا۔

وہ جو اسے سرپرائز دینا چاہتے تھے انہیں ایسا سرپرائز ملا کہ متوحش سے حرا کی جانب بڑھے جو قالین پر بے سدھ پڑی تھی۔ انہوں نے آگے بڑھ کر تیزی سے اسے سیدھا کیا جو اوندھی پڑی تھی۔ اس کا چہرہ خون میں بھیگا ہوا تھا۔ خون تازہ تھا اور ابھی تک ماتھے سے رس رہا تھا جس کا مطلب تھا اس کے یہ چوٹ ابھی لگی ہے۔ آف وہائٹ قالین پر بھی کئی دھبے سرخ سرخ لگے ہوئے تھے۔ خون اور اس کی بے ہوشی نے انہیں حواس باختہ کردیا تھا۔ وہ اسے اٹھا کر سیدھے پورٹیکو میں آئے تھے جہاں ڈرائیور ابھی ان کا لایا ہوا سامان اتار کر فارغ ہی ہوا تھا۔ اس نے فوراً ہی کار کی پچھلی نشست کا دروازہ کھول دیا تھا۔

اسی وقت عرفان جو اپنی کھڑکی سے یہ منظر دیکھ رہا تھا تیزی سے بھاگ کر وہاں پہنچا تھا اور ڈرائیور کو منع کرکے خود کار ڈرائیو کرکے نزدیک ترین ہسپتال کی طرف کار دوڑانے لگا تھا۔

''ڈیڈی! یہ کیا ہوا؟'' وہ انجان بن کر مصنوعی پریشانی سے گویا ہوا۔

''مجھے خود نہیں معلوم۔ میں ابھی ٹورنٹو سے واپس آیا ہوں۔ کمرے میں آتے ہی میری نگاہ ان پر پڑی تو یہ بے ہوش تھیں اور پیشانی سے خون بہہ رہا تھا۔''

''اوہ، کہیں ماما کو سوتے میں چلنے کی بیماری تو نہیں ہے؟'' وہ بہت شاطر ذہنیت کا مالک تھا۔ خلاف توقع خرم صاحب کی آمد اور پھر اپنی گھٹیا حرکت کا ادراک اسے اب ہو رہا تھا۔ وہ اپنے باپ کے مزاج وغصے سے پوری طرح آشنا تھا۔ اگر اس کے وہم وگمان میں ان کی اس طرح آمد کا احساس ہوتا تو وہ کبھی بھی اس ارادے سے آگے نہ بڑھتا۔ اب جو کچھ ہوا تھا وہ بھولا نہیں جاسکتا تھا۔ وہ اس بات سے خوفزدہ تھا کہ اگر ہوش میں آنے کے بعد حرا نے اس کی حرکت بتادی تو پھر کچھ بعید نہیں کہ وہ اسے شوٹ ہی کر ڈالیں۔ خود کو متوقع سزا سے بچانے کی تدبیر یہی تھی کہ وہ لہجہ اختیار کیا جائے، وہ انداز اختیار کئے جائیں کہ وہ اس پر مکمل اعتماد کرنے لگیں۔

''نہیں، حرا ایسی کسی بیماری میں مبتلا نہیں ہیں۔'' سوتیلے رشتے سے منحرف بیٹے کے منہ سے حرا کو ماما کہنا خاصا سرور وشادماں کر گیا تھا۔ وہ تمام ناراضگی وخفگی بھلا کر گویا ہوئے تھے۔

''پھر کس طرح انہیں یہ چوٹ آئی؟'' وہ طرح طرح سے اپنا اطمینان چاہتا تھا۔

''اب اس سوال کا جواب حرا ہی دے سکتی ہیں۔''

ہسپتال میں حرا کی فوری ڈریسنگ کردی گئی تھی۔ اس کی ازحد کمزوری ونقاہت کے پیش نظر صبح تک کے لئے اسے ایڈمٹ کرلیا گیا تھا۔ خرم صاحب نے پرائیویٹ روم حاصل کرلیا تھا۔ اس کارروائی کے دوران عرفان ان کے ساتھ ساتھ رہا تھا۔ اس کے دل میں خوف تھا۔ وہ کوئی لمحہ ان سے دور نہیں ہونا چاہتا تھا کہ یہ جو کچھ بھی ہوا تھا اس کی اصل وجہ، مین کردار وہی تھا۔

حرا ابھی بھی بیڈ پر بے سدھ پڑی تھی۔ اس کے دائیں بازو میں ڈرپ انجیکٹ تھی جس میں ڈاکٹر کے حکم پر نرس کئی انجکشنز انجیکٹ کر رہی تھی۔

''فکر کی تو کوئی بات نہیں ہے ڈاکٹر؟'' عرفان گویا ہوا۔

''نہیں۔'' لیڈی ڈاکٹر گویا ہوئی تھی۔

''تھینکس گاڈ۔ ورنہ خون دیکھ کر میں تو بری طرح پریشان ہوگیا تھا۔''

''ڈیڈی! آپ گھر جاکر آرام کریں، میں ماما کے پاس ہوں، فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ سفر سے آئے ہیں، تھک گئے ہوں گے۔'' وہ بڑی محبت سے خرم سے مخاطب ہوا تھا۔

''یور آر ویری لکی مسٹر خرم! جو آپ کے بیٹے آپ کی اور اپنی اسٹیپ مدر کی اتنی کیئر کرتے ہیں، عزت کرتے ہیں۔ ورنہ ہم نے بچوں کو بدلتے دیکھا ہے۔'' لیڈی ڈاکٹر، عرفان کی چاپلوسی وعیاری سے خاصی متاثر نظر آرہی تھی۔ یہی حال خرم صاحب کا بھی تھا۔

''میں شکر گزار ہوں اپنے پروردگار کا جس نے مجھے ایسی اولاد دی ہے۔ بیٹے آپ گھر چلے جاؤ، میں حرا کو ڈسچارج کرواکر لے آؤں گا۔ میں بالکل ٹھیک ہوں، کوئی تھکن نہیں ہے۔'' وہ دھیرے سے مسکرا کر گویا ہوئے تھے۔

''پہلے آپ میرے ساتھ ڈاکٹر روم چلیں، وہاں میں آپ کو کچھ سلپس دوں گی۔ پیشنٹ کے چند ٹیسٹ کرواتے ہیں۔'' ڈاکٹر کے ہمراہ خرم صاحب باہر نکل گئے تو عرفان کی جان میں جان آئی۔ وہ بھی چاہتا تھا کہ خرم صاحب کی غیر موجودگی میں حرا کو ہوش آئے تاکہ وہ اپنا منصوبہ مکمل کرسکے۔ اب اس کی راہ میں حائل وہاں نرس موجود تھی۔

''سسٹر پلیز ایک کام کریں گی آپ؟ ایک کولڈ ڈرنک لادیں بلکہ آپ اپنے لئے بھی کولڈ ڈرنک اور برگر بھی لے لینا۔'' اس نے ایک بڑا نوٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بھرپور آفر دی اور نرس مسکراتی ہوئی چلی گئی۔ نرس کے باہر نکلتے ہی وہ مستعدی سے اٹھا تھا۔

دروازہ کھول کر باہر گیلری میں جھانکا جو دور تک سنسان پڑی تھی۔ اس نے دروازہ اندر سے لاک کیا اور حرا کے بیڈ کی جانب بڑھ گیا۔ اسی اثناء میں حرا کی پلکوں میں جنبش ہونا شروع ہوئی تھی۔ وہ قریب گیا تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔

''تت...... تم......؟'' وہ جس کے زیر اثر ہوش وحواس سے بیگانہ ہوئی تھی اسی مکروہ چہرے کو قریب دیکھ کر وہ خوف سے گھگیائی تھی۔

''خاموش......'' وہ اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر غرایا۔ ''اگر کوئی بات ڈیڈی کو بتانے کی کوشش کی تو یاد رکھنا وہ اس بڈھے کا آخری دن ہوگا۔ وہ تو اس دنیا سے جائے گا ہی ساتھ تمہیں بھی برباد کر جائے گا، جب میں اس بتاؤں گا کہ تم بدچلن ہو، بدکردار ہو، تمہارے آشنا کے ساتھ میں نے تمہیں خود رنگ رلیاں مناتے دیکھا اور جب میں اسے پکڑنے گیا تو تم راستے میں آکر مجھ سے ٹکرا گئیں اور تمہارا عاشق بھاگ گیا۔''

''اتنا بڑا بہتان...... ایسا بھیانک جھوٹ...... میری زندگی میں خرم کے علاوہ کوئی مرد نہیں آیا۔ میں خرم کو تمہاری گھناؤنی ومکروہ شکل ضرور دکھاؤں گی۔ تم انسان نہیں شیطان ہو۔ پکے شیطان۔'' وہ غصے سے کانپتے ہوئے بولی۔

''دیکھ لو، سوچ لو، تمہارے پاس صرف ایک لائف لائن ہے جس سے تم اپنی زندگی بنا بھی سکتی ہو اور سنوار بھی سکتی ہو۔ مرد کی وفاؤں پر اعتبار کبھی نہیں کرنا چاہئے۔ یہ وقت کی طرح پل پل بدلتی رہتی ہیں اور خصوصاً تو جوان بیوی کو ادھیڑ عمر شوہر کی محبت پر تو بھروسا کرنا ہی نہیں چاہئے۔ کیونکہ ایسے بڈھے شوہر سب کچھ کرسکتے ہیں مگر اپنی جوان بیوی پر کبھی بھی اعتماد وبھروسہ نہیں کرتے۔ دراصل یہ عمر ہی ایسی ہوتی ہے۔ بڈھا شخص ہر شے پر بداعتمادی وشک رکھتا ہے خواہ وہ عمر ہو، زندگی ہو یا تو جوان بیوی

اسے ہر ایک سے دھوکے کی توقع ہوتی ہے کہ عمر نہ معلوم کس لمحے دغا دے جائے۔ زندگی نہ معلوم کس لمحے موت کی آغوش میں دم توڑ دے؟ ہوہی، ہاہاہا..... نہ معلوم کس لمحے سب دولت و جائیداد سمیٹ کر کسی کے ساتھ فرار ہو جائے۔'' وہ ہنستے ہوئے ازحد بے رحمانہ انداز میں کہہ رہا تھا۔ اس وقت اس کا چہرہ سفاکی و حیوانیت کا دوسرا رخ دکھا رہا تھا۔ وہ لرز کر رہ گئی۔

''نہیں بتاؤں گی خرم کو کچھ بھی۔ مگر تم آئندہ ایسی حرکت کے بارے میں سوچنا بھی مت۔'' وہ کمزور عورت تھی، اس کی اسی کمزوری نے اسے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ جانتی تھی عرفان بلا کا چرب زبان و مکار فطرت ہے۔ اس کی زبان میں ایسی تاثیر ہے کہ وہ جھوٹ بھی کہے تو سچ لگتا ہے۔

''ہوں..... تم حسین ہی نہیں ذہین بھی ہو ورنہ تمہارے اس بڈھے کو وہ ٹھیک ہو چکے ہیں تیسر تو سیدھا اوپر ہی لے جاتا۔'' اس نے ہنستے ہوئے اوپر کی طرف اشارہ کیا اور آہستگی سے لاک ہٹا دیا تھا۔

''بتا دینا اپنے شوہر نامدار کو کہ میں نیند میں باتھ روم جانے کے لئے اٹھی تھی اور پاؤں کسی چیز سے الجھنے پر گر گئی۔'' وہ اطمینان سے بتا رہا تھا۔

□●□

بے جی حسب عادت فجر کی نماز سے فارغ ہو کر ناشتہ کر کے سو گئی تھیں۔ پھر اپنے وقت پر بیدار ہوئیں تو دیکھا پورا گھر جگر جگر چمک رہا ہے۔ ہر شے اپنی جگہ قرینے سے رکھی چمک رہی ہے۔ کمرے، باتھ رومز، لاؤنج، گیلری سب صاف وشفاف پڑے ہیں۔ ان کی صفائی پسند طبیعت جھوم اٹھی۔ بے اختیار کئی دعائیں سائرہ کے لئے دل سے نکلی تھیں۔ وہ کچن کی طرف بڑھ گئیں۔

''اٹھ گئیں بے جی؟'' سائرہ دیگچی میں چمچ چلاتے ہوئے گویا ہوئی۔

''تم تو آتے ہی لگ گئیں بچی۔ ایک دن تو مہمان بن کر آرام کر لیتیں۔''

''اپنوں کے ہاں بھی کوئی مہمان بن کر رہ سکتا ہے؟ پھر آپ کے ہاں کا کام ہی کتنا ہوتا ہے بے جی۔'' وہ برنر سلو کرتی ہوئی بولی۔

''ہاں، جنہیں کام کی عادت ہوتی ہے وہ بے کار کہاں بیٹھ سکتے ہیں۔ قورمہ پکا رہی ہو؟'' پورے کچن میں قورمے کی اشتہا انگیز خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔

''کل آپ کہہ رہی تھیں نا کہ آپ کا دل چاہ رہا ہے قورمہ کھانے کو۔ تو میں نے فریج سے چکن نکال کر پکا لیا اور میٹھے میں شاہی ٹکڑے بنانے کے لئے دودھ چولہے پر رکھ دیا تا کہ وہ پک کر ہلکا بادامی رنگ کا ہو جائے تو اس میں فرائی کئے ہوئے سلائس ڈالوں۔'' وہ چائے کے مگ ٹرے میں رکھتی ہوئی گویا ہوئی اور ٹرے اٹھائے لاؤنج میں چلی آئی۔ بے جی کارپٹ پر رکھے کشن کے سہارے بیٹھ گئیں اور ساتھ ہی ہاتھ بڑھا کر اس کے اردگرد بھی کشنز لگا دیئے تھے۔

''جیتی رہو..... سدا خوش رہو۔'' چائے کا مگ ہاتھ میں پکڑتے ہوئے حسب عادت دعا دی تو غیر محسوس انداز میں سائرہ کے لبوں پر مجروح مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''اس لئے میں نے تمہیں روکا تھا۔ دیکھ رہی ہو نا گھر کی تنہائی و خاموشی۔'' بے جی نے چائے پیتے ہوئے شفقت سے کہا۔

''یہ آپ کی محبت ہے..... ورنہ سچ تو یہ ہے کہ اگر آپ مجھ کو نہ روکتیں تو بھی میں نہ جاتی۔'' وہ کپ کی سطح پر اٹھتے دھوئیں کو دیکھ کر سنجیدگی سے بولی۔

''ہاں، ہاں..... ضرور بچی..... یہ گھر تمہارا ہی ہے۔''

''نہیں بے جی۔ درحقیقت عورت کا تو کوئی گھر ہی نہیں ہوتا۔ شادی سے پہلے وہ جس گھر کو اپنا گھر سمجھتی ہے وہ گھر اس کے باپ کا ہوتا ہے، پھر بھائیوں کا۔ اس کے بعد شوہر کا اور پھر بیٹوں کا۔ عورت مالک نہیں، مزدور ہے۔ وہ تاحیات اپنے ہاتھوں سے ایک ایک اینٹ جوڑ کر گھر بناتی ہے۔ اپنی آرزوئیں، تمنائیں، خواہشیں سب تج ڈالتی ہے، اپنا آپ مٹا دیتی ہے اور جب کڑی ریاضت کا ثمر ملنے کا وقت آتا ہے تو اسے انعام میں اسی گھر کے ایک تاریک کونے میں بے کار برتن کی طرح پھینک دیا جاتا ہے۔ یہ صلہ ہے عورت کی قربانی و وفاؤں کا جو ہر دور میں اسے ملتا رہا ہے۔''

''کیوں اس قدر سوچتی ہو بچی۔ عورت سب سے لڑ سکتی ہے مگر اپنے نصیب سے نہیں لڑ سکتی، جو ہمارے حصے کی کٹھنائیاں ہیں، پریشانیاں و دکھ ہیں ان سے مقابلہ کر کے ہی ہم مسرتوں و سکون کے ساگر میں تیر سکتے ہیں۔ جس طرح سونا بھٹی میں پک کر کندن بن جاتا ہے اسی طرح دکھوں و مصیبتوں کی آگ انسان کو نکھار دیتی ہے۔ حوصلہ و قوت بخشتی ہے۔ انسانوں کو جلد یا بدیر ان مراحل سے گزرنا ہی پڑتا ہے۔ اب کون ان سے ہنستے مسکراتے گزرتا ہے یا روتے، سسکتے، بلکتے۔ ان مقامات پر ہمارے ایمان کی قوت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے ہمارے تعلقات کی آگہی ملتی ہے اور اس رب کائنات کی ذات پر ہمارا کتنا یقین و بھروسہ ہے اس کا ادراک بھی ہمیں ہوتا ہے اور ہم جتنا اس کی ذات پر یقین کامل و صداقت رکھتے ہیں اسی حساب سے ہماری پریشانی و دکھ مٹتے چلے جاتے ہیں۔'' بے جی اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے مشفقانہ انداز میں سمجھانے لگیں تو بے اختیار ہی وہ رونے لگی تھی۔

بے جی نے خاموشی سے اس کے دل کا غبار نکلنے دیا۔

''میں تنگ آ گئی ہوں ان حالات سے جو سیاہ رات کی طرح میرے نصیب پر محیط ہو گئے ہیں۔ میں تنہا ہوتی بے جی تو کسی نہ کسی طرح سب برداشت کر لیتی مگر اب اماں کی جو حالت دیکھتی ہوں تو میں خود کو مجرم محسوس کرتی ہوں۔'' دل کی گھٹن آنسوؤں کے ذریعے باہر نکلی تو وہ قدرے پرسکون انداز میں گویا ہوئی تھی۔

''وہ کبھی ظاہر نہیں کرتیں مگر میں سمجھتی ہوں وہ اندر ہی اندر میرے غم میں گھل رہی ہیں۔ میرا دکھ، میرا وجود کسی آسیب کی مانند انہیں لگ گیا ہے جس سے چھٹکارا پانے کے لئے وہ سب کچھ ہی کر رہی ہیں، کبھی عاملوں و نجومیوں کے چکر لگاتی ہیں، کبھی درگاہوں و مزارات پر حاضریاں دیتی ہیں مگر خلاصی کسی طرح نصیب نہیں ہو رہی، خالی ہاتھ بدستور خالی ہیں۔''

''اس رب کے ہاں دیر ہے، اندھیر نہیں۔ ہمیں کبھی بھی ہمارے حوصلوں سے بڑھ کر نہیں آزمایا جاتا۔ حوصلہ رکھو، سب درست ہو جائے گا۔'' بے جی چائے سے فارغ ہو کر وہیں کشنز کے سہارے نیم دراز ہو کر گویا ہوئیں۔

''یہی بات میں اماں کو سمجھاتی ہوں مگر وہ روگ لگا بیٹھی ہیں اور اس قدر چڑچڑی و کم حوصلہ ہو گئی ہیں کہ انسان تو انسان پرندوں تک کو کوسنوں و گالیوں سے نوازنے لگی ہیں۔'' سائرہ ماں کے لئے ازحد فکر مند تھی۔

''ارے زرینہ کی حرکتیں تو تم رہنے ہی دو، مت سوچا کرنا، کوئی تمہاری وجہ سے وہ ایسی بہکی بہکی حرکتیں نہیں کر رہی ہے، بچپن سے عادت ہے اس کی۔'' بے جی مسکرا کر گویا ہوئیں اور اسے زرینہ کے بچپن کے قصے سنانے لگیں جو لڑائی، جھگڑوں سے بھرپور تھے۔

□●□

محبت سے اگر مانگو تو ہے یہ جان بھی حاضر
مگر نفرت سے میرا سر کبھی بھی خم نہیں ہوتا
نہ جانے کس گلی کے موڑ پر ہم تم بچھڑ جائیں
وصال ہجر کا یارو کوئی موسم نہیں ہوتا

شاہ ویز حسب عادت ناشتے سے فارغ ہو کر سیر کو نکل چکا تھا۔ پہلے دن کے بعد اس نے مروتاً بھی اسے ساتھ چلنے کی آفر نہ کی تھی۔ اس نے بھی کوئی ایسی خواہش ظاہر نہیں کی تھی۔ وہ قید سے آزاد ہوئی تھی اور تنہا اپنی آزادی کا جشن منانا چاہتی تھی اور منایا بھی تھا مگر عادت کے مطابق وہ اس روٹین سے بھی ایک ہفتے میں اکتا گئی تھی۔ اپنی اس بوریت کا اظہار اس نے شاہ ویز سے کیا تو اس نے مشورہ دیا کہ وہ فریدہ کی ماں کے ہمراہ گاؤں کی عورتوں سے ملے۔ ان کے طور طریقے دیکھے اور محسوس کرے کہ گاؤں کی عورت اور شہر کی عورت میں کیا فرق ہے۔ ان کی زندگی کے کیا اصول و ضوابط ہیں۔ پہلے تو اس نے منہ بنا کر منع کر دیا کہ وہ سوشل ورک کو پسند نہیں کرتی اور نہ ہی وہ شہر اور گاؤں کی عورت میں کوئی تضاد دیکھنے کی خواہش مند ہے۔ عورت، عورت ہوتی ہے۔ خواہ وہ کہیں سے بھی تعلق رکھتی ہو۔ جواباً لاپروائی کے انداز میں کاندھے اچکاتے ہوئے شاہ ویز نے اسے اس کی مرضی پر چھوڑ دیا تھا۔

جہاں بات اس کے اختیار یا ذات سے ہٹ کر ہوتی تھی، وہاں وہ کبھی بھی اپنی نہیں منواتا تھا مگر ہونٹوں پر ایسی طنزیہ مسکراہٹ ہوتی تھی کہ خواہ مخواہ سامنے والا بندہ طیش میں آ کر وہ کر گزرتا تھا جو وہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اب بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ وہ اطمینان سے شانے اچکا کر مسکرا کر چلا گیا تھا اور وہ غصے میں چوکیدار کی بیوی کے ہمراہ نکل گئی تھی۔

ان کے بنگلے سے کافی دور وہ کچے کا علاقہ تھا جہاں ٹوٹی پھوٹی جھونپڑیاں بنی ہوئی تھیں جن کے اطراف میں ہرے بھرے کھیت تھے۔ کھیتوں کے درمیان سے ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈیاں نکل رہی تھیں، دو نہریں بہہ رہی تھیں جن میں مٹیالے رنگ کا پانی تھا۔ ان نہروں کے کنارے ہی گاؤں کی کچھ لڑکیاں اور عورتیں کپڑے دھونے میں مصروف تھیں جن کے قریب ہی کپڑوں سے بے نیاز بچے مٹی میں کھیلنے میں مگن تھے۔ وہ نخوت بھرے انداز میں سب دیکھتے ہوئے چل رہی تھی۔

اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

نہ کھیتوں کی ہریالی۔

نہ صاف وشفاف ہوا کی فرحت بخش تازگی۔

نہ اسے ننگ دھڑنگ مٹی سے لت پت بچوں سے ہمدردی تھی۔

نہ رنگ برنگی پھولدار سوٹ پہنے، بڑی بڑی اوڑھنیاں اوڑھے عورتوں سے دلچسپی۔

یہ ماحول اور یہ لوگ کسی طور پر بھی اس کے مزاج کے خانے میں فٹ نہیں ہوتے تھے۔ وہ بے زار ہو گئی تھی چند لمحوں میں۔ اس کی دل کی کیفیت چہرے سے عیاں تھی جو چوکیدار کی بیوی بہ خوبی محسوس کر رہی تھی لیکن وہ اس کے مزاج کو سمجھتی تھی کہ اگر وہ کچھ کہے گی تو مشتعل کے حاکمانہ ذہن پر یہ بات ناگوار گزرے گی کہ نوکرانی ہو کر منہ کھول رہی ہے۔

''یہاں کی عورتیں اسی طرح کام کرتے کرتے ہی زندگی گزار دیتی ہیں؟ کوئی مشاغل نہیں ہیں ان کے؟'' خوب سارا جائزہ لینے کے بعد وہ تھک کر واپس کار میں آ کر بیٹھ گئی تھی اور منرل واٹر پیتے ہوئے بولی تھی۔

''غریبوں کے کیا مشاغل جی۔ صبح سے رات تک عورت کام کرتی ہے، گھر کا بھی اور کھیتوں کا بھی، پھر دو وقت ڈھنگ سے پیٹ بھرنے کو روٹی ملتی ہے ورنہ کوئی پوچھنے والا بھی نہیں ہوتا۔''

''عورت کو اپنے حق کے لئے آواز بلند کرنی چاہئے۔ وہ کیوں ان گائے بھینسوں میں رہ کر ان کی طرح ہی بے زبانی کی زندگی گزار رہی ہیں؟''

''بی بی جی! کون مانگے گا اور کون دے گا؟ عورت کا حق عورت ہی مارتی ہے۔ اصل ظلم کرنے والی عورت پر، عورت ہی ہوتی ہے۔ مرد کے تو صرف کان بھرے جاتے ہیں۔''

''جب لوگوں کو علم سے دور رکھا جائے گا تو جہالت پھیلے گی۔ اور جہالت سے بری چیز کوئی نہیں ہے۔ تعلیم نہیں ہوگی تو شعور نہیں آئے گا، بہتر اور بدتر کی تمیز نہیں آئے گی۔'' وہ سوچ رہی تھی۔ پھر سارا دن وہ گاؤں کے مختلف گھروں میں جا کر ان سے ملتی رہی اور ان مظلوم عورتوں کی کہانیاں اس کے اندر تغیرات پیدا کرنے لگیں۔

وہ شام کو واپس لوٹی تو جھولی میں بہت سی داستانیں بھری تھیں کہ جن کے کردار دل پر نقش ہو کر رہ گئے تھے۔

وہ جن عورتوں کو از حد اجڈ، جاہل و گنوار سمجھ کر اگنور کر رہی تھی، ان کے ہمت و حوصلوں، صبر و استقلال نے اسے متحیر کر ڈالا تھا۔ وہ اپنی سوچ پر شرمندہ ہو کر رہ گئی تھی۔

''میں نے کہا تھا نا لوگوں سے مل کر ہم ان کے متعلق جان کر ہی بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ دنیا کے چال چلن کا اندازہ بھی ہمیں ہو جاتا ہے۔'' رات کھانے کے بعد چہل قدمی کے دوران مشعل نے سارے دن کی روئیداد سنائی تو وہ گویا ہوا تھا۔

''ہم کب چلیں گے یہاں سے؟''

''کیوں...... ابھی ہمیں یہاں کتنا عرصہ ہوا ہے؟'' اس نے الٹا سوال کر دیا۔

''کیا ہم یہاں ساری زندگی گزارنے کے لئے آئے ہیں؟''

''ساری زندگی......'' وہ تمسخرانہ انداز میں مسکرایا تھا۔

''میں نے جوک نہیں سنایا، سوال کیا ہے۔'' ہمیشہ کی طرح اس کی مسکراہٹ مشعل کو تپا گئی تھی مگر پھر بھی اس نے لہجے کو نارمل رکھا تھا۔

''میں نے قہقہہ تو لگایا نہیں ہے۔''

''لیکن مسکراہٹ قہقہے سے زیادہ بھاری ہے۔''

''ارے یار! تم تو مسکراہٹ پکڑ لیتی ہو۔'' راستے میں آئے پتھر کو ٹھوکر مارتے ہوئے وہ بے تکلف لہجے میں بولا۔

''ساری زندگی...... آخر مقصد کیا ہوا اس طرح تخاطب کا؟'' شاہ ویز کے جملے نے اس کی طنزیہ مسکراہٹ کی کاٹ اسے بہت کچھ سمجھا گئی تھی۔

''کچھ نہیں...... کچھ بھی نہیں۔ ان بلاوجہ کی باتوں میں کیوں دماغ کھپاتی ہو؟'' شاہ ویز نے کہہ کر بات ختم کر دی تھی مگر مشعل کے دل میں عجیب وہم چھانے لگے تھے۔

وہ یہ اچھی طرح جانتی تھی، شاہ ویز سے اس کی مرضی کے بنا کوئی بات معلوم نہیں کی جا سکتی، اسی طرح وہ قبل از وقت کچھ کہنے سے بھی گریزاں رہتا تھا۔

وہ تفکرات کے نئے پھندوں میں الجھنے لگی تھی۔

شاہ ویز کی ادھوری بات بہت سے معنی رکھتی تھی جن کو وہ بہ خوبی سمجھنے، جاننے، محسوس کرنے کا ادراک رکھنے لگی تھی۔ پہلے وہ اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی تدبیریں کرتی تھی، وجوہات ڈھونڈتی تھی جن کے بہانے سے ان سے جان چھڑائی جا سکے۔ اپنی انہی خواہشات و توقعات کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اس نے بہت موثر و جامع پلاننگ کی تھی جس کے تحت نہ صرف شاہ ویز کو زچ و پریشان کیا تھا بلکہ اس کی ماں یعنی بے جی کی تو اس قدر توہین و تذلیل کی تھی کہ اگر کوئی عام عورت ہوتی تو کب کی اسے گھر سے نکال چکی ہوتی بلکہ گھر سے ہی نہیں اپنے بیٹے کی زندگی سے بھی علیحدہ کر چکی ہوتی۔ اسے اب اپنی زیادتیوں و بے حسی کا احساس ہو رہا تھا تو بے جی کی فراخ دلی و خلوص کا اندازہ بھی ہو رہا تھا۔

جب سے وہ محبوب ہوا تھا اسی وقت سے اس سے وابستہ ہر شے عزیز تر ہوتی چلی گئی تھی۔

رسوائیوں کا خوف ہے ورنہ یہ خواہش ہے
تم میرے ہو ہر جگہ یہ خبر ٹھہرے
تیرا وجود ہے اتنا عزیز کہ تجھے
رکھوں کہیں بھی نظر تیری منتظر ٹھہرے

□●□

حسن بیگ کے سامنے آفس ٹیبل پر مختلف فائلیں پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ ایک نیلے رنگ کی فائل پر از حد انہماک سے جھکے اپنے گولڈن قلم سے کچھ تحریر کرنے میں مصروف تھے جب ایک جھٹکے سے دروازہ کھلا تھا۔

''میڈم...... میڈم میری بات سنیں پلیز۔'' حسن صاحب نے سر اٹھا کر دیکھا اور بے اختیار کھڑے ہو گئے۔

''سر! یہ میڈم منع کرنے کے باوجود اندر آ گئی ہیں۔ میں نے کہا بھی کہ آپ بے حد بزی ہیں، بنا اپائنٹمنٹ کے نہیں مل سکتے مگر یہ یہاں آ گئیں۔'' سیکرٹری پریشان لہجے میں ان سے مخاطب ہوا تھا۔

''تم تو کیا...... دنیا کی کوئی طاقت مجھے اپنے بھائی سے ملنے سے نہیں روک سکتی۔'' رافعہ کی تیز و کراری آواز حسن صاحب کو حواسوں میں کھینچ لائی، وہ انہیں بالکل غیر متوقع طور پر وہاں دیکھ کر کچھ عجیب سی کیفیت کا شکار ہو گئے تھے۔

''او کے، نوشیش، یو گو پلیز۔'' فوراً ہی شائستگی سے بولے تو سیکرٹری چلا گیا۔

''بھائی جان!'' وہ ان کے شانے سے لپٹ کر جذباتی لہجے میں گویا ہوئی تھیں۔ ''کس بات کی سزا دی آپ نے مجھ کو؟ بنا کچھ کہے، بنا کچھ بتائے ایسے غائب ہوئے کہ ڈھونڈنے سے بھی آپ کا پتہ نہ مل سکا۔'' رافعہ نے ان کے شانے سے لگے لگے ہی دھواں دھار روتے ہوئے شکوے شکایات شروع کر دی تھیں۔

''آپ کے سوا کون ہے میرا...... ماں باپ، بہن بھائی سب رشتے آپ کی ذات سے ہی وابستہ ہیں میرے۔ آپ کی غیر موجودگی بلکہ گمشدگی نے مجھے فکر و پریشانیوں میں ڈال دیا تھا۔ میں کتنی فکرمند تھی یہ آپ محسوس ہی نہیں کر سکتے۔''

ان کے لہجے میں اپنائیت و تڑپ، چھم چھم برستے آنسو، بے قراری و اضطرار حسن بیگ جیسے نرم دل و بلند ظرف شخص کا دل موم کی طرح پگھلا گئے۔

وہ تمام باتیں، تکلیف دہ اذیت ناک مراحل جو دل و جاں کے ساتھ ساتھ رشتے و قرابت داریوں کو بھی مسخ کر گئے تھے اس وقت جیسے دلوں سے بالکل محو ہو گئے تھے۔ اپنی ازلی شفقت و محبت سے انہوں نے ان کے سر پر ہاتھ رکھا تھا۔

''میں جانتا ہوں تمہاری محبت کو۔ احساس ہے مجھے کہ مجھے نہ پا کر تمہیں کیسا محسوس ہوا ہوگا۔ مگر انسان پر کبھی کبھی ایسا وقت بھی آ جاتا ہے کہ وہ اپنی پرچھائیں سے بھی پوشیدہ رہنا چاہتا ہے۔ پھر بھی ایسی ہی آفت ٹوٹ پڑی تھی۔'' وہ انہیں لے کر صوفے پر بیٹھ گئے اور ان کی افسردگی دور کرنے کے لئے وضاحتی لہجے میں گویا ہوئے۔

''کہاں رہ رہے ہیں آپ؟ کلفٹن والی کوٹھی پر تالا پڑا ہے۔'' وہ کیوں منہ چھپا کر روپوش ہوئے تھے یہ وہ اچھی طرح جانتی تھیں اس لئے سرعت سے ان کی بات نظر انداز کر کے وہ عام سے لہجے میں استفسار کرنے لگیں۔

''یہیں آفس کے ایریا میں کچھ گیسٹ رومز ہیں، ان میں سے ایک میں رہ رہا ہوں۔''

''ہائے، کیوں بھائی جان! اتنا کچھ ہونے کے باوجود آپ مہمانوں کے کمرے میں مہمانوں کی طرح کیوں رہ رہے ہیں؟''

''بس وقت کے تقاضے ہیں۔ فی الحال بتاؤ کولڈ ڈرنک لو گی یا چائے کافی؟''

''میں نے تو کھانا ہی نہیں کھایا، دراصل آپ سے ملنے کی خوشی میں بھوک ہی اُڑ گئی تھی۔ اب آپ کو اپنے سامنے دیکھ کر بھوک کا احساس جاگ اٹھا ہے۔''

''اچھا آفس ٹائم آف ہو رہا ہے۔ ہم ڈنر باہر کریں گے۔'' حسن بیگ اٹھتے ہوئے گویا ہوئے تو وہ بھی فوراً اٹھتے ہوئے بولیں۔

''ہوں...... یہ ٹھیک ہے۔ چائنیز فوڈ کھائے کتنا عرصہ ہو گیا ہے، میں ابھی جوجو کو فون کر کے کہتی ہوں وہ چائنیز میں آ جائے۔ بہت عرصے بعد ہم ساتھ کھانا کھائیں گے اور مجھے آپ کو، آپ کے اس مکار و رکر کے کارنامے بھی سنانے ہیں کہ کس کس طرح وہ ہماری نازک پھولوں سی مشعل پر ظلم کرتا ہے۔'' وہ فون کی طرف بڑھتے ہوئے شاطرانہ لہجے میں کہہ رہی تھیں اور فائل پر سائن کرتے کرتے حسن بیگ کی انگلیوں میں پکڑا سنہری قلم یکلخت رک گیا تھا۔

□●□

اس نے اضطرابی طور پر انگلیاں آپس میں پیوست کرتے ہوئے اِدھر اُدھر چکر لگاتے ہوئے بے سدھ سوئے ہوئے شاہ ویز پر نظر ڈالی۔

کتنی گہری و میٹھی نیند سو رہا تھا وہ، اس کی نیند اڑا کر۔ چوکیدار دو مرتبہ آ چکا تھا کہ وہ اسے بیدار کر دے۔ کسی ضروری کام کے لئے انہیں کہیں جانا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کس طرح جگائے اور اسی اضطراب میں چکر کاٹ رہی تھی کہ اسی اثناء میں چوکیدار تیسری مرتبہ پیغام دے گیا تو جھجکتی ہوئی اس کی جانب بڑھی تھی۔ عجلت میں پاؤں کارپٹ پر سلپ ہوا تھا اور وہ جو اسے جگانے کے ارادے سے کچھ جھک کر آگے بڑھ رہی تھی، سلپ ہونے کے باعث سیدھی اس پر جا گری تھی۔ شاہ ویز کے چہرے سے اس کا چہرہ ٹکرایا تھا۔ بے اختیار سنبھلنے کے لئے اس نے شاہ ویز کا بازو پکڑ لیا تھا۔

شاہ ویز جاگ گیا تھا۔

مشعل نے گھبرا کر اس کی جانب دیکھا۔ وہ بھی سرخ سرخ خمار آلود نگاہوں سے اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔ نا معلوم اس لمحے اس کی آنکھوں میں کون سے رنگ تھے۔ وہ مخصوص تمسخرانہ و ظالمانہ چمک نہ تھی جو اس کا وطیرہ خاص تھی۔

وہ شرمندہ ہو کر اٹھنے لگی۔

''میں...... میں آپ کو جگانے آئی تھی۔'' وہ بوکھلائی، گھبرائی سی ہکلا کر بولی۔

''میں جاگ گیا ہوں۔'' شاہ ویز نے دلکشی سے مسکراتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے ذومعنی لہجے میں کہا۔

''میں جاگ گیا ہوں۔ فرمائیں کیا خدمت کروں؟ کیا حکم ہے میرے لئے؟''

''واچ مین کئی بار بیل بجا چکا ہے۔'' وہ اس کی جانب سے رخ موڑ کر کھڑی تھی۔

''اوہ، یہ بات ہے...... ورنہ میں سمجھا میری پرسنالٹی نے آج آپ کو جھکنے پر مجبور کر ہی ڈالا۔'' وہ اٹھ کر بیٹھتے ہوئے اپنے مخصوص لہجے میں گویا ہوا تھا۔

مشعل کچھ نہ بولی۔ وہ ابھی اپنے دھڑکتے دل و کانپتے وجود پر قابو نہ پا سکی تھی۔ عجیب سی کیفیت تھی جو اس پر طاری تھی۔

''جگانے کا یہ انداز مجھے بے حد پسند آیا ہے۔ نیند میں ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا بہت سارے مہکتے گلاب میرے سینے پر آ گرے ہوں۔'' وہ اس کے مقابل چلا آیا تھا۔

''سنو......'' وہ اس کے سرخ چہرے پر نگاہیں جما کر بولا۔ ''اتنا فنٹاسٹک اسٹائل کہاں سے سیکھا ہے؟'' وہ اسے زچ کر رہا تھا۔

''میں نے از خود یہ نہیں کیا ہے۔ میں جگانے آ رہی تھی میرا پاؤں سلپ ہوا اور میں آپ پر گر گئی۔'' مشعل آہستگی سے گویا ہوئی تھی۔

''ارے میں نے کوئی اعتراض تو نہیں کیا، نہ ہی مائنڈ کیا، بلکہ گزارش کر رہا ہوں کبھی کبھی جگا دیا کیجئے شاید اسی طرح آپ کی بات بن جائے۔''

''کمینہ، ذلیل انسان، کس قدر خود پسند ہے۔'' اس کے کمرے سے جانے کے بعد وہ بڑبڑائی تھی۔

وہ سر جھٹک کر کمرے سے نکل آئی تھی۔

شہر کی نسبت گاؤں کی صبحیں خوب صورت و خوش گوار ہوتی ہیں۔ ٹھنڈی ٹھنڈی کثافت سے پاک ہوا، دھوئیں، شور اور ہنگاموں سے مبرا نکھری، ستھری ترو تازہ فضا۔ وہ لان کی نم گھاس پر ٹہلتی ہوئی شریفے، امرود اور جامن کے درختوں کی ٹہنیوں پر اٹھکیلیاں کرتی چڑیوں کو دیکھ رہی تھی جن کا مدھم شور ماحول میں ارتعاش پیدا کر رہا تھا۔

''بی بی صاحبہ! چائے لیجئے۔'' رشیدہ کپ و ساسر لئے بڑے مؤدبانہ انداز میں مخاطب ہوئی تھی۔ اس نے ساسر ہاتھ میں پکڑتے ہوئے اس کی جانب دیکھا۔

لائٹ گرین بڑے دوپٹے کو نماز کے اسٹائل میں لپیٹے نگاہیں جھکائے، گردن کو معمولی خم کئے وہ اس لمحے اسے بہت منفرد اور پُرکشش محسوس ہوئی تھی۔ ہر آرائش و زیبائش سے بے نیاز۔ اس کے چہرے پر انوکھی جاذبیت اور نکھار تھا۔ ایسی جاذبیت اور نکھار اس نے ان سب ماں بیٹیوں کے چہرے پر محسوس کیا تھا حالانکہ وہ عام سے نقوش اور گندمی رنگت والی لڑکیاں تھیں جن کو میک اپ کے نام پر فیس پاؤڈر بھی استعمال کرنے کی اجازت نہ تھی جو تھریڈنگ، بلیچنگ، فیشل وغیرہ کے عمل سے بھی ناواقف تھیں۔ جن کی زندگی گھر اور گھر کی چہار دیواری تک ہی محدود و محصور تھی۔

پھر نا معلوم کس طرح وہ اتنی معمولی ہونے کے باوجود غیر معمولی و پُرکشش تھیں۔

''آپ ناشتے میں کیا لیں گی؟'' اسے مسلسل اپنی طرف گھورتے دیکھ کر رشیدہ کی جان ہوا ہو رہی تھی۔ اسے مسلسل خاموش دیکھ کر وہ سہمے ہوئے انداز میں گویا ہوئی تھی۔

''تم کیا کھاتی ہو؟'' بے اختیار ہی لب وا ہوئے تھے۔

''جی...... میں؟...... کبھی انڈا پراٹھا، کبھی رات کا باسی روٹی سالن، کبھی پراٹھا اچار۔'' بہت سعادت مندی سے اس نے تفصیل بتا دی تھی۔

''ہوں......'' اس نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے بغور اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اور چہرے پر کیا لگاتی ہو؟''

''چہرے پر کچھ بھی نہیں جی...... اماں ناراض ہوتی ہیں پاؤڈر کریم لگانے سے۔''

بلا کی مرعوبیت تھی۔

''صاحب کو بیڈ ٹی دی؟''

یکدم اس کو احساس ہوا کہ وہ ایسے سوالات کر کے انہیں خوش فہمی کا موقع دے رہی ہے جو درست فعل نہیں ہے۔ اپنی حماقت کا احساس ہوتے ہی وہ اسے آج کے ناشتے کا مینو بتا کر بیڈ روم میں چلی آئی جہاں شاہ ویز جانے کی تیاریاں کر رہا تھا۔

□●□

آنسو کتنا پُرفسوں احساس ہے۔

وہ جو آنکھ کی سیپ سے گرتے ہیں، موتیوں سے بھی زیادہ حسین و دلکش لگتے ہیں اور ان خوب صورت موتیوں کی قدر کوئی قدر دان ہی کر سکتا ہے۔ وہی ان کی اہمیت و افادیت کو سمجھ سکتا ہے ورنہ دوسروں کے لئے یہ ارزاں و بے وقعت سی چیز ہیں۔

آنسو یونہی حاصل نہیں ہو جاتے۔ انہیں حاصل کرنے کے لئے دل پر بڑی گہری چوٹ کھانی پڑتی ہے، احساسات کو گھائل کرنا پڑتا ہے۔ جب درد کا دھواں آنسوؤں کی صورت میں نکلتا ہے جو تمام خزانوں سے زیادہ قیمتی ہیں، ان موتیوں کو وہی چنتا ہے جو ان کی قدر و قیمت سے آگاہ ہوتا ہے اور فرم نے اس کی آنکھ سے گرنے والے ہر موتی کو بڑی چاہ، اپنائیت سے چن لیا تھا کہ وہ ایک بہترین شریک سفر ہی نہیں بلکہ کامیاب جوہری بھی تھی۔

''میں کتنا خوش ہوں...... اس کا اندازہ شاید تمہیں نہیں ہوگا۔ اس عمر میں جب کہ میں اپنی زندگی سے قطعی مایوس ہو گیا تھا تم نے مجھے ایک نئی زندگی سے ہم کنار کیا ہے۔'' رپورٹس ان کے ہاتھ میں تھیں۔ مسرت و شادمانی سے ان کا انگ انگ چمک رہا تھا۔

''تھینکس...... تھینکس اے لوٹ مائی ڈارلنگ۔'' انہوں نے جھک کر اس کا مخروطی ہاتھ تھام کر اپنی آنکھوں سے لگا کر بوسہ دیا تو وہ بری طرح لجا کر رہ گئی۔

''تم بھی کچھ کہو جب سے یہ خوش خبری سنی ہے میں بولے ہی جا رہا ہوں۔ تم بھی کچھ کہو۔ کیا تمہیں ماں بننے کی خوشی نہیں ہے؟'' وہ قریب بیٹھتے ہوئے لمحے بھر کو فکر مند ہوئے۔

''نہیں، یہ بات نہیں ہے۔ یہ رشتہ لازوال ہے۔ ایک عورت کی تکمیل ماں بن کر ہی ہوتی ہے۔ میں نے اس خیال کو، اس آرزو کو دل میں تھپک تھپک کر سلا دیا تھا کہ شاید آپ مجھے اس سعادت سے محروم رکھیں گے کیونکہ آپ باپ پہلے بن چکے ہیں اور شاید...... شاید آپ سے وابستہ دوسرے رشتے بھی اس رشتے کو قبول نہ کریں۔'' اس نے آہستگی سے اپنے خدشات و احساسات ان سے شیئر کئے تھے جنہیں سن کر وہ کھل کر مسکراتے ہوئے گویا ہوئے۔

''تمہاری سوچ اور تفکرات بے بنیاد نہیں ہیں ڈارلنگ۔ دراصل حقیقی مشاہدے میں پہلی بار آیا ہے کہ جو لوگ میری عمر میں سیکنڈ میرج کرتے ہیں وہ ہسبنڈ کا رول تو بہ خوشی قبول کر لیتے ہیں مگر وفادار بننا گوارہ نہیں کرتے اور شاید میں بھی نہیں کرتا اگر مجھے تم جیسی باوفا، با کردار بیوی نہ ملی ہوتی، تمہاری پیار بھری رفاقت نہ ملی ہوتی تو میں بھی عام مردوں کی طرح صرف نفسانی خواہشات کی تسکین کے لئے یہ رشتہ استعمال کرتا مگر اب میری دلی خواہش ہے کہ باپ بنوں اور اس رشتے کے حقیقی تعلق کو محسوس کروں اور رہا سوال مجھ سے وابستہ لوگوں کا تو نہ میں نے کسی کی پرواہ آج تک کی ہے اور نہ آئندہ کروں گا۔ جب زندگی ہماری ہے، اس پر ہمارا حق ہے تو بلا کسی خوف و خطر کے ہمیں اپنے طریقے سے جینا چاہئے۔ کیوں بلاوجہ کے ڈر و خوف میں پھنس کر خود کو پابند کریں۔''

''آپ آرام کریں...... رات ہسپتال میں بھی نہیں سوئے ہیں اور اب بھی بے آرام ہو رہے ہیں۔'' حرا ان کی جانب پیار بھری نظروں سے دیکھتی ہوئی گویا ہوئی۔ گرے پینٹ، اسکائی لائٹ کلر کی شرٹ میں ان کے وجیہ چہرے پر تھکان سرخی بن کر چھا رہی تھی۔ آنکھوں میں حقیقی مسرت کی روشنی چمک رہی تھی۔

''بیگم صاحبہ! آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔ ہمیں تو آپ کی خدمت کرنے کی سعادت نصیب ہوگی اب۔'' بے پایاں خوشی کے احساس نے اس سنجیدہ و پُروقار شخص کو خاصا شوخ بنا ڈالا تھا۔

□●□

شام کا جادو تھا یا شدت تمہاری یاد کی
وقت کیا مجھ کو تو دریا بھی ٹھہرا لگا

حسن بیگ صاحب سنجیدگی سے رافعہ کی گفتگو سن رہے تھے اور رافعہ بغیر کسی فل اسٹاپ یا کومے کے بول رہی تھیں، کسی سیلاب زدہ چڑھتی ندی کی مانند ان کی زبان رواں دواں تھی۔ حسن بیگ سے ان کی یہ چوتھی ملاقات تھی۔

چار دنوں کی اس چوتھی ملاقات میں ان کی زبان پر موضوع گفتگو شاہ ویز کی شر پسندی، حیوانیت، ظلم و ستم اور جواب میں مشعل کی مظلومیت، معصومیت، صبر و استقلال کی من گھڑت داستانیں تھیں کہ جن کو سنا سنا کر ان کے آنسو خشک نہ ہوتے تھے۔ چرب زبانی و دوغلی فطرت تو ان کی اصل تھی۔ مکار و سازشی ذہن اس قدر کہ لمحے بھر میں ملے ہوؤں کو لڑوا دیں یا لڑے ہوؤں کو ملوا دیں۔ ہر طریقے سے وہ اپنی غرض پوری کرنا جانتی تھیں۔

ان کا ہر قدم اپنے بہتر سے بہتر مفاد کی جانب بڑھتا تھا۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا بھائی جان! میں آپ کو ایک ایک بات، ایک ایک حرکت اس فراڈی کی بتا رہی ہوں اور آپ بجائے مشعل کو اس وحشی کے پنجوں سے آزاد کروانے کے میری باتیں سن کر مسکرانے پر اکتفا کرتے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہی آپ کی پالیسی۔ مجھے تو لگتا ہے ان حرام خور ماں بیٹے نے آپ پر کوئی سحر وغیرہ کروا دیا ہے۔ جس لڑکی کو آپ نے سگی اولاد سے بڑھ کر چاہا، کبھی ڈانٹ مار تو درکنار پھولوں کی چھڑی سے بھی نہ چھوا ہو، اسے وہ غیر و اجنبی شخص ایسے دھنتا ہے جیسے دھوبی کپڑے کو دھوتا ہے یا لوہار لوہے پر ہتھوڑے کی ضربیں لگا کر حسب منشا اشکال ترتیب دیتا ہے اور ایسا ہی حال اس وحشی جلاد نے ہماری لاڈوں پلی مشعل کا کیا ہے۔ آہ! مشعل جو، جو جوگ کے سنگ مشعل کی طرح چمکدار و روشن دکھائی دیتی تھی اب کسی بجھے چراغ کی طرح بے رونق و ویران نظر آتی ہے۔''

چند لمحے توقف کے بعد وہ پھر رواں ہوئیں۔

''مجھے تو محسوس ہو رہا ہے بھائی جان، آپ کے دل سے مشعل کی محبت نکل گئی ہے اور ایسا تو ہونا ہی تھا۔ آخر کسی اور کی ناجائز اولاد کو آپ کب تک ......''

''رافعہ!'' وہ صوفے سے کھڑے ہو گئے۔ آواز غیر معمولی طور پر بلند ہو گئی تھی۔ شدید تر غصے کی سرخی ان کے چہرے پر نمایاں تھی۔ قدرے تیز تنفس سے ان کا جسم جھنجھنا اٹھا تھا۔

''میں نے غلط تو نہیں کہا بھائی جان۔'' وہ بھی ان کے انداز سے سراسیمہ ہو کر بولیں۔

''غلط...... تم نے ایسی بات کہی ہے کہ تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو دوبارہ ایسی بات کہنے کی جرأت نہ کرتا۔'' اس وقت سخت اشتعال انگیزی ان کے چہرے، ان کی آنکھوں و لہجے سے مترشح تھی۔

''لیکن بھائی جان، میں نے کیا غلط کہہ دیا؟''

''ایک بار نہیں، بار بار تم نے میرے جذبات کو ٹھیس پہنچائی ہے۔ مشعل سے تمہیں محبت نہ سہی مگر میرے احساسات کا تو خیال رکھا کرو۔ وہ میری بیٹی ہی نہیں میری زندگی، میری روح ہے۔ اس کو گالی دینا مجھے گالی دینے کے مترادف ہے۔ اس کی توہین میری توہین ہے۔ اس کی رسوائی میری رسوائی ہے۔''

''ہائے ہائے بھائی جان! خون کے رشتے اتنے بودے اور ناپائیدار ہو گئے کہ سگی بہن کی کوئی حیثیت ووقعت ہی نہ رہی۔ وہ کچھ نہ رہی جو سب کچھ تھی اور وہ سب کچھ ہو گئی جو کچھ نہ تھی۔'' حسب معمول وہ آنسو بہانے کو تیار تھیں۔

''اس دور میں خون کے رشتے اتنے ہی نازک و ناپائیدار ہیں جتنے کانچ کے برتن ہوتے ہیں کہ ذرا معمولی سی لغزش ہوئی نہیں اور وہ چکنا چور ہوئے۔ اور اگر انہیں کسی تدبیر سے جوڑ بھی دیا جائے تو وہ پہلے جیسے نہیں رہتے، ان میں پڑنے والی بدصورت لکیریں ہر ایک کو اس حقیقت سے آگاہ کر دیتی ہیں کہ ٹوٹنے کے بعد انہیں دوبارہ جوڑ اگیا ہے اور رشتوں کا بھی حال ایسا ہی ہوتا ہے۔'' حسن بیگ صاحب کے لہجے میں ایک ایسی کاٹ و آنچ تھی کہ رافعہ چند لمحوں کو گنگ سی رہ گئی تھیں۔ انہوں نے جو کچھ ان کے ساتھ کیا تھا وہ سب انہیں بخوبی ازبر تھا مگر وہ خود غرض اور خود پرست لوگوں کی اس برادری سے تعلق رکھتی تھیں جو دوسروں پر ظلم و ستم روا رکھ کر بھی خود کو مظلوم و معصوم تصور کرتے ہیں۔

اس وقت بھی بھائی کے منہ سے نکلی سچائی انہیں عرقِ ندامت میں شرابور کرنے کی بجائے احساسِ تنفر سے سلگا گئی تھی۔ وہ اندر ہی اندر کسی گیلی لکڑی کی مانند دھواں دھواں سلگتی گئی تھیں۔ اگر انہیں ان سے مطلب نہ ہوتا تو وہ ایک ٹھوکر مار کر انہیں وہاں سے نکل گئی ہوتیں، مگر مجبوری یہی تھی کہ انہیں ان سے رقم لینی تھی کہ درحقیقت ان کے تمام عیش و آرام حسن بیگ کے ہی مرہونِ منت تھے۔

''یہ آپ نے کس طرح سوچ لیا کہ میں مشعل کو اپنا نہیں سمجھتی؟ اس سے محبت نہیں کرتی؟ نہیں نہیں بھائی جان یہ آپ کی غلط فہمی ہے۔ اگر وہ مجھے عزیز نہ ہوتی یا میں اس سے محبت نہ کرتی تو کیوں اسے جوجو کے لئے انگیج کرتی؟'' بازی تیزی سے پلٹتی دیکھ کر انہوں نے پینترا بدلا تھا۔

''اب جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ نصیب تو اوپر والا لکھتا ہے، جوڑے بھی آسمان پر ہی بنائے جاتے ہیں۔ مشعل کا نصیب جواد سے وابستہ نہیں کیا گیا تھا، اس کا نصیب شاہ ویز کے ساتھ لکھا گیا تھا جو اسے مل گیا۔ شاہ ویز میں وہ تمام خوبیاں ہیں جو ایک ہونہار و قابلِ فخر داماد میں موجود ہونی چاہئیں۔ مجھے از حد فخر ہے اس پر۔''

حسن بیگ کے انداز میں شاہ ویز کے لئے بے حد ستائش و توصیف تھی۔ رافعہ کی حسد و غصے کے مارے بری حالت تھی مگر مجبوراً مسکرا رہی تھیں۔

❏●❏

شاہ ویز کا پچھلے دو ہفتوں سے یہ معمول بن گیا تھا کہ وہ صبح ہی نکل جایا کرتا تھا اور شام ڈھلے واپس آتا۔ پھر غسل وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد یا تو چوکیدار کے ساتھ گاؤں کے بزرگوں کی بیٹھک میں جا بیٹھتا یا کمرے میں تاریخی یا ادبی موٹی موٹی کتابیں لے کر بیٹھ جاتا اور پھر اسے اردگرد کی کوئی خبر نہ رہتی تھی۔

اس کے ان معمولات نے مشعل کو بوریت کی انتہاؤں تک پہنچا ڈالا تھا۔ یہاں قیام پذیر ہوئے انہیں ایک ماہ سے زائد عرصہ گزر چکا تھا۔ اب وہ یہاں رہنے کو قطعی تیار نہیں تھی اس وقت بھی ایسا ہی کچھ ہوا تھا۔

وہ ایک کتاب لے کر بیڈ پر نیم دراز ہو کر مطالعہ کرنے لگا۔

''میری سزا کب ختم ہو گی؟'' وہ جو اس کی طرف سے خوب جلی بھنی بیٹھی تھی، اسے مطالعے میں محو ہوتے دیکھ کر پاؤں پٹختی ہوئی وہاں جا کر گویا ہوئی۔

''کون سی سزا؟ اگر میرا ساتھ تمہیں سزا لگتا ہے تو یہ سزا میں بھی برداشت کر رہا ہوں۔'' اس نے کتاب سے نگاہیں اٹھائے بغیر اپنے مخصوص لہجے میں جواب دیا۔

''تم سے تو سیدھے منہ بات کرنے کی کوشش ہی فضول ہے۔''

''سیدھے لوگوں سے سیدھی بات، الٹے لوگوں سے الٹی بات۔ لوگوں کو میں ان کی اوقات کے مطابق ہی ڈیل کرتا ہوں۔'' اس کا انداز ہنوز تلخ تھا۔

''میں یہاں مزید رہنا نہیں چاہتی۔ میرا دل گھبرا رہا ہے۔'' اس کے لہجے میں بے چارگی تھی۔ شاہ ویز نے اس کی جانب دیکھا تھا۔

کاٹن کے سادہ پنک سوٹ پر پنک اینڈ بلیک پرنٹڈ دوپٹہ لئے وہ براؤن بالوں کا سادہ سا جوڑا بنائے خاصی پرکشش و معصوم لگ رہی تھی۔ چہرے پر اداسی و بے کلی نے عجیب سا نکھار پیدا کر دیا تھا۔ اس کی بے ارادہ اٹھائی گئی نگاہ گویا اٹھی ہی رہ گئی تھی۔ بے ساختہ دیکھے گیا تھا۔

''دل ...... اس دل کے کہنے پر چل کر بڑے بڑے دانش مند لوگوں نے اپنی حیات تباہ کر ڈالی، دل کی باتوں پر دھیان مت دیا کرو، دل مس گائیڈ کرتا ہے، ہمیشہ غلط سمت دکھا کر بھٹکا دیتا ہے۔ دماغ پر توجہ دیا کرو، اس کی سنا کرو۔''

''میں اب یہاں سے جانا چاہتی ہوں۔''

''کہاں؟''

''جہاں سے ہم آئے تھے۔''

''وہ جگہ تمہارے لئے قید خانہ تھی۔''

''میری زندگی میں قید لکھ دی گئی ہے تو میں کیا کر سکتی ہوں ماسوائے صبر کے؟''

دھیما لہجہ، شائستہ انداز۔

جھکی نگاہیں، سنجیدہ چہرہ۔

یہ وہ لڑکی تو نہ تھی جس کی ہر جنبش سے تحقیر جھلکتی تھی، جس کے لبوں سے لفظ انگارے بن کر نکلتے تھے۔

جو خود سری، خود پسندی و خود پرستی کا وجود تھی، حد درجہ مغرور و منہ پھٹ، کسی کو خاطر میں نہ لانے والی سرکش اور ضدی۔

بلکہ یہ لڑکی تو اس لڑکی کا عکس بھی نہ تھی۔ از حد معصوم و دلربا، کلیوں کی مانند شگفتہ و پھولوں کی طرح شاداب، اس کے حکم کی تابع۔

''تمہارا میرا معاہدہ ہوا تھا کہ تم وہی کرو گی جو میں چاہوں گا۔'' اس نے کتاب سینے پر اوندھی کر لی تھی اور تکیہ سیدھا کر کے لیٹ گیا تھا۔ وہ پوری طرح سے اس کی جانب متوجہ تھا۔ اس کی نگاہیں محویت سے اس کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

''اتنے عرصے سے کیا کر رہی ہوں؟'' اس کے اشارے پر وہ بیڈ کے کنارے پر ٹک گئی تھی۔

''ہوں...... بہت کم بلکہ چیونٹی سے بھی کم رفتار ہے، ذرا تیز تیز حرکت کرو تو یہاں سے جانے کا موقع میسر ہو۔''

''جب تک ہم خود کو تبدیل کرنا نہیں چاہیں گے تو دنیا کی کوئی طاقت یہ امر انجام نہ دے پائے گی اور جب ہم خود کو بدلنے کا تہیہ کر لیں، ہمیں یقین ہو جائے کہ ہم میں کچھ باتیں غلط ہیں، ہمارے قدم درست سمت نہیں اٹھ رہے ہیں تو قدم واپس پلٹنے میں، راستہ بدلنے میں زیادہ وقت نہیں لگتا۔ البتہ کچھ وقت ضرور لگتا ہے خود کو چینج کرنے میں۔''

''اور یہ کچھ وقت کتنے سالوں پر محیط ہوتا ہے...... ذرا وضاحت کریں گی؟''

''یہ انسان کی ول پاور اور اسپیشل فیلنگز پر ڈپینڈ کرتا ہے۔'' اس کی شوخی کا جواب بھی اس نے بڑی سنجیدگی سے دیا تھا۔

''میں بھی یہاں بے جی سے دور رہنے میں کوئی مسرت محسوس نہیں کر رہا۔ بے جی سے دور رہنا میرے لئے ایک کڑا امتحان ہے جس میں، میں کامیابی سے سرخرو ہونا چاہتا ہوں کہ میری یہاں تک آمد ان کے حکم کی بجا آوری ہے۔ اپنی ذات کی نفی کے لئے میں سب کچھ کر سکتا ہوں مگر بے جی کی کوئی خواہش رد کرنے کا حوصلہ نہیں۔''

''ہاں محبتیں ہی انسان کو بہت سی حقیقتوں سے آشنا کرتی ہیں اور ہم کو بے حد خوب صورت و روشن منزل کا ادراک دیتی ہیں جن کا تصور بھی ہمیں نہیں ہوتا۔''

''آہ...... آہ! یہ کیا ہوا؟ ...... یہ کیا ہوا؟'' شاہ ویز اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام کر بری طرح کراہ رہا تھا۔

''کک ...... کک ...... کیا ہوا؟'' یکدم گھبرا کر وہ اس کی جانب بڑھی تھی اور مضطرابی انداز میں اس کا سر اپنے ہاتھوں میں تھام لیا تھا۔

''یہ تم ہی ہو نا؟'' اپنے سر پر رکھے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر وہ از حد سنجیدگی سے گویا ہوا تھا، بالکل نارمل انداز میں۔

''ہاں ...... میں ہی ہوں۔ لیکن تمہیں ہوا کیا ہے؟'' اچانک اس کا کراہنا، پھر یکدم نارمل ہو جانا اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا وہ ہونق بنی سوال کر رہی تھی۔

''اتنی سمجھداری کی باتیں تم کر سکتی ہو ...... مجھے یقین نہیں آ رہا۔ میں سمجھا شاید میرا دماغ چل گیا ہے۔'' وہ شوخ لہجے میں مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ مشعل کے دونوں ہاتھ اس کے ہاتھوں میں تھے۔ اس وضاحت پر وہ مسکرا اٹھی خفیف انداز میں۔

''حسن بیگ صاحب کی زمینوں اور فش پاؤنڈز کے کچھ مسائل ہیں جن کو حل کرنے میں دو ہفتے لگیں گے، تب تک تمہیں انتظار کرنا ہوگا۔'' اس کے مضبوط اور حدت سے پُر ہاتھوں میں اپنے ہاتھوں کو وہ اچھی ڈھنگ سے محسوس بھی نہ کر پائی تھی کہ اس نے بہت آہستگی سے اس کا ہاتھ ہٹا دیا تھا۔

وہ جو لمحے کے ہزارویں حصے میں خوش گمانیوں کے عروج پر مائل پرواز تھی، دھڑام سے پر کٹے پرندے کی مانند زمین بوس ہوئی تھی۔

''کیا ہوا...... ؟ ایک دم گم صم کیوں ہو گئی ہو ...... طبیعت ٹھیک ہے؟'' شاہ ویز نے چونک کر اس کی جانب دیکھا تھا۔ لحہ قبل مسکراتی مشعل یکدم بت بن گئی تھی۔

''کیا ہوا؟...... کیا ہو سکتا ہے مجھے؟...... یہ سوال تو انسانوں سے پوچھے جاتے ہیں جو احساس رکھتے ہیں، جذبات رکھتے ہیں یا ان سے پوچھا جاتا ہے جن کا کوئی اپنا ہوتا ہے، جن کا کسی کو خیال ہوتا ہے، جن کو کوئی پیار کرتا ہے، چاہتا ہے، اس کی ضرورت محسوس کرتا ہے، اس کو اہمیت دیتا ہے۔ میرے لئے یہ سوال بے معنی و فضول ہے، کسی کو پروا ہے میری؟ کون چاہتا ہے مجھے؟ میری ضرورت کسی کو بھی نہیں ہے۔ میں صرف ایک موم کا وجود ہوں جس کو سب اپنی اپنی مرضی کے مطابق اشیپ بنانا چاہتے ہیں بس۔''

ایک عرصے سے اندر کھولتی اداسی، مایوسی و بے بسی نے یک لخت ہی صبر و ضبط کا دامن چھوڑ دیا تھا۔ وہ ہسٹریائی انداز میں چیخ چیخ کر رونے لگی تھی۔

شاہ ویز بالکل خاموشی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔

''پاپا نے مجھے مُردوں سے بدتر سمجھ لیا، ایسا ایٹی ٹیوڈ تو مرنے والوں کے ساتھ بھی نہیں کیا جاتا۔ ان کی قبر پر بھی فاتحہ خوانی کے لئے کبھی کبھار لوگ پہنچ ہی جاتے ہیں مگر مجھ زندہ کے ساتھ تو یہ بھی نہیں ہوا کہ ان گزرے سات آٹھ ماہ کے دوران پاپا نے غلطی سے ہی کال کر لی ہو، کبھی مجھ سے میرے متعلق پوچھا ہو کہ میں جو ان سے ایک دن دور رہنا برداشت نہیں کرتی تھی، اب اتنا عرصہ ان کے بغیر کیسے رہ رہی ہوں یا جس کو انہوں نے اتنی امپورٹنس دی، جو ان کی بیٹی سے بھی زیادہ ان کے لئے ویلیوڈ ہے، جس شخص سے وہ بہت زیادہ انسپائرڈ ہیں وہ ان کی بیٹی کو وہ احترام، عزت، محبت و اہمیت دے رہا ہے جو ایک ہسبنڈ اپنی وائف کو دیتا ہے۔'' وہ بولتے بولتے رو رہی تھی۔

روتے روتے بول رہی تھی۔ شاہ ویز بہت خاموشی سے اس کی ہر بات بہ غور سن رہا تھا۔ اس دوران اس نے اسے خاموش کرنے یا جواباً کچھ کہنے کی کوشش قطعی نہیں کی اور مشعل تمام غبارِ دل آج نکال دینے کے درپے تھی۔

''میں نے اپنی تمام گزشتہ غلطیاں مان لیں، اقرار کر لیا کہ میں غلط تھی۔ حالانکہ اس کی میں ذمے دار نہیں تھی۔ انسان جس ماحول میں موو کرتا ہے اور جس انداز میں اس کی کیئرنگ ہوتی ہے، وہ وہی اپناتا ہے جو اسے سکھایا جاتا ہے۔ میں جیسی تھی اس میں میری خطا نہیں تھی کیونکہ میری پرورش اسی انداز میں کی گئی تھی۔ اگر میری طرح تمہیں بھی یہی ماحول ملتا تو تم بھی میری طرح ہی ہوتے یا تمہاری طرح مجھے ماحول ملا ہوتا، پرورش کی گئی ہوتی تو آج میں بھی تمہاری طرح فخر و غرور سے اکڑی ہوئی ہوتی، ناز کرتی، اتراتی۔ مگر کسی کی زندگی خراب پھر بھی نہیں کرتی۔'' وہ دل کی بھڑاس نکال کر چپ چاپ آنسو بہانے لگی۔

''شکوے، شکایتیں، گلے اور اب یہ آنسوؤں کی برسات...... کیوں مجھ غریب کو ڈبو کر مارنا چاہتی ہو؟'' وہ اٹھ کر اس کے قریب چلا آیا تھا۔ اس کا لہجہ ہی نہیں آنکھیں بھی مسکرا رہی تھیں۔ لیکن دل میں وہ بھی یہ اعتراف کر رہا تھا کہ مشعل کی گستاخیاں، بدتمیزیاں بجا سہی مگر حسن بیگ صاحب کا اسے بالکل نظر انداز کر دینا صریحاً غلط فیصلہ ہے۔ ہر انسان چاہت کے رنگوں سے زندگی کی رنگینی کشید کرتا ہے اگر زندگی میں محبت و الفت نہ ہو تو زندگی پھیکی اور بے رنگ ہو جاتی ہے۔

جس طرح غذا، ہوا، پانی زندگی کی اشد ضرورت ہے اسی طرح محبت کے بغیر زندگی بھی نامکمل ہے۔ خواہ محبت کا تعلق خونی رشتوں سے ہو یا ازدواجی۔

''میں تنہائی چاہتی ہوں۔'' اس کی بے ریا مسکراہٹ اسے خود پر طنز محسوس ہوئی۔

''اوکے، پہلے اپنے آنسو تو صاف کر لو۔ کہیں ان سے گاؤں میں سیلاب آ گیا تو پھر تمہارا تو کچھ نہیں جائے گا مے چارے گاؤں والوں کی شامت آ جائے گی۔''

''گاؤں والے کیوں...... میں خود ڈوب کر مرنا چاہتی ہوں۔''

''اگر ڈوبنے کو اتنا ہی دل مچل رہا ہے تو میری آنکھوں میں ڈوب جاؤ۔'' وہ اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر ہنس کر بولا۔

جملے رومانٹک تھے مگر انداز وہی مضحکہ اڑاتا ہوا۔ مشعل نے زخمی نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا تھا اور اپنے شانوں سے اس کے ہاتھ ہٹا کر باتھ روم کی جانب بڑھ گئی تھی۔

❑●❑

دل کا دیا جلا کر ہواؤں میں رکھ دیا
سورج دہک رہا تھا سو چھاؤں میں رکھ دیا
دل جیتنا کسی کا بڑے فن کی بات ہے
یہ فن خدا نے اس کی اداؤں میں رکھ دیا

گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ خرم کی محبتوں میں شدتیں بڑھ رہی تھیں۔ وہ اس کا ایسے ہی خیال رکھ رہے تھے جیسے وہ گوشت پوست کی بنی لڑکی نہ ہو کوئی کانچ کی بنی گڑیا ہو جس کو ایک معمولی سی ٹھیس بھی نقصان پہنچا سکتی ہے۔

حرا نے اتنی نازبرداریاں و چاہتیں کہاں دیکھی تھیں۔

احساسِ تشکر سے اس کی آنکھیں اکثر نم ہو جاتی تھیں جنہیں وہ خرم سے چھپ کر صاف کیا کرتی تھی۔ زندگی ازحد پُرسکون و حسین ہو گئی تھی۔

عرفان واپس چلا گیا تھا اور جاتے وقت ان سے مل کر نہیں گیا تھا اور اس نے قصداً خرم سے عرفان کی اس نازیبا حرکت کا ذکر نہیں کیا تھا۔

خرم اسے آرام کی تلقین کر کے دفتر گئے تھے۔ ان کے جانے کے بعد وہ بیڈ پر لیٹ گئی تھی۔ گزشتہ رات سے اسے درد کی شکایت تھی جس کو بہت ضبط سے برداشت کرتی رہی تھی کہ خرم کو ذرا بھی محسوس ہوا تو وہ دفتر نہیں جائیں گے اور ڈاکٹروں کی فوج یہیں جمع کر لیں گے۔ ڈلیوری میں ابھی اس کے کئی ماہ باقی تھے۔ ہر ماہ چیک اپ وہ باقاعدگی سے کروا رہی تھی۔ میڈیسنز بھی لے رہی تھی۔

ایسی تکلیفیں تو پریگنینسی میں ہوا ہی کرتی ہیں۔ ازحد صعوبتیں اٹھا کر عورت ماں کے مقدس و معتبر رشتے پر فائز ہوتی ہے۔ اس بات سے وہ آگاہ تھی اسی لئے نہیں چاہتی تھی کہ خرم پریشان ہوں۔

وہ میڈیسن لے کر لیٹی ہی تھی کہ امی حضور کمرے میں آئی تھیں جنہیں دیکھ کر وہ احتراماً اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''ارے میں کہتی ہوں خرم کی عمر تو ہے ہی سٹھیانے کی مگر تم کیا کرنے چلی ہو...... کچھ خیال ہے تمہیں یا بالکل ہی بدعقل ہو گئی ہو۔ جو عمر خرم کی اپنے بچوں کے بچے کھلانے کی ہے، اس عمر میں تم اسے باپ بنا رہی ہو؟''

خرم کی موجودگی میں تو ان کی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ وہ کمرے میں بھی قدم رکھ لیں، ایسی باتیں کہنے کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ خرم کی غیر موجودگی ان کو موقع فراہم کر گئی تھی اور وہ موقع سے مستفید ہونے کو وہاں فوراً پہنچ گئی تھیں۔

''امی حضور! اس میں میرا کیا دوش ہے۔ اولاد اللہ کی منشا سے ملتی ہے، اس کی یہی مرضی ہے تو ہم مجبور ہیں۔'' حرا نے آہستگی سے کہا۔

''ارے واہ...... میں خوب اچھی طرح سمجھتی ہوں تمہاری مجبوری کو۔ بچہ پیدا کرنا یا نہیں کرنا یہ عورت کی مرضی ہوتی ہے۔ اس میں مرد کا کیا دخل۔ ابھی بھی وقت ہے، زیادہ دن نہیں گزرے ہیں۔ اس مصیبت سے چھٹکارا پا سکتی ہو۔ دوا میں نے منگوالی ہے۔ چند گولیاں ہیں، ابھی کھالو۔ جان چھوٹ جائے گی۔''

وہ ہاتھ میں پکڑی گولیاں لے کر اس کی جانب بڑھی تھیں جس کا چہرہ ان کے عزائم جان کر سفید پڑ گیا تھا۔

''اللہ کے قہر و غضب سے خوفزدہ ہوں امی حضور! میں کس طرح اس بچے کا قتل اپنے سر لے سکتی ہوں جس کے وجود کی تکمیل بھی ابھی پوری نہیں ہوئی، جو دنیا میں آیا بھی نہیں۔ یہ قتل ہے صریحاً قتل۔ جو اللہ کبھی معاف نہیں کرے گا۔''

وہ ماں نہیں بنی تھی۔ ابھی صرف اس کی کوکھ آباد ہوئی تھی۔

کوکھ تو ابھی سونی تھی۔

پھر بھی اس ان دیکھے گوشت کے لوتھڑے نے اس کے اندر ممتا و شفقت کی گرمی و تڑپ پیدا کر دی تھی۔ ان کی بات اسے بری طرح تڑپا گئی تھی۔

وہ جو امی حضور کی ہمیشہ ہاں میں ہاں ملاتی آئی تھی، اس وقت اپنے بچے کے دفاع کی خاطر وہ ان کے روبرو تھی۔

''خوفزدہ مجھے نہیں تمہیں ہونے کی ضرورت ہے۔ جس بچے کی خاطر تم آج میرے منہ لگ رہی ہو وہ بچہ اگر دنیا میں آ بھی گیا تو بہت تباہی و بربادی لے کر آئے گا۔ کہیں آنے سے قبل ہی تمہارے آشیانے کو نہ اجاڑ دے۔'' ان کے انداز میں اتنی سفاکی اور نفرت تھی کہ حرا لرز کر رہ گئی۔

''خدارا امی حضور! آپ اگر دعا نہیں دے سکتیں تو بددعا تو نہ دیں۔ میرا نہیں تو خرم کا خیال تو کریں۔ وہ آپ کے بیٹے ہیں۔'' وہ روہانسے لہجے میں گویا ہوئی تھی۔ جواباً وہ منہ بنا کر گویا ہوئیں۔

''بیٹے کی محبت میں، اس کی عزت کے خیال سے ہی تمہیں مشورہ دے رہی ہوں ورنہ مجھے اس سے کیا سروکار۔ تم ایک یا ایک درجن بچوں کو جنم دو میری صحت پر کیا اثر پڑتا ہے اس سے بھلا۔ خرم نے اس عمر میں جگ ہنسائی کروائی تھی جو اب باپ بننے چلا ہے۔'' وہ شاید تہیہ کر کے آئی تھیں کہ اسے زبان سے تیر کے لگا لگا کر نڈھال کر دیں گی۔

''خرم اس عمر میں باپ بن رہے ہیں تو یہ کوئی انوکھی و مضحکہ خیز بات نہیں ہے۔ کیا اس عمر میں لوگوں کو یہ سعادت نصیب نہیں ہوتی؟ کیا آپ کے خاندان میں اس سے قبل ایسا نہیں ہوا؟ دور کیوں جاتی ہیں امی حضور! پچھلے ماہ ہی تو آپ کے بھائی کی سیکرٹری نے آپ کے بھائی کے ناجائز جڑواں بچوں کو جنم دیا ہے، جس کی وجہ سے ان کے گھر میں جنگ کا ماحول ہے۔ وہ تو خرم سے بھی عمر میں بڑے ہیں اور ان کے بچوں کے بچے بھی جوان ہیں۔ خرم کے ساتھ یہ مسئلہ نہیں ہے۔ آپ بھائی کی ناجائز اولاد برداشت کر سکتی ہیں مگر بیٹے کی جائز اولاد نہیں۔ یہ کیسا تضاد اور منافقت ہے؟''

''ابھی ماں نہیں بنی، جب تیری یہ ڈھٹائی و ہٹ دھرمی ہے بعد میں تو ہمیں گھر سے بے دخل کر دے گی۔ تمام دولت و جائیداد ہڑپ کر جائے گی۔'' امی حضور جو اپنے خاندان کے بارے میں ان کے منہ سے سن کر ششدر رہ گئی تھیں، شدید غصے سے گویا ہوئی تھیں۔

''نہیں چاہئے مجھے ایسی دولت و جائیداد جو خون کے رشتوں پر حاوی ہو جائے۔ یہ سب آپ ہی کو مبارک ہو۔ آپ ہمیں سکون سے جینے دیں۔'' وہ التجائیہ انداز میں ہاتھ جوڑ کر بولی تو وہ چند منٹ اسے کینہ توز نگاہوں سے گھورتی رہیں پھر گویا ہوئیں۔

''بہتر یہی ہے یہ گولیاں کھا کر قصہ پاک کر دو۔ ورنہ بچے کو جنم تو دوگی مگر کبھی دیکھ نہ سکو گی۔ یاد رکھنا تم نے میرے بھائی، میرے خاندان کے لئے ناجائز لفظ استعمال کیے

ہیں، ایک بار شاید ناگن بدلہ لینا بھول جائے مگر میں نہیں بھولتی۔ ایسا ڈستی ہوں کہ مرنے سے قبل تڑپنے کا موقع بھی نہیں دیتی۔" خوفناک تیور، خطرناک انداز..... وہ اسے گھورتی ہوئی چلی گئیں اور وہ خوف سے پسینہ پسینہ ہوگئی۔ ایک عجیب سی گھبراہٹ اسے لاحق ہوگئی تھی۔

□●□

اس طرح کا جیون میں حادثہ نہیں ملتا
تم تلک پہنچنے کا واسطہ نہیں ملتا
آرزو تو ملتی ہے جستجو نہیں ملتی
منزلیں تو ملتی ہیں راستہ نہیں ملتا
روح کی زمینوں پر عجیب عالم ہے
درد اور تمنا میں فاصلہ نہیں ملتا
سوگوار لوگوں کی، بے قرار لوگوں کی
زندگی میں کوئی بھی ضابطہ نہیں ملتا
اس طرح بھی ہو جاتا ہے خراب موسم میں
دور کے مسافر سے رابطہ نہیں ملتا

اس دن موسم خوش گوار ہو رہا تھا۔ ہوائیں پھولوں کی مہک ہر سو پھیلاتی گھوم رہی تھیں۔ وہ لان میں چلی آئی۔ شام دھیرے دھیرے ماحول کو جکڑ رہی تھی ہر طرف خواب ناک سا سناٹا بکھر رہا تھا۔ وہ وہاں رکھی چیئر پر بیٹھ گئی اور اداس نظروں سے اُڑتے پرندوں کو دیکھنے لگی۔ تب ہی گیٹ سے شاہ ویز داخل ہوا۔ لائٹ گرین پینٹ پر بلیک شرٹ میں ملبوس تر و تازہ اور از حد مسرور سا۔

"ہیلو، کیا ہو رہا ہے؟" وہ اس پر قدرے جھک کر بولا تو وہ بوکھلا کر اسے دیکھنے لگی۔

"ایسے کیا دیکھ رہی ہو..... کیا نظر لگانے کا ارادہ ہے؟"

"بہت ناز ہے خود پر؟" وہ سنجیدہ تھی۔

"ہونا بھی چاہئے..... آفٹر آل ایک حسین ترین لڑکی کا شریک سفر ہوں۔" اس کا لہجہ شوخ تھا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"مجھے ایسے بے ہودہ مذاق قطعی ناپسند ہیں۔"

"ارے میں کب مذاق کر رہا ہوں..... یہ حقیقت ہے۔ خواہ ناپسندیدہ ہی سہی۔"

"آخر مجھے کب تک سزا ملتی رہے گی؟ کیا بگاڑا ہے میں نے تمہارا؟ کیوں ہر وقت مجھے ٹیز کرتے رہتے ہو۔ میں تنگ آگئی ہوں خود سے، اپنی زندگی سے۔" وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رونے لگی۔

"سوری..... آئی ایم رئیلی سوری۔ تم اتنی نیرو مائنڈڈ ہو جاؤ گی، مذاق بھی برداشت نہ کر سکو گی میں نے سوچا نہیں تھا۔" وہ سخت پشیمانی کا شکار ہو گیا تھا۔ پہلے تو وہ جان بوجھ کر اس سے بیگانہ و لاتعلق رہتا تھا لیکن اب دیکھ رہا تھا وہ بتدریج خود کو بدل رہی تھی۔ وہ خودسری و خود پسندی، بدتمیزی و ہٹ دھرمی جو اس کی ذات کی شناخت تھی رفتہ رفتہ منہدم ہوتی جا رہی تھی۔ وہ تیزی سے بہتری کی طرف بڑھ رہی تھی اور گزشتہ ایک ہفتے سے وہ محسوس کر رہا تھا بلکہ بغور اس کا جائزہ لے رہا تھا کہ وہ بہت اُداس و دل گرفتہ رہنے لگی ہے۔ اکثر تنہائی میں اسے روتے دیکھا تھا۔ پہلے اس کے آنسو اسے ذرا بھی شرمندہ و متاسف نہ کرتے تھے مگر اب اسے ندامت محسوس ہونے لگی تھی۔ اس کا ضمیر اسے تنگ کرنے لگا تھا۔

اس وقت بھی اس کی اداسی و آنسو اس کو مضطرب سے کر گئے تھے۔

"نہیں..... معافی تو مجھے مانگنی چاہئے۔ نا معلوم کیا ہو گیا ہے مجھے..... شاید میں پاگل ہو گئی ہوں، بلاوجہ یا بے بات آنسو آجاتے ہیں۔" وہ دونوں ہاتھوں سے آنکھوں کو رگڑتی ہوئی وہ نادم لہجے میں بولتی کچھ ایسی ہی دلکش لگی تھی کہ وہ اسے یک ٹک دیکھے گیا پھر ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

"تیاری کر لو۔"

"کہاں چل رہے ہیں؟" وہ بے حد ایکسائیٹڈ تھی۔

"پاگل خانے۔"

"وہاٹ! یو آر جوکنگ؟" وہ ایک دم مضطرب ہوئی تھی۔

"یس..... مذاق ہی کر رہا ہوں۔ یہ تو میری ہمت ہے جو تمہیں برداشت کر رہا ہوں ورنہ پاگل خانے والے اتنے باحوصلہ و مستقل مزاج کہاں ہوں گے۔" بظاہر سنجیدہ انداز میں اس کے شوخی جھلک رہی تھی۔

وہ بے ساختہ مسکرا اٹھی تھی۔ بے تصنع و بناوٹ سے پاک مسکراہٹ جو اس کے چہرے کو اس طرح ہی روشن کر گئی تھی جس طرح چاند کو چاندنی۔

ان کا مختصر سا سامان سمیٹنے میں رشیدہ و فریدہ نے بھرپور مدد کی۔ وہ خاندان ان کے جانے سے بہت افسردہ تھا۔ وہ بھی ان کی محبت و خلوص سے متاثر ہوئی تھی اور اپنے کئی سوٹ، جیولری اور سینڈلز ان کو دی تھیں۔ بہت محبتوں کی چھاؤں میں وہ لوگ نکلے تھے۔ ڈرائیور انہیں کار میں ایئر پورٹ تک چھوڑنے آیا تھا۔

□●□

حسن بیگ کا بے جی سے کوئی قریبی رشتہ نہیں تھا مگر ان کی ملنسار طبیعت و بے غرض مروت و احترام انہیں ان کا گرویدہ بنا گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ گاہے بگاہے ان کی طرف آجایا کرتے تھے اور ان سے باتیں کر کے، مسئلے مسائل ڈسکس کر کے خاصے پُرسکون ہو جاتے تھے۔

"بہن! آپ برا تو محسوس نہیں کرتیں کہ جب دل چاہتا ہے میں یہاں آجاتا ہوں خواہ مخواہ آپ کا ٹائم برباد کرنے۔" اس ہفتے میں یہ ان کا ساتواں چکر تھا۔ یعنی پورے ہفتے ہی وہ یہاں آتے رہے تھے۔ وجہ ایک تو ان کے پاس رافعہ کی برابر آمد تھی جن کا ہر بار یہی مقصد ہوتا کہ وہ کسی طرح بھی انہیں شاہ ویز سے اس حد تک بدگمان و بدظن کر ڈالیں کہ وہ فوراً ہی مشعل کو اس سے طلاق دلا کر دوبارہ ان کے پنجوں میں دے دیں۔

حسن صاحب، بہن کا اصل کردار نہ دیکھ چکے ہوتے تو یقیناً وہ ان کی لگائی گئی جھوٹ و پُرفریب باتوں کی آگ میں کود پڑتے اور اپنے ساتھ مشعل کو بھی خاک کر ڈالتے مگر ان کے لگائے گئے زخموں سے ابھی تک خون رس رہا تھا۔ وہ تکلیف، وہ درد کس طرح وہ بھول سکتے تھے کہ محض ان کی خودغرضی، لالچ، مطلب پرستی، بدلحاظی و بے مروتی کے باعث انہوں نے اپنی لاڈلی، اکلوتی بیٹی کو ایسے چوروں کے انداز میں فقیروں کی طرح خالی ہاتھ رخصت کیا تھا اور پھر اس کی پُرخلوص طبیعت اور تباہ کن مالی حالت کو چھپانے کی خاطر اس سے بالکل ہی لاتعلقی اختیار کر رکھی تھی۔ اس بیٹی سے جس کی لمحے بھر کی جدائی انہیں گوارا نہ تھی۔ یہ کسی کی دعاؤں کا صلہ تھا یا ان کی قسمت کی خوبی کہ انہیں شاہ ویز جیسا ہونہار و محنتی داماد ملا تھا، جس نے دن رات کی محنت و لگن سے ان کے بزنس کی گرتی ہوئی ساکھ کو از سر نو بحال کیا تھا اور انہیں سر اٹھانے کا موقع فراہم کیا تھا۔ وہ اسے کس طرح چھوڑ سکتے تھے۔

گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ وہ انہیں عزیز تر ہوتا جا رہا تھا۔

یہ علیحدہ بات تھی کہ مشعل کی محبت کو چاہت کو جس طرح انہوں نے دل میں دبا کر رکھا ہوا تھا، اس کی یاد میں موم کی طرح اندر ہی اندر پگھل رہے تھے اور رافعہ کی مشعل، مشعل کی گردان نے دوبارہ سے ان کے اندر بیٹی کی محبت کو بیدار کر دیا تھا۔ اب انہیں محسوس ہو رہا تھا ضبط کی طنابیں چھوٹ جائیں گی اور وہ مزید مشعل کی جدائی برداشت نہ کر پائیں گے۔ یہی احساسات وہ بے جی سے شیئر کرنے آجاتے تھے۔

"یہ کیسی بات کر ڈالی آپ نے بھائی صاحب! بھلا بہنوں کو بھائی کی آمد بھی کبھی گراں گزرتی ہے۔ آپ کی آمد میرا مان بڑھا دیتی ہے۔" بے جی اپنے مخصوص نرم و شفیق انداز میں محو گفتگو تھیں۔ ان کا یہی انداز تو لوگوں کو بھی گرویدہ بنا دیتا تھا۔

"مہربانی..... میں یہ سوچ سوچ کر پریشان ہوں کہ مشعل سے میں اب زیادہ دن دستبردار نہیں رہ سکتا، اس کی یاد ہر لمحہ مجھے آنے لگی ہے۔ خوابوں میں بھی وہ مجھے اداس، غمگین اور روتی ہوئی نظر آتی ہے، مجھ سے شکوہ کرتی ہوئی۔ میں بے حد مضطرب ہو گیا ہوں۔" ان کے لہجے میں دکھ اور تڑپ محسوس کر کے بے جی بھی افسردہ ہو گئیں۔

"میں آپ کی محبت، آپ کی تکلیف سمجھ سکتی ہوں اور میرے خیال میں اب اللہ کی مہربانی سے آپ امتحان کے بھنور سے نکل آئے ہیں۔ مشعل کو آپ بلوا لیں۔ وہ بہت بہتر ہو گئی ہے۔ ہر بات کو سمجھنے کی اہلیت رکھنے لگی ہے۔ شاہ ویز کا فون آیا تھا تو بتا رہا تھا کہ وہ وہاں سے مری جا رہا ہے اور آپ کہیں گے تو وہ مشعل بیٹی کو لے کر یہاں آجائے گا۔"

"ہاں کل رات میری بات ہوئی تھی اس سے۔ وہ دونوں مری پہنچ گئے ہیں اور انہیں یہاں بلانے کا فیصلہ میں آپ کی مرضی کے مطابق کروں گا۔"

بہت بھاری ذمے داری انہوں نے ان کے شانوں پر ڈال دی تھی مگر جن کے دل اللہ کے خوف سے دھڑکتے ہوں اور وہ کسی سے کوئی کدورت و ذاتی پرخاش نہ رکھتے ہوں ان کے لئے کوئی فیصلہ مشکل نہیں ہوتا۔ انہوں نے بخوشی اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔

□●□

"اماں! پھر تم نے ان فریبی و مکار لوگوں کے ہاں چکر لگانے شروع کر دیئے؟" سارہ نے انہیں پانی کی بوتل اور کچھ دوسری چیزیں شاپر سے نکالتے دیکھ کر اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ارے تُو نہیں سدھریو کبھی بھی۔ یہ سب میں تیرے بھلے کو ہی کر رہی ہوں۔ آخر کب تک ایسا ہوتا رہے گا..... ہر بات کی کوئی حد بھی ہوتی ہے کہ نہیں۔ باقر کا یہ وطیرہ بن گیا ہے کہ یا تو اس کی مانو ورنہ یوں ہی در بدر پھرو۔'' وہ سامان اسے تھماتی ہوئی چارپائی پر لیٹتے ہوئے خفگی سے گویا ہوئی تھیں۔

''یہ سب میرے نصیب میں لکھا ہے تو ہو رہا ہے۔'' وہ ان کے قریب بیٹھ کر ان کی ٹانگیں دباتی ہوئی گویا ہوئی۔

''ہر بات نصیب سے مت جوڑا کرو۔ کچھ تدبیریں ایسی بھی ہوتی ہیں کہ تقدیر کو بدل کر رکھ دیتی ہیں۔ زندگی میں کچھ بھی بغیر جدوجہد کے نہیں ملتا، مثلاً کھانا ہمارے نصیب میں ہے مگر جب تک ہم اس کو تیار نہیں کریں گے نہیں کھا سکتے، جب تک کوشش نہیں کریں گے کچھ بھی حاصل نہیں ہو سکے گا'' انہوں نے مفصل جواب دیا تھا اسے مطمئن کرنے کے لئے۔

''میں تقدیر کو بھی مانتی ہوں اور تدبیر کو بھی اور یہ بھی کہ ہر کام کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔ جب اوپر سے اشارہ ملتا ہے تو پھر کوئی دیر نہیں لگتی۔ ہر کام کو انجام دینے والی ذات اللہ کی ہے۔ اس رب کے حکم کے بغیر تو کسی معمولی پتے کو بھی جنبش کرنے کی ہمت نہیں ہے۔''

''تو میں کب کچھ کہہ رہی ہوں۔''

''پھر یہ عاملوں، باباؤں کے پاس چکر لگانے کی کیا ضرورت ہے؟''

''توبہ بھئی، کس قدر کوڑھ مغز لڑکی سے پالا پڑا ہے۔ ہیر پھیر کر پھر اسی بات پر آ جاتی ہے۔'' وہ غصے سے اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ ''جن کے پاس میں جا رہی ہوں یہ کوئی چھوٹے موٹے بابا نہیں ہیں، بہت پہنچی ہوئی ہستی ہیں۔ عام انسان نہیں ہیں وہ۔'' ان کے لہجے میں ازحد ستائش و مرعوبیت تھی۔ سائرہ کے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ پھیل گئی جسے چھپانے کے لئے اسے رخ پھیرنا پڑا تھا۔ اپنے کمرے سے نکل کر اصغر بھی ان کے درمیان آ بیٹھا۔

''میں بھی تو سنوں اس خاص انسان میں ایسی کیا خوبیاں ہیں جنہوں نے ہماری اماں جیسی ذہین فطین عورت کو گرویدہ بنا ڈالا ہے؟'' وہ پُرشوق لہجے میں بولا۔

''ارے انہوں نے دوسری دنیا کی مخلوق کو قابو میں کر رکھا ہے۔ جن، پری، چڑیل، ہمزاد اور نا معلوم کون کون سے مؤکلات ان کے تابع ہیں۔''

''ہاہا..... اماں! ایسے عاملوں اور باباؤں کے اشتہارات سے سنڈے میگزینز بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں پر اعتقاد مت رکھا کریں، جو ایسی لمبی لمبی بڑی بڑی باتوں سے محض لوگوں کو بے وقوف بناتے ہیں۔'' اصغر سنجیدگی سے گویا ہوا تو زرینہ کے ماتھے پر ناگواری کی شکنیں پڑ گئیں۔

''ارے چپ رہو..... ایک بہن کیا کم تھی جو بھائی بھی چلا ہے باتیں بنانے کو۔ اگر یہ جھوٹے ہوں تو لوگ کیوں جائیں، لوگوں کو کچھ ملتا ہے تو وہاں جاتے ہیں ورنہ کون کسی کو پوچھتا ہے اس دور میں۔''

''سب کچھ گنوا کر لوگوں کو عقل آتی ہے اور جب ان کی آنکھیں کھلتی ہیں تو سب کچھ لوٹ کر ایسے لوگ جنوں کی طرح ہی غائب ہو جاتے ہیں۔'' اصغر سنجیدگی سے ماں کو سمجھانے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔

''مجھ سے بحث ہی کرتے جاؤ گے یا بہن کو بسانے کی کوشش بھی کرو گے؟ کچھ احساس ہے تمہیں، سائرہ کتنے عرصے سے گھر آ کر بیٹھی ہوئی ہے۔ اسے گھر بھیجنا ہے کہ نہیں؟ یہ سب میں اس کی خاطر ہی کر رہی ہوں۔ تمہیں اس کی فکر نہ سہی مجھے بڑی فکر ہے۔''

اب ان کے لہجے میں تفکر و افسردگی تھی۔

''اماں! سائرہ مجھ پر کوئی بار نہیں ہے، نہ ہی آپ اس کو بوجھ سمجھیں۔ شادی سے پہلے بھی وہ اس گھر کی بیٹی تھی، میری بہن تھی اور اب شادی کے بعد بھی اس کا مجھ سے اور اس گھر سے رشتہ نہ ٹوٹا ہے اور نہ ٹوٹے گا۔ باقر نے اسے خود بھیجا تھا یہ اپنی مرضی سے نہیں آئی ہے اور اب یہ تبھی جائے گی جب باقر خود یہاں اسے لینے آئیں گے۔'' اس نے دوٹوک انداز میں اپنا فیصلہ سنا ڈالا۔

سائرہ بھی اصغر کے فیصلے سے متفق تھی۔

''ہاں اماں! بھیا ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ مجھے بھائی کے فیصلے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔''

سائرہ کی بات پر انہوں نے دونوں کو گھور کر دیکھا اور بولیں۔

''اس کی بیوی آج میکے گئی ہوئی ہے تو اس کو بہن اور ماں کی یاد آئی ہے۔ کل اس کے آتے ہی سب بھول جائے گا۔ تمہاری خیر خواہ صرف ماں ہی ہو سکتی ہے۔''

□●□

''ارے..... آپی..... آپ یہاں.....؟'' بالکل غیر متوقع طور پر فرح کو سامنے موجود دیکھ کر حرا حیرت و مسرت سے گنگ رہ گئی تھی۔

''ہاں میں، میری جان!'' انہوں نے لپک کر اسے سینے سے لگا لیا تھا۔ بے حد خوشی سے ان کا چہرہ بھی گل رنگ ہو رہا تھا۔

کافی دیر تک وہ ایک دوسرے سے لپٹی بے تحاشہ مسرت کے احساس سے سرشار آنسو بہاتی رہیں۔ مسکراہٹوں اور آنسوؤں کی عجیب مگر خوب صورت برسات تھی۔

''یہاں بیٹھو آرام سے..... کیسا لگا سرپرائز؟'' فرح حرا کو بیڈ پر بٹھاتے ہوئے مسکرا کر گویا ہوئیں اور خود بھی اس کے نزدیک بیٹھ گئیں۔

''مجھے یقین نہیں آ رہا ابھی تک، یہ سب خواب یا آنکھوں کا دھوکا محسوس ہو رہا ہے۔ لیکن یہ خواب ہے تو خدا کرے میری آنکھ کبھی نہ کھلے۔''

''آ جائے گا یقین بھی۔ جب رات دن تمہارے سر پر سوار رہوں گی تو خود دعا مانگو گی کہ یہ خواب ہوتا کہ جلد از جلد آنکھیں کھول سکو۔''

''مرتے دم تک میں آپی آپ سے بیزار نہیں ہو سکتی۔''

''پگلی، ایسی باتیں منہ سے نہیں نکالتے..... میں مذاق کر رہی تھی۔'' فرطِ جذبات سے انہوں نے بہن کو گلے سے لگا لیا۔ اسی لمحے خرم اندر داخل ہو کر بولے۔

''میں نے کھانا لگوا دیا ہے۔ پہلے طعام کر لیجئے پھر سارا وقت آپ کے لئے ہی وقف ہے۔ خوب باتیں کیجئے گا۔'' خرم خوش مزاجی سے گویا ہوئے۔

''آپ گھبرائیے نہیں خرم صاحب! صرف آج کی رات میں حرا سے بہت سی باتیں کرنا چاہتی ہوں، پھر کل سے دن ہی میرے لئے وقف ہوا کرے گا۔'' فرح کی پُرشوخ وضاحت پر خرم بے ساختہ مسکرائے تھے۔ حرا جھینپ گئی تھی۔

''آپی! آپ اکیلی ہی آئی ہیں..... دولہا بھائی کہاں ہیں؟''

''میں تنہا ہی آئی ہوں۔ منصور پاکستان گئے ہیں وہ دبئی سے بزنس وائنڈ اپ کر رہے ہیں تو بہت مصروفیات ہیں۔ تمہاری خوش خبری کا سنا تو مجھ سے رہا نہیں گیا اور میں نے چند ہفتوں کا پروگرام ترتیب دے ڈالا۔''

''آپ نے مجھے بالکل لاعلم رکھا، ہر بات سے باعلم ہونے کے باوجود۔''

کھانے کے کمرے میں فرح، امی حضور سے ملنے لگی تو وہ موقع پاتے ہی مخاطب ہوئی۔

''اگر بتا دیتا تو تمہارے چہرے پر ایسی خوشیوں کی چمکتی روشنی کس طرح دیکھتا۔ میری خواہش ہے تمام عالم کی مسرتیں تمہارے وجود میں سما دوں۔''

جاں نثار اور بھرپور چاہت دینے والے شوہر کی رفاقت حرا کو مغرور کر گئی۔

''امی حضور! یہ فرح ہیں، حرا کی بڑی بہن۔ دبئی سے آئی ہیں۔ ان کے ماموں ممانی کا انتقال ہو چکا ہے۔ اب یہ یہیں ٹھہریں گی۔'' خرم نے سپاٹ لہجے میں تعارف کروایا تھا۔

''ہاں، ہاں..... کیوں نہیں..... شوق سے رہیں..... یہ ان کا اپنا گھر ہے۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ بہو کی ایسی حالت میں ان کا بھی کوئی عزیز قریب ہوگا۔ پہلی زچگی ہے، بہت احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب مجھ بڑھیا سے اپنا دھیان نہیں رکھا جاتا تو اس معصوم کا کیسے رکھوں گی۔ صرف دعا ہی کر سکتی ہوں۔'' بیٹے کو سامنے دیکھ کر امی حضور بچھی بچھی جا رہی تھیں۔

ان کے انداز سے چاپلوسی و خوشامد جھلک رہی تھی۔ ان کے چہرے سے ذرا بھی تو محسوس نہیں ہو رہا تھا کہ وہ کل ہی اسے کس بری طرح اپنی کوکھ اجاڑنے پر مجبور کر رہی تھیں۔ اس سمے ان کے چہرے پر کس قدر سفاکی، درشتگی و تختی تھی جیسے وہ چہرہ کسی جلاد کا ہو۔

حرا کے اندر ایک تنفر سا اٹھا یہ سوچ کر کہ یقیناً ان میں کچھ ایسی ہی ناپسندیدہ صفات ہوں گی جن کی بنا پر ان کا سگا بیٹا انہیں ایک حد میں رکھتا ہے۔ اس سے قبل اس نے کتنی سعی کی تھی کہ ان ماں بیٹے کو قریب لے آئے۔ ان کے درمیان بیگانگی و لاتعلقی کی دیوار کو منہدم کر ڈالے۔ مگر خرم نے ذرا بھی تعاون نہ کیا تھا اور بہت سرعت سے خود ان کا رویہ بھی ایسا بدلا تھا کہ وہ آج ان کا روپ دیکھ کر سخت متنفر و برگشتہ ہو گئی تھی۔

□●□

مری کے خوب صورت مرغزاروں اور گرتے آبشاروں کے دلآویز ماحول میں بھی اس کی بے چینی و کسلمندی کم نہ ہوئی تھی۔ وہ کھوئی کھوئی سی بے مقصد کسی بھٹکی ہوئی روح کی مانند ہوٹل کے کمرے یا ٹیرس پر گھومتی رہتی تھی۔

اس دن بھی وہ بلا مقصد کھڑکی سے باہر خلاؤں کو گھور رہی تھی کہ شاہ ویز نے شانے پر ہاتھ رکھا تو وہ چونک پڑی تھی۔

''آج دوسرا دن ہے ہمیں یہاں آئے ہوئے اور تم ابھی تک کمرے میں بند ہو کر بیٹھی ہوئی ہو۔ گاؤں میں شور کر رہی تھیں کہ وہاں سے چلو، جگہ چینج کرو اور یہاں آ کر بھی تمہاری وہی روٹین ہے۔'' وہ چیئر کھینچ کر بیٹھتا ہوا گویا تھا۔

''مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟'' اس نے ایک لحظہ نگاہ اس پر ڈال کر جھکاتے ہوئے کہا۔

''تمہاری بوریت دور کرنے کے لئے۔''

''کیا تمہیں میری اتنی پرواہ ہے؟ احساس ہے میری بوریت و تنہائی کا یا مجھ پر ترس کھا رہے ہو؟'' اس کا لہجہ اس کے اندر کی ٹوٹ پھوٹ و خلفشار کا غماز تھا۔

''پرواہ ہے، تب ہی تو تمہیں سب کام چھوڑ کر یہاں لے کر آیا ہوں۔''

مشعل کے لبوں پر مجروح مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔ شاہ ویز کے لفظ ایسے ہی تھے جیسے کاغذی پھول مہک و تازگی سے محروم ہوتے ہیں۔

''کہاں چلیں؟'' وہ سرد آہ بھر کر مخاطب ہوئی تھی۔

''پہلے کسی بوتیک سے ڈریسز خریدیں گے۔ کیونکہ تم اپنے تمام ملبوسات خاصی فیاضی سے رشیدہ، فریدہ کو دے کر آ گئی ہو۔ آج سارا دن ہم شاپنگ کریں گے، رات چائنیز ڈنر ہوگا پھر کل کا پروگرام ترتیب دیں گے۔''

وہ اس سے اسی طرح مخاطب تھا جیسے کسی بچے کو بہلا رہا ہو۔

دوسرے دن وہ دونوں گھومنے کے لئے نکل گئے تھے۔

ویلوٹ کی ڈارک بلیو قمیض، سلک کے کولڈن تنگ پاجامے و کولڈن سلک کے بڑے سے دوپٹے میں بلیو اسٹون کی نازک سی جیولری پہنے وہ خاصی پُرکشش لگ رہی تھی۔

ہونٹوں پر ڈارک پنک لپ اسٹک نے چہرے کو دل آویزی بخشی تھی۔ بال اس نے برش کر کے ایسے ہی چھوڑ دیئے تھے۔

بلیک کوٹ سوٹ میں شاہ ویز بھی آج عام دنوں سے زیادہ نکھرا نکھرا خوش نظر آ رہا تھا۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کافی دور نکل آئے تھے۔ آسمان پر سفید و سرمئی بادل محو گردش تھے۔ زمین پر برف بچھی ہوئی تھی۔ ماحول میں تازگی و ٹھنڈک تھی۔

''آگے راستہ بلاک ہے...... کافی پیدل چلنا پڑے گا۔ رات برف باری خاصی ہوئی ہے۔'' شاہ ویز نے واپس آنے والے لوگوں سے معلومات لے کر اسے بتایا۔

''واپس ہوٹل چلتے ہیں۔ ہمیں کسی خاص جگہ تو نہیں جانا۔''

''میں تمہاری بوریت دور کرنے لایا ہوں، ہوٹل کے کمرے میں بند کرنے نہیں۔'' اس نے پہلی استحقاق بھری نگاہ اس پر ڈالی تھی۔

برف باری کے شوقین لوگ شوخ رنگ ملبوسات میں سفید برف پر ادھر اُدھر بکھرنے لگے تھے۔ ان لوگوں میں زیادہ تر نوبیاہتا جوڑے تھے۔

مشعل اس کی نگاہوں سے بے خبر قریب سے گزرتے ہوئے ایک کپل کو دیکھ رہی تھی۔ لڑکی کا فیروزی بھڑکیلا لباس جھلملا رہا تھا۔ وہ اردگرد سے بے نیاز اپنے ساتھی کی بانہوں میں چلتی ہوئی از حد مسرور و مغرور دکھائی دے رہی تھی۔ مرد کے چہرے پر بھی سرشاری و والہانہ محبت کے رنگ تھے۔ دونوں آسودہ تھے۔

''کیا سوچ رہی ہو...... یہ ہنی مون پوائنٹ ہے، یہاں پر اس سے بڑھ کر نظارے ملیں گے۔'' وہ اس کی نگاہوں کے تعاقب میں شوخی سے بولا۔

''میرے خیال میں ہمیں واپس چلنا چاہئے۔ موسم بدل رہا ہے۔ ہوٹل بھی یہاں سے کافی فاصلے پر ہے اور بادلوں کو دیکھ کر لگ رہا ہے کہ برف باری کبھی بھی شروع ہو سکتی ہے۔'' وہ خفیف انداز میں بادلوں کی طرف دیکھ کر گویا ہوئی جہاں تیزی سے گہرے سرمئی بادل جمع ہو رہے تھے۔ سفید بادلوں کا نام و نشان نہ تھا۔

''تو کیا ہوا؟ ہم یہاں انجوائے کرنے آئے ہیں۔ اور پھر برف باری کا موسم بار بار دیکھنے کی سعادت کہاں نصیب ہوتی ہے۔''

اونچے اونچے درخت، پھول، پتے، مکانوں کی چھتیں سب برف سے ڈھکے ہوئے تھے۔ ہر سُو مقدس چاندنی سی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ برف سے ڈھکی سیڑھیوں پر احتیاط سے پاؤں جما جما کر ریلنگ کے سہارے اوپر چڑھ رہی تھی تاکہ پُل کے اس پار بنے کافی ہاؤس میں پہنچ سکیں۔

ان کے ساتھ اور بھی کپلز تھے، ہنستے مسکراتے، ایک دوسرے کی بانہوں کا سہارا لئے، اردگرد سے بےگانہ اپنے آپ میں مگن چل رہے تھے۔

محبت ایک نشہ ہے...... جو اس کے جام نوش کرتے ہیں وہ اسی طرح اردگرد سے بےگانہ محبوب کی چاہت میں گم رہتے ہیں۔ وہ سب بھی تو محبت کے نشے میں گم تھے۔ ان کے ہر سُو محبوب کی چاہتیں تھیں، وہ تھے اور باقی کچھ نہ تھا۔

ہمارے درمیان بھی تو یہی رشتہ ہے...... ہم ایک دوسرے کے لائف پارٹنر ہیں...... ہمارے درمیان بھی تو ایسا مضبوط و قوی رشتہ بندھا ہے مگر تعلق نہ بندھ سکا۔ تعلقات کی نوعیت بھی تو رشتوں سے مربوط جذبات و احساسات سے اٹیچڈ ہوتی ہے۔ ہمارے درمیان صرف بندھن ہے۔ نہ نازک جذبوں کی مہکار ہے نہ کومل کومل احساسات کی دلربائی ہے جو محبت و چاہت کے پھول کھلا دے۔

اس نے دزدیدہ نگاہوں سے ساتھ چلتے ہوئے بے نیازانہ انداز میں کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے، شاہ ویز کو دیکھتے ہوئے سوچا۔

بظاہر یہ فاصلہ چند قدموں کا تھا مگر وہ جانتی تھی اس کو عبور کرنے میں شاید صدیوں کا سفر درکار ہو۔

عجیب تضاد ہے وقت کا بھی۔ جس منصب پر آج ہم فائز ہوتے ہیں کل اس منصب پر ہمارا مقابل براجمان ہو جاتا ہے اور جانے انجانے میں ہم سے ہونے والی گستاخیاں، زیادتیاں و کج ادائیوں کا سود سمیت بدلہ لیتا ہے اور اسی کو مکافات عمل کہتے ہیں۔

کل تک میں جن جذبوں سے بےخبر اپنی انا و ضد کی قید میں تھی، اس کا شکار آج شاہ ویز ہے۔ وہ کسی طرح مجھے معاف کرنے کو تیار نہیں اور میں اس کے بغیر زندہ رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔

بڑی اصول زندگی تھی
تُو نے بے مول بنا ڈالی
اس چاہت کے دھوکے میں
ہم نے جند جان گنوا ڈالی

''کتنی دور اور چلنا ہے؟'' جیسے جیسے وہ اوپر بڑھ رہے تھے سردی بڑھنے لگی تھی۔ ہوائیں خنک ہوتی جا رہی تھیں۔

''اوہ...... اتنی اوپر جانے کی کیا ضرورت ہے...... ہم ہوٹل واپس چلتے ہیں۔''

''ذرا سا ہی تو فاصلہ رہ گیا ہے۔ وہاں کی کافی سنا ہے بہت مزے دار ہوتی ہے اور وہاں سے مری کا نظارہ بڑا خوب صورت و دلکش نظر آتا ہے۔'' وہ اس کے قریب آ کر چلتے ہوئے بولا۔

''خوب صورتی و دلکشی!...... تمہیں بھی کوئی خوب صورتی و دلکشی اٹریکٹ کر سکتی ہے؟'' اس نے جلتی ہوئی نگاہیں اٹھا کر پوچھا تھا۔

''ہاں ہاں کیوں نہیں...... قدرت کی بنائی ہوئی ہر خوب صورت شے سے مجھے عشق ہے۔'' اس نے کوٹ اتار کر اس کے شانے پر ڈالتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

''تمہیں سردی تو نہیں لگ رہی؟'' اس کی اس اپنائیت نے اس کے اندر خوش گمانیوں کے غنچے کھلا دیئے تھے۔

''تمہاری طرح کانچ سے نہیں بنا ہوا فولاد سے بنا ہوا ہوں۔''

''شاہ ویز! کیا تم نے کسی سے محبت کی ہے کبھی؟''

''محبت ایک بے اختیاری جذبہ ہے اور مجھ پر بھی یہ حاوی ہو چکا ہے۔'' وہ کھوئے کھوئے انداز میں گویا ہوا تھا۔

''اوہ ریئلی؟'' مشعل نے بے یقینی سے استفسار کیا تو شاہ ویز مسکرا اٹھا۔

''تمہارے علاوہ کسی اور سے محبت ہو سکتی ہے؟'' اس نے آگے بڑھ کر اس کے شانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

مشعل نے مسکراتی نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا تھا اور ایک آسودہ مسکراہٹ اس کے اندر تک اتر گئی۔ وہ تھامنا چاہتی تھی ان غیر متوقع لمحوں کو جو شاید قدرت نے اس کے دامن میں ڈال دیئے تھے۔ ایک مدہوش کر دینے والی خوشبو تھی جو اس کی رگ و پے میں سما گئی تھی۔

ایک سرشاری
ایک خوش کن سحر انگیز کیفیت سے وہ دوچار تھی۔

وہ ہوٹل کے کافی پیلس میں پہنچے تو زیادہ تر ٹیبلز ریزرو تھیں۔ وہ ویٹر کی رہنمائی میں اس ٹیبل کی طرف بڑھے تھے جو کھڑکی کے قریب تھی۔ اندر مہکتے ہنگامے اور معطر فضا میں احساس کو بالیدگی بخشنے والا نرم گرم ماحول بڑا دلفریب لگ رہا تھا۔

وہ چیئر پر بیٹھ چکے تھے۔ مشعل نے شاہ ویز کا کوٹ جو بڑی چاہ سے اس نے اس کے شانوں پر ڈالا تھا، اتار کر چیئر کی بیک پر ڈال دیا تھا۔ پھر اس نے جھک کر سینڈل پاؤں سے اتارے، ٹشو بکس سے ٹشو نکال کر بھیگے پاؤں صاف کرنے لگی۔

شاہ ویز شیشوں کے پار دیکھ رہا تھا جہاں ہر سُو روئی کی مانند برف کے گالے مستی میں رقص کرتے ہوئے زمین بوس ہو رہے تھے۔

فضا پر ایک خواب ناک اندھیرا سا محیط تھا جس سے ماحول دھندلا دھندلا سا لگ رہا تھا۔ اس کے اندر عجیب سا اضطراب ہمکنے لگا۔

حیات کی بے ثباتی و بے مقصد گزرنے والے دن و رات کا تسلسل اس کے اندر کے سوئے ہوئے مرد کو بیدار کرنے لگا کہ اس کی زندگی کا، اس بھاگ دوڑ کا حاصل کیا ہے؟ وہ بے جی سے دور ہے اور ان کے حکم کی بجا آوری کی خاطر ہی وہ کٹھ پتلی کی مانند کام کر رہا ہے۔ پہلے ان کی صلاح پر اسے لے کر گاؤں گیا کہ وہ چاہتی تھیں مشعل کو کھلی فضا اور آزادی نصیب ہو، حسن بیگ کے زرعی مسائل تھے وہ نمٹانے میں اسے وہاں چند ہفتے لگے تھے اور جب کام مکمل ہو گیا تو حسن بیگ کی طرف سے پیغام ملا کہ شمالی علاقہ جات کی طرف نکل جاؤ۔ کچھ دن وہاں گزار کر کراچی لوٹ آنا۔

ان کی بات وہ ٹال دیتا اگر اس کا خود کا دل چند دن آرام و سکون کی طلب نہ کرتا۔ وہ اسی ارادے سے یہاں آیا تھا کہ کچھ دن اس طرف گزارے۔ وہ اپنی زندگی کا سنجیدگی سے لائحہ عمل طے کرے گا کہ اس طرح زندگی کیونکر گزر سکتی ہے۔ گھر اور گھریلو زندگی کی آرزو اسے محسوس ہونے لگی تھی۔

بظاہر وہ ایک شادی شدہ شخص تھا۔

ایک از حد حسین و طرح دار لڑکی اس کی شریک سفر بن چکی تھی لیکن ان دونوں نے ہی اس بندھن کو اول روز سے قبول نہ کیا تھا۔

وہ اپنے حُسن، امارات و اسٹیٹس کے زعم میں مبتلا تھی۔

وہ اپنی خودداری، حمیت و شرافت کے خول میں مقید تھا۔

جہاں رشتوں میں محبت، خلوص، ایک دوسرے کا احترام و اہمیت شامل نہ ہو وہاں ایسے رشتے اسی طرح ٹوٹتے ہیں جیسے ریت کے گھروندوں کو صرف ایک لہر منہدم کر کے

ان کا وجود متا ڈالتی ہے اور ان کے درمیان بھی یہ نام نہاد رشتہ کب کا ٹوٹ چکا ہوتا اگر اس کی طبیعت میں ٹھہراؤ، قوت برداشت میں ٹھوس پن، اخلاق و درگزر کی عادت پختہ نہ ہوتی یا بے جی جیسی فرشتہ صفت ماں کی تربیت و رہنمائی حاصل نہ ہوتی۔ شادی کے ابتدائی دنوں میں جو ذلت و خواری مشعل کے رویوں نے اسے بخشی تھی، وہ لاکھ بھلانے کی سعی کر چکا تھا مگر جیسے کوئی پھانس سی اس کے اندر چبھتی رہتی تھی۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے انسان بڑی سے بڑی تکلیف بھول جاتا ہے اور بے رحم معمولی سا زخم اکثر و بیشتر درد جگائے رکھتا ہے۔

اسی طرح وہ اپنی ذات پر توڑے گئے اس کے تمام ظلم و ستم بھول گیا تھا مگر بے جی کے ساتھ اس کا روا رکھا جانے والا، اس کا نہایت گھٹیا و تحقیرانہ و اہانت و نفرت سے لبریز رویہ نہ بھولتا تھا۔

چند مناظر اس کی گستاخی و بدتمیزی کے وہ ملاحظہ کر چکا تھا اور باقی گھر میں کام کرنے والی چوکیدار کی بیوی نے اس کے گوش گزار کیے تھے۔ بے جی کی تذلیل اسے اپنی ذاتی اہانت سے زیادہ گراں ثابت ہوتی اور وہ اس کے دل سے اس طرح علیحدہ ہوئی گویا کوئی ورق کتاب ہستی سے جدا ہو کر بے وقعت و نا قابل اعتناء ہو جاتا ہے۔ وقت کبھی یکساں نہیں رہتا تغیرات ہر شے کو بدل ڈالتے ہیں۔

کبھی راتیں طویل، دن مختصر ہو جاتے ہیں۔

کبھی صبحیں سہانی اور شامیں اُداس دکھائی دیتی ہیں۔

کبھی سورج کی شعاعیں جسم و جاں کو جھلسا ڈالتی ہیں۔

کبھی نیلے اُفق پر چاند کی چاندنی کی فسوں خیزی تن من کو سرد محسوس ہونے لگتی ہے۔ صبح و شام، رات دن، چاند سورج، ہوا، بادل گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ اپنا آپ تبدیل کرتے رہتے ہیں۔ پھر انسان جو بالکل بے اختیار و بے بس نہیں ہے اس پر بھی ان تبدیلیوں کا بھرپور اثر ہوتا ہے۔ بدلتا وقت، تبدیل ہوتی حیات انسان کو بدل دیتی ہے۔ ناپسندیدہ لوگ پسندیدہ بن جاتے ہیں، ناپائیدار رشتے پائیدار ہونے لگتے ہیں۔ اس طرح مشعل میں بھی نمایاں تبدیلی آئی تھی۔

وہ ازحد بدل گئی تھی۔

اسے چاہنے لگی تھی، اس سے وابستہ رشتے کی نزاکت کو سمجھنے لگی تھی اور اس سے بھی اسی ردعمل کی متقاضی تھی۔

وہ مجبور تھا۔

اس کی چاہت کا جواب چاہت سے نہیں، مروت سے دے سکتا تھا۔ وہ فراخ دل تھا مگر اس کے معاملے میں ازحد تنگ نظر و تنگ دل بن گیا تھا۔ اسے یہ سب وقتی جذباتیت محسوس ہوتی تھی۔ شاید ذہن کے کسی مخفی زاویے میں یہ خیال، یہ حقیقت کسی سانپ کی طرح کنڈلی مار کر بیٹھ گیا تھا کہ وہ اس کی سیکنڈ چوائس ہے یا وقتی بہلاوا اور جذباتیت ہے جو اتنے عرصے ساتھ رہنے سے محسوس ہوئی ہے جو وہ اپنے ماحول میں جا کر بھول جائے گی جس کو وہ محبت کا نام دے رہی ہے۔

اس کی پہلی محبت، پہلی چوائس جوجو عرف جواد احمد ہے اور یہ دنیا گول ہے۔ انسان جس مقام سے قدم آگے بڑھاتا ہے، واپس اسی پر آ کر رکتا ہے۔ اور وہ بھی آج نہیں تو کل جوجو کی طرف لوٹ جائے گی۔

خیالات کا لامتناہی سلسلہ تھا جو اسے سمندر جیسی عمیق گہرائیوں میں غرق کیے ہوئے تھا اور وہ موجود ہوتے ہوئے بھی وہاں موجود نہ تھا۔

''کافی ٹھنڈی ہو رہی ہے۔'' مشعل نے چمچ بجا کر اسے خیالوں کی دنیا سے کھینچ نکالا۔ وہ خفیف انداز میں ٹیبل کی جانب متوجہ ہوا جہاں ویٹر کافی کے برتن، کافی اور سینڈوچز کی پلیٹس لگا کر جا چکا تھا۔

□●□

امی حضور نے دبے دبے قدموں سے چلتے ہوئے بیرونی برآمدہ عبور کیا تھا اور ہر طرف سے اطمینان کرنے کے بعد لابی میں رکھے فون کی طرف بڑھ گئی تھیں۔ پھر فون کو ہاتھ لگانے سے قبل ان کے ذہن میں وسوسہ جاگ اٹھا تو وہ دوبارہ دبے قدموں سے حرا کے بیڈروم کی طرف بڑھی تھیں اور نہایت احتیاط سے کھڑکی کا پردہ ہٹایا تو حرا کو بدستور محو خواب دیکھ کر پھر لابی میں آئی تھیں۔ اندر سے دروازہ بند کر کے فون کی جانب بڑھی تھیں۔

''ہیلو عرفان! میں تمہاری گرینڈ مدر بول رہی ہوں۔'' کال مل جانے پر ریسیور منہ سے لگائے مخاطب ہوئی تھیں۔

''خیریت ہی تو نہیں ہے..... تم جلد سے جلد ندا کو لے کر یہاں پہنچو۔ تمہاری سوتیلی ماں نے تمہاری دولت و جائیداد پر قبضہ کرنے کے لئے ایک وارث کو پیدا کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور اس منصوبے میں تمہارا باپ برابر کا شریک ہے۔'' ان کے لہجے کی نفرت و عداوت سے بڑھ کر دوسری جانب سے اظہار ہوا تھا۔

''وہاں بیٹھے بیٹھے غصہ دکھانے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اگر کچھ لینا ہے تو فوراً پہنچ جاؤ۔ حرا کی بڑی بہن فرح دبئی سے آئی ہوئی ہے اور وہ بہت تیز اور چالاک عورت ہے۔ خرم نے پورے گھر کا انتظام اس کے سپرد کر رکھا ہے ورنہ جانے اندر ہی اندر ان لوگوں میں کیا کھچڑی پک رہی ہے۔ مجھے تو ایسا لگ رہا ہے کہیں جانے کی تیاری کر رہے ہیں یہ لوگ..... نہیں نہیں، دولت و جائیداد لے کر کیسے فرار ہو سکتے ہیں۔ اپنی آنکھیں اور کان ہر وقت کھلے رکھتی ہوں۔'' دوسری طرف سے تشویش بھرے لہجے پر وہ اعتماد سے گویا ہوئی تھیں۔

''بہت کوشش کرتی ہوں کان لگا کر ان کی باتیں سننے کی مگر سماعت کی کمزوری کے باعث صاف سن نہیں پاتی۔ بس تم دونوں بہن بھائی جلد از جلد یہاں پہنچو۔ میں روز روز فون نہیں کر سکتی۔ آج بھی وہ ''چالاکو'' کہیں گئی ہے خرم کے ساتھ اور وہ ''مکارن'' اپنے کمرے میں سو رہی ہے۔ ملازمائیں بھی کوارٹرز میں ہیں تو موقع دیکھ کر میں بات کر رہی ہوں۔ تم لوگ فوراً پہنچو۔''

پورچ میں کار رکنے کی آواز سن کر انہوں نے گھبرا کر عرفان کو تاکید کی اور فون بند کر کے دروازہ کھول کر باہر نکلنا ہی چاہتی تھیں کہ قریب آتی جوتوں کی آوازیں انہیں دروازے کے پیچھے رکنے پر مجبور کر گئیں۔

وہ لابی سے ملحقہ بیڈروم میں رکھے صوفے پر براجمان ہو گئے تھے جب کہ ہیلز کی ٹک ٹک آگے جا کر معدوم ہو گئی۔ پھر چند لمحے بعد دوبارہ ٹک ٹک کی آواز ابھری تھی اور قریب آ کر رک گئی تھی۔

''حرا ابھی سو رہی ہے۔'' یہ فرح کی آواز تھی۔

''اچھا ہے..... میں بھی یہی چاہتا ہوں وہ زیادہ سے زیادہ آرام کرے۔''

''آج حرا کی پاکستان جانے کی تمام کارروائی مکمل ہو گئی ہے، چند دن میں ویزا مل جائے گا تو ٹکٹ ریزرو کروا لیں گے۔ مگر میں چاہتی ہوں اگر آپ ایک مرتبہ پھر اپنے فیصلے پر نظر ثانی کر لیں تو بہتر ہوگا۔'' فرح کا لہجہ سنجیدگی و فکرمندی سے لبریز تھا جب کہ دروازے کے پیچھے کھڑی امی حضور اس انکشاف پر دنگ رہ گئی تھیں۔

''میں نے بے حد سوچ کر فیصلہ کیا ہے اور رزلٹ یہی آیا ہے کہ حرا اور اپنے آنے والے بچے کو اس ماحول، اس جگہ اور ان لوگوں سے دور ہی رکھنا چاہیے اور اس فیصلے کا یہ مقصد نہیں کہ میں کسی سے خوف زدہ ہوں یا کسی کے پریشرائز ڈ کیے جانے کے خوف سے یہ سب کر رہا ہوں نہیں..... ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں ڈرنے اور ڈرانے والا بندہ ہرگز نہیں ہوں۔ دراصل.....'' وہ چند لمحے توقف سے گویا ہوئے۔ ''ایک عجیب سی کیفیت ہے میرے اندر جس کو میں سمجھ نہیں پا رہا ہوں۔ میرا ادراک، میری سکستھ سینس کہتی ہے آنے والا وقت سازگار نہیں ہے۔ نہ معلوم کیا ہو جائے۔ میں چاہتا ہوں حرا اور بچہ آزاد فضا، آزاد ماحول میں رہیں۔ ڈیلیوری میں ابھی کئی ماہ باقی ہیں۔ تب تک میں بھی بزنس وائنڈ اپ کر کے وہیں آ جاؤں گا۔'' خرم کے لہجے میں خوشی و اضطراب کے ملے جلے رنگ تھے۔

فرح بہن کے بخت پر نازاں و مسرور تھیں کہ انہیں اس قدر چاہنے و سراہنے والا شوہر ملا تھا جو اس کی خاطر سب کچھ وارنے کو تیار تھا۔

ان کی سوچ سے قطع نظر امی حضور کی سماعتوں میں خطرے کی گھنٹیاں سی بجنے لگی تھیں اور ان کے دیدے حلقوں میں سرچ لائٹس کی طرح گردش کرنے لگے تھے۔

□●□

میرے حاصل، یہ محرومی عجب محسوس ہوتی ہے
تجھے پا کر بھی کیوں تیری طلب محسوس ہوتی ہے
تمہارے ساتھ دیکھی تھی وگرنہ زندگی ہم کو
نہ تب محسوس ہوتی تھی، نہ اب محسوس ہوتی ہے

''مشی..... مشی.....!''

وہ گھبرا کر پلٹی تھی اور اپنے سے کچھ فاصلے پر کھڑی لڑکی کو دیکھ کر حیرت آمیز مسرت محسوس ہوئی تھی۔

''سونیا!'' وہ آنے والی لڑکی سے بڑی محبت سے گلے ملی تھی اور کئی لمحوں تک ایک دوسرے کے گلے سے لگی رہی تھیں۔

''مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا کہ یہ تم ہی ہو..... کافی دیر سے میں تمہیں دیکھ رہی ہوں اور خود کو یقین دلا رہی ہوں کہ یہ تم ہی ہو، میری لاڈلی، چہیتی، ازحد عزیز فرینڈ۔'' سونیا اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھامے گرم جوشی سے کہہ رہی تھی۔ مشعل بھی بہت خوش و پُرجوش دکھائی دے رہی تھی۔

''مگر میں تمہیں پہلی نظر میں ہی پہچان گئی۔''

''تم شروع سے ہی جینئس ہو..... انکل کہاں ہیں؟'' معاً وہ چونک کر گویا ہوئی تھی۔

''میں پاپا کے سنگ نہیں آئی ہوں۔ آؤ کمرے میں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔'' وہ ٹیرس سے کمرے میں آ گئیں۔ وہاں سے اس نے انٹرکام پر روم سروس کو کافی لانے کا آرڈر دیا پھر اس کے قریب بیٹھ گئی، جو بہت تعجب سے سوئیٹ کا جائزہ لے رہی تھی۔ اس کی حیران کن نگاہیں ڈبل بیڈ پر رکھی مردانہ جیکٹ پر مرکوز ہو گئیں۔

''پھر کس کے ساتھ آئی ہو..... یہ جیکٹ کس کا ہے؟ کیا جوجو کے ساتھ آئی ہو؟ مگر تم ابھی ان میرڈ ہو، پھر اس حد تک لیڈو انس بھی نہیں کہ ان میرڈ ہونے کے باوجود جوجو

کے ساتھ اس طرح......''

''میں اب میرڈ ہوں اور یہ میرے ہسبنڈ کا جیکٹ ہے۔''مشعل اس کی بات قطع کر کے ڈرامائی انداز میں گویا ہوئی۔

''وہاٹ...... آر یو سیریس؟''سونیا ازحد متحیر تھی۔

''آف کورس۔''

ویٹر کافی دے گیا تھا۔وہ کپوں میں انڈیلتی ہوئی گویا ہوئی۔اس کے انداز میں بھرپور اسرار و سسپنس تھا۔

''کس سے...... کیا اسی احمق اُلو جو سے؟''

''ارے ایسے تو نہ کہو اس غریب کو۔''وہ کافی سرو کرتی ہوئی مسکرا کر بولی۔

''اوہ...... مجھے نہیں معلوم تھا کہ اسے تم لائف پارٹنر کے لئے چوز کر سکتی ہو۔''سونیا کے لہجے میں برملا گہرا رنج و تاسف تھا۔''تم نے اسی لئے مجھے شادی میں انوائٹ نہیں کیا اور مزے سے اس گھامڑ کے سنگ رشتہ استوار کر بیٹھی ہو جو مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتا۔''سونیا سخت کبیدہ تھی۔ہنستے مسکراتے چہرے پر ملال کے رنگ اتر آئے تھے۔مشعل اس کی حالت سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔

''مجھے اس طرح دانت مت دکھاؤ،ایک گدھے سے شادی کر کے تم نے کوئی نئی دنیا دریافت نہیں کر ڈالی ہے۔''وہ کافی سپ کرتی ہوئی بولی۔

''خواہ مخواہ میرے ہینڈسم ہسبنڈ کو برے برے ناموں سے پکار رہی ہو۔''

''برے نہیں،پرفیکٹ نیم ہیں اس کے لئے۔بہر حال اچھا ہی ہوا جو تم نے مجھے انوائٹ نہیں کیا ورنہ میں یہ شادی ہونے ہی نہ دیتی۔اب میں چلتی ہوں،تم یہ کارڈ رکھ لو بلکہ شام کو میں ڈرائیور کو بھیج دوں گی،تم سامان لے کر آجانا،جب تک یہاں رہو گی،میرے ساتھ ہی رہو گی۔''وہ وزیٹنگ کارڈ پرس سے نکال کر اس کی طرف بڑھاتی ہوئی گویا ہوئی تھی۔

''اتنی جلدی بھی کیا ہے۔بیٹھو ابھی۔بہت ساری باتیں کرنی ہیں۔اور یہ تو بتاؤ تم آسٹریلیا سے کب آئی ہو اور یہاں کیسے رہنے لگیں؟سرمد بھائی کیسے ہیں اور تم بہت بدلی ہوئی لگ رہی ہو۔''

''مجھے آسٹریلیا سے یہاں آئے ہوئے ایک ماہ ہوا ہے۔ہماری ساس کی ساس یعنی سرمد کی دادی کی رہائش گاہ یہیں پر ہے۔ان کی خواہش پر ہم یہاں رہ رہے ہیں۔سرمد سے معلوم کرنا وہ کیسے ہیں اور بدلی بدلی تو تم مجھے لگ رہی ہو۔تم تو شعلہ جوالا تھیں،کہاں شبنم کی طرح نرم نرم ٹھنڈک تمہارے رگ و پے،لہجے میں در آئی ہے۔بالکل مختلف لگ رہی ہو اپنی فطرت سے۔''

سونیا کے ٹھیک ٹھاک تجزیے پر وہ مسکرا کر رہ گئی۔

''میرے ہسبنڈ سے مل کر جاؤ۔وہ ابھی آرہے ہیں۔''

''شام میں ملاقات ہوگی۔اب کیا کروں تمہاری وجہ سے اسے اہمیت تو دینی پڑے گی۔''وہ اسے جلد آنے کی تاکید کر کے چلی گئی تھی۔

اس کے جانے کے بعد وہ یہ سوچ سوچ کر مسکراتی رہی کہ جب شام کو وہ شاہ ویز کے ساتھ وہاں جائے گی تو سونیا کا ردعمل دیکھنے کے لائق ہوگا جب وہ جو کی بجائے ایک اجنبی شخص کو اس کے ہمراہ دیکھے گی۔

وہ اسی تصور میں گم مسکرا رہی تھی جب شاہ ویز اندر داخل ہوا تھا۔

''خیریت ہے نا؟یہ تنہا کس خوشی میں مسکرایا جا رہا ہے؟''وہ صوفے پر بیٹھ کر شوز اتارتے ہوئے استفسار کرنے لگا۔

''آج اتفاقاً میری کلوز فرینڈ سونیا سے ملاقات ہوئی ہے۔وہ یہاں کسی کام سے آئی تھی،میں ٹیرس پر کھڑی تھی۔ہم نے ایک دوسرے کو دیکھ لیا تھا۔وہ شادی کے بعد دو سال قبل آسٹریلیا چلی گئی تھی،ایک ماہ قبل یہاں آکر سیٹل ہوئی ہے۔وہ رات ڈنر پر انوائٹ کر کے گئی ہے بلکہ کہہ رہی ہے ہم جب تک یہاں پر ہیں اس کے ساتھ رہیں گے۔''مسرت کے خوش رنگ گلاب اس کے چہرے پر کھلے ہوئے تھے۔شاہ ویز صوفے پر نیم دراز دلچسپی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس کی گفتگو سن رہا تھا۔

''چلیں گے نا؟''معاً اس کو احساس ہوا وہ خاموش ہے۔

''ہوں...... چلیں گے لیکن......''

''لیکن کیا؟''

''ہم رات کو واپس آجائیں گے۔بلاوجہ کہیں قیام کرنا فضول ہے۔''

شاہ ویز کی بات پر اس نے سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔

سونیا کے ہاں اس کا پرتپاک استقبال ہوا تھا۔سرمد بہت گرم جوشی سے ملے تھے۔شاہ ویز کا موڈ بھی بہت خوشگوار تھا۔

''مشی!یہ کیا معاملہ ہے؟یہ حضرت کون ہیں؟تم تو کہہ رہی تھیں جو جو،جبکہ......''

''یہ سرپرائز ہے تمہارے لئے...... یہ شاہ ویز ہیں،میرے ہسبنڈ...... تم نے مجھے بتانے کا موقع ہی نہیں دیا اور خود ہی جو جو،جو جو پکارتی رہیں تو میں نے سوچا شام کو تمہیں تمام باتیں بتاؤں گی۔''وہ آرام سے صوفے پر بیٹھ کر بولی۔''کیسا لگا؟''

''کون...... شاہ ویز؟''

''نہیں سرپرائز۔''

''سرپرائز اور دولہا بھائی دونوں شاندار بلکہ لاجواب۔''وہ بھی بے تکلفی سے اس کے قریب بیٹھ گئی۔اس کے چہرے پر مسرت و الجھن کے ملے جلے رنگ تھے۔وہ سب کچھ جان لینے کو بے تاب تھی۔

مشعل کو بھی کوئی ہمدرد و مہربان وجود ایک عرصے بعد میسر آیا تھا،وہ بھی دل میں کافی غبار و الجھنیں رکھتی تھیں۔اپنی پریشانیاں و احساسات کسی کے ساتھ شیئر کرنا چاہتی تھی۔اس نے بھی شاہ ویز سے پہلی ملاقات سے لے کر آج تک پیش آنے والے تمام واقعات و باتیں سچ سچ بتا ڈالی تھیں۔

''یہ تمہاری خوش قسمتی ہے مشی جان کہ تمہیں اتنا مضبوط کردار کا پرخلوص مرد ملا ہے ورنہ مردوں کے ضبط،برداشت و نفس اتنے طاقتور نہیں ہوتے کہ اپنی ذات و خواہشات کو یکسر نظر انداز کر کے محض دوسرے فریق کی خاطر،اس کی مرضی پر جیون گزاریں۔بہت گریٹ ہیں شاہ ویز۔ان کی پروقار پرسنالٹی سے میں پہلی نظر میں متاثر ہوگئی تھی مگر اب ان کے بارے میں تفصیل جان کر ان کی گرویدہ ہوگئی ہوں۔''سونیا کے لہجے میں ازحد ستائش تھی شاہ ویز کے لئے۔

''لوگوں کو متاثر کرنا اس کے لئے کوئی مسئلہ نہیں ہے...... اس کام میں وہ بے حد ماہر ہے۔پاپا کو بھی اس نے ایک ملاقات میں ہی متاثر کر لیا تھا۔''

''اور پاپا کی بیٹی کو کون سی ملاقات میں متاثر کر سکا تھا؟''سونیا شوخی سے ہنس کر گویا ہوئی تو وہ صرف مسکرا کر رہ گئی۔

''رئیلی،میں انکل کے انتخاب پر بہت خوش ہوں اور سچ پوچھو تو تمہاری آنٹی اور جو جو مجھے شروع سے ہی ایک آنکھ نہ بھاتے تھے۔''

وہ باتوں میں مصروف تھیں جب کہ دروازہ ناک کر کے سرمد اندر آیا تھا۔

''محترم خواتین!آپ کی باتوں کے لئے ساری رات پڑی ہے،پہلے کھانا لگالیں،ڈنر کے بعد گفتگو کا سلسلہ وہیں سے جوڑیے گا جہاں سے منقطع ہو رہا ہے۔''وہ شرارتی لہجے میں بولا تو وہ دونوں مسکرا کر اٹھ گئیں۔

''تم ہو بہت لکی۔''کھانے سے فارغ ہو کر وہ واش بیسن پر ہاتھ دھو رہی تھی،جب سونیا ناول اسٹینڈ سے ناول اس کی طرف بڑھاتی ہوئی کہہ اٹھی۔

''کس طرح؟''

''اس طرح کہ تمہاری طرح تمہارے ہسبنڈ بھی بے حد گریس فل اور اسمارٹ ہیں۔ان کی گفتگو کا انداز کتنا دل کو اپیل کرتا ہے۔اونچا مضبوط اور شاندار۔ٹوٹ کر محبت کرنے والے لگتے ہیں۔''

''وہ ٹوٹنا نہیں توڑنا جانتا ہے۔''وہ بے اختیار کہہ اٹھی۔

''کیا مطلب؟''

''ارے کوئی مطلب نہیں...... ایسے ہی منہ سے نکل گیا۔''وہ گڑبڑا کر رہ گئی۔باوجود خواہش کے وہ سونیا کو یہ نہیں بتا سکی کہ ان کے درمیان آج تک بیگانگی و سرد مہری کی دیوار حائل ہے۔ساتھ ساتھ رہتے،اٹھتے بیٹھتے نظر آنے کے باوجود وہ اب بھی ایک دوسرے کی خواہشوں،جذبات،احساسات سے اتنے ہی لاعلم،انجان ہیں جتنے شادی سے قبل تھے۔نامعلوم اس میں اُس کی انا کی سرخروئی کا دخل تھا یا خودداری و وقار کا تقاضا کہ وہ ہر بات شیئر کرنے کے باوجود یہ شیئر نہ کر سکی تھی۔

''لگتا ہے بہت چاہتا ہے تمہیں...... ہے نا...... جو ٹوٹ کر چاہتے ہیں ان کے پیار کرنے کے انداز میں ایسی شدتیں اور وحشتیں ہوتی ہیں۔''سونیا کے مسکراتے چہرے اور معنی خیز لہجے میں ازدواجی مسرتوں کی شوخیاں تھیں۔

مشعل محض مسکرا کر رہ گئی۔اب وہ اسے کیا بتاتی کہ اس نے اس کے محض غیظ و غضب،وحشت و بربریت کے وحشیانہ روپ دیکھے ہیں،پیار محبت،عشق و چاہت کے رنگ اور محبت کی شدتوں،چاہت کی برکھا سے وہ کہاں بھیگی تھی۔

اس پیاس سے ابھی پوری طرح آشنائی نہیں ہوئی تھی۔

''کن رنگین یادوں میں کھو گئیں؟''سونیا نے اسے خاموش دیکھ کر شرارت سے کہا۔

''آں...... کچھ نہیں۔چلو،وہ کہیں گے اندر جا کر بیٹھ گئیں۔''وہ ہاتھ پونچھ کر تولیہ اسٹینڈ پر لٹکا کر اس کا ہاتھ پکڑ کر باہر نکل آئی۔سونیا کی معنی خیز باتیں،گہری مسکراہٹ

اسے بوکھلا رہی تھی۔ اسے اپنا بھرم ٹوٹتا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ سٹنگ روم میں پہنچی تو ملازمہ کافی بنا رہی تھی۔ پھر انہیں سرو کر کے چلی گئی۔

''سچ کہا ہے کسی نے جب دو خواتین ملتی ہیں تو گپ شپ میں سب کو فراموش کر دیتی ہیں۔'' سرمد کافی پیتے ہوئے گویا ہوا۔

''سوری سرمد! ہم اتنے عرصے بعد ملے ہیں تو ظاہر ہے باتیں بے حد جمع ہو گئی ہیں۔''

''پھر ختم ہوئیں باتیں یا ابھی باقی ہیں؟'' شاہ ویز نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔

''ابھی کہاں...... ابھی شروع بھی نہیں ہوئیں۔''

''جب عورتیں ملتی ہیں تو کیا باتیں کرتی ہیں...... آئی مین کس طرح کی باتیں ہوتی ہیں؟''

''آپ کو کیوں بتائیں؟'' سونیا ان کی طرف دیکھ کر شرارت سے بولی۔

''دو عورتیں دوسری عورتوں کی برائیاں ہی کر سکتی ہیں۔'' سرمد نے چھیڑا تھا۔

''شکر کریں آپ کی برائیاں نہیں کرتے ہیں۔'' سونیا نے دوبدو جواب دیا۔

''سرمد صاحب! کیوں شعلوں کو ہوا دے رہے ہیں، اتنے نزدیک بیٹھ کر؟'' شاہ ویز مسکرا کر گویا ہوا تھا۔ سونیا صوفے پر سرمد کے قریب ہی بیٹھی تھی جب کہ مشعل سنگل صوفے پر بیٹھی تھی۔ اس کے جملے پر سرمد نے بے اختیار قہقہہ لگایا تھا، وہ دونوں بھی مسکرا اٹھی تھیں۔

''میری فکر مت کرو یار، ہم تو جل کر خاکستر ان کی پہلی نگاہ سے ہی ہو گئے تھے۔ اب تو وجود کی راکھ لئے گھومتے ہیں۔'' سرمد نے مخمور نگاہوں سے اس کی جانب دیکھ کر فدویانہ لہجے میں کہا۔ سونیا کے چہرے پر حیا کی سرخی دوڑ گئی تھی۔ شاہ ویز اس سے عجیب سے احساسات سے دوچار ہوا۔ بے ساختہ نگاہیں مشعل کی جانب اٹھی تھیں، جس کے سرخ عارضوں پر سیاہ دراز پلکیں لرزاں تھیں۔

مختلف باتوں کا سلسلہ چل نکلا تھا۔ سرمد اور شاہ ویز بہت جلد بے تکلف ہو گئے تھے۔ گویا مدتوں کی شناسائی و دوستی ہو۔

''یہاں کے موسم کا بھی کوئی اعتبار نہیں، پل پل بدلتا رہتا ہے۔'' سونیا نے کھڑکی سے پردہ ہٹایا تو باہر خنک ہواؤں کے ساتھ ساتھ موٹی بوندیں بھی گر رہی تھیں۔

''آپ موسم کی بات کر رہی ہیں، ہم نے انسانوں کو پل پل بدلتا دیکھا ہے۔'' شاہ ویز انکھیوں سے مشعل کو دیکھ کر گویا ہوا۔

''تجربہ ہے آپ کو انسانوں کو پرکھنے کا؟'' سرمد گویا ہوا۔

''جی ہاں...... میری تو ساری لائف ایسے ہی تجربوں میں گزری ہے۔'' وہ دونوں ہنس دیئے، سوائے مشعل، جو ان کے درمیان خود کو مس فٹ محسوس کر رہی تھی۔ سونیا اور سرمد ایک دوسرے کے قریب بیٹھے مکمل لگ رہے تھے۔ ان دونوں کی موجودگی کے باوجود سرمد کی نثار ہوتی، چاہت چھلکاتی نگاہیں سونیا کے چہرے پر وقفے وقفے سے ٹھہر رہی تھیں۔ ہر بات میں وہ سونیا کی تائید لازمی حاصل کرتا تھا۔

جب کہ شاہ ویز بات کرنا تو در کنار، ایک نگاہ غلط اس پر ڈالنے کا روادار نہ تھا۔ نہ ہی وہ اس کی ضرورت محسوس کر رہا تھا حالانکہ وہ قریب ہی بیٹھی تھی۔

وہ تنہا ہی اپنی ذات میں انجمن تھا مگر اس کی ویلیو ڈاؤن کر رہا تھا۔

''شاہ ویز بھائی! ان تجربات کے دوران کوئی ہستی ایسی ملی جس نے آپ کو متاثر کیا ہو؟'' سونیا نے پوچھا تھا۔ ''یا آپ سے کوئی انسپائر ہوا ہو؟''

''ہاں...... ساری زندگی مجھے ایک ہستی نے متاثر کیا۔ وہ میری ماں، میری بے جی ہیں۔ دوست، ماں، ہمدرد، از حد جاں نثار کرنے والی ہستی۔ ان کی تنہا ذات نے مجھے ہر قریبی و عزیز رشتوں کا احساس بخشا ہے۔'' اس کے مدھم، گمبھیر لہجے میں بے جی کے لئے جو عقیدت و احترام تھا اس سے وہ بھی متاثر ہوئے تھے۔

''دوسرے سوال کا جواب گول کر رہے ہیں۔''

''بے حد عام سا بندہ ہوں...... بھلا کس کو متاثر کر سکتا ہوں۔''

''میری اتنی کیوٹ اینڈ بیوٹی فل دوست کے منسوب بننے کے بعد بھی آپ کو اتنی اسمارٹنس، چارمنگ، اٹریکشن پرسنالٹی کا احساس نہیں ہوا، حیرت ہے۔ مشعل جیسی لڑکی آپ کے قریب ہے اور آپ ایسی بات کر رہے ہیں۔ ایسی کوئی بات تو ضرور ہے آپ کی پرسنالٹی میں جو شوخ و شنگ ہر لمحے پارے کی مانند بے قرار رہنے والی میری دوستی کتنی سویٹ اور سوبر ہو گئی ہے۔ جس کو بلا سوچے سمجھے، بے تکان بولنے کی عادت تھی، وہ اب سوچ سوچ کر بلکہ تول تول کر بولنے لگی ہے۔''

سونیا کی زبان رواں ہو گئی تو وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔

''چلیں اب؟'' وہ سٹپٹا کر شاہ ویز سے مخاطب ہوئی۔

''کہاں چلیں؟ تمہیں یہیں رہنا ہے۔ میں نے کہا تھا تم سے۔'' سونیا کھڑی ہوئی تو سرمد کو بھی کھڑا ہونا پڑا جب کہ شاہ ویز پہلے ہی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

''سوری بھابی! ہم ہوٹل واپس جائیں گے، کل آپ لوگ آیئے گا ہماری طرف۔ ملاقات ہوتی رہے گی اب تو۔''

''کیسی غیروں جیسی بات کر رہے ہو یار تم۔ موسم خراب ہے پھر ہم نے آپ لوگوں کے لئے بیڈ روم سیٹ کروا دیا ہے۔ یقین مانیں، ہم دونوں میں سے کوئی بھی آپ کو ڈسٹرب نہیں کرے گا۔'' سرمد کا شوخ انداز بے باکی سے لبریز تھا۔ بے حد بولڈ ہونے کے باوجود شاہ ویز کچھ تو جھینپ گیا پیش نہ کر سکا۔ مشعل جھکا چہرہ مزید جھکا گئی۔

ازدواجی تعلقات میں بندھے لوگوں کے درمیان ایسے چھوٹے موٹے معنی خیز مذاق اور شوخیاں چلتی رہتی ہیں۔ سونیا کو امید تھی شاہ ویز حاضر جواب ہے لہٰذا کوئی پھڑکتا ہوا جواب ملے گا مگر شاہ ویز کا کترانا، مشعل کا گھبرانا اسے عجیب سے احساس سے دوچار کر گیا۔

''ڈرائیور آپ کا سامان ہوٹل سے ابھی لے آئے گا مگر آپ لوگ اب ہماری میزبانی قبول کریں گے۔''

''پلیز پھر......''

''کوئی ایکسکیوز نہیں چلے گا۔ تم سے آپ بالکل بھی فکر مت کریں، ہم آپ کی تنہائیوں میں بالکل مخل نہ ہوں گے اور آپ کے لئے بیڈ روم بھی ہم نے بالکل الگ تھلگ سیٹ کروایا ہے۔ خاصی پُرسکون و رومانٹک جگہ ہے وہ۔ شادی کے ابتدائی ایام ہم نے وہیں گزارے تھے اور کتنا......''

''ایسی بات نہیں ہے...... دراصل ہم نہیں چاہتے کہ آپ کو میزبانی کی تکلیف میں مبتلا کریں، پھر مہمان کو وبال جان بننے میں زیادہ دیر نہیں لگتی۔''

''ارے چھوڑو یار یہ تکلف۔ سب چلتا ہے۔ پھر وہ لوگ پہلی ہی ملاقات میں دل سے قریب ہو جائیں تو وہ مہمان نہیں عزیز از جان لگتے ہیں۔ ورنہ جب مجھے سونی نے بتایا کہ اس کی فرینڈ کے منسوب سے ملنا ہے تو سچ مانو میں تو یہ سوچ کر ہی کوفت میں مبتلا ہو گیا تھا کہ......''

''اوہو بھئی اب انہیں آرام بھی کرنے دیں گے یا پھر اور ایک اسٹوری شروع کرنے کا ارادہ ہے؟'' سونیا کو مداخلت کرنی پڑی۔

''اوکے...... اوکے...... جو حکم سرکار۔'' سرمد نے سعادت مندی کا اعلیٰ ترین مظاہرہ ہونٹوں پر انگلی رکھ کر دیا۔ وہ تینوں ہی مسکرا اٹھے تھے۔

□●□

''یہ تم میرے وارڈ روب میں کیا کر رہے ہو؟ کتنی دفعہ تمہیں سمجھایا ہے میری چیزوں کو ٹچ مت کیا کرو، لیکن تمہاری سمجھ میں نہیں آتا۔'' رافعہ نے ایک جھٹکے سے وارڈ روب کا دروازہ بند کیا تھا اور جوجو جس نے ابھی خاصی جدوجہد کے بعد کی ہول میں چابی گھما کر دروازہ کھولا تھا، ان کی غیر متوقع آمد اور جارحانہ انداز نے موڈ بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔

''مما! آپ کا ایٹی ٹیوڈ کیسا ہوتا جا رہا ہے میرے ساتھ، جیسے میں کوئی چور ہوں۔ کیا آپ کے کمرے میں گھسنے سے قبل مجھے آپ کی پرمشن لینی ہے؟ کیا ایک گھر میں رہنے والے آپس میں ایسے ٹرمز رکھتے ہیں؟''

''اوہو...... مت پریشان کرو مجھے۔ میں ویسے ہی پریشان ہوں۔ بھائی جان پہلے جیسے نہیں رہے۔ جاؤ تو بڑی خوش اخلاقی سے ملتے ہیں، بڑی آؤ بھگت کرتے ہیں گویا مجھ سے بڑھ کر ان کو کوئی عزیز نہیں ہے اور اگر نہ جاؤں کئی دن تو پلٹ کر خبر بھی نہیں لیتے کہ زندہ ہوں یا نہیں۔ اور مزید ستم یہ کہ مشی کمینی اس چالاک شاہ ویز کو لے کر نہ معلوم کہاں چھپی ہوئی ہے جو آنے کا نام ہی نہیں لے رہی اور یہاں تیزی سے ایک کے بعد ایک اکاؤنٹ خالی ہو رہا ہے۔ انکم کوئی نہیں، مہنگائی پوچھو نہیں۔'' رافعہ سرخی مائل بالوں پر برش چلاتے ہوئے اکتائے لہجے میں کہہ رہی تھیں۔

''مہنگائی، اس ٹاپک کو میرے سامنے مت چھیڑا کریں۔ مجھے دینے کا وقت آتا ہے تو آپ کو مہنگائی اور خالی اکاؤنٹ کا رونا یاد آتا ہے۔ آپ روز جو پارٹیز اٹینڈ کرنے کے لئے مہنگے گفٹس، ساڑھیاں، جیولری یوز کرتی ہیں، ہر ہفتے جو پارلرز کے چکر لگتے ہیں وہ کیا کسی صدقے خیرات سے کرتی ہیں؟ کل بھی آپ نے دس ہزار کی ساڑھی خریدی ہے اور ہینڈ پرس......''

''شٹ یور ماؤتھ جوجو! اولاد ہو، اولاد بن کر رہو، باپ بننے کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے معاملے میں مت بولا کرو۔'' حسب عادت وہ سچی بات پر طیش میں آ کر چنگھاڑی تھیں۔

''آپ تو مجھے ماں ہی نہیں لگتی ہیں۔ کبھی بھی آپ کو میری اور میری ضروریات کی پرواہ نہیں رہی ہے۔ پہلے مشی تھی تو وہ میری تمام ضروریات پوری کرتی تھی۔ انکل بھی بے حساب پاکٹ منی دیا کرتے تھے۔ آپ نے کچھ نہیں کیا میرے لئے...... کچھ نہیں کیا۔'' وہ غصے میں دھاڑ سے دروازہ بند کرتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

رافعہ بے فکری سے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی بال سنوارتی رہیں۔ ان کے کسی بھی انداز سے پریشانی یا پشیمانی کا احساس نہ ہو رہا تھا۔

□●□

سارا دن آنگن جلتی دھوپ میں دہکتا رہا تھا۔

سورج اپنی آگ برساتی شعاعوں سمیت چند لمحے قبل ہی رخصت ہوا تھا لیکن سرمئی فرش سے نادیدہ شعلے ابھی بھی گرم گرم لپیٹے مارتے دکھائی دے رہے تھے۔ در و دیوار جھلسے دکھائی دے رہے تھے۔

سائرہ نے آنگن کے ایک طرف لگے نل میں پائپ لگایا، جھاڑو اٹھائی اور پہلے پھرتی سے پورا آنگن دھویا، پھر سائیڈوں میں رکھے گملوں میں پانی ڈالنے کے بعد دوبارہ

فرش کی دھلائی شروع کردی۔

''میرے ہاں پیدا ہونے سے بہتر تھا کسی جمع دار کے ہاں پیدا ہو جاتی تو چوبیں گھنٹے جھاڑو ہاتھ میں پکڑے رہنے کا خوب موقع مل جاتا۔'' زرینہ گھر میں داخل ہوئیں تو اسے تیزی سے وائپر چلاتے دیکھ کر گویا ہوئیں۔

''کتنی ٹھنڈک ہو گئی ہے اماں! کچھ دیر پہلے تو یہاں چپل پہن کر بھی قدم نہیں رکھا جا رہا تھا۔''

''ہاں...... یہ تو ہے۔ ٹھنڈک ہو گئی ہے۔'' وہ برقع ایک طرف رکھ کر پلنگ پر نیم دراز ہو گئیں۔ گملوں میں کھلے بے شمار موتیے کے پھولوں سے نکلتی مہکار نے آنگن کی ٹھنڈی فضا کو اپنی آغوش میں لے لیا تھا۔

عصر کی اذان کے بعد سائرہ نے فوراً وضو کر لیا تھا اندر نماز ادا کرنے جاتے ہوئے اس نے پائنتی سے برقع اٹھاتے ہوئے انکھیوں سے ماں کی طرف دیکھا جو خلاف معمول خاموش و فکر مند نظر آ رہی تھیں۔

اس نے بے آواز، خاموش گہری سانس اندر کھینچی تھی اور اندر رنگر پر برقع لٹکاتے کے بعد جاء نماز کی طرف بڑھ گئی تھی۔ ماں کی افسردگی و پریشانی کا سبب خود اس کی ذات تھی کہ باقر نے گزشتہ دو ماہ سے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔ وہ جیسے اس کو بھول گیا تھا یا اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتا تھا۔

ادھر گھر والے تو اس کی موجودگی سے کوئی پریشان نہیں تھے اور ویسے یہ تو دستور دنیا ہے کہ جو شخص بڑھ چڑھ کر گھریلو سرگرمیوں اور کاموں میں از خود حصہ لے، بلا کسی اعتراض و شکایت کے تو ایسے لوگوں کو ہر کوئی عزیز رکھتا ہے۔ پھر وہ تو اس کے اپنے تھے۔

پھر بھی لوگوں کی چبھتی، کاٹتی، کچوکے لگاتی نظریں اس کو گھائل کر ڈالتی تھیں۔ وہ بے قصور ہوتے ہوئے بھی خود کو مجرم سمجھتی تھی۔

''سائرہ بیٹی! ایک پیالی چائے دو بنا کر۔ آج تو سر میں درد ہو رہا ہے۔'' سائرہ کے بعد وہ بھی نماز ادا کر کے دوبارہ پلنگ پر نیم دراز ہوتے ہوئے گویا ہوئیں۔ اسی لمحے کچن میں سے سائرہ برآمد ہوئی تھی۔ ہاتھ میں چھوٹی پلاسٹک کی ٹرے میں دو کپ چائے سے پُر بھاپ اُڑا رہے تھے۔

''چائے تو میں نے نماز پڑھتے ہی تیار کر لی تھی، تمہارا انتظار کر رہی تھی۔'' ایک کپ انہیں پکڑا کر دوسرا خود لے کر ان کے قریب ہی بیٹھ گئی تھی۔

''یہ نگوڑ ماری لت بڑی بری پڑ گئی ہے۔ تمہارے ابا کی زندگی میں تو کبھی چائے کی شکل گھر میں دیکھنے کو بھی نہ ملتی تھی۔ کہتے تھے چار کی جگہ دو کپ دودھ کے بندہ پی لے تو جان میں جان تو آئے۔ یہ چائے تو نری خون جلاتی ہے، دماغ الگ خشک کرتی ہے۔'' وہ گھونٹ پر گھونٹ بھرتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

''اماں! ابا کو تمہارا دماغ اور خون بہت عزیز ہو گا ناں۔''

''اچھا...... اب تُو مجھ سے ٹھٹھول کرے گی؟''

''اماں! سچ تو کہہ رہی ہوں۔ اب نہ ابا رہے اور نہ تمہارا دماغ اور خون ویسا رہا، تبھی تو دن میں چار چار کپ چائے پی جاتی ہو۔'' وہ ان کی افسردگی دور کرنے کی سعی میں لگی ہوئی تھی۔

''وقت بدل جاتا ہے، انسان بھی بدل جاتا ہے، عمر ڈھل جاتی ہے، عادتیں بھی اپنا آپ بدل ڈالتی ہیں کہاں رہی ہوں پہلے جیسی...... سب کچھ بدل گیا ہے۔''

''یہ ہماری فطرت ہے۔ اس سے ہم کہاں بچ سکتے ہیں؟''

''آپا حاجرہ کی بیٹی شرمین جو سال بھر سے میکے روٹھ کر بیٹھی ہوئی تھی، جانتی ہو اس کے ساتھ کیا ہوا؟'' وہ جس بات کو اس سے چھپانے کی سعی کافی دیر سے کر رہی تھیں بالآخر وہ خود کو بتانے سے باز نہ رکھ سکی تھیں اور اس سے کہہ رہی تھیں۔

''کیا ہوا؟'' وہ جو چائے کے آخری گھونٹ بھر رہی تھی، چونک کر بولی۔

''اس کے میاں نے دوسری شادی کر لی اور شرمین سے اجازت بھی نہیں لی۔ بلکہ بدبخت اجازت کیا خاک لیتا، اس نے بتانا بھی گوارہ نہ کیا۔ وہ تو اتفاقاً کوئی عورت ادھر سے آئی تو اس نے بتایا کہ اسے شادی کئے بھی چھ ماہ ہو چکے ہیں اور اسی بات نے تو آپا حاجرہ کے دل میں آگ سی لگا دی۔ ان کے میاں نے کسی جاننے والے سے مشورہ کیا تو وہ ایک وکیل کے پاس لے گئے۔ وکیل نے خاصی تسلی دی۔ نہ معلوم کون کون سی درخواستیں لکھوائیں اور کہہ دیا کو جلد ہی وہاں سے اس کے میاں کے گرفتاری کے وارنٹ جاری کروا دیئے جائیں گے۔ وکیل نے لمبی چوڑی تقریر کر کے اتنی لمبی رقم بھی فیس کے نام پر بٹھیالی۔ یہ باتیں ابھی چل رہی تھیں کہ آج صبح شرمین کا میاں آیا اور اس کا بھتیجا جو گھر سے باہر کھیل رہا تھا اسے کہا کہ شرمین آنٹی کو بلا کر لاؤ۔ بچے نے جا کر شرمین سے کہا۔ اس لڑکی کے نہ معلوم کیا دل میں آئی یا وہ کیا سمجھی جو سیدھی دروازے پر چلی آئی۔ اور جیسے ہی اس نے چہرہ نکال کر دروازے سے جھانکا ہے، بے رحم شیطان نے ہاتھ میں چھپائی ہوئی تیزاب کی بوتل اس کے چہرے پر انڈیلی اور بھاگ گیا۔''

''ہائے...... شرمین تو بہت اچھی اور صابر لڑکی ہے۔ اس کا کیا ہوا، کیسی طبیعت ہے اس کی؟'' سادہ سی کم گو شرمین کا سراپا اس کی نگاہوں میں ابھر آیا۔ وہ ایسے ہی تڑپ اٹھی جیسے یہ تکلیف اسے ہوئی ہو۔

''اللہ خیر کرے، انتہائی نگہداشت میں رکھا ہوا ہے اسے۔ کسی کو منہ دیکھنے بھی نہیں دے رہے۔ ان کے گھر میں کہرام مچا ہوا ہے۔ اس کے بھائی، باپ سب غم و غصے سے بدحواس ہوئے ہیں۔''

''اس کے شوہر کو نہیں پکڑا جس نے ایسا سنگین جرم کیا ہے؟''

''وہ پورا گھر غائب ہے۔ ایک ہفتہ قبل وہ گھر بیچ کر نا معلوم کہاں چلے گئے ہیں۔ آج کچھ رقم جو بقایا تھی وہ لے کر اپنا مقصد پورا کر کے وہ بھی چلا گیا۔ بندوں سے چھپ سکتا ہے انسان لیکن اللہ سے نہیں۔ وہ جب تک خاموش ہے تب تک بچتا ہے۔ جب اس کی لاٹھی چلتی ہے تو بے آواز ہوتی ہے اور کسی کو بھی راہ فرار نہیں مل سکتی۔'' زرینہ افسردگی سے کہہ رہی تھیں اور سائرہ گم صم بیٹھی خلاؤں میں تک رہی تھی۔

□●□

''آپ مجھے خود سے جدا کرنا کیوں چاہتے ہیں...... میں آپ کے بغیر تنہا نہیں رہ پاؤں گی۔'' فرح نے اسے بتا دیا تھا کہ خرم کی خواہش پر وہ اس کے ہمراہ پاکستان جا رہی ہے۔ مکمل تفصیل وہ بتا چکی تھی اور جب سے وہ بے قرار، مضطرب ہو گئی تھی کہ موقع ملتے ہی پریشان کن لہجے میں گویا ہوئی۔

''آپ تنہا کہاں ہیں، ہماری امانت آپ کے ساتھ ہے۔ پھر یہ سب آپ کے لئے ہی کر رہے ہیں۔ کچھ عرصے کی تو بات ہے، میں بھی بہت جلد تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔ پھر فرح آپ کے ساتھ ہیں وہ از حد بہادر و پُراعتماد عورت ہیں۔ مجھے ان پر مکمل بھروسہ ہے۔'' وہ آہستگی سے اس کے بال سہلاتے ہوئے سمجھا رہے تھے۔

''اس میں تو کوئی شک نہیں ہے مگر نا معلوم کیوں میرا دل نہیں مان رہا۔ مجھے عجیب عجیب وہم آ رہے ہیں...... بس میں آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی، خواہ کچھ بھی ہو۔'' اس کی آواز بھرا گئی تو ان کے کشادہ سینے میں منہ چھپا لیا۔ حرا کے ہر انداز سے اضطراب اور بے تحاشا محبت جھلک رہی تھی۔ وہ جو ایک عمر سے سچی و خالص محبت کے متلاشی رہے تھے یکدم ہی بھرپور سرشاری و شادابی ان کے انگ انگ کو طمانیت بن کر سیراب کر گئی۔

''اوہو...... یہ کیسا بچوں جیسا ڈر، خوف ہے۔ ارے بابا! میں جلد آ جاؤں گا۔ یہ عارضی جدائی ہے کوئی ابدی جدائی نہیں۔''

''آہ...... خدانخواستہ کیوں ایسی باتیں کرتے ہیں۔ میری عمر بھی اللہ آپ کو لگا دے۔'' اس نے سہم کر ان کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا تو وہ بے اختیار کھلکھلا کر ہنسنے لگے تھے۔

''پگلی، عورتیں بھی سچ مچ بڑی وہمی ہوتی ہیں۔ اگر کہنے سے باتیں پوری ہونے لگیں تو کیا ضرورت ہے کسی کو اتنی محنت کرنے کی، اس قدر جدوجہد کرنے کی۔ فقط منہ سے نکالا اور بات فوراً قبول ہوئی۔''

''کوئی گھڑی کوئی لمحہ قبولیت کا ضرور گزرتا ہے جس میں ہمارے منہ سے نکلی بات فوراً پوری ہوتی ہے، اس لئے ہمیشہ اچھی بات کہنی چاہئے۔''

''اوکے...... آئندہ خیال رکھوں گا۔ مگر اب جو منہ سے نکل گیا اس کا کیا کروں؟'' اس کا انداز ہنوز شوخ تھا۔

''ملازمہ نے کھانا لگنے کی اطلاع دی تو وہ ڈائننگ ہال میں چلے آئے جہاں میز انواع و اقسام کے کھانوں سے سجی ہوئی تھی۔

''واہ...... آج بڑا اہتمام ہے، کوئی مہمان آ رہا ہے امی حضور؟'' وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے ان سے مخاطب ہوئے۔

''مہمان نہیں، گھر کے ہی بچے ہیں، ندا اور عرفان آئے ہیں بمبئی سے۔''

''ندا اور عرفان؟ کب آئے وہ لوگ؟'' ان کے لہجے میں حیرت آمیز مسرت تھی۔ ایسی ہی خوشی جو اپنے بچوں کے لئے ہوتی ہے۔

''ہیلو پاپا!'' اسی لمحے ان دونوں نے اندر داخل ہو کر کہا تھا۔

''ونڈرفل سرپرائز...... بہت خوشی ہو رہی ہے ندا بیٹے آپ کو دیکھ کر۔'' نازک سراپے، تیکھے ابرو، ڈائنا کٹ ہیئر اسٹائل میں ندا کے خوبصورت چہرے پر برہمی و ترشی کے آثار تھے۔ آنکھوں میں ناگواری و نفرت تھی۔

''عرفان کو دیکھ کر آپ کو خوشی نہیں ہوئی؟''

''عرفان کو کچھ ہفتے قبل دیکھ چکا ہوں، آپ کو طویل عرصے بعد دیکھ رہا ہوں۔''

''میڈم! آپ یہاں سے اٹھیں، یہ گرینڈ مدر کی چیئر ہے۔'' ندا فرح کی جانب بڑھ کر درشت لہجے میں گویا ہوئی۔

''ندا! یہ کیا بدتمیزی ہے؟ مہمانوں سے ایسے بی ہیو کرتے ہیں؟''

''یہ بدتمیزی نہیں، حق ہے ہمارا۔ میری مما کی چیئر پر تو یہ عورت بیٹھ گئی ہے مگر گرینڈ مدر کی چیئر کوئی نہیں ہتھیا سکتا۔'' خرم صاحب کی غصے سے چیختی آواز کی پروا کئے بغیر وہ غصے سے بولی تھی۔

کمرے کی پرسکون فضا ایک دم ہی ٹینس ہو گئی۔ فرح تو فوراً ہی ہکا بکا سی کھڑی ہو گئی تھی۔ حرا بھی گو مگو حالت میں آنکھیں پھاڑے دیکھ رہی تھیں۔ امی حضور کسی بچے کی

طرح ساکت وصامت تھیں جب کہ عرفان کے تیور بھی بگڑے بگڑے تھے۔

''ندا! معافی مانگو۔ فوراً معافی مانگو۔ یہاں چیئرز پر نام نہیں لکھا ہوا۔''

''رہنے دیجیے خرم صاحب! معافی کی کوئی بات نہیں ہے۔ بچے ایسے ہی جذباتی ہوتے ہیں۔ میں اس چیئر پر بیٹھ جاتی ہوں۔'' خرم کا پُرجلال انداز، ندا کی ہٹ دھرمی و بدتمیزی نے انہیں بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔ بات سنگین ہوتے دیکھ کر فرح فوراً ہی مصالحت آمیز انداز میں دوسری کرسی پر بیٹھتی ہوئی گویا ہوئی تھیں۔ ندا اسی طرح باپ کے روبرو تن کر کھڑی تھی۔

''ہاں ہاں کھاؤ...... خوب کھاؤ...... تم جیسے گھٹیا لوگوں کو کھانے سے غرض ہوتی ہے، کرسی سے نہیں۔ کرسی ہو یا نہ ہو، بس کھانا چاہیے۔''

وہ حقیرانہ لہجے میں فرح کو گھور کر مخاطب ہوئی پھر پلٹ کر حرا سے بولی، جو اس صورت حال سے مارے خوف کے کانپ رہی تھی۔

''یہ مہارانی اپنے باپ کی عمر سے بڑے آدمی سے شادی رچا کر اس لیے بیٹھی ہیں کہ اچھے اعلیٰ کھانوں کے علاوہ مال و دولت بھی ہڑپ کر جائیں۔ گھٹیا خاندان کے ذلیل لوگ۔'' ندا نے بدتمیزی و گستاخی کی حد کراس کر دی تھی۔ خرم صاحب آگے بڑھے تھے اور کمرہ تھپڑوں کی آوازوں سے گونج اٹھا تھا۔

□●□

رات خوب برف پڑی تھی۔

ہر سو سفید چادر کی طرح ہر شے لپیٹے وجود سے ڈھانپے ہوئے تھی۔ ہر سمت گہرا سکوت چھایا ہوا تھا۔ معمولی سی بھی ہلچل نہ تھی۔ مشعل نے کھڑکی سے ذرا سا سر نکال کر دیکھا تھا۔ اوپر آسمان بالکل صاف تھا اور دور افق پر سنہری روشنیوں کا آبشار سا بہہ رہا تھا۔ شاید سورج جلوہ افروز ہونے کی تیاریوں میں مگن تھا۔ کافی دیر بعد وہ کھڑکی سے ہٹی اور بند کمرے کے پردہ برابر کر ڈالا اور بیڈ کی طرف آگئی۔ اس کی نگاہیں شاہ ویز کے چہرے سے ٹکرائی تھیں۔ رات سونیا اور سرمد کی معنی خیز باتوں اور اشاروں نے محض اسے ہی نئی آگ سے آشنا نہیں کروایا تھا، اس سے شاہ ویز بھی خود کو نہ بچا سکا تھا۔ کمرے میں آتے ہی سونے کا اعلان کرتا ہوا نائٹ سوٹ بدل کر لائٹ آف کر کے سیدھا وہ بیڈ پر دراز ہو گیا۔ وہ پہلے ہی لیٹ چکی تھی۔ ساری رات دونوں کو کسی انجانے جذبے نے بے کل و بے چین رکھا تھا۔ وہ اپنی نسوانیت، اپنی انا، اپنے وقار کا خیال کیے بالکل اسی طرح پڑی رہی جیسے بے خبر سو رہی ہو جب کہ پہلی بار اس نے شاہ ویز کو جاگتے، کروٹیں بدلتے محسوس کیا تھا۔ ساری رات گزر جانے کے بعد کچھ دیر قبل ہی نیند اس پر مہربان ہوئی تھی اور وہ اس سے بھی محروم رہی تھی۔

اس کی رنگت جو کبھی گندمی تھی، اب گندمی رنگت میں سرخی و سفیدی شامل ہو گئی تھی۔ ناک اونچی تھی اور پیشانی کشادہ، گھنی مونچھوں کی رنگت بلیک و براؤن تھی اور ہونٹ ہلکے گلابی خوب صورت تھے۔ اس وقت بے خبر سوتا ہوا وہ اس قدر اچھا لگ رہا تھا کہ وہ بنا پلکیں جھپکائے یک ٹک اسے دیکھے گئی تھی۔

جگا نہ سکے ترے لب، لکیر ایسی تھی
ہمارے بخت کی ریکھا بھی تیر ایسی تھی
یہ ہاتھ چومے گئے، پھر بھی بے گلاب رہے
جو رُت بھی آئی، خزاں کے مغیر ایسی تھی

''کیا ہمارے درمیان یہ بیگانگی و لاتعلقی کا رشتہ مستقل قائم رہے گا؟ مجھے میری نادانی و ناسمجھی کی سزا کب تک ملتی رہے گی؟ میں پگھل رہی ہوں، اندر ہی اندر تمام ہو رہی ہوں۔ تمہاری خاموش نفرت، سرد خاموشی مجھے مار ڈالے گی۔ میں مر جاؤں گی۔ ایک محبت کا جہان اپنے اندر آباد لیے، اپنی حسرتوں کی بربادی شاید مجھ سے منظور نہ ہو گی۔ شاہ ویز! تم تو بہت محبت کرنے والے، ازحد خیال رکھنے والے ایک قابل ستائش و قابل فخر انسان ہو۔ تم میں یہ خصوصیت ہے کہ تم لوگوں کو پہلی ہی ملاقات میں اپنا گرویدہ بنا لیتے ہو۔ ہر کوئی تم سے مل کر تمہارا ہو جاتا ہے پھر ذرا سی جگہ میرے لیے کیوں نہیں نکل سکتی؟''

وہ اسے دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی دل کی دنیا زیر و زبر تھی، کسی طور پر وہ اس سے دستبردار ہونے کو تیار نہ تھی۔ اس کا ہر ستم، ہر جفا، ہر بے رُخی کے وار کو سہنے کے باوجود شاہ ویز سے علیحدہ ہونے کا تصور ہی سوہانِ روح تھا۔ نا معلوم یہ طلب کی ضابطگی تھی یا محبت کی اساس، وہ اس سے تعلقات کی وابستگی چاہتی تھی۔

وہ اس کے ساتھ رہے، دسترس سے دور سہی، نگاہوں سے اوجھل نہ ہو، ہاتھ اسے چھونے سے گریزاں تھے مگر نگاہیں تو ہر دم بوسے لیتی تھیں۔ دل کے تعلقات جتنے انوکھے ہوتے ہیں اس کی چاہتیں اتنی ہی نرالی و متوالی ہوتی ہیں۔ اسے احساس ہی نہ ہوا اور نا معلوم کب آنسوؤں کے موٹے موٹے قطرے آنکھوں سے نکل کر شاہ ویز کے چہرے پر گرے تھے اور قبل اس کے کہ وہ پیچھے ہٹ کر سنبھلتی، شاہ ویز آنکھیں کھول چکا تھا۔

سرخ سرخ

خمار آلود آنکھیں مشعل کے گھبرائے ہوئے چہرے پر مرکوز تھیں۔

''آنسوؤں سے میرا چہرہ دھونے کی کیا ضرورت پیش آگئی؟''

جواباً مشعل نے کوئی لفظ نہ کہا۔ دل اس وقت کچھ ایسے ہی ان کہے جذبات و احساسات سے دوچار تھا۔ جب زبان کچھ نہ کہہ سکے تو لفظ بول اٹھتے ہیں۔ آنسوؤں کو زبان مل جاتی ہے اور پھر وہ ہر وہ بات کہہ ڈالتے ہیں جو زبان نہیں کہہ سکتی۔

وہ رو رہی تھی، بے ساختہ، بے اختیار۔ اسے معلوم نہ تھا کہ وہ کیوں رو رہی ہے۔ آنسو کیوں اس طرح بہہ رہے ہیں جیسے یکلخت دریا میں طغیانی آجائے اور موجیں تمام بند توڑ کر حشر برپا کر دیں۔

وہ رو رہی تھی۔

شاہ ویز دیکھ رہا تھا۔

بالکل خاموش اور سنجیدگی سے۔ نہ اسے خاموش کرنے کی سعی کی تھی، نہ ہی کوئی لفظ کہا تھا۔

یہ مشغلہ ہے کسی کا نہ جانے کیا چاہے
نہ فاصلوں کو مٹائے نہ فاصلہ چاہے
میری بساط ہے کیا، میں ہوں برگِ آوارہ
اُڑا کے لے چلے مجھ کو جدھر ہوا چاہے

''یہ بن بادل برسات کیوں؟ معلوم تو ہو مجھے کچھ۔'' قدرے توقف کے بعد شاہ ویز اس سے مخاطب ہوا تھا جس کی رقت انگیزی میں کمی آگئی تھی۔

''آئی ایم سوری، نہ معلوم مجھے کیا ہو گیا تھا۔'' دونوں ہاتھوں سے اپنا بھیگا چہرہ رگڑتے ہوئے وہ سنجیدگی سے کہہ رہی تھی۔

''طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟'' وہ تکیہ اونچا کرتا ہوا نیم دراز ہوا تھا اور ساتھ ہی ہاتھ آگے بڑھا کر اس کا دایاں ہاتھ تھام لیا تھا۔

''کل وہاں بھی بالکل خاموش بیٹھی رہی تھیں۔''

''ٹھیک ہوں میں...... بالکل ٹھیک...... بھلا مجھے کیا ہو گا؟'' وہ اس سے اپنا ہاتھ چھڑانے کی سعی کرتی ہوئی گویا ہوئی مگر اس سے ہاتھ چھڑا نہ سکی تھی۔ بہت مضبوطی سے شاہ ویز نے تھام رکھا تھا۔ انداز میں ملائمت و گرم جوشی تھی۔

مضبوط گرفت میں حدت تھی، شعلوں کی سی۔ مشعل نے گھبرا کر اس کی جانب دیکھا اور نگاہیں جھکا لی تھیں۔

اس کی نگاہوں میں کچھ ایسی ہی وارفتگی و والہانہ پن تھا کہ اس کا دل بے ہنگم انداز میں دھڑکنے لگا۔

''ہوں، بتاؤ نا...... کیوں مجھ سے کچھ چھپا رہی ہو؟ کیوں رو رہی ہو؟ کوئی وجہ تو ہو گی قیمتی آنسو بہانے کی۔'' اس نے اسے کھینچ کر سینے سے لگاتے ہوئے گمبھیر لہجے میں کہا۔

اس کی یہ جسارت نہ معلوم غیر ارادی تھی یا وہ سونیا اور سرمد کی ازدواجی خوش حالی، محبت بھری زندگی سے متاثر ہو گیا تھا۔

شادی کے ان سات آٹھ ماہ کے عرصے میں پہلی بار وہ اس سے اس قدر قریب ہوئی تھی۔ اس کی دھڑکنیں منتشر تھیں ہی، اس کے سینے سے سر ٹکائے اس کی سماعتوں میں شاہ ویز کے دل کی دھڑکنیں بھی خاصے زور و شور سے گونج رہی تھیں۔ وہ بھی شدید اضطراب کا شکار تھا۔

وہ جیسے کسی درخت کی ٹوٹی ڈال کی طرح اس کے سینے پر دھری تھی۔ پھر کتنے ہی پل اسی گومگو کی حالت میں گزرے تھے۔

وہ بے حس و حرکت تھی۔

وہ گویا منجمد ہو چکا تھا۔

وہاں صرف دھڑکنوں کی صدائیں تھیں اور سانسوں کی بازگشت۔

باہر سے دروازہ ناک کیا گیا تو ان جیتے جاگتے مجسموں میں جنبش پیدا ہوئی تھی۔ مشعل آہستگی سے دور ہوئی تھی۔ اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو سامنے سونیا بلیو نائٹی میں چائے لیے کھڑی تھی۔

''صبح بخیر۔'' وہ دلکشی سے مسکرائی تھی۔

''صبح بخیر، اندر آئیے۔'' اس نے بھی جواباً مسکراتے ہوئے اسے اندر آنے کا راستہ دیتے ہوئے کہا تو وہ ٹرے اٹھائے اندر چلی آئی۔

''ہماری جیتی دوست صاحبہ کہاں ہیں؟'' وہ سائیڈ ٹیبل پر ٹرے رکھتی ہوئی کمرے میں نگاہیں دوڑاتی استفسار کرنے لگی جب کہ مشعل دستک کی آواز سن کر باتھ روم میں چلی گئی تھی۔ وہ اس وقت ایسے احساس سے دوچار تھی کہ کسی کا بھی سامنا کرنے کا موڈ نہیں رکھتی تھی۔

''آپ کی دوست ہیں...... آپ ان کے بارے میں زیادہ جانتی ہیں کہ وہ اس وقت کہاں جا سکتی ہیں۔'' شاہ ویز نے اس کے ہاتھ سے کپ لیتے ہوئے کہا۔

''اب مجھ سے زیادہ اختیار آپ کو ہے۔ اب ساری معلومات آپ کو ہونی چاہئیں۔''

''اس سبجیکٹ پر آپ کو میں مطمئن نہ کر سکوں گا۔'' اس نے کپ کو منہ لگاتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

سونیا نے استفہامیہ نظروں سے شاہ ویز کی طرف دیکھا تھا جس کے وجیہہ چہرے پر سنجیدگی اسے پُروقار بنا رہی تھی۔ آنکھوں میں خمار آلود سرخی اور لبوں پر دھیمی سی مسکراہٹ کے باوجود وہ ایک ٹوٹا بکھرا شخص لگ رہا تھا۔ باتھ روم سے شاور سے پانی گرنے کی آواز نے مشعل کی وہاں موجودگی کا پتا دے دیا تھا۔ اس نے کپ پر سا سر ڈھانپ دی تا کہ چائے مشعل کے آنے تک ٹھنڈی نہ ہو جائے۔

''آیئے، باہر کا نظارہ کریں۔ رات خوب برف پڑی ہے۔'' اس نے شاہ ویز کو دعوت دی تو وہ اس کے سنگ باہر آ گیا۔

رات خوب برف پڑی تھی۔ مکانوں کی چھتیں، سڑکیں، گلیاں اور نیچے اونچے درختوں، ننھے منے پھول پودوں پر برف ہی برف پڑی ہوئی تھی۔ لیکن اب آسمان بالکل شفاف تھا۔ دھلے دھلائے صاف وشفاف نیلے آسمان پر سفید براق چھوٹے چھوٹے بادلوں کے ٹکڑے بہت حسین لگ رہے تھے۔ دور افق پر سنہری روشنیوں کا آبشار سا بہہ رہا تھا۔ وہ مبہوت سا کھڑا دیکھتا رہا۔

''خوب صورت چیزوں سے آپ کو کچھ زیادہ ہی دلچسپی ہے۔'' سونیا نے کہا۔

''قدرت کی طرف سے ودیعت کیا ہوا ہر حُسن ہر آنکھ کو اپیل کرتا ہے خواہ کوئی کتنا ہی بدذوق کیوں نہ ہو۔ جب ایسے نظارے سامنے ہوں تو کوئی منہ نہیں موڑ سکتا۔'' اس نے دھیرے دھیرے سپ لیتے ہوئے کہا۔

''ایک بات کہوں؟ آپ مائنڈ تو نہیں کریں گے؟'' سونیا کچھ جھجکتی ہوئی گویا ہوئی تھی۔ شاہ ویز نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

''مشی بھی بے مثال حُسن کی مالک ہے، ان نظاروں کی طرح ہی پُرکشش، سحر انگیز، اس کی طرف سے آپ کیوں بے نیازی برت رہے ہیں بلکہ بدذوقی کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔'' سونیا کے مسکراتے لہجے میں سنجیدگی تھی۔ وہ چونک کر بولا۔

''مشعل نے کچھ کہا آپ سے؟''

''نہیں...... بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں شاہ ویز صاحب جن کی ادائیگی لفظوں کی محتاج نہیں ہوتی۔ وہ بغیر اندازِ بیان کے اپنا آپ ظاہر کر دیتی ہیں۔ دراصل انسان ایک معمہ ہے کہ جب اس کو حل کرنے کی سعی کرو تو کوئی سرا ہاتھ نہیں آتا بلکہ وہ اُلجھتا ہی چلا جاتا ہے اور بعض اوقات ایسے آسان وسادہ لفظوں سے مزین کتاب بن جاتا ہے کہ بغیر کسی حیل وحجت کے ہم اس کا لفظ لفظ ازبر کر لیتے ہیں۔ سطر سطر ہم پر عیاں ہو جاتی ہے اور ہم بنا زبان کو جنبش دیئے صرف آنکھ سے ہر بھید، ہر راز سے آگاہ ہو جاتے ہیں۔ مشعل نے مجھ سے کچھ نہیں کہا لیکن اس کے چہرے کی سادگی، آنکھوں میں تیرتی یاسیت، لہجے کی بے چارگی، سراپے کی ویرانی مجھ پر عیاں کر گئی ہے کہ وہ کچھ نہیں بلکہ بہت کچھ مجھ سے چھپا رہی ہے۔ وہ الجھن بھری تکلیف میں ہے اور یہ سوچ مجھے کل سے بے کل کئے ہوئے ہے۔ مجھے آپ بتائیں، آپ دونوں کے درمیان کچھ مس انڈر اسٹینڈنگ ہو گئی ہے؟ وہ آپ کے ساتھ خوش نہیں ہے یا آپ کی طرف سے کوئی بات ہے؟'' سونیا کا فکرمند وازحد پریشان کن لہجہ ظاہر کر رہا تھا کہ وہ مشعل کے ساتھ بہت مخلص وسچی دوستی کا رشتہ رکھتی ہے۔

''یہ سوالات آپ مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہیں؟ بہتر ہوگا اسی سے پوچھیں۔''

''بالکل درست کہہ رہے ہیں آپ۔ اگر آپ کی جگہ کوئی اور ہوتا تو میں ضرور مشی سے بھی دریافت کرتی مگر میں حقیقت پسند ہوں، خیالوں وخوابوں کی دنیا سے دور رہتی ہوں۔ انسانوں کا بہت گہرائی سے جائزہ لیتی ہوں اور اسے میری خوش فہمی کہیں یا حساسیت کہ مشعل کے مقابلے میں آپ مجھے ذمے دار، حساس، باشعور وبااعتماد شخص محسوس ہوئے ہیں۔ اسی وجہ سے میں نے آپ سے ہی معلوم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ مشعل کے حوالے سے آپ بھی مجھے عزیز ہیں۔''

''تعریف وتوصیف کا بے حد شکریہ۔ اتنی ساری باتیں آپ بنا کہے بنا سنے جان گئی ہیں تو اور بھی جان جائیں گی۔ سچ کبھی چھپتا نہیں ہے۔ بہت جلد آپ کو آپ کے سوالات کے جوابات مل جائیں گے۔ فی الحال ابھی کچھ بھی کہنا مناسب نہیں ہے۔'' شاہ ویز نے گول مول جواب دیا تھا اور سونیا مزید الجھن کا شکار ہو گئی تھی۔

❒●❒

تھپڑوں کی گونج اعلانِ جنگ کے نقارے کی طرح گونج کر رہ گئی تھی۔ سب ہی اس صورت حال کے زیر اثر ساکت وجامد بیٹھے تھے۔

خرم صاحب سرخ سرخ قہر آلود نگاہوں سے بیٹی کو دیکھ رہے تھے جو دونوں رخساروں پر ہاتھ رکھے باپ کی جانب پھٹی پھٹی حیران کن نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

''پا...... پا...... آپ...... نے مجھے...... مارا......'' پہلے ندا ہی کا سکتہ ٹوٹا تھا۔

''یہ آپ کی بدتمیزی کی سزا ہے۔'' ان کا لہجہ بدستور کرخت تھا۔

''سزا...... ہونہہ...... اب میں بچی نہیں رہی ہوں جو آپ مجھے ماریں۔''

''میرے لئے تم کل بھی بچی تھیں آج بھی بچی ہو اور تاحیات بچی رہو گی۔''

''یہ آپ کی بھول ہے پاپا! اب ہم بڑے ہو چکے ہیں اور برا بھلا سمجھتے ہیں۔ آپ کا کوئی حق نہیں بنتا ہم پر ہاتھ اٹھانے کا، سزا دینے کا۔'' عرفان بھی اٹھ کھڑا ہوا تھا اور بہن کی طرفداری میں گویا ہوا تھا۔

''عرفان، تم بہن کو سمجھانے کی بجائے فضول حمایت لے رہے ہو۔''

''اب سمجھنے سمجھانے کا وقت آپ کا ہے پاپا، ہم اس سے گزر چکے ہیں۔'' ندا ان کے قریب اکڑ کر کھڑی ہو گئی تھی اور ساتھ ہی عرفان بھی بگڑے تیور لئے کھڑا تھا۔ ماحول میں وحشت ناچنے لگی تھی۔ حرا دم بخود بیٹھی ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں خوف چھایا ہوا تھا۔

فرح بھی عجیب گومگو کی کیفیت میں بیٹھی تھیں اور چاہنے کے باوجود بول نہ پا رہی تھیں کہ یہاں بہت نازک رشتہ اور حیثیت رکھتی تھیں۔ اپنی حیثیت کا تعین انہیں چند لمحات قبل ہو چکا تھا اس وجہ سے وہ ان کے ذاتی معاملات میں بولنے کا حق نہ رکھتی تھیں مگر وہ اس وقت سخت الجھن وبے چینی محسوس کر رہی تھیں۔

اس وقت ایک ایسا وجود تھا جو یہاں کی ٹینشن سے بے پرواہ اپنے آپ میں مگن تھا وہ امی حضور تھیں جو سپاٹ چہرہ جھکائے مطمئن بیٹھی تھیں۔

''ماں، باپ اولاد کے لئے فخر ومسرت کا باعث ہوتے ہیں۔ راحت وآرام پہنچانے کی تگ ودو میں آخری سانس تک لگے رہتے ہیں اور ایک آپ ہیں پاپا! ماں تو مر گئی ہمیں چھوڑ کر اور آپ نے ہمیں زندہ رہتے ہوئے مردہ تصور کر لیا۔''

''غلط...... بالکل غلط۔ میں نے ہر ممکن طریقے سے تم لوگوں کا خیال رکھا ہے۔ کبھی بھی تم دونوں سے بے خبر نہیں رہا۔ ہاں تم لوگوں نے میری پرواہ کرنی چھوڑ دی ہے۔ تمہاری نظروں میں میری کوئی ویلیو، کوئی پرسٹیج نہیں ہے۔''

''آپ کو کس نے مشورہ دیا تھا کہ آپ شادی کریں؟''

''عرفان!'' خرم اتنی زور سے چیخے تھے کہ ان کی آواز کمرے میں گونج کر رہ گئی۔ ''تمہاری یہ جرأت گستاخ، بدتمیز، دفع ہو جاؤ میرے سامنے سے۔''

''تکلیف ہوئی نا آپ کو اُخی نے اس طرح بات کی تو۔ اور آپ کی سیکنڈ میرج کی خبر نے ہمیں بھی اسی طرح تکلیف سے پل پل زخمی کیا ہے۔ سسرال میں، میں کسی کے آگے سر اٹھا کر بات کرنے کے قابل نہ رہی۔ اُخی کے سسرال میں بھی لوگ اس کا مضحکہ اڑاتے ہیں۔ عزیز واقارب ہر کوئی جان پہچان والا ہمیں تمسخر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ شادی آپ نے کی اور مذاق ہمارا بن رہا ہے۔'' ندا ابھرے بادلوں کی طرح یکدم برسنے لگی تھی۔ عرفان اس کی تائید میں برابر گردن ہلا رہا تھا، گویا وہ اپنے ساتھ ساتھ اس کے جذبات کی ترجمانی بھی کر رہی تھی۔

''میں نے شادی کی ہے، کوئی گناہ نہیں۔ کیوں تم لوگ ایسا سلوک کر رہے تھے؟'' خرم صاحب کے لہجے میں اب وہ سختی ومضبوطی نہ رہی تھی۔

''اس عمر میں شادی کر کے آپ نے گناہ سے بڑھ کر گناہ کیا ہے اور مزید ستم یہ کہ اب باپ بننا چاہ رہے ہیں۔'' عرفان کے نفرت سے لبریز لہجے نے انہیں عرق عرق کر ڈالا تھا۔ کہنے سننے کو کچھ نہ رہا تھا، ان کے گرد طوفانی ہوائیں سائیں سائیں کرتی چکرا رہی تھیں۔ وہ قوی حوصلہ وبلند سوچ رکھنے والا شخص، آج اپنے خون کے ہاتھوں ریزہ ریزہ ہو گیا تھا کسی مٹی کے کھلونے کی مانند۔

''ہمیں یا اپنی آنے والی اولاد میں سے آپ کو کسی ایک کو چننا ہوگا۔ یا اسے دنیا میں آنے سے قبل ختم کروا دیں یا پھر ہم دونوں بہن بھائی کا گلا دبا کر اپنے ہاتھوں سے دفن کر دیں تا کہ بعد میں لوگوں کی باتیں و ہنسی سننے کے لئے ہم زندہ ہی نہ ہوں اور آپ اپنے نئے بیوی بچے کے ہمراہ چین کی بانسری بجایئے گا۔'' ندا، عرفان دونوں مل کر بول رہے تھے۔ خرم صاحب کی نگاہیں ان کے چہروں پر تھیں۔ ان کے لبوں سے ادا ہونے والا ایک ایک لفظ کسی نوکیلے خنجر کی طرح ان کے دل میں پیوست ہو رہا تھا۔ ان رشتوں سے زخم تو انہوں نے بارہا کھائے تھے مگر آج تو گویا ان کی نفرت، حقارت، گستاخی وبدتمیزی کے شرمناک مظاہروں نے انہیں قتل کر ڈالا تھا۔

ان کے اندر ٹوٹ پھوٹ ہونے لگی تھی۔

خون کی روانی میں ٹھہراؤ سا محسوس ہونے لگا تھا۔ دل میں ایک دم ہی بھونچال سا آیا تھا۔ درد کی شدت سے ان کا چہرہ متغیر ہوا۔ سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے وہ لڑکھڑائے تو فرح اور حرا گھبرا کر ان کی طرف بڑھی تھیں اور حرا نے لپک کر انہیں سہارا دیا تھا۔

''مجھے میرے کمرے میں لے چلو۔'' درد کی شدت سے ان کی آواز لرز رہی تھی۔ حرا اور فرح سہارا دے کر انہیں بیڈ روم میں لائی تھیں اور بیڈ پر لٹایا تھا۔

''مجھے ڈر تھا انہی لمحوں کا۔ ایسے ہی کڑے وقت کا جب میں بے گناہ ہوتے ہوئے بھی گناہ گار ٹھہرایا جاؤں۔ میں نے ساری پلاننگ پہلے کر لی تھی۔''

''آپ باتیں نہ کریں، آپی نے ڈاکٹر کو فون کر دیا ہے۔ وہ آتے ہی ہوں گے۔'' حرا ان کا سینہ سہلاتے ہوئے روتے ہوئے کہنے لگی۔

''کرنے دو مجھے باتیں۔ نہ معلوم پھر موقع ملے نہ ملے۔ حالات کیسے ہی ہوں ان لوگوں پر اعتبار مت کرنا۔ میرے بعد یہ لوگ تمہیں بھی زندہ نہیں رہنے دیں گے۔ میں نے اپنے بچے کے لئے اور تمہارے لئے اتنی جائیداد چھوڑی ہے کہ تم اور وہ ساری زندگی عیش وآرام سے گزار سکتے ہو۔ کاغذات تمہیں پاکستان جا کر مل جائیں گے۔

یہاں کسی پر بھی اعتبار مت کرنا۔ پرسوں صبح کی تمہاری فلائٹ ہے۔ حالات کچھ بھی ہوں، تمہیں یہاں سے ہر صورت نکل جانا ہے۔ یہ میری آخری خواہش ہے۔ اس کا احترام تمہیں ہر حال میں کرنا ہے۔''

موسم سرد تھا۔ اس موسم میں بھی وہ درد کی شدت سے پسینے پسینے ہو رہے تھے مگر درد سے بے پروا اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لئے مسلسل بول رہے تھے۔

''آپ ایسی باتیں کیوں کر رہے ہیں؟ کچھ نہیں ہوگا آپ کو...... ٹھیک ہو جائیں گے آپ۔ ہم ساتھ رہیں گے، ساتھ جائیں گے۔'' حرا ان کے ہاتھوں پر چہرہ رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔

''کاش ایسا ہوتا......'' ان کی آنکھوں سے بھی پانی بے آواز بہنے لگا تھا۔

کچھ دیر قبل زندگی سے بھرپور روشن نظر آنے والی آنکھیں اب چراغوں کی مدھم لو کی طرح بجھتی جا رہی تھیں۔

بڑی حسرت زدگی سے بلک بلک کر روتی ہوئی حرا کو دیکھ رہے تھے۔ ایسے جیسے آج کے بعد پھر کبھی دیکھ نہ پائیں گے۔

''حی...... را......'' درد کی شدید ترین لہر اٹھی تھی۔ انہوں نے کرب انگیز لہجے میں حرا کے ہاتھ کو مضبوطی سے پکڑتے ہوئے پکارا تھا۔ ان کی بگڑتی حالت دیکھ کر حرا نے چیخ کر فرح کو پکارا تھا جو اسی لمحے ڈاکٹر کے ہمراہ اندر داخل ہو رہی تھیں۔ پیچھے پیچھے مدا عرفان اور امی حضور تھے۔ خرم صاحب کی گردن بائیں طرف ڈھلک گئی تھی۔

❐●❐

''سائرہ! کیا سوچ رہی ہو؟ جب سے شرمین کی ڈیتھ کی خبر ملی ہے تم تو بالکل ہی گم صم ہو گئی ہو۔'' فریحہ، سائرہ کے پاس بیٹھتی ہوئی گویا ہوئی تھی۔

''بھابی! کیا شرمین نے سوچا ہوگا کہ جس شخص کے ساتھ اس نے زندگی بھر کا بندھن باندھ رکھا ہے وہی شخص اسے نہایت سفاکی سے زندگی کی روشنی سے موت کے اندھیرے میں پہنچا دے گا۔'' اس کے لہجے میں قنوطی پن تھا۔

''ایسا کوئی سوچ نہیں سکتا، نہ ہی کسی کے عزائم اس کی پیشانی پر لکھے ہوتے ہیں۔ انسان اللہ تعالیٰ کی سب سے اچھی مخلوق ہے، بہترین سمجھ سوجھ رکھنے والی اعلیٰ و برتر فیصلے کرنے کا حق رکھنے والی۔ لیکن جب تہذیب یافتہ انسان انسانیت کی بلند سطح سے گر کر ذلالت و حیوانیت کے پاتال میں گرتا ہے تو درندوں سے بھی زیادہ درندگی کا ثبوت دیتا ہے اور اس کے اس وحشیانہ طرز عمل سے کئی خاندان ظلم و ستم کا شکار ہو کر سسک سسک کر زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔''

''ہمارے معاشرے میں ایسی وارداتیں، ایسے جرائم روز بروز بڑھ رہے ہیں۔ لوگ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی ضد میں اس طرح کی ظالمانہ کارروائیاں کر گزرتے ہیں۔ کیونکہ وہ تو اپنی نفرت یا ضد و غصے کی آگ اس طرح سرد کر لیتے ہیں کہ جانتے ہیں اپنے جرم کی سزا سے وہ کہیں اثر و رسوخ استعمال کر کے اور کہیں رشوت سے منہ بند کر کے خود کو بچا لیں گے۔''

''جو ہونا ہوتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے۔ شرمین کی زندگی اتنی لکھی تھی وہ گزار گئی۔ اسے اسی طرح رخصت ہونا تھا، سو ہو گئی۔ بھول جاؤ اسے۔ ہماری زندگی میں لوگ اس طرح آتے جاتے رہتے ہیں۔ کسی دن ہم بھی چلے جائیں گے۔ اس دنیا میں ٹھہرنا کس کو ہے، سب ہی مسافر ہیں۔'' فریحہ اس کا ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے رسانیت سے سمجھا رہی تھی۔

''بھابی! باقر کو اگر میں شادی کی اجازت نہ دیتی تو وہ بھی میرے ساتھ یہی سلوک کرتا۔ مرد اپنی منوانے کیلئے ہر قسم کا سلوک روا رکھنا جائز سمجھتے ہیں۔''

''سائرہ! تم نے باقر کو شادی کی اجازت کیوں دی اور کب دی؟'' جس بات کو اس نے اپنے اندر بہت چھپا کر رکھا تھا اس وقت جلد بازی میں اس کے ہونٹوں سے عیاں ہو گئی تھی جس کا ادراک ہوتے ہی وہ سہم سی گئی تھی، مزید گھبراہٹ میں مبتلا ان کے سوال نے کر ڈالا تھا۔

''وہ...... وہ...... بھابھی...... وہ......''

''گھبرا کیوں رہی ہو؟'' اس نے آگے بڑھ کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے محبت و اپنائیت سے کہا تو بے اختیار امڈ آنے والے آنسوؤں کو نہ روک سکی۔

''مجھ پر یقین کرو۔ میں تمہارے اعتماد کے آئینے کو معمولی سی ٹھیس بھی لگنے نہ دوں گی۔ جو دل میں ہے کہہ ڈالو۔ کیا روگ لگائے بیٹھی ہو؟''

''تم پر بھروسہ کر رہی ہوں بھابی! اماں اور بھائی کو یہ معلوم نہیں ہونا چاہئے۔ باقر کا فون آیا تھا دو ماہ قبل۔ وہ مجھے طلاق دینے پر آمادہ تھا۔ اس کے گھر والوں نے اس کی دوسری شادی کی مکمل تیاریاں کر رکھی تھیں۔ وہ بھی ہر صورت میں شادی کے لئے بے قرار تھا اور اس نے مجھ سے علیحدگی کی خاطر ہی فون کیا تھا مگر میں نے بڑی منت و سماجت کے بعد اسے راضی کر لیا کہ وہ مجھے طلاق دیئے بغیر شادی کر لے۔'' اس نے گویا دھماکا کیا تھا۔ وہ ہکا بکا اس کی شکل دیکھ رہی تھیں جس پر ضبط و کرب کے کئی تکلیف دہ رنگ پھیلتے سمٹتے نظر آ رہے تھے۔

''ایسا کیوں کیا تم نے؟ اپنی مرضی سے سوکن قبول کر لی؟ تم جانتی ہو عورت سب کچھ بانٹ سکتی ہے مگر شوہر کی تقسیم برداشت نہیں ہوتی اس سے۔ یہ درد سب سے بڑا درد ہوتا ہے جو برداشت نہیں ہوتا۔ پھر......''

''میں اس سے بھی بڑے دکھ سے گزر رہی ہوں۔ میرے نزدیک بے اولادی سے بڑا اور ناقابل برداشت دکھ کوئی نہیں ہے۔ اتنے سالوں میں، میں ان کو یہ خوشی نہ دے سکی تو انہیں مزید روکنے کا حق بھی نہیں ہے مجھ کو۔'' وہ صبر و استقلال کی زندہ مثال بنی اس کے سامنے بیٹھی اپنے دھیرے دھیرے بہنے والے آنسو صاف کر رہی تھی اور فریحہ کو اس کے حوصلے و قربانی نے از حد متاثر کیا تھا۔ کتنا بڑا دکھ وہ خاموشی سے سہہ رہی تھی۔

''تم نے سوچا ہے یہ بات کب تک چھپ سکتی ہے؟ کبھی بھی اماں یا اصغر کو معلوم ہو گیا تو وہ طوفان اٹھا کر رکھ دیں گے۔''

''جب اپنی کشتی میں نے اپنے ہاتھوں تاراج کر دی تو اب کسی طوفان کا کیا خطرہ۔ میں سمجھا دوں گی، عیب دار ان کی بیٹی ہے۔''

''دونوں سر جوڑ کر بیٹھ جاتی ہو تو بیٹھی ہی جاتی ہو۔ ارد گرد کا ہوش ہی نہیں رہتا ہے۔ ابھی کچھ دیر اور میں نہ آتی تو وہ ناہنجار بلی سارا دودھ گرا دیتی۔'' زرینہ کی تیز آواز سن کر وہ دونوں بری طرح چونکی تھیں۔ سامنے سے وہ ہاتھ میں دودھ کی دیگچی پکڑے فریج کی طرف بڑھتے ہوئے بڑبڑا رہی تھیں۔ سائرہ نے پریشان نظروں سے فریحہ کی طرف دیکھا، فریحہ نے اشارے سے ہی کہا کہ سب ٹھیک ہے۔ اماں نے کچھ نہیں سنا۔

''بہو تو پھوہڑ ہے ہی، اب بیٹی بھی اس کے نقش قدم پر چلنے لگی ہے۔ اس مہنگائی نے ہم جیسوں کی تو کمر توڑ دی ہے، تم ایسی لاپرواہی دکھا کر گلا کاٹ دو۔ بڑی محنت کرتا ہے میرا بچہ جب سامان لاتا ہے۔ کوئی درختوں پر نوٹ نہیں لگتے کہ توڑے اور لے آئے۔'' وہ حسب عادت شروع ہو چکی تھیں۔

''اماں! دودھ گرم تھا۔ بھابی کہنے لگیں ٹھنڈا ہو جائے گا تو فریج میں رکھیں گی۔ اتنی سی بات ہے بس۔'' سائرہ نے حسب عادت وضاحت کی۔

❐●❐

رکتا بھی نہیں ٹھیک سے چلتا بھی نہیں ہے
یہ دل کہ تیرے بعد سنبھلتا بھی نہیں ہے
اس عمر کے صحرا سے تیری یاد کا بادل
ٹلتا بھی نہیں ہے اور برستا بھی نہیں ہے

اس روز موسم کچھ زیادہ ہی خنک ہو رہا تھا، ہوائیں پھولوں کی مہک لئے ادھر ادھر گھوم رہی تھیں۔ شام دھیرے دھیرے ماحول پر چھا رہی تھیں اور ہر طرف ایک خواب ناک سماں سا بکھر رہا تھا۔ وہ اس اداس شام میں اس کا ایک حصہ لگ رہی تھی۔ بے ترتیبی و اضطراب تو اس کی زندگی میں بہت عرصہ قبل داخل ہو چکا تھا اب تو وہ اس کی عادی ہو چکی تھی مگر سونیا کے ہاں رہائش سے وہ عجب کشمکش و پیچ میں مبتلا ہو گئی تھی۔

شاہ ویز کے سنگ وہ تنہا تھی۔ اس کی بے بسی و مصنوعی زندگی کا تماشا دیکھنے والا کوئی نہ تھا۔ وہ کھل کر روتی تھی۔ بے فکری سے اپنا غم مناتی تھی۔ اپنی تنہائیوں پر کڑھتی تھی۔ اپنی حسرتوں پر آنسو بہاتی تھی۔

شاہ ویز کا ہونا یا نہ ہونا کوئی معنی نہ رکھتا تھا۔ وہ اس کے لئے اپنے ہونے نہ ہونے کا احساس رکھتا بھی نہ تھا۔ وہ رو کر اپنے آنسو خود پونچھ لیا کرتی تھی۔ خود کو تسلی دے کر منا لیا کرتی تھی مگر یہاں آ کر وہ جیسے خود کو غیر محفوظ و کمتر محسوس کرتی تھی۔ ہر وقت اس پر خوف مسلط رہا کرتا کہ سونیا اور سرمد ان کی بناوٹی اور کھوکھلی زندگی کے بارے میں نہ جان جائیں۔ وہ کس طرح ان کا سامنا کرے گی۔

سونیا اس کے ماضی کی ایک ایک ادا سے واقف تھی۔ اس کی دولت، اس کے کروفر، اس کے گھمنڈ سے۔

کچھ بھی تو مخفی نہ تھا۔ کس کس طرح سے وہ جنس مخالف کے دلوں سے کھیلتی تھی اور کھیل کر ایک ٹھوکر میں اڑا دیا کرتی تھی۔ فلرٹ اس کی ہابی تھی۔

محبت کی فسوں خیزی سے وہ واقف نہ تھی۔

چاہت کی چاشنی اس کے لبوں کو چھو کر نہ گزری تھی۔

کل تک وہ جسم ہی جسم تھی اور آج روح تھی۔ عشق کی روح، محبت کی روح، چاہت کی روح۔

عشق روحوں کا ملاپ ہے۔ روح کوئی توقع نہیں رکھتی۔ وہ توقعات سے بالا ہوتی ہے۔ ہوس کی کوئی تاریکی ان پاکیزہ روشنیوں کے قریب نہیں آ سکتی۔

''اوہو...... بہت گہری سوچ ہے بھئی...... کیا سوچا جا رہا ہے؟'' سونیا مسکراتی اس کے قریب بیٹھتی ہوئی گویا ہوئی تو وہ بھی مسکرا دی تھی۔

''کچھ نہیں...... ایسے ہی بیٹھی تھی۔'' اس نے سنبھل کر جواب دیا۔

''کچھ نہیں، ایسے ہی، تم ان لفظوں کا استعمال زیادہ ہی کرنے لگی ہو۔''

''بعض اوقات محسوس نہیں ہوتا اور انسان ایک جیسے ورڈز بول دیتا ہے۔''

''اسی محسوس پر تو میں فکر مند ہوں۔ پہلے تو تم ان احساسات کے سحر میں گرفتار نہ ہوتی تھیں خاصی بامعنی اور دو ٹوک گفتگو کیا کرتی تھیں۔'' سونیا کے لہجے میں وہی تفتیش و تشویش تھی جس سے وہ بچنے کی سعی میں رہا کرتی تھی۔

''تم تو جانتی ہو اچھی طرح، انسان کبھی بھی یکساں نہیں رہتا۔ وقت و حالات کی طرح وہ بھی بدلتا رہتا ہے۔ مجھ میں آئی تبدیلی نے تمہیں کیوں اس قدر متحیر کر رکھا ہے..... مجھے سمجھ نہیں آتا۔''

''یہ بات نہیں ہے مشی! میں تمہارا بدلا ہوا رنگ ڈھنگ دیکھ کر بہت زیادہ خوش ہوں اور مطمئن ہوں کہ تمہیں ایسا لائف پارٹنر ملا ہے جس کی رفاقت پر تم جتنا بھی ناز کرو کم ہے۔''

''پھر کیوں ڈسٹرب ہو میری طرف سے؟''

''ان ساری باتوں کے باوجود تم دونوں کے درمیان کوئی ایسی دیوار ہے جو دکھائی نہیں دیتی مگر محسوس ضرور ہوتی ہے۔''

وہ اس کے بالکل درست تجزیے پر لمحے بھر کو شرمندگی کے احساس سے کانپ اٹھی تھی مگر اتنی بے وقوف نہ تھی کہ اپنی دکھتی رگ پر اس طرح ہاتھ رکھنے دیتی سو سنبھل کر گویا ہوئی۔

''شادی کر کے تم نے خوامخواہ اپنے ٹیلنٹ کو ضائع کیا ہے ورنہ ایک اچھی ڈیٹیکٹیو بن سکتی تھیں اور اس طرح تمہیں اپنے لوگوں میں جاسوسی نہ کرنا پڑتی۔'' اس نے ہنسی میں اس کی بات اڑانے کی سعی کی تھی۔

''تم مجھے اس طرح بدھو نہیں بنا سکتیں۔ پلیز تم دونوں کے درمیان جو کچھ چل رہا ہے وہ مجھ سے شیئر کرو، ابھی وقت ہے۔ ہم بہت کچھ سدھار سکتے ہیں۔ غلط فہمیاں، رنجشیں دور کر سکتے ہیں۔ اگر وقت گزر گیا تو پھر صرف پچھتاوے رہ جائیں گے۔ مجھ سے کچھ نہ چھپاؤ پلیز۔''

''تمہیں وہم ہو گیا ہے سونی۔ ہمارے درمیان ایسا کچھ نہیں ہے۔ ہم اچھی لائف گزار رہے ہیں۔''

''خدا کرے یہ سب میرا وہم ہی ہو۔ تم سدا خوش رہو۔ سچی خوشیوں کے ہمراہ۔'' اس نے محبت سے اس کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے کہا۔

''سونی! تم میرے بارے میں اتنی فکر مند کیوں ہو؟''

''میں دیکھ رہی ہوں تمہاری شادی کو ابھی اتنا عرصہ نہیں ہوا جتنی تمہارے اور شاہ ویز کے درمیان لاتعلقی ہے۔ اتنے بیگانہ تو وہ بھی نہیں ہوتے جن کی شادی کو پچاس ساٹھ سال ہو جاتے ہیں بلکہ سرمد کو ہی دیکھ لو، ہماری شادی کو دو سال ہونے والے ہیں اور وہ ابھی تک اول روز کی طرح ہی چاہتے ہیں اور اس چاہت میں گزرتے وقت کے ساتھ اضافہ ہو رہا ہے۔ اور ایک تم دونوں ہو کسی کو کسی کی خبر نہیں۔ ایک شمال کی طرف منہ کر کے بیٹھا ہے تو دوسرا جنوب کی سمت میں۔ اب بھی شاہ ویز بھائی اوپر ٹیرس پر بیٹھے ہیں اور تم یہاں نیچے لان میں اداس بیٹھی ہو۔'' سونیا نے اچھی طرح کھنچائی کی تھی۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ہنس پڑی تھی۔

''سونیا ڈیئر! کیا ضروری ہے کہ تم لیلیٰ مجنوں بنے رہتے ہو تو ہم بھی لیلیٰ مجنوں بن کر دکھائیں؟''

''مشعل ڈارلنگ! لیلیٰ مجنوں بن کر دکھایا نہیں جاتا بلکہ محبت خود ہی لیلیٰ مجنوں بنایا کرتی ہے۔ اینی وے، اس ٹاپک کو ہم کلوز کرتے ہیں۔ یہ بتاؤ رات ڈنر میں کیا بنواؤں؟''

''ہم دونوں مل کر کوکنگ کریں گے، اپنی مرضی سے ڈشز بنائیں گے۔'' وہ کھڑی ہوتی ہوئی پرجوش لہجے میں گویا ہوئی تھی۔

رات کھانے کی ٹیبل پر وہ چاروں جمع تھے۔

''آج کھانے کی خوشبو کچھ مختلف و منفرد ہے۔ اسپیشل کھانا بنوایا ہے کیا؟'' کھانے کے شوقین سرمد نے خاصے بے صبرے پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے ٹیبل پر موجود ڈشز کے ڈھکنے ہٹاتے ہوئے استفسار کیا۔

''ہوں..... آج مشعل نے یہ سارا اہتمام کیا ہے۔ میں نے صرف سلاد و رائتے بنانے میں مدد کی ہے اس کی۔'' سونیا پلیٹیں سیدھی کرتی ہوئی بولی۔

''سرمد صاحب! یہاں قریب میں کوئی ڈاکٹر وغیرہ موجود ہیں نا؟''

''خیریت..... کوئی پرابلم ہے کیا؟'' وہ دونوں میاں بیوی یکدم ہی پریشانی سے گویا ہوئے جب کہ مشعل نے ہونٹ بھینچ لیے تھے۔ وہ اس کے طنز کو سمجھ گئی تھی۔

''ہماری بیگم کے ہاتھوں سے پکائے کھانے کھا کر ڈاکٹر کی ضرورت ہمیں فوراً پڑے گی۔'' اس نے اس انداز میں کہا کہ وہ دونوں مسکرا دیے۔

''یہ آپ زیادتی کر رہے ہیں۔ کھانے کی خوشبو بتا رہی ہے کھانا یقیناً لذیذ ہے اور میں تو اس معاملے میں ایکسپرٹ ہوں، کھانا سونگھ کر ہی بتا سکتا ہوں کہ کھانا کس کوالٹی کا ہے۔'' سرمد نے چکن روسٹ کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ شاہ ویز نے بھی ڈش سے چکن بریانی پلیٹ میں نکالی جب کہ مشعل سلاد، رائتہ کانچ کی پلیٹ و پیالی میں نکال کر دے رہی تھی۔

کچے قیمے کے کباب، بروسٹ، بریانی اور پالک پنیر اس نے خود بنایا تھا۔ ساتھ سونیا کو رکھا تھا کہ اس میں ابھی اعتماد نہ تھا کس کو کتنی دیر پکانا ہے اور کس ڈش میں کتنا مسالہ ڈالنا ہے۔ یہ سب اسی کی ہیلپ سے کیا تھا۔ ایک ہفتہ اسے ہو گیا تھا یہاں آئے ہوئے اور اس ایک ہفتے میں اس نے سونیا سے بہت سی گھرداری سیکھ لی تھی۔ کھانے پکانے کی خاصی تراکیب اسے ازبر ہو چکی تھیں۔ آج اس نے عملی قدم اٹھایا تھا اور دھڑکتے دل سے منتظر تھی کہ اس کی کوکنگ کا رزلٹ کیا نکلتا ہے؟

''واہ..... فنٹاسٹک..... کھانا بے حد ٹیسٹی ہے۔'' سرمد نے تمام ڈشوں سے لقمے لے کر ستائشی لہجے میں کہا۔

مشعل کی بے ساختہ نگاہ شاہ ویز کی جانب اٹھی تھی جو خاموشی سے کھانے میں مگن تھا جس کے لبوں پر نہ تعریفی جملے تھے نہ چہرے پر ستائش۔ اس کا دل بجھ کر رہ گیا۔ یہ ستائشی و توصیفی جملے وہ اس سے سننا چاہتی تھی۔ سونیا نے انکھیوں سے اسے، پھر شاہ ویز کو دیکھا تھا۔

''بہت لکی ہو یار، جو حسین ہونے کے علاوہ ذائقہ دار کھانے پکانے والی بیوی کے شوہر ہو۔ ورنہ میں نے حسین عورتوں کو صرف ادائیں دکھاتے ہی دیکھا ہے یا نازا ٹھواتے ہوئے۔''

''وہ مرد کاٹھ کے الو ہوتے ہوں گے۔ شاہ ویز بھائی جیسے کٹھور مرد نہیں جو بیوی کی جائز تعریف کرنے پر بھی کنجوسی سے کام لیتے ہیں۔'' سونیا میٹھے لہجے میں طنز کرنے سے باز نہ رہ سکی تھی۔

''دراصل مجھے موٹی بھدی عورتیں پسند نہیں ہیں اور مشعل کی اسمارٹنس کی سلامتی اسی میں ہے کہ تعریف و توصیف کی کیلوریز سے دور رکھا جائے۔'' اپنا دفاع کرنا وہ خوب جانتا تھا تبھی باتیں بنا کر چکنی مچھلی کی طرح ان کی گرفت سے نکل گیا تھا۔

کھانے کے بعد کافی کا دور چلا تھا اور ساتھ ساتھ باتیں بھی چل رہی تھیں۔ سرمد اور سونیا دونوں ہی خوب باتیں کرنے کے عادی تھے اور ان کی عادت انہیں خوب بھائی تھی کہ انہیں بولنے کا موقع کم سے کم ہی ملتا تھا۔

□●□

''بھائی جان! حالت دیکھی ہے اپنی، کتنے کمزور ہو گئے ہیں۔ نہ معلوم کیا وجہ ہے جو اپنا محل کی طرح گھر ہوتے ہوئے بھی مہمانوں کے ریسٹ ہاؤس میں رہائش پذیر ہیں۔'' رافعہ آج صبح ہی ان کے آفس چلی آئی تھیں۔

''وجہ کچھ نہیں ہے۔ اتنے بڑے گھر میں تنہا کس طرح رہ سکتا ہوں؟''

''یہ کیا بات ہوئی بھائی جان، آپ تنہا کیوں رہیں گے؟'' وہ لمحے بھر توقف کے بعد گویا ہوئیں۔ ''میں ہوں، جوجو ہے آپ کے ساتھ۔ آپ خود کو تنہا کیوں سمجھ رہے ہیں؟ پھر ایک نہ ایک دن مشعل بھی لوٹ آئے گی۔ آپ تنہا کبھی نہیں ہو سکتے۔'' اس وقت وہ قدرے مہربان و شیریں نظر آ رہی تھیں۔

''اب تنہا رہنے کی عادت پڑ گئی ہے۔ تم میری طرف سے فکر مند مت ہوا کرو۔'' وہ سادہ مزاج و نرم طبیعت کے مالک تھے، کسی کی زیادتی پر وقتی طور پر ملول و برہم ہو جاتے تھے اور اس شخص سے بات صاف ہوتے ہی تمام ناراضگی و ملال حرف غلط کی طرح مٹ جایا کرتا تھا۔

رافعہ کی طرف سے پہنچائی گئی تمام تکلیفیں و زیادتیاں ان کے معافی مانگنے پر وہ بھلا چکے تھے لیکن رافعہ نے سگی بہن ہوتے ہوئے بھی ان سے بالکل مختلف مزاج پایا تھا۔ ان کے اندر چالاکی و مکاری از حد تھی۔ گرگٹ کی طرح ماحول دیکھ کر رنگ بدلنے کی عادی تھیں۔ ان کے تمام منصوبے، تمام راستے صرف اور صرف اپنی بہبود و فلاح کی طرف جاتے تھے۔ خود پرستی اور موقع پرستی میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔

''یہ کیسی بات کی آپ نے بھائی جان! آپ کی فکر میں نہیں کروں گی تو کون کرے گا۔ یہ دوسری بات ہے کہ آپ نے میری نادانی و بے وقوفی کو دل سے معاف نہیں کیا۔ آپ ابھی بھی مجھ سے خفا ہیں۔'' انہوں نے ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رونا شروع کر دیا۔

''ارے رافعہ! یہ کیا بچوں جیسی حرکت ہے۔ بھلا ایسا بھی ہوتا ہے؟ ہمارے درمیان ناراضگی تھی جو اب ختم ہو چکی ہے۔ بھلا میں اتنا عرصہ کسی غیر سے خفا نہیں رہ سکتا پھر تم تو میری پیاری بہن ہو۔'' انہوں نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''بس آپ میرے ساتھ چل کر رہیں، میں آپ کو تنہا نہیں رہنے دوں گی۔ آپ کی صحت کی مجھے از حد فکر ہے۔''

''تمہارے ساتھ..... لیکن صرف دو کمرے ہیں، وہاں گنجائش کہاں ہے؟'' ان کی نگاہوں میں ان کے دو کمروں کا چھوٹا سا فلیٹ گھوم گیا۔

''وہاں..... وہاں کہاں گنجائش ہے۔ میں تو مشعل پیلس کی بات کر رہی ہوں، وہاں ہم آرام سے رہیں گے اور جس فلیٹ میں، میں رہ رہی ہوں وہاں تو بھائی جان سایہ ہے کسی کا۔'' وہ آہستگی سے گویا ہوئیں۔

''سایہ؟ کیسی باتیں کر رہی ہو رافعہ؟'' وہ بے ساختہ مسکرا اٹھے۔

''پہلے مجھے یقین نہیں آیا تھا۔ شروع شروع میں جوجو نے مجھے بتایا کہ کوئی اس کے کمرے میں سے قیمتی چیزیں غائب کر رہا ہے۔ میں نے ملازمہ پر نگاہ رکھنی شروع کی مگر ملازمہ ایسی نہ تھی۔ پھر میرے کمرے میں سے میری جیولری، پرفیومز، ڈریسز اور رقم غائب ہونا شروع ہو گئی ہے۔''

''وہم ہے سب تمہارا..... کہیں اور رکھ کر بھول جاتی ہو گی۔''

''نہیں، میں اب تو لاکر میں یا وارڈروب لاک کر کے رکھتی ہوں اور لاکڈ میں سے ہی سامان غائب ہو جاتا ہے اور اسی بات سے ہی مجھے یقین ہو گیا کہ یہ کسی پراسرار ہستی کا ہی ہاتھ ہے جو لاک کے باوجود سامان نکال لیا کرتی ہے۔''

ان کے چہرے پر، لہجے میں حقیقی خوف و وحشت تھی۔ حسن بیگ بھی چند ساعت سوچوں میں مستغرق رہے تھے۔

''میرے خیال میں تم گھر پر ہی آجاؤ۔واچ مین کے پاس رومز کی چابیاں ہیں وہ لے لینا۔میں دفتر سے فارغ ہو کر وہیں آؤں گا۔''

□●□

ایک قیامت تھی جو اچانک اس پر ٹوٹی تھی۔

آخری سانس تک وفا نبھانے کے وعدے کرنے والا وعدہ وفا کر گیا تھا۔خرم کی ابدی جدائی بجلی بن کر حرا پر گری تھی اور اسے ہوش و حواس سے بیگانہ کر گئی تھی۔

سات ماہ پہلے اس نے شادی کا سرخ جوڑا پہنا تھا۔بہت محبت و اعتماد کے ساتھ خرم نے اسے زندگی میں شامل کیا تھا۔اس قلیل عرصے میں اسے صدیوں کی محبت و پیار دیا تھا۔

اس قدر چاہا تھا اسے، اس قدر اہمیت، وقعت دی کہ وہ اپنی تمام محرومیوں کو بھول بیٹھی تھی۔

خرم کی رفاقت میں زندگی زندگی لگنے لگی تھی۔

ابھی تو اس نے خوش رہنا سیکھا تھا۔

ابھی اس کے پنکھ پرواز سے آشنا ہوئے تھے۔

یہ کیسی آندھی چلی تھی کہ ایک جھونکے میں ہی اس کے پنکھ توڑ ڈالے تھے۔آشیانہ اجاڑ ڈالا تھا اور اس کا وجود خزاں زدہ پتے کی مانند ہواؤں میں اڑتا پھر رہا تھا۔

اس کی مسرت، عیش و نشاط، خوش گوار زندگی کے دن کتنے کم تھے۔بالکل بہار کے موسم کی طرح مختصر، اس کے آنسو خشک نہیں ہو رہے تھے۔وہ خود سے بالکل بیگانہ ہو کر رہ گئی تھی۔خرم کی موت نے حالات کی سنگینی کا احساس بھی مٹا دیا تھا۔

کل ڈاکٹر نے خرم صاحب کے ہارٹ فیل کی جیسے ہی تصدیق کی، کمرے میں بھونچال سا آ گیا تھا۔حرا اس صدمے کی تاب نہ لا کر بے ہوش ہو گئی تھی۔دل و دماغ کو جھٹکا تو فرح کو بھی خرم کی موت سے لگا تھا، خرم کے مردہ جسم کے اردگرد دادا اور امی حضور بیٹھ گئی تھیں۔ان کی آنکھیں آنسوؤں سے خالی تھیں مگر لبوں پر حرا کے لئے کوسنے و گالیاں تھیں۔فرح کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس طرح صورت حال کو سنبھالیں۔ایک طرف مردہ بہنوئی تھا، دوسری طرف بہن ہوش و حواس سے عاری پڑی تھی۔مستزاد ان دادی، پوتی کا بہیمانہ رویہ، ان کی بے حسی و خود غرضی نے خرم صاحب کی جان لے لی تھی اور وہ یہ الزام حرا پر لگا رہی تھیں۔نہ معلوم صورت حال کیا روپ اختیار کرتی اگر عرفان مداخلت نہ کرتا۔اس نے سمجھا بجھا کر بہن اور دادی کو خاموش کیا اور حویلی نما بنگلے کے سب سے آخری حصے میں بنے کمرے میں انہیں پہنچا کر گیا تھا۔

اس کا کہنا تھا کہ وہ محفوظ جگہ پر انہیں چھوڑ کر جا رہا ہے۔ان کا غصہ اترتے ہی انہیں یہاں سے نکال لے جائے گا۔یہ اس کی چال تھی۔یہ حقیقت اس وقت آشکارا ہوئی جب انہوں نے دروازہ کھول کر باہر جانے کی کوشش کی تو باہر سے دروازہ بند ملا۔کھڑکیوں پر بھی سلاخیں لگی تھیں۔

کھڑکیوں سے باہر ہال نما کمرے میں چھوٹی چھوٹی کوٹھریاں تھیں جن میں اناج کی بوریاں بھری ہوئی نظر آ رہی تھیں۔اس کے علاوہ کوئی ذی روح نظر نہ آتا تھا۔حرا کو رونے کے سوا کچھ نہ سوجھ رہا تھا۔

''حرا! خود کو سنبھالو میری بہن۔حالات کی نزاکت کو سمجھو۔ہمیں یہاں دھوکے سے قید کر دیا گیا ہے۔نامعلوم انہوں نے کیا پروگرام بنایا ہے.....کیا چاہتے ہیں وہ۔'' وہ اس کے دوپٹے سے آنسو صاف کرتی ہوئی گویا ہوئیں۔

''وہ صرف میری موت چاہتے ہیں۔مجھے مارنا چاہتے ہیں اور کیا چاہیں گے۔تو ماردیں مجھے۔خرم کے بعد اب زندہ رہنے کی تمنا نہیں رہی ہے۔مر تو میں گئی ہوں۔'' وہ بلک بلک کر رونے لگی تھی۔

''میں سمجھتی ہوں تمہارا دکھ۔تمہاری زندگی کی بہاروں پر خزاں چھا گئی ہے۔تمام شوخ رنگ روٹھ گئے ہیں۔زندگی تلخ ہو گئی ہے۔مگر تمہیں اس زہر کو گھونٹ گھونٹ پینا ہو گا، جینا ہو گا، اپنے لئے نہ سہی مگر اپنے آنے والے بچے کے لئے۔خرم کی نشانی کو پرورش کرنے کے لئے۔''

''جب خرم نہ رہے تو.....''

''ایسے مت کہو.....وہ نظروں سے اوجھل ہوئے ہیں، دل سے نہیں۔اور جو دل میں بستے ہیں وہ دور ہو کر بھی کبھی دور نہیں ہوتے۔سنبھالو خود کو۔'' فرح نے اس کی بات قطع کر کے دھیرے سے سمجھایا۔

''کس طرح خود کو سنبھالوں آپی! کیا کروں میرے دل میں درد ہے۔مجھے یقین نہیں آتا خرم اتنی جلدی مجھے چھوڑ کر چلے جائیں گے۔وہ شہر سے باہر جانے سے ہفتوں قبل مجھے بتا دیا کرتے تھے۔اب اتنی دور اچانک چلے گئے۔کوئی ایسے بھی جاتا ہے؟ وہ بالکل ٹھیک تھے، صحت مند تھے، کہہ رہے تھے تم جاؤ کچھ دنوں بعد میں بھی پاکستان آ جاؤں گا پھر دنیا سے کیوں چلے گئے مجھے چھوڑ کر.....کیوں گئے؟''

صبر کا پیمانہ اس کا لبریز تھا۔فرح جتنا اسے بہلانے کی تلقین کرتیں، چپ کروانے کی سعی کرتیں وہ اتنا ہی بے قابو ہو رہی تھی۔وہ اسے صبر کی تلقین کرتیں پھر خود بھی رونے لگتیں کہ ان مختصر سے دنوں میں خرم نے اپنی خوش مزاجی و مہمان نوازی کا بھرپور احساس دیا تھا اور سب سے زیادہ اپنی بہن کو خوش و خرم ان کی سنگت میں دیکھ کر وہ دل سے ان کا احترام کرتی تھیں۔ان کی اچانک موت نے فرح کو بھی از حد ڈسٹرب کیا تھا مگر اسے خود کو اور حرا کو بھی سنبھالنا تھا۔خرم کی ماں اور بچوں کے رویوں نے پہلے ہی اسے دل برداشتہ کر دیا تھا اب یہاں بہانے سے قید کرنے نے پریشان کر ڈالا تھا۔کل سے اب تک وہ دونوں یہاں قید تھیں۔کسی نے ان کی خبر تک نہ لی تھی۔وہ ہر بات سے بے خبر تھیں۔

''حرا! مت ہلکان کرو خود کو۔جو ہو گیا اسے ہم بدل نہیں سکتے۔یہ آنسو تو اب تا حیات تمہارے ساتھ رہیں گے۔موت ایسی بھی آتی ہے بلکہ موت تو ہمیشہ ہی ہمارے آگے پیچھے رہتی ہے۔ہم غافل رہتے ہیں اس سے، وہ ہم سے غافل نہیں ہوتی۔جب بندے کا وقت آ جاتا ہے دبوچ لیتی ہے۔انسان کو موت سے غافل کبھی نہیں ہونا چاہئے۔وہ کہتے ہیں نا کہ سامان سو برس کا ہے پل کی خبر نہیں۔

''ان ظالموں نے ان کے آخری دیدار سے محروم کر دیا۔'' حرا سسکیوں کے دوران بولی۔اسی دم باہر سے کسی کے قدموں کی آہٹیں گزری تھیں۔وہ دونوں ایک دم چونک گئیں۔وہ آہٹیں دور جا کر غائب ہوئی تھیں۔

فرح نے خوف زدہ ہو کر بہن کو سینے سے لگا لیا تھا۔ابھی چند لمحے ہی گزرے تھے کہ بائیں دیوار کی درمیان کا حصہ دروازے کی مانند ہٹ گیا۔قبل اس کے کہ وہ اپنی حفاظت کے لئے کوئی تدبیر کرتیں یا کوئی آواز نکالتیں، اس خلا سے ان کا پرانا ملازم بڑے میاں داخل ہوا تھا۔

''مالکن! میں آپ کا نمک حلال ملازم ہوں، مجھ سے خوفزدہ مت ہونا۔'' اس نے اندر آتے ہی عاجزی سے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

''یہ کیا ہو رہا ہے ہمارے ساتھ؟ ہمیں یہاں قید کیوں کیا گیا ہے؟'' فرح آگے بڑھ کر اس سے مخاطب ہوئی تھی۔

''بہت خراب لوگ ہیں جی وہ سب۔یہاں آپ لوگوں کو قید کر دیا وہاں سب مہمانوں سے کہہ رہے ہیں کہ آپ ان کا سب روپیہ، زیور اور نامعلوم کیا کیا لے کر بھاگ گئی ہیں، اسی صدمے میں صاحب کی موت ہو گئی ہے۔'' بڑے میاں کے انکشاف پر وہ دونوں ہی بھونچکا رہ گئی تھیں۔

''کیسے بے ضمیر و بے ایمان لوگ ہیں.....ایسے بہتان باندھتے ہوئے ان کے منہ کیوں نہیں ٹوٹ گئے۔کتنے بدنیت اور بد احساس لوگ ہیں۔'' حرا کے زخموں پر گویا نمک چھڑک دیا گیا تھا۔درد و کرب سے وہ بلبلا گئی تھیں۔

''مالکن! ابھی بہت برا وقت ہے۔ان لوگوں کے ارادے بہت خطرناک ہیں۔صاحب کو آج دوپہر میں سپرد خاک کر چکے ہیں۔مہمانوں سے گھر بھرا ہوا ہے، کل تک سب چلے جائیں گے تو وہ آپ کو مار کر کہیں دفنا دیں گے۔وہ لوگوں کے جانے کے انتظار میں ہیں تاکہ کوئی ان پر شک نہ کرے۔''

''تمہیں یہ باتیں کس طرح معلوم ہوئیں؟ اور ہم کس طرح تم پر یقین کر لیں؟ تم بھی تو اس گھر کے ملازم ہو اور پھر جس طرح یہ خفیہ دروازہ کھول کر تم آئے ہو اس سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ تم ہر جگہ سے واقف ہو اور یقیناً تم ان سے ملے ہوئے ہو گے۔'' فرح دل کے خدشے کو زبان پر لے آئی تھیں جسے سن کر وہ ادھیڑ عمر ملازم ہاتھ جوڑ کر گڑگڑا کر گویا ہوا۔

''مجھ غریب پر شک کر کے آپ میری وفاداری کو داغ دار مت کریں بیگم صاحبہ! میری پشتیں سالوں سے اس خاندان کی خدمت کرتی آ رہی ہیں۔وفاداری ہماری رگوں میں خون کی طرح دوڑتی آ رہی ہے۔ہم موت سے تو ہاتھ ملا سکتے ہیں مگر اپنے مالکوں سے غداری نہیں کر سکتے۔'' بوڑھے ملازم کے لہجے میں وفا و یقین کی مضبوطی تھی جو فرح کو اطمینان دلا گئی تھی۔ویسے بھی حالات ایسے تھے کہ کسی پر تو اعتبار کرنا ہی تھا۔

''بڑے مالک کے مجھ پر بہت احسانات ہیں۔ان احسانات کا بدلہ تو میں نہیں اتار سکتا مگر میں چھوٹے مالک کو آپ کا خون کرنے نہیں دوں گا۔میں مالک کے کمرے کی صفائی کر رہا تھا جب میں نے سنا تھا۔وہ سب مل کر آپ دونوں کو مارنے کی باتیں کر رہے تھے۔ساتھ ان کے نداپی بی کے خاوند اور عرفان صاحب کی بیوی بھی شامل ہیں۔بلکہ وہ کہہ رہے تھے کہ وہ وکیل کو بھی خرید چکے ہیں۔ان سے ہی میں نے سنا تھا کہ آپ لوگوں کو یہاں قید کر رکھا ہے۔بس میں موقع کی تلاش میں لگ گیا اور یہاں آ گیا کہ ہر جگہ سے واقف ہوں۔''

''کیا تم ہمیں یہاں سے نکال کر ایئر پورٹ پہنچا سکتے ہو؟''

''میں آپ کو یہاں سے نکالنے کے ارادے سے ہی آیا ہوں۔اللہ ہماری مدد کرے گا، ہم پہنچ جائیں گے وہاں تک انشاء اللہ۔''

''لیکن ہمارا نکلنا اتنا آسان ہے؟ عرفان ہمیں قید کر کے نگرانی سے غافل کس طرح ہو گا؟'' حرا دھیمے سے بولی۔

''بڑے میاں! تم نے دیکھا ہے باہر کوئی ہے پہرے داری پر؟'' فرح مخاطب ہوئی تھیں۔

''باہر کوئی نہیں ہے، پھر عرفان صاحب کہہ رہے تھے کہ وہ نہیں چاہتے کسی طرح بھی آپ لوگوں کا کسی کو معلوم ہو۔لوگ یہی سمجھیں کہ آپ روپیہ، زیور لے کر فرار ہو گئی ہیں۔اس وجہ سے انہوں نے کسی پر بھی اعتبار نہیں کیا ہے۔اگر کسی ملازم کو پہرے پر لگاتے تو انہیں ڈر ہے یہ بات کسی نہ کسی طرح ضرور باہر پہنچے گی اور اسی وجہ سے انہوں نے نگرانی کے لئے کسی کو نہیں رکھا۔''

انہوں نے کچھ دیر مزید تاریکی پھیلنے کا انتظار کیا تھا۔ رات جب گہری ہوگئی تو وہ دبے قدموں سے بے میاں کے ساتھ اس قید خانے سے نکل گئی تھیں۔ آسمان پر اس کے نصیب کی طرح سیاہی پھیلی ہوئی تھی۔ ہواؤں میں خنکی رچی ہوئی تھی۔ حرا کے آنسو پھر رواں ہو گئے تھے اور دل نوحہ کناں تھا۔

□●□

شاہ ویز نے کنکھیوں سے مشعل کی جانب دیکھا، میرون اور بلیک کنٹراسٹ سوٹ میں شانوں پر بال بکھرائے وہ بے کل بے کل سی اس کے ارد گرد گھوم رہی تھی جیسے کچھ کہنا چاہ رہی ہو اور کہہ نہ پا رہی ہو۔

''کچھ کہنا ہے؟'' اس سے زیادہ مشعل کی بڑبڑاہٹ برداشت نہ ہو سکی تھی۔

''ہاں...... ہم یہاں سے کب چلیں گے؟'' وہ اس کے قریب صوفے پر بیٹھتے ہوئے گویا ہوئی تھی۔

''جب تم کہو، میں تیار ہوں۔''

''آج شام تک۔ میرا دل نہیں لگ رہا، مجھے پاپا شدت سے یاد آ رہے ہیں۔ میں کسی قیمت پر یہاں رکنے کو تیار نہیں ہوں۔'' بہت عرصے بعد اس کے لہجے میں بے قراری وبے ہٹ دھری آئی تھی۔

''میں تیار ہوں، تم اپنی فرینڈ سے اجازت لو تب تک میں سیٹ کنفرم کروالیتا ہوں۔'' وہ موبائل ہاتھ میں لے کر نمبر پش کرنے لگا۔ وہ سونیا کے روم میں آ گئی جہاں سونیا نماز پڑھ کر جاء نماز لپیٹ رہی تھی۔

''تم نماز پڑھتی ہو ریگولر؟'' مشعل صوفے پر بیٹھتے استعجابیہ لہجے میں گویا ہوئی تھی۔ اس سے قبل بھی اس نے سونیا کو کئی بار نماز ادا کرتے دیکھا تھا۔

''ہاں...... اب عادت ہو گئی ہے۔'' وہ دوپٹہ کھول کر عام طریقے سے اوڑھتے ہوئے بولی۔

''پہلے تو تم کو کبھی نماز پڑھتے نہیں دیکھا؟''

''سرمد کی فیملی ماڈرن ہونے کے باوجود مذہب سے بے حد قریب ہے۔ سرمد خود نماز پابندی سے ادا کرتے ہیں اور مجھے بھی تلقین کرتے ہیں۔'' وہ اس کے قریب بیٹھتے ہوئے گویا تھی۔

''شاہ ویز بھی نماز پابندی سے پڑھتے ہیں، مجھے بھی انہوں نے کئی بار کہا مگر میں نے کبھی نماز نہیں پڑھی۔ مگر میں نے نوٹ کیا ہے جو لوگ نماز پڑھتے ہیں ان کے چہرے بڑے فریش نظر آتے ہیں۔ ان چہروں پر ایسا حسن، ایسا عجیب نکھار و کشش نظر آتی ہے جو کسی میک اپ سے نہیں آتی۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟''

''نماز پڑھنے سے بہت سکون ملتا ہے، نماز پانچ وقت کی ہوتی ہے اور جب انسان پانچ وقت وضو کر کے اپنے مالک وخالق کے حضور سجدہ ریز ہوتا ہے تو اللہ کی رحمتیں و نور کی بارش بندے پر برستی ہیں جو اسے روحانی و جسمانی طور پر آسودہ و خوش حال کر دیتی ہیں۔ ہر غلاظت و نحوست سے پاک کر دیتی ہیں۔ یہ جو تم کو خوب صورتی و کشش نظر آتی ہے یہ نور ہوتا ہے۔''

''میں نے کبھی نماز نہیں پڑھی۔ کیا اللہ مجھے معاف کر دیں گے؟'' وہ بچوں کی سی معصومیت سے گویا ہوئی۔

''اللہ تعالیٰ معاف کرنے والے ہیں۔ اللہ کا در ہمیشہ وا رہتا ہے، وہ اپنے بندوں سے مایوس نہیں ہوتا۔ وہ ہمہ وقت بندوں کے پکارنے کا منتظر رہتا ہے۔ وہ ستر ماؤں سے زیادہ چاہنے والا ہے۔''

''ارے بھئی! کچھ سنا تم نے؟ یہ ہمارے مہمان جانے کے لئے تیار ہیں۔'' سرمد کہتے ہوئے کمرے میں داخل ہوا تھا۔ ساتھ ہی دوسرا ہاتھ شاہ ویز کا بھی پکڑا ہوا تھا۔

''کہاں جا رہے ہیں؟'' سونیا، مشعل اور شاہ ویز کی جانب دیکھتے ہوئے حیرانگی سے گویا ہوئی تھی۔

''میں تم سے اجازت لینے آئی تھی اور باتوں میں بیٹھ گئی۔'' مشعل نے مسکرا کر کہا۔

''کہاں جا رہی ہو؟'' وہ حیران تھی۔

''کراچی...... پاپا کے پاس۔''

''میں ابھی نہیں جانے دوں گی اتنی جلدی۔''

''میں پھر آؤں گی۔''

''آپ تنہا کیوں، شاہ ویز کو ساتھ نہیں لائیں گی؟'' سرمد فوراً مخاطب ہوا۔ اس کے سوال نے لمحے کو مشعل کو بوکھلا ڈالا تھا جب کہ شاہ ویز کے لبوں پر گہری مسکراہٹ نمودار ہو کر غائب ہوئی تھی۔

''سرمد! آپ کو بال کی کھال نکالنی آتی ہے۔ اس کے کہنے کا مقصد یہی تھا۔'' سونیا نے اس کی حمایت لے کر مشکل آسان کر دی تھی۔

وہ دونوں میاں بیوی انہیں چھوڑنے ایئر پورٹ تک آئے تھے اور سرمد اور شاہ ویز خوش گپیوں میں لگے رہے تھے۔

سونیا اسے سمجھاتی رہی تھی۔ آخری وقت تک یہ معلوم کرنے کی سعی کرتی رہی کہ ان دونوں کے درمیان جو کچھ ہے وہ اسے بتا دے تا کہ معاملہ سنبھالا جا سکے اور وہ مسکرا کر اس کے ہر خدشے کی نفی کرتی رہی تھی۔

جہاز فلائی کر گیا تھا۔ وہ دونوں اپنی سیٹوں پر بڑی طریقے سے بیٹھے تھے۔ شاہ ویز بالکل خاموش بیٹھا تھا۔ خاصی دیر گزر جانے کے بعد بھی جب اس کی چپ نہ ٹوٹی تو مشعل کو وحشت محسوس ہونے لگی۔ وہ مخاطب ہوئی۔

''ہم پہلے پاپا کے پاس جائیں گے یا بے جی کے پاس؟''

''تم اپنے راستے جانا، میں اپنے راستے جاؤں گا۔'' اطمینان سے جواب ملا۔

''کیا مطلب؟'' اس کا دل بری طرح دھڑکا۔

''مطلب بالکل واضح ہے۔ میں اپنی بے جی کے پاس تم اپنے پاپا کے پاس۔ حسن صاحب کو میں نے کال کر کے تمہاری بے تابی و بے قراری کا بتا دیا ہے۔ اتنے ہی بے قرار و بے چین وہ بھی تم سے ملنے کے لئے ہیں۔'' اس کے لہجے میں اتنی بیگانگی و لاتعلقی تھی جیسے وہ اس سے کوئی رشتہ نہ رکھتا ہو۔ اتنے دنوں کی رفاقت کوئی معنی نہ رکھتی ہو۔ دوٹوک انداز میں اس نے علیحدہ راستوں کا بتا دیا تھا۔ وہ نادان یا کم عقل نہ تھی جو اس کی باتوں کے معنی نہ سمجھ سکتی تھی۔

عورت کی جیت تو یہ ہوتی ہے کہ مرد کا دل موہ لے نہ کہ وہ اس سے چھٹکارا پانے کی تدبیریں سوچے۔ اپنے من پسند مرد کے لئے عورت کتنی قربانیاں دیتی ہے، کتنے دکھ اٹھاتی ہے، کتنے روپ دھارتی ہے اور وہ بے احساس، بے قدر کچھ نہ سمجھے، کوئی قدر نہ کرے۔ آخر عورت کو جیتنا بھی ایک کمال ہے، ایک اعزاز ہے۔ اگر عورت نکاح کے تین بولوں سے اسیر ہو جائے تو کوئی عورت طلاق نہ لے۔

''میری زندگی میں بہت سے مرد آئے مگر تم جیسا نہیں آیا شاہ ویز! تم جو دولت کو ٹھوکر میں رکھتے ہو، آن، بان، شان سے جینا جانتے ہو، تم جیسے مرد کو مسخر کرنے میں بعض اوقات جان سے گزر جانے کو دل چاہتا ہے لیکن تم کہاں سمجھو گے میری دلی کیفیت؟'' سوچوں کے درمیان ایک طویل آہ اس کے لبوں سے خارج ہوئی تھی۔

''تم نے مجھ سے بار بار آزادی کا مطالبہ کیا تھا اور ہر بار میں نے تمہیں یہی کہا تھا کہ جب تک تمہیں انسانیت سے روشناس کرا کے رشتوں کا احترام نہ کروا دوں تب تک تمہیں آزاد نہیں کروں گا۔'' وہ اپنی گمبھیر آواز میں پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

''یہ...... یہ کون سا موقع ہے اس گم گشتہ بات کو یاد کرنے کا؟'' وہ دل و جان سے لرز کر رہ گئی۔

''میں نے تم سے یہ کہا تھا کہ تم اپنا عزم بھول جاؤ گی مگر میں اپنا وعدہ یاد رکھوں گا۔ میں وعدے کا پکا ہوں، میری یادداشت قابل رشک ہے۔''

مشعل کا چہرہ متغیر ہو رہا تھا۔ اس کی سمجھ نہیں آ رہا تھا وہ کہاں ہے؟ کیا سن رہی ہے؟ کیا دیکھ رہی ہے؟ اسے کیا کرنا چاہئے اور کہنا چاہئے؟

''تو آج...... '' وہ پر اسرار انداز میں مسکرایا۔ ''میں آپ کو آپ کی آزادی لوٹا رہا ہوں، آپ نے واقعی ایک بہترین قابل فخر عورت بن دکھایا، بڑی محنت کے ساتھ زندگی کا قرینہ سیکھا، بڑے نظم و ضبط، صبر و استقلال کا مظاہرہ کیا۔ ہر وہ ناپسندیدہ کام کیا جو کبھی خواب میں بھی نہ کیا ہو گا اور ثابت کر دیا کہ ہر برے انسان کے اندر اچھا انسان چھپا ہوتا ہے جس کو تلاشنے کی، سنوارنے کی ضرورت ہے۔ جس طرح ایک پتھر کو قابل جوہری تراش خراش کر قیمتی و نایاب بنا دیا کرتا ہے اسی طرح تمہیں بھی ایک گائیڈ کی ضرورت تھی۔ کچھ عرصہ قبل حسن بیگ صاحب نے جس قدر شرمندگی و خجالت سے تمہیں مجھے سونپا تھا، تمہارے مزاج، تمہاری تربیت، تمہارے ایٹی ٹیوڈ نے جس قدر انہیں ٹینس و فکر مند کر رکھا تھا، ان کی پریشانی ان کا درد محسوس کر کے تب ہی میں نے فیصلہ کیا کہ تمہیں اس قابل بناؤں گا کہ وہ بہت فخر سے تمہارے متعلق سوچ سکیں، تعارف کروا سکیں۔'' وہ کہہ رہا تھا۔ آج موڈ اس کا بہت خوشگوار و دوستانہ تھا۔ اس سے چھٹکارا پانے کی خوشی میں اس کا انگ انگ کھل رہا تھا۔ وجیہہ چہرے کو شفاف مسکراہٹ نے روشن کر رکھا تھا۔

جدائی کا دکھ۔

علیحدگی کا رنج۔

کہیں سے بھی ظاہر نہ ہو رہا تھا جب کہ اس کا دل بند ہوتا جا رہا تھا۔

آنکھوں میں رہا دل میں اتر کر نہیں دیکھا
کشتی کے مسافر نے سمندر نہیں دیکھا
پتھر مجھے کہتا ہے میرا چاہنے والا
میں موم ہوں اس نے مجھے چھو کر نہیں دیکھا

''میں نے آپ پر ایک مہربانی کی ہے مانیں یا نہیں مانیں، میں نے آپ کے ساتھ جسمانی تعلق نہیں رکھا، جسمانی تعلق رشتے کی مضبوطی کے لئے، محبت کی پختگی کے لئے قائم کیے جاتے ہیں۔ محض حیوانی جذبات کی تسکین کے لئے ہرگز نہیں اور بعض اوقات ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ جسم کا تعلق جذباتی وابستگی کا سبب بن جاتا ہے۔ میں نے کبھی بھی حد سے تجاوز کرنے کی کوشش نہیں کی۔ کبھی تنہائی کی قربت سے فائدہ اٹھانے کی سعی نہ کی۔ حالانکہ میں ایسا چاہتا تو آپ کی طرف سے ایسی کوئی پابندی نہ تھی مگر میں دل کے رشتوں کے ساتھ ہی جسم کے تعلقات کو پروان چڑھانا چاہتا ہوں۔'' وہ چپ ہو گیا۔ گویا اب کچھ سننے سنانے کو باقی رہا نہ ہو۔ لفظ گم ہو گئے۔ سب گویائی کھو بیٹھے تھے۔ سب کچھ فنا ہو گیا تھا۔ ان کا تعلق نہیں، ایک کانچ کا گلدان تھا جو ایک ٹھوکر میں ہی کرچی کرچی ہو کر بکھر گیا اور وہ ساری کرچیاں اس کے دل میں پیوست ہو گئی تھیں۔

اسے ہر سمت لہو نظر آ رہا تھا۔ ہر سمت، ہر شے پر لہو تھا۔ اس کے ارمانوں کا، خواہشوں کا، آرزوؤں اور وفاؤں کا۔ اس نے درد بھری نظروں سے شاہ ویز کی جانب دیکھا جو سیٹ سے سر ٹکائے آنکھیں بند کیے آسودہ تھا۔

ایک بار، دوبار، کئی بار اس نے شاہ ویز کی جانب دیکھا تھا۔

وہ گویا دل کی تپش بجھا کر بے خبر، بے فکر ہو کر مزے سے آنکھیں بند کر کے طمانیت حاصل کر رہا تھا یا شاید ایکٹنگ کر رہا تھا سونے کی۔ اس کے چہرے پر چھائی آسودگی و سرشاری مشعل کو بھسم کر رہی تھی۔ اس کے لبوں سے نکلنے والے لفظوں نے اسے وحشتوں کے صحرا میں متوحش بھٹکا ڈالا تھا۔ وہ گویا کانٹوں میں الجھ کر رہ گئی تھی۔

کائنات کی ہر شے میں تغیر ہے خواہ وہ جاندار ہوں یا بے جان۔ وقت، موسم، ماحول اور حالات، یہ سب تغیرات کے مراحل سے گزرتے ہیں، گھومتے ہیں۔ اسی طرح جس طرح زمین اپنے مدار کے گرد چکر لگاتی ہے اور کئی تغیرات وجود میں آتے اور جاتے رہتے ہیں۔

صبح، دوپہر، شام، سردی۔ گرمی، خزاں، بہار، بارش...... اسی طرح انسان بھی کائناتی نظام کا ایک خاص اور حساس حصہ ہے اور اپنے اندر یہ تمام تبدیلیاں رکھتا ہے اور وقت و حالات کے مطابق ان کا استعمال کرتا ہے۔ مشعل کے اندر بھی یہ تبدیلیاں ہوئی تھیں۔ کل وہ شاہ ویز کو سخت ناپسند کرتی تھی اور آج اس کے سوا اس کی کوئی پسند ہی نہ تھی۔

کل وہ اس کے ساتھ ایک پل رہنا گوارہ نہ کرتی تھی اور اب اسی کی جدائی اس کے لئے سوہان روح تھی۔

وہ ایسا پرندہ تھی جو اپنے صیاد کی شیدائی ہو گئی تھی اور رہائی پانا نہ چاہتی تھی۔

شاہ ویز بے خبر سو رہا تھا اور وہ سوچ رہی تھی اسے شاہ ویز کی جدائی کا سوگ منانا چاہئے یا پاپا سے ملنے کی خوشی؟

لیکن نامعلوم کیا ہوا تھا، پاپا سے ملنے کے لئے وہ جس طرح تڑپتی، بے چین رہی تھی اب جب کہ ان سے ملنا کچھ دیر بعد تھا تو وہ بے چینی، وہ اضطراب وانتظار نہ رہا تھا۔ احساسات و جذبات پر ٹھنڈی کہر چھا گئی تھی۔ اس کی ساری حسیات، تمام تر دیدو شوق کا محور تو فقط وہ بے حس شخص ہو گیا تھا جو اس کے اندر وحشتیں جگا کر بے نیاز کر گیا تھا۔

''اے کہاں گم ہو؟ کیا پلین سے باہر جانے کا ارادہ نہیں ہے؟'' اندر ہی اندر جلتے بھنتے وہ غنودگی میں ہو گئی تھی۔ جہاز لینڈ کر چکا تھا۔ مسافر اتر رہے تھے۔

شاہ ویز اسے مطلع کر کے خود بھی اٹھ گیا تھا جب کہ وہ بیٹھی ہی تھی۔

''کیا سوچ رہی ہو؟'' اس نے دوبارہ اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''ڈونٹ ٹچ می۔'' اس نے ایک جھٹکے سے اس کا بھاری ہاتھ اپنے شانے سے ہٹا کر سخت لہجے میں کہا تھا۔

''ابھی ہمارے درمیان رشتہ موجود ہے۔'' اس نے حیرانگی سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے جتایا تھا۔

''ہونہہ...... جس رشتے کی دیواریں کھوکھلی ہیں اور چھت کسی لمحے منہدم ہونے کو ہے۔'' اس کے سکون، اطمینان و بے فکری نے اسے سلگا ڈالا تھا۔ وہ اس سے چھٹکارا پا کر جس راحت و مسرت سے سرشار تھا، اسی کیفیت نے ازحد غمگین واداس کرنے کے علاوہ بے کل و متنفر بھی کر دیا تھا جس نے ان لمحوں میں اس کو ترش رو بنا دیا۔

''او کے، ایز یو وش۔'' اس نے بے پرواہی سے شانے اچکاتے ہوئے کہا اور کھڑا ہوا تو اسے بھی اس کی تقلید کرنی پڑی۔

حسن صاحب کے انداز میں بے حد بے قراری و محبت و چاہت کا بے کراں سمندر موجزن تھا۔ متاع حیات حیا کی طرح انہوں نے مشعل کو سینے سے لگایا تھا۔ وہ بھی کسی معصوم بچے کی طرح بھاگ کر ان کے سینے سے لگی تھی۔ اشکوں کا سیلاب جو اس کی آنکھوں سے بہہ نکلا تھا، وہ ان کے سینے سے لگی سسکیاں لے رہی تھی۔ اس کی زبان پر ایک ہی لفظ کی تکرار تھی۔ پاپا، پاپا...... اس کا انداز والہانہ محبت و بے پناہ چاہت کا غماز تھا۔ ایک عرصے کی جدائی کے بعد وہ ان سے ملی تھی۔ حسن بیگ کے لئے بھی یہ جدائی ایک اذیت ناک تکلیف تھی۔ اب ملنے پر اسے سینے سے لگائے دائیں ہاتھ سے سر سہلاتے ہوئے فرط جذبات سے ان کی آواز رندھ گئی تھی۔ آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ شاہ ویز ملاپ کے ان جذباتی لمحات سے ازخود دور چلا گیا تھا۔ حسن صاحب سے وہ مشعل سے پہلے ہی مل چکا تھا۔

''میرے پاس آ گئی ہو، اب جب تک دل چاہے میرے پاس رہنا۔ شاہ ویز سے میں پہلے ہی اجازت لے چکا ہوں اور اس نے بہ خوشی اجازت دے دی ہے کہ تم جب تک مرضی ہو میرے پاس رہ سکتی ہو۔ اسے کوئی اعتراض نہ ہو گا۔''

''مجھ سے چھٹکارا حاصل کرنا ان کی اولین کوشش تھی۔ اب تو وہ جشن آزادی منا رہا ہے مجھ سے نجات پانے کی خوشی میں۔ اسے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔'' بڑے زہر خند انداز میں اس کی سوچ ابھری تھی۔

''او کے بیگ صاحب، مجھے اجازت دیں۔ بے جی شدت سے انتظار کر رہی ہوں گی۔'' وہ پارکنگ میں موجود گویا ہوا تھا۔

''ہم آپ کو گھر ڈراپ کر دیں گے۔'' انہوں نے خوش دلی سے کہا تھا۔ مشعل سے ملنے کے بعد ان کے چہرے پر مسرت کی سرخی زندگی بن کر دوڑنے لگی تھی۔

''تھینکس، آپ کا راستہ الگ ہے اور میرا الگ، خوامخواہ آپ کو زحمت دینا مجھے گوارہ نہیں ہے۔''

''زحمت کیسی...... کار ڈرائیور ڈرائیو کر رہا ہے۔''

''کوئی بات نہیں پاپا...... اگر یہ اپنے راستے پر تنہا جانا چاہتے ہیں تو ان کی مرضی...... جس طرح میں آپ سے ملنے کو بے قرار تھی اسی طرح یہ بھی بے چین ہیں۔ مت اصرار کریں، جانے دیں۔'' مشعل جانتی تھی اس کی ناکبھی ہاں میں نہیں بدلتی خوامخواہ اصرار وانکار میں وقت برباد ہو گا۔

''او کے بیٹے، اللہ حافظ۔'' انہوں نے ہاتھ ملایا تھا اور وہ الوداعی انداز میں ہاتھ ہلاتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ اس نے اخلاقاً بھی مشعل کی طرف نظر نہ ڈالی تھی جب کہ وہ اس کی ایک نگاہ کی منتظر بیٹھی تھی۔

وہ قدم بہ قدم اس سے دور ہوتا جا رہا تھا اور اسے اپنے اردگرد اندھیرے ہی اندھیرے پھیلتے محسوس ہو رہے تھے۔ اس کا ہر دور ہوتا قدم اسے گویا زندگی سے دور کر رہا تھا۔

❑●❑

آسمان پر چھائے گہرے بادل اس کی آنکھوں کی طرح برسنے لگے۔ ماحول پر چھائی وحشت، اداسی و ویرانی اس کے اندر کا منظر پیش کرنے لگی۔ تیز بھیگی ہوا کے تھپیڑے اس کی سسکیوں و آہوں کا ساتھ دے رہے تھے اور سردی کے یخ بستہ موسم میں برستی یہ بارش بھی اس کے دل میں بھڑکتی آگ کو سرد کرنے میں ناکام تھی۔

بڑے میاں اور فرح ازحد محتاط و چوکنا انداز میں قد آور کھیتوں کے درمیان سے گزر رہے تھے۔ سخت سردی سے ان کے جسم شل ہو رہے تھے۔ عرفان کے خوف سے بہت ہراساں و خوفزدہ آگے بڑھ رہے تھے۔

حرا ہر خوف و احساس سے عاری آنسو بہاتی ان کے ساتھ گھسٹ رہی تھی۔ فرح نے مضبوطی سے اس کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا ورنہ اندھیرے اور بارش کے پانی سے بھر جانے والے گڑھوں میں وہ کئی بار گرتے گرتے بچی تھی۔

قدرت کوئی پلان بناتی ہے تو اسے بگاڑنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ پراسرار طریقے سے ہر کام خود بہ خود ہو جاتا ہے۔ ان کی زندگیاں اللہ کو بچانی تھیں سو وہ اتنے خطرات و مشکلات سے نکل کر بڑے میاں کی ہمراہی میں ایئر پورٹ تک پہنچ گئیں اور محفوظ طریقے سے پاکستان آ گئیں جہاں منصور نے انہیں خوش آمدید کہا۔ کراچی آتے ہی اس نے اپنی دوست کے ہسپتال میں حرا کا مکمل چیک اپ کرایا۔ جن حالات و صدمے سے وہ گزر کر آئی تھی وہ ٹینشن ماں اور بچے دونوں کے لئے خطرناک تھی کہ حرا کا بی پی لیول شوٹ کر گیا تھا۔

ایک ہفتے تک اسے انتہائی نگہداشت کے شعبے میں رکھا گیا تھا جہاں بہترین ٹریٹمنٹ کے بعد اس کی حالت کچھ بہتر ہوئی تو اسے پرائیویٹ روم میں شفٹ کر دیا گیا۔

فرح اور منصور اس کی بڑے خلوص کے ساتھ دیکھ بھال کر رہے تھے۔ دو ہفتے بعد اس کی طبیعت بہتر ہوئی تو وہ اسے اپنے گھر لے آیا۔ یہاں لا کر بھی ان کی محبت میں کوئی کمی نہیں آئی۔ وہ ایک ماں کی طرح اس کی دلجوئی کرتی تھیں۔ فرح بے اولاد تھیں اور سسرال میں بھی کوئی عزیز نہ تھا جسے حرا کے یہاں رہائش یا ان کی محبتوں و خدمتوں پر کوئی اعتراض ہوتا۔ منصور بھی ان مردوں میں سے نہ تھے جن کو سسرالیوں سے کوئی بغض یا خار ہوتا ہے بلکہ وہ حسب توفیق حرا کا خیال رکھ رہے تھے۔

''کیا سوچ رہی ہو حرا؟ اب تو خاموشی توڑ دو۔ میرا دل چاہتا ہے تم سے باتیں کرنے کو، تمہاری آواز سننے کو۔ گھر کی اس خاموشی سے میں پاگل ہونے لگی ہوں۔ دو ماہ سے منصور کی مصروفیات بھی اس قدر بڑھ گئی ہیں کہ وہ مجھے ٹائم ہی نہیں دے پا رہے۔'' وہ حرا کے نزدیک بیٹھتے ہوئے افسردہ سی بولیں۔

''دل بھر گیا ہے مجھ سے؟ آپ کہتی تھیں مجھ سے کبھی گھبرائیں گی نہیں؟'' وہ آہستگی سے اٹھتے ہوئے بولی۔

''میرا یہ مطلب نہیں ہے۔''

''خرم مجھے چھوڑ کر چلے گئے تو ہر رشتے پر سے میرا اعتبار ختم ہو گیا ہے۔''

''خرم پر آ کر سب رشتے ختم نہیں ہو جاتے حرا...... خرم سے رشتہ ہمارے بعد جڑا ہے اور تم نے سب رشتوں کو فراموش کر کے صرف ایک رشتے کو یاد رکھا ہے۔ میری محبت اور خلوص کو تم نے ٹھیس پہنچائی ہے اور خرم کی محبت کو بھی تم نے نہیں بخشا۔'' انہوں نے نرم لہجے میں اس کی کھنچائی کی۔

''یہ کیا کہہ رہی ہیں آپی؟'' حرا کا انداز استعجابیہ تھا۔

''اپنی اولاد کے بدترین سلوک نے خرم کو ہلاک کر دیا تھا۔ مرنے کے بعد تمہارا سلوک انہیں بے سکون رکھے ہوئے ہے۔ سمجھ رہی ہو تم؟''

''میرا سلوک...... کیا کہہ رہی ہیں آپی آپ؟''

''خرم کی خواہش تھی تم اور تمہارا بچہ خوش و خرم رہو، ہر پریشانی و دکھ سے بچانے کی خاطر انہوں نے تمہیں یہاں بھیجنے کا پلان ترتیب دے ڈالا تھا۔ پھر مکمل تیاری بھی ان کی بے لوث و شدید محبت کی گواہی ہے۔ وہ ہر رشتے پر تمہاری خوشی اور اپنے بچے کی سلامتی کو فوقیت دیتے ہیں اور ان کی محبت بلکہ دلی وابستگی کا ثبوت ہے کہ تم آج یہاں خیریت سے بیٹھی ہو ورنہ جانتی ہو ہمارے زندہ بچ جانے کا چانس ہی نہ تھا۔ یہ سب اس شخص کی دور اندیشی کا نتیجہ ہے جو ہم یہاں بیٹھے ہیں۔ ورنہ ہماری تو قبروں کا نام و نشان بھی کسی کو نہ ملتا۔'' فرح کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے رسانیت سے سمجھا رہی تھی اور حرا کی آنکھوں سے رم جھم برکھا برسنے لگی تھی۔

خرم کی یادوں کے چراغ اس کے اندر ہمہ وقت روشنی بکھیرتے رہتے تھے۔ وہ اس روشنی سے اپنی اندھیر دنیا کو آخری سانس تک روشن رکھنا چاہتی تھی۔ ایک باوفا بیوی کی پہلی آرزو ہوتی ہے شریک حیات کے لئے اپنا آپ وقف کر ڈالنا، اس کے لئے جینا، اس کے لئے مرجانا۔ عورت کی زندگی میں آنے والا مرد اول و آخر ہوتا ہے جس کے ساتھ اس کے سب تعلقات وابستہ ہو جاتے ہیں، جذبات و احساسات کی تمام ڈوریں اس سے منسلک ہو جاتی ہیں۔ محبت، الفت، ناراضگی، خفگی، ہجر و وصال، سب ایک رشتے سے وابستہ ہو جاتا ہے۔ ایسی ہی محبت اس نے خرم سے کی تھی کہ اس کی جدائی اس کے لئے موت تھی۔ وہ اس کی چاہتوں کا کفن پہن کر اس کی یادوں کی قبر میں ہمیشہ کے لئے سوجانا چاہتی تھی۔ مگر آپی نے کیسی بات کی تھی کہ وہ خرم کی روح کو بے سکون رکھے ہوئے ہے؟

''یہ کیونکر ہو سکتا ہے؟''

''مجھے سکون و مسرت سے آشنا کروانے والا شخص بھلا کیوں میری وجہ سے بے سکون ہونے لگا؟ ہاں شاید میرے آنسو، یہ ان کی یاد میں، ان کی جدائی میں بہتے ہیں۔ لیکن وہ مجھ سے جدا کب ہوئے ہیں؟ ان کے سانسوں کی مہک تو آج بھی میری سانسوں میں بسی ہے۔ ان کا احساس میرے وجود سے لپٹا ہوا ہے۔ وہ جدا کہاں ہوئے ہیں۔ آنکھیں بند کرتی ہوں تو ان کو اپنے قریب پاتی ہوں۔ وہ میرے دل کے مکین ہیں۔ ذرا آنکھیں بند کیں اور دیدار کر لیا۔ ہماری محبت لازوال و بے مثال ہے۔ ٹھیک کہہ رہی ہیں آپی، میں سچ مچ خرم کو تکلیف دے رہی ہوں۔''

□●□

بے جی شاہ ویز سے اسی بے تابی سے ملی تھیں جیسے صدیوں کے بعد وہ آیا ہو۔ کافی دیر تک اسے سینے سے لگائے کھڑی رہی تھیں۔ وہ بھی کسی معصوم بچے کی طرح ان کے سینے سے سر ٹکائے کھڑا تھا۔ سکون در سکون، طمانیت بھری غنودگی اس کی رگ رگ میں دوڑنے لگی تھی۔ مشعل کی یہاں موجودگی میں جو کوفت، ذہنی انتشار اسے مضطرب و مضمحل کئے رکھتے تھے آج ان سے وہ بالکل آزاد تھا۔

''میرے خیال میں کھانا تو آج نہیں کھائیں گے آپ لوگ؟'' سائرہ ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے شوخی سے گویا ہوئی۔

''کیوں؟'' شاہ ویز جو بے جی کے شانے سے سر ٹکائے بیٹھا گفتگو کر رہا تھا، چونک کر گویا ہوا۔

''جب سے آپ آئے ہیں یہ محبت و الفت ختم نہیں ہو رہی۔ میرے خیال میں اسی سے آپ کا پیٹ بھر چکا ہوگا۔ پھر کھانا کھانے کی گنجائش کہاں ہوگی؟''

''بے جی کی محبت سے کبھی میرا پیٹ نہیں بھر سکتا۔ اس معاملے میں، میں ہمیشہ فاقہ زدہ رہتا ہوں۔'' اس کی شوخ وضاحت پر وہ دونوں مسکرا اٹھیں۔

''ہاں، ہاں...... مجھے معلوم تھا، ندیدے تم سدا کے ہو۔ چلو کھانا کھاؤ، کھانا لگ چکا ہے۔ خالہ جان نے مسالہ جات سے زیادہ اپنی محبت ڈال کر کھانا بنایا ہے۔''

''تم نے بھی میرے ساتھ برابر کی محنت کروائی ہے۔''

''بے جی ہیلپر کی کوئی ویلیو نہیں ہوتی، داد کک کو ہی ملتی ہے۔'' خلاف عادت وہ بہت شوخ ہو رہا تھا۔

سائرہ بے چھیڑ چھاڑ، مسکراہٹ سے جگمگاتا چہرہ، روشن روشن آنکھوں میں سکون و اطمینان، چہرے کی شادابی اس کی وجاہت میں اضافہ کر رہی تھی۔ بے جی نے بہت گہری نگاہوں سے اس کا جائزہ لیا تھا۔

ٹیبل پر اس کی تمام پسندیدہ ڈشز موجود تھیں۔ بے جی نے اپنے ہاتھوں سے اس کے لئے پلیٹوں میں چکن بریانی، شامی کباب اور بروسٹ نکالے تھے۔ سائرہ دیگر لوازمات نکال رہی تھی۔ میز پر ہر شے موجود تھی۔ بے جی اس کی برابر والی کرسی پر براجمان تھیں۔ ایک اضافہ سائرہ کی صورت میں تھا۔ مگر پھر بھی اسے کوئی کمی محسوس ہو رہی تھی۔ ہاتھ بار بار رک سا جاتا تھا۔ نگاہیں بے اختیار کسی وجود کی کھوج میں لگ جاتی تھیں۔ اپنی دلی کیفیت و اضطرابی انداز کو سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اسے کس کی تلاش ہے؟ وہ کیا چاہتا ہے؟

''کیا ہوا بیٹا...... ڈھنگ سے کیوں نہیں کھا رہے ہو؟'' بے جی کی نگاہیں اس کے چہرے پر ہی فوکس تھیں۔

''اتنا عرصہ بھابھی صاحبہ کے ساتھ رہ کر آئے ہیں تو ظاہر بات ان کی غیر موجودگی محسوس کر رہے ہیں۔'' سائرہ کی شرارت پر وہ مسکرا بھی نہ سکا تھا۔

□●□

تُو نہیں تو زندگی میں اور کیا رہ جائے گا
دور تک تنہائیوں کا سلسلہ رہ جائے گا
آنکھ تازہ منظروں کی آس میں کھو جائے گی
اور دل پرانے موسموں کو ڈھونڈتا رہ جائے گا

''نا معلوم کس کمبخت کی نظر لگ گئی میری پھولوں سی بچی کو؟ جس کا رنگ روپ پھولوں کو شرماتا تھا وہ اب سرسوں کا پھول بن کر رہ گئی ہے۔'' وہ خاموش بیٹھی اپنی سوچوں میں گم تھی جب رافعہ اس کے قریب بیٹھتی ہوئی دہائی دینے والے انداز میں گویا ہوئی تھیں۔

''آنٹی! چمن ہمیشہ بہاروں سے خوشنما نہیں رہتا۔ خزاں اسے بھی ٹنڈ منڈ کر جاتی ہے۔ پھر انسان صدا ایک جیسا کیسے رہ سکتا ہے؟''

''خزاں چھائے تمہارے دشمنوں پر...... غارت ہوں وہ لوگ جو تمہیں اس حال تک لے آئے ہیں۔ میں تو رات دن ان کے مرنے کی دعائیں مانگتی ہوں جنہوں نے تمہیں ہنسنا مسکرانا سب بھلا دیا۔ زندگی کی خوشیوں سے دور کر دیا۔''

''کیوں خود کو بددعائیں دیتی ہیں آنٹی آپ؟''

''ارے، میں خود کو بددعائیں کیوں دوں گی؟ میں تو ان کو کوستی ہوں جنہوں نے تمہارا یہ حال کیا ہے۔'' ان کے لہجے میں تعجب تھا۔

''آپ ہی تو ذمے دار ہیں میری اس حالت کی۔''

''ہیں...... کیا کہہ رہی ہو...... میں کیوں ہونے لگی؟''

''آپ نے ہی تو چیلنج کیا تھا کہ مجھ جیسی لڑکی سے کوئی شادی نہ کرے گا۔ نہ آپ چیلنج کرتیں نہ یہ سب ہوتا۔'' اس کے لہجے کی کاٹ رافعہ کو بری طرح تلملا گئی تھی۔ اگر انہیں غرض نہ ہوتی تو وہ حشر مچا دیتیں مگر بہ مشکل انہوں نے اپنے غصے پر قابو پایا کیونکہ وہ دیکھ رہی تھیں جب سے وہ آئی ہے بالکل بدل گئی ہے۔ ایک عام سادہ و گھریلو ٹائپ کی لڑکی بن گئی ہے۔ جوجو کے ہزار ہا اصرار کے باوجود اس کے ساتھ کہیں جانے کو تیار نہ تھی۔ نہ اسے کمپنی دینے کو۔ حد تو یہ تھی کہ ان سے بھی گریزاں تھی۔ بہت کم ان کے پاس بیٹھنے کا موقع دیتی یا بیٹھتی بھی تو رویہ اتنا بیگانہ و سرد مہر ہوتا کہ وہ ایک آدھ چاپلوسانہ جملے کے علاوہ کچھ نہ کہہ پاتیں نہ کچھ پوچھ پاتیں۔ اب بھی اس کا رویہ اتنا ہی خشک و سرد تھا۔

''ہاں صحیح کہہ رہی ہو میری جان، یہ سب میرا ہی کیا ہوا ہے۔ نہ میں اس دن غصے میں آتی نہ یہ سب ہوتا۔ بس تو ملال مجھے اور جوجو کو دیمک کی طرح چاٹ رہا ہے۔ غصے میں کتنا بڑا نقصان کر لیا۔'' روانی میں ان کے منہ سے سچ نکل گیا تھا جس کا احساس ہوتے ہی انہوں نے چونک کر مشعل کو دیکھا جو پہلے کی طرح ہی سپاٹ چہرہ لئے بیٹھی تھی تو وہ مطمئن ہو گئیں۔

''ارے تمہیں کھونا تو نقصان سے بڑا نقصان ہے۔ دولت جائیداد کی تمنا تو وہ شاہ ویز جیسے لالچی کرتے ہیں جنہوں نے کبھی یہ دیکھی نہیں ہوتی۔''

''اس کا نام نہ لیں پلیز۔'' دل کی بے قراری سوا ہونے لگی تھی۔

''میں کون سا چاہتی ہوں اس منحوس نام کو...... بلکہ میں چاہتی ہوں یہ نام تمہاری زندگی سے بھی ہمیشہ کے لئے نکل جائے۔''

دل میں شدید ہلچل ہوئی تھی۔ اس نے زخمی نگاہوں سے ان کی جانب دیکھا تھا جو اس کی حالت سے بے خبر اپنی کہنے میں مگن تھیں۔

جوجو تم سے اب بھی شادی کرنے کو تیار ہے، وہ تم سے روز اول کی طرح محبت کرتا ہے۔ تم شاہ ویز کے ساتھ رہی ہو نو دس ماہ، تمہارے ان تعلقات کو بھی وہ نظر انداز کر رہا ہے اور یہ اس کی محبت کی انتہا ہے جو وہ برداشت کرنے کو تیار ہے۔ ورنہ کوئی اتنا اعلیٰ ظرف و روشن خیال نہیں ہوتا کہ کسی کا جھوٹا کھائے یا برتن استعمال کرے۔ یہ تو جوجو کی محبت کی مثال......''

''دماغ درست ہے آپ کا؟ کیا بکواس کر رہی ہیں؟'' وہ ایک دم کھڑے ہوتے ہوئے چیخی۔ غصے سے اس کا چہرہ سرخ تھا۔

''مم...... میں نے ایسا کیا کہہ دیا؟'' وہ بھی گھبرا کر بوکھلا کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''اتنی بے ہودہ بکواس کرنے کے باوجود آپ کو احساس نہیں ہے کہ آپ نے کیا کہا ہے؟ میں ان عورتوں میں سے نہیں ہوں جو وقت کے ساتھ ساتھ شوہر بھی بدلتی ہیں، جس طرح میری ماں کا ایک شوہر تھا، جس طرح میرے باپ کی ایک بیوی تھی اسی طرح میرا بھی ایک ہی شوہر رہے گا۔ خواہ وہ مجھے چاہے یا نہ چاہے۔ مجھے آزاد کرے یا برباد، مجھے رکھے یا چھوڑے، خواہ غریب رکھے یا فقیر، مجھے صرف وہی عزیز رہے گا، میری زندگی میں آنے والا پہلا مرد بھی وہی ہے اور آخری بھی۔ آپ کو کسی خوش فہمی میں رہنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' ایک عرصے بعد اس کا جلالی روپ لوٹا تھا۔ رافعہ کے خوش فہمی کے تمام گھڑے زمین بوس ہو گئے تھے۔

□●□

ان کے سمجھانے کا اثر حرا پر خاصی حد تک ہوا تھا۔ پہلے وہ ایک طرف بیٹھی روتی یا خلاؤں میں گھورتی رہتی تھی مگر اب اپنے کمرے سے نکل کر زندگی کی سرگرمیوں میں حصہ

لینے لگی تھی اور اس جمود سے نکل کر اس کے چہرے پر زندگی کی تازگی آگئی تھی جس نے اس کی سنجیدگی کو پُروقار کر دیا۔ فرح اس کی طرف سے مطمئن ہوئیں تو منصور کی طرف سے پریشانی لاحق ہو گئی جو یکدم ہی کاروبار کی تباہی کا شکار ہو گئے تھے۔ ان کے دن رات اسی فکر میں گزر رہے تھے، قرض داروں اور پارٹنرز کو رقم کی ادائیگی کس طرح اور کہاں سے ہو گی۔ معاملہ بھی کروڑوں کا تھا۔ کوئی بینک قرضہ دینے کو تیار نہ تھا۔ ان ہی سوچوں میں ایک رات منصور فرح سے مخاطب ہوئے۔

''ان مشکلات سے نکلنے کا ایک حل ہے میری نظر میں، اگر تم مانو تو ہم سب کا فائدہ ہے۔'' وہ مصالحانہ لہجے میں گویا ہوئے۔

''ایسے حالات میں کسی تمہید کی ضرورت نہیں ہے۔''

''حرا تمہاری بہن ہونے کے ناتے میری بھی بہن ہے اور مجھے بہنوں کی طرح ہی عزیز ہے۔ یہ جانتی ہو نا تم؟'' وہ بغور برابر میں نیم دراز بیوی کا جائزہ لیتے ہوئے سنبھل کر کہہ رہے تھے۔

''میں نے سوچا ہے خرم صاحب نے حرا کا اکاؤنٹ بہت بھاری بھر کم کر دیا ہے، اتنی رقم ہے کہ اس کے بچے کو بڑھاپے تک چلے گی۔ میرا خیال ہے ہم وہ رقم استعمال میں لے لیتے ہیں، بعد میں کاروبار بہتر ہو جانے پر دگنی واپس کریں گے۔ پھر حرا کا اور اس کے بچے کا ہمارے سوا ہے بھی کون۔''

''ہاں تو یوں کہیں نا دولت دیکھ کر آپ کی نیت خراب ہو گئی ہے اور آپ نے ہتھیانے کے لئے پوری اسکیم بنا ڈالی۔'' وہ ایک جھٹکے سے دور ہٹی تھیں۔

''میری نیت پر شک مت کرو، اس میں ہم سب کی بھلائی ہے۔'' ان کے لہجے میں مفاد پرستوں والی نرمی اور آنکھوں میں عیارانہ چمک تھی۔

''میں جانتی ہوں اس بھلائی کو، تمہاری اسی جوئے کی لت نے ہر شے داؤ پر لگا دی ہے۔ آخر میں میرے زیور بچے تھے وہ بھی تم نے نہیں چھوڑے۔ اب حرا کی دولت پر آنکھیں لگائے بیٹھے ہو۔ تم ایک بدنیت اور بدفطرت آدمی ہو اور میں تمہیں حرا اور اس کے بچے کے حق پر ڈاکہ ڈالنے نہیں دوں گی۔'' وہ بری طرح بپھر اٹھی تھیں۔

''کول ڈاؤن مائی ڈیئر، کول ڈاؤن آرام سے سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا۔'' انہوں نے بڑے لاڈ سے چمکارا تھا۔

''جو میرا فیصلہ آج ہے وہ کل بھی ہو گا، کبھی نہیں بدلے گا۔'' ان کا لہجہ اٹل تھا۔

''میں سوچ رہا تھا تم دانش مندی سے کام لو گی تو کام بن جائے گا۔'' منصور کی کوشش انہیں موم کرنے کی جاری تھی۔

''یہ عقل مندی کا ہی فیصلہ ہے..... میرا مقدر تو تم تاریک کر ہی چکے ہو مگر اب بیاری اپنی مظلوم بہن کے مقدر پر نہیں پھیرنے دوں گی۔'' ان کا لہجہ پختہ اور ارادہ اٹل تھا۔

''ٹھیک ہے..... بعد میں مجھ سے شکایت مت کرنا۔'' ان کے لہجے میں غراہٹ تھی۔ ایک خوفناک فیصلہ جو وہ پہلے ہی کر چکے تھے، اب اس پر عمل درآمد کا وقت آ پہنچا تھا.....!

□●□

''مما! مشی اتنی بدل کیوں گئی ہے، پاگل بالکل اولڈ وومن بن گئی ہے، جس کو نہ ہنسا آتا ہے نہ مسکرانا، بلکہ ہر وقت ناگن کی طرح ڈسنے کو تیار رہتی ہے۔''

''اس ناگن کے پھن کو تو میں خود کچل ڈالوں گی، بس مجھے موقع مل جائے، دیکھنا کیسے کیسے تڑپا کر ماروں گی۔'' رافعہ کسی زہریلی ناگن کی طرح ہی پھنکاری تھیں۔

''اب موقع نہیں ملنے والا مما! بہت اونچا اُڑ رہی ہے، پروں پر ہاتھ کہاں رکھنے دے گی۔ نامعلوم کیسا سحر پھونکا ہے اس کنگلے نے کہ کسی کو خاطر میں ہی نہیں لاتی۔''

''ارے احمق، اس سحر کا توڑ تو بہت آسان ہے۔'' وہ مسکرائی تھیں۔

''کیا آپ نے کوئی پلاننگ کی ہے؟'' ماں کی ہنسی سے وہ سمجھ گیا انہوں نے کوئی چالاکی دکھا ڈالی ہے، بڑے مسرور انداز میں ماں کے نزدیک بیٹھا تھا۔

''گھر کے تمام فون کے کنکشنز پر اب ہمارا قبضہ ہے، جس کا بھی فون آئے گا پہلے ہمارے کمروں میں رکھے فونز وہ کال ریسیو کریں گے اور اس طرح ہم بھائی کے بزنس کے متعلق بھی تمام باتیں معلوم کر لیں گے اور سب سے اہم بات یہ کہ شاہ ویز اور مشعل کے درمیان کوئی رابطہ نہ ہونے پائے، ورنہ تمام کھیل بگڑ جائے گا۔''

''یہ کس طرح ممکن ہے..... وہ ہر فون بیل پر پاگلوں کی طرح بھاگتی ہے جیسے وہ فون اسی کے لئے ہو۔'' جو جو منہ بنا کر گویا ہوا تھا۔

''تب ہی تو میں نے موقع لگایا ہے کہ ایک دفعہ شاہ ویز کا فون آیا تھا، میں نے اس کا نام سنتے ہی کہہ دیا کہ مشعل گھر پر نہیں، جوجو کے ساتھ کلب گئی ہو گی۔ اس نے جل کر کہا اسے مشعل سے نہیں بھائی جان سے کام تھا اور جھٹ فون رکھ دیا۔

''مجھے محسوس ہوتا ہے ان دونوں کے درمیان کوئی جھگڑا چل رہا ہے، ایک ہفتہ ہو گیا اسے گھر آئے ہوئے۔ نہ یہ اُدھر گئی اور نہ وہ اِدھر آیا۔ کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔''

''لگ تو مجھے بھی ایسا ہی رہا ہے، مگر وہ بتاتی نہیں ہے۔ خیر کب تک چھپا سکتی ہے۔''

اسی دم ملازمہ نے کھانا لگنے کی اطلاع دی تو وہ ڈائننگ روم میں چلے آئے جہاں حسن صاحب کرسی پر بیٹھے تھے۔ دوسری کرسی پر مشعل بیٹھی تھی۔ بلیک اور پرپل سوٹ میں ملبوس ہم رنگ دوپٹہ قرینے سے اوڑھے، بہت اچھی لگ رہی تھی۔

''آؤ، آؤ رافعہ! آج تو کمال ہو گیا۔ مشعل نے کوکنگ کی ہے، یہ تمام ڈشیں خود بنائی ہیں۔'' وہ میز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خوشی سے گویا ہوئے۔

''ہائے، مشی نے کوکنگ کی..... کیا ہمارے ملازم مر گئے؟''

''ملازم کو کیوں کوستی ہیں آنٹی! یہ سب تو میں نے اپنی خوشی سے کیا ہے۔'' مشعل حسن صاحب کی پلیٹ میں چائنیز رائس ڈالتے ہوئے خوش دلی سے بولی تھی۔

''بھائی جان کی بے حساب دولت کی تنہا وارث ہو بیٹی تم۔ پھر کیوں تھرڈ کلاس عورتوں کی طرح جان ماری کر رہی ہو۔ کیا ضرورت ہے یہ مغز ماری کی؟''

''پہلے تو تم نے کبھی کچن میں جھانک کر بھی نہ دیکھا تھا۔'' جوجو نے کہا۔

''یہی تو افسوس ہے مجھے کہ پہلے کتنی احمق و بے خبر تھی، کبھی ان چیزوں کے بارے میں سوچا نہیں۔ پاپا کی صحت کی فکر نہ اپنی پرواہ۔ کک لذیذ کھانا بناتا ہے مگر پھر بھی ان ذائقوں میں پیار، محبت اور اس احساس کی لذت نہیں ہوتی جو ہم اپنوں سے کرتے ہیں۔ اور تھرڈ کلاس عورت وہ نہیں ہوتی جو اپنی محنت سے گھر چلاتی ہے، سنوارتی ہے بلکہ تھرڈ کلاس وہ ہے جو گھر کی مالک تو بن جاتی ہے مگر گھر داری سے نابلد رہتی ہے۔''

''مائی گاڈ! مشی تم کتنی عجیب عجیب باتیں کرنے لگی ہو۔ ہاؤ ویری امیزنگ۔'' جوجو شانے اچکا کر حیرانگی سے گویا ہوا۔

''رافعہ! تمہارے آسیب کا کیا حال چال ہے، یہاں تو تمہیں تنگ نہیں کر رہا؟'' ماحول میں یکدم پیدا ہونے والے تناؤ کو ختم کرنے کے لئے حسن بیگ کو بات بدلنی پڑی۔

''بھائی جان، تنگ تو کر رہا ہے مگر کوئی نقصان نہیں ہو رہا۔''

''آسیب؟ کیا مطلب پاپا؟'' مشعل نے چونک کر کہا۔

''ایک دلچسپ بات ہے، رافعہ جس جگہ رہ رہی تھیں وہاں کوئی ان دیکھا یعنی پراسرار وجود رافعہ کے زیورات، قیمتی پرفیومز وغیرہ چوری کرتا رہا۔ رافعہ نے مجھ سے ذکر کیا تو میں نے اسے یہاں آ کر رہنے کا مشورہ دیا۔''

''یہاں آ کر لگتا ہے بھائی جان اس آسیب کی طاقت کمزور پڑ گئی ہے کیونکہ کمرے میں چیزیں ایسی ملتی ہیں جیسے کوئی ان کی تلاشی لیتا رہا ہو۔''

''او گاڈ! اس دور میں بھی آپ ایسی باتوں پر یقین رکھتی ہیں؟'' وہ کھلکھلا کر ہنسی تھی۔ ''یقیناً یہ تمام شرارتیں جوجو کی ہوں گی کیونکہ پاکٹ منی دینے میں آپ شروع سے ہی سست ہیں، سو اس نے یہ سلوشن نکالا ہو گا۔''

''پاگل ہو گئی ہو کیا..... میں کیوں چوری کرنے لگا؟'' کسٹرڈ کی پیالی اس کے ہاتھ سے گر پڑی۔ پیشانی عرق آلود ہو گئی۔ وہ گھبرا کر بولا۔

مشعل اور حسن بیگ کے لبوں پر معنی خیز تبسم تھا جب کہ رافعہ بھی بیٹے کی اُڑی اُڑی رنگت و بوکھلاہٹ سے چونک اٹھی تھیں۔

''اپنے گھر سے سامان لینا کوئی چوری تھوڑی ہوتا ہے؟ بس تم نے یہ بدتمیزی کی کہ آنٹی کو نہیں بتایا بلکہ ان کی غلط فہمی سے فائدہ اٹھایا۔'' مشعل کے لہجے میں بلا کی خود اعتمادی و یقین تھا جو، جوجو کو زیادہ دیر تک اپنی چوریوں کے اعتراف سے روک نہ سکا۔

''سوچ سمجھ کر بولا کرو مشعل! بھلا جوجو کو کس چیز کی کمی ہے جو یہ چوری کرے؟'' رافعہ بیٹے کی حالت سے سمجھ گئی تھیں مگر رسوائی کس طرح گوارہ کرتیں سو غصے سے گویا ہوئیں۔

''بات کو غلط رنگ مت دو، بچے ایسی حرکتیں کرتے ہیں تو قصوروار مائیں بھی ہوتی ہیں، جو بچوں کو ان کی خواہشوں و ضرورتوں سے محروم کر کے ایسے سنگین جرم کرنے پر مجبور کرتی ہیں جو آگے بڑھ کر ان کے لئے ہی نہیں معاشرے کے لئے بھی بے سکونی و بدامنی کا سبب بنتے ہیں، جو آپ کی بیماریاں میں اسی دن سمجھ گیا تھا جس دن رافعہ نے مجھے بتایا تھا۔ بہرکیف اپنی ماں سے معافی مانگو اور آئندہ کبھی ایسا خواب میں بھی نہ سوچنا ورنہ بہت برا ہو گا۔'' ان کے انداز میں پیار و سرزنش دونوں شامل تھیں۔

جوجو ان کی کم گوئی و سنجیدگی کے باعث ازحد مرعوب رہتا تھا۔ اب حقیقت کھل جانے پر بالکل بُت بن گیا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ باپ بیٹی اس کی چالاکیوں کو اتنی جلدی سمجھ جائیں گے۔ حالانکہ رافعہ کو وہ کامیابی سے اُلو بناتا آ رہا تھا۔ شروع شروع میں رافعہ سے جیب خرچ نہ ملنے پر چھوٹی موٹی چیزیں چوری کرتے ہوئے خوفزدہ رہتا تھا کہ مما کو معلوم ہو گا تو خیر نہیں ہو گی مگر رافعہ کی بے پروائی نے اس کے حوصلوں کو جلا بخشی اور اس نے بہت چالبازی سے تمام لاکرز اور رومز کی ڈپلی کیٹ چابیاں بنوا لیں۔ جب لمبی رقمیں اور بھاری سامان چوری ہونے لگا تو اس نے خود کو محفوظ رکھنے کے لئے آسیب کا ڈرامہ کھیلا اور خود رافعہ کو اپنی مہنگی چیزیں چوری ہونے کی جھوٹی اطلاعات دیتا رہا تاکہ اس پر شک نہ کیا جا سکے۔ لیکن فریب اور جھوٹ کا پول کھل کر رہتا ہے جو آج کھل چکا تھا۔ اس نے اعتراف کر لیا تھا اور رافعہ کو دکھ اس کی اس حرکت پر نہیں تھا کہ اس نے ان کے پیار و اعتماد کو بری طرح کچل ڈالا بلکہ تلملاہٹ اس بات کی تھی کہ یہ سب ان دونوں کے سامنے کیوں ہوا، بعد میں وہ خود سنبھال لیتیں۔

□●□

زرینہ بہت عرصے بعد ہنستی مسکراتی آئی تھیں۔ بے جی بہن کو دیکھ کر نہال ہوئی تھیں۔ سائرہ کو بھی ماں کو خوش دیکھ کر سچی خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ اصغر نے اپنے اور فریحہ کے علاوہ زرینہ اور بے جی کی بھی حج درخواستیں جمع کروائی تھیں جن کی منظوری آ گئی تھی۔ ایسی سعادت مندو پُرایمان خوشخبری نے ان سب کو ہی مسرور کر ڈالا تھا۔ وہ سب بے جی کے گرد جمع تھے۔

''اللہ جب سنتا ہے تو کوئی خلش باقی نہیں رہتی۔ اصغر نے جب حج کی بات کی تھی تو میرا دل رو اٹھا تھا کہ سائرہ کا مسئلہ کس طرح حل ہوگا؟ اسے کہاں چھوڑ کر جاؤں گی؟ باقر یا اس کے گھر والوں نے پلٹ کر خبر نہ لی۔ لیکن اللہ واقعی سب کی سننے والا ہے بس صرف اس کو دل سے پکارنے کی ضرورت ہے۔ ہر پکار پر وہ لبیک کہنے والا رب ہے۔''

''کتنی دفعہ کہا ہے سیدھی سیدھی بات کیا کرو۔ کیا باقر میاں نے کچھ کہا ہے؟'' بے جی نے انہیں جھڑکا تھا۔ سائرہ باقر کے ذکر پر ہمہ تن گوش تھی۔ جب کہ قریب بیٹھی فریحہ معنی خیز انداز میں مسکرا رہی تھی۔

''سیدھی بات یہ ہے کہ جب سے سائرہ آئی ہے تب سے باقر میاں کے فون آ رہے ہیں۔ وہ اپنے طرزِ عمل پر بہت شرمندہ ہے، معافیاں مانگ رہا تھا، کہہ رہا تھا آئندہ فاقوں مر جائے گا مگر کبھی بیوی کو ہاتھ پھیلانے کے لئے میکے نہیں بھیجے گا۔ اس کی غیرت زندہ ہو گئی ہے۔''

''شکر ہے، دیر آید درست آید۔ صبح کے بھولے کو گھر یاد تو آیا اور یہ سب سائرہ بچی کے چٹانی صبر و استقلال کا پھل ہے۔'' بے جی نے بڑی شفقت سے سائرہ کو سینے سے لگایا تھا۔

''باقر نے کوئی شادی وادی نہیں کی ہے۔ اتنا عرصہ انہوں نے اس لئے لگایا کہ کاروبار سیٹ کرنے میں لگے ہوئے تھے، میری بات ہوئی تھی ان سے، وہ ہر سزا بھگتنے کو تیار ہیں تمہاری محبت کی خاطر۔'' فریحہ نے اس کی کیفیت جانتے ہوئے وضاحت کی تو وہ دھیرے سے مسکرا دی تھی۔

وہ شوہر پرست عورت تھی۔ اس میں اتنا حوصلہ وضبط تھا کہ ہزار بے وفائی اور بے مروتی کے تیروں سے گھائل ہونے کے باوجود اپنی وفا پر حرف نہ آنے دے۔ صلح و امن، ہمدردی و خدمت گزاری اس کی فطرت تھی۔

''السلام علیکم خالہ جان! کیسی ہیں آپ؟'' شاہ ویز آفس سے آیا تھا۔

''وعلیکم السلام بیٹا، تم تو عید کا چاند ہو گئے جو مدتوں بعد نظر آتا ہے۔ پہلے ہفتے، مہینے میں چہرہ دکھا دیا کرتے تھے اب تو مہینوں گزر جاتے ہیں۔ اور دلہن کہاں ہے تمہاری؟ جب سے آئی ہوں نظر نہیں آ رہی۔''

''بہو میکے گئی ہوئی ہیں کچھ دنوں کے لئے۔ شاہ ویز! کپڑے بدل لو پھر کھانا لگواتی ہوں۔ اصغر اندر بیٹھا خبریں دیکھ رہا ہے، بھوک کے باوجود تمہارے انتظار میں بیٹھا ہے۔'' بے جی فوراً ہی اٹھ کھڑی ہوئی تھیں، جانتی تھیں زرینہ حسب عادت پے در پے سوالات کرے گی اور بات کچھ سے کچھ بن جائے گی سو بہانے سے مخاطب ہوئی تھیں۔

شاہ ویز بے جی کی دانش مندی کو سراہتا کمرے کی جانب بڑھ گیا تھا۔

□●□

ایک غیر معروف ہوٹل میں وہ آمنے سامنے ایک دوسرے کو جانچتی نگاہوں سے پرکھ رہے تھے۔ ایک کا انداز از حد محتاط و چوکنا تھا، دوسرے کے انداز سے مسرت و اعتماد ظاہر ہو رہا تھا۔ اچھی طرح اطمینان حاصل کرنے کے بعد پہلے شخص نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے مصافحے کے لئے لب کشائی کی۔

''میں منصور حمید آپ کو پاکستان میں خوش آمدید کہتا ہوں مسٹر عرفان خرم۔''

''مسٹر منصور! مجھے بھی آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔'' بہت والہانہ انداز میں اس نے ہاتھ ملایا تھا۔

''آپ بالکل ٹھیک ٹائم پر پہنچ گئے ہیں عرفان، ورنہ مجھے تو خدشہ تھا کہ حرا کی ڈلیوری کے بعد آپ یہاں آئے تو بے حد مسئلہ ہو جائے گا۔'' وہ ایک کمرے میں بیٹھے گفتگو کر رہے تھے۔

اس نے فرح کو سمجھانے کی بہت کوشش کی مگر فرح ان کی لالچی فطرت کو بہ خوبی جانتی تھی۔ اس نے کسی طرح ہامی نہیں بھری حرا کی رقم استعمال کرنے کی تو انہوں نے حرا کے کاغذات سے دہلی کا ایڈریس نکال کر عرفان سے رابطہ کر لیا۔ پھر ایک بے ایمان ہی دوسرے بے ایمان پر بھروسہ کر سکتا ہے۔ دولت کی ہوس میں اندھے ہو کر عرفان نے سگے باپ کی پرواہ نہ کی تھی تو پھر منصور کا کوئی خونی رشتہ حرا سے نہ تھا جو وہ ایسی حرکت کرتا۔ ان دونوں کے درمیان رابطے بڑھے، عرفان، نئے میاں کو تاراج کر کے پہلے ہی سب کچھ معلوم کر چکا تھا اور پاکستان آنے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ اسے یقین تھا بہت جلد وہ حرا کو ڈھونڈ لے گا اور اس کی یہ پریشانی منصور کی بے ضمیری و کم ظرفی نے پوری کر دی تھی۔

''یہ کس طرح ممکن تھا کہ ہمارے حقوق پر کوئی قبضہ جمانے کے لئے وارد ہونے والا ہے اور ہم بیٹھے چین کی بانسری بجاتے رہیں۔ ٹائم پر پہنچ گیا نا فرینڈ؟'' کافی کے سپ لیتا ہوا عرفان چہکا۔

''آپ نے تمام مراحل کلیئر کر لئے ہیں، کوئی پرابلم تو نہیں ہوگی؟''

''آپ بے فکر رہیں..... لیبر روم کے تمام اسٹاف کو خرید لیا ہے اور ایک مُردہ بچے کا انتظام بھی وقت پر ہو جائے گا۔ وقت پر میرا کام وہاں سے فرح کو ہٹانا ہے اور اس عرصے میں آپ کو اپنا کام کر کے لمحوں میں وہاں سے اوجھل ہونا ہے۔ اگر فرح کی نظر آپ پر پڑ گئی تو نہ صرف یہ کام بگڑ جائے گا بلکہ میرا گھر، میری لائف بھی تباہ ہو جائے گی۔'' لمحے بھر کو منصور پریشان سا ہو اٹھا۔

''ڈونٹ وری مائی فرینڈ۔ مجھ سے کوئی کوتاہی نہ ہوگی۔''

''اوکے، میں چلتا ہوں۔ فرح، حرا کے پاس ہسپتال میں ہے۔ میں بھی وہیں جا رہا ہوں۔'' منصور اس سے ہاتھ ملا کر باہر نکل گیا۔

گزشتہ چار روز سے وہ ہسپتال میں تھی۔ فرح اسے وقت پر یہاں لے آئی تھی۔ اس کی دگرگوں حالت دیکھ کر فوراً لیبر روم میں لے جایا گیا تھا اور وہ جو سوچ رہی تھی جلد ہی وہ کوئی خوشخبری سنیں گی اسی انتظار میں آج چوتھا روز تھا۔ حرا تکلیف میں تھی اور وہ بے چین ہو رہی تھیں۔

''فرح کیوں جان کر اپنی بہن کو تکلیف میں مبتلا کر رہی ہو۔ ڈاکٹر نے سرجری کا کہا ہے تو سائن کر دو۔ کیوں وقت برباد کر رہی ہو؟ کوئی تو پرابلم ہوگی جو لیڈی ڈاکٹر نے آپریشن کا کہا ہے۔'' منصور ہسپتال کے کیفے میں فرح سے مخاطب تھے۔

''میرا دل نہیں مان رہا۔ آصفہ نے پچھلے ہفتے چیک اپ کے بعد رپورٹ دی تھی کہ سب ٹھیک ہے، کیس نارمل ہوگا۔ پھر چار پانچ دن میں کس طرح پیچیدہ ہو گیا؟ مجھے یہ صحیح نہیں لگ رہا، نہ معلوم کیوں مجھے عجیب عجیب وسوسے آ رہے ہیں۔'' فرح روہانسی ہو گئیں۔

''ایجوکیٹڈ ہو کر جاہلوں جیسی باتیں مت کرو۔ کہیں ایسا نہ ہو تمہاری یہ فضول وہمی طبیعت ماں یا بچے کو کوئی نقصان پہنچا دے۔''

منصور کے سمجھانے پر اور حرا کی تکلیف دیکھتے ہوئے وہ راضی ہو گئیں۔ اسی وقت ڈاکٹرز نے آپریشن کی تیاریاں شروع کر دیں۔ فرح ایک طرف دل تھام کر بیٹھی دعا کر رہی تھیں۔ میڈیکل کی تمام ذمے داریاں منصور نے سنبھالی تھیں۔ اس وقت وہ دہرا کردار ادا کر رہے تھے۔ ایک طرف ذمے داری و فرض شناسی کا دکھاوا کر کے فرح کو متاثر کر رہے تھے دوسری طرف فون کر کے عرفان کو بلا لیا تھا جو وہیں ایک تاریک گوشے میں روپوش تھا۔ ڈاکٹر سمیت تمام اسٹاف اس سے ملا ہوا تھا۔ پھر نرس نے دوا منگوانے کے بہانے سلپ پر لکھ کر دیا کہ وہ فرح کو یہاں سے لے جائیں اور عرفان کو بھیج دیں۔ وہ فرح کو بہانے سے وہاں لے گئے کہ چند منٹ تازہ ہوا میں کھڑی ہو جائیں تاکہ ٹینشن دور ہو اور اسی اثناء میں ان کے پیچھے بہت بھیانک کھیل کھیلا گیا تھا۔ نرس نے چادر میں لپٹا بچہ عرفان کے حوالے کیا تھا جسے لے کر وہ فوراً ہی پارکنگ کی طرف بڑھ گیا۔

''اوہ منصور..... وہ..... وہ عرفان......'' اندر داخل ہوتے وقت فرح کی اچٹتی نگاہ نے ایک سرسری جھلک عرفان کی دیکھی تو وہ گھبرا کر گویا ہوئیں۔

''عرفان؟ دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا..... اسے کس طرح یہاں کا ایڈریس مل سکتا ہے؟ میں اس لئے تمہیں یہاں لایا تھا کہ کچھ تازہ دم ہو جاؤ گی مگر تمہارے وہم تمہارا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ چلو او۔ ٹی میں چلتے ہیں۔'' اندر ہی اندر وہ بری طرح لرز اٹھے تھے مگر سمجھداری سے ان کا ہاتھ پکڑ کر آپریشن تھیٹر سے وہاں لے آئے۔ ابھی وہ وہم و حقیقت کی کشمکش میں مبتلا تھیں کہ نرس نے اطلاع دی کہ حرا کے ہاں مُردہ بیٹا پیدا ہوا ہے.....!

□●□

وہ فون کی ہر بیل پہ بے قرار ہو کر لپکتی تھی۔

سماعت ہر آہٹ پہ بڑھ جاتی تھی۔

آنکھیں اس کی دید کی تمنائی تھیں اور دل اس سے ملنے کا خواہش مند۔ اسے یہاں آئے چار ہفتوں سے زائد عرصہ ہو چکا تھا اور وہ پل پل اس کے لئے بے چین رہتی تھی، بے قرار تھی، اس کے بغیر زندگی، زندگی نہ رہی تھی۔ وہ اس کی ضرورت نہ تھی، خواہش نہ تھی، اس کا حاصل نہ تھی۔ وہ زبردستی اس کی زندگی میں داخل ہوئی تھی۔ وہ شرافت سے اسے برداشت کر رہا تھا۔ غضب کا حوصلہ وضبط تھا اس کی ذات میں۔ یہ سب جانتے ہوئے بھی وہ بے کل تھی۔

اپنی پچھلی زندگی پر ندامت ہوتی تھی، اپنی نادانی پر رنج ہوتا تھا۔ کتنی بے وقوف تھی وہ۔ بھلا یوں بھی کسی مرد کو تسخیر کیا جاتا ہے؟ دولت کے زعم میں، حسن کے غرور میں، خود کو برباد کیا ہی کیا، شاہ ویز کی زندگی بھی برباد کر ڈالی تھی۔ کتنی کٹھن منزلوں سے گزر کر محسوس ہوا ہے کہ عشق کیا بلا ہے۔

محبت کیسی آگ ہے جو جلاتی ہے لمحہ لمحہ مگر مرنے نہیں دیتی۔

وفا کی منزل کہاں ہے؟

فنا کا طریقہ کیا ہے؟

میں فضول جذبوں کو محبت سمجھتی رہی۔ عشق سے مجھے نفرت تھی لیکن اب معلوم ہوا عشق اور محبت کے درمیان جسم کوئی پڑاؤ نہیں، کوئی منزل نہیں۔ عشق جسمانی قرب سے ماورا ہے۔ چاہت گھل جانے، مٹ جانے، فنا ہو جانے کا نام ہے۔

شاہ ویز کا دل جیتنا میرے لئے ناممکن ہے..... نہ معلوم وہ کون خوش نصیب ہوگی جو اس تک رسائی حاصل کرے گی، اس کی چاہتوں کا مرکز بنے گی۔ میرے مقدر میں یہ خوشی ہرگز نہیں ہے۔'' وہ قنوطی ہو رہی تھی۔ اسی پل حسن بیگ کو دیکھ کر وہ جبراً مسکرائی تھی۔

''گھر سے باہر نکلنا بالکل چھوڑ دیا ہے بیٹا؟'' وہ شفقت سے گویا ہوئے۔

''جب باہر نکلتی تھی تو گھر میں رہنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ اب باہر نکلنا اچھا نہیں لگتا۔ آپ کی بیٹی پاگل ہے پاپا، اس کا کوئی کام نارمل نہیں ہوتا۔''

''نہیں نہیں...... میری بیٹی جیسی شاید ہی کوئی ہو۔ آپ تو میرا فخر ہو۔'' انہوں نے اس کا سر اپنے شانے سے لگاتے ہوئے کہا۔

''آفس چلوں پاپا؟'' اس سنگدل کو دیکھنے کی امید بر آئی تھی۔

''ہاں چلو۔ آج شاہ ویز سائٹ پر جائیں گے۔ کام کی تمام ذمہ داری مجھ پر ہی ہوگی۔ اچھا ہے مجھے آپ کی موجودگی میں ریلیکس مل جائے گا۔'' پاپا نے مسرت کا اظہار کیا تھا مگر اس کی مسرت کی کلی بن کھلے ہی مرجھا گئی تھی۔ اسے اپنی بے قراری پر غصہ آنے لگا تھا۔

□●□

''یہ تماشا کب ختم ہوگا بیٹے! اتنا عرصہ ساتھ رہنے کے باوجود تم اس بچی کو وہ جگہ، وہ مقام دینے سے کترا رہے ہو جو اس کا حق ہے۔ آخر کب تک تم دونوں کے درمیان یہ رسہ کشی رہے گی؟'' بے جی جو حج پر جانے کی تیاریوں میں مصروف ہونے کے ساتھ ساتھ شاہ ویز کی حرکات و سکنات کا بغور جائزہ بھی لے رہی تھیں۔ مشعل کی جانب سے اس کی خاموشی اور لاتعلقی انہیں بری طرح کھلنے لگی تھی۔ بالآخر انہیں بولنا ہی پڑا تھا۔

''بے جی! میں آپ کو کس طرح سمجھاؤں؟ آپ کو میری آزادی پسند نہیں آرہی ہے۔'' وہ مسکراتا ہوا ان کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

''مجھے سمجھانے سے بہتر ہے اپنے دل کو سمجھاؤ۔''

''دل کو...... دل کو کیا ہوا ہے؟''

''جو سمجھ کر بھی نہ سمجھ سکے اسے کوئی نہیں سمجھا سکتا۔''

''میرے پیچھے سے آپ خاصی پہیلیاں وغیرہ کہنے میں ماہر ہو گئی ہیں۔''

''مذاق میں اڑانے کی کوشش مت کرو میری بات۔ سیدھے جاؤ، جا کر بہو کو لے آؤ۔ اس میں میری خوشی ہے، اس گھر کی خوشی ہے اور تمہاری بھی۔'' اسے سنجیدہ دیکھ کر انہیں سنجیدہ ہونا پڑا۔

''شادی کے بعد لڑکی کے لئے باپ کا گھر پرایا ہو جاتا ہے، اس کا سسرال ہی اپنا ہوتا ہے، وہیں بسنے میں اس کی شان و توقیر ہوتی ہے۔ جس طرح اینٹ دیوار سے علیحدہ ہو تو اینٹ کہلاتی ہے۔ دیوار بن جاتی ہے تو مضبوط گھر کہلاتی ہے۔''

''بے جی! آپ اس کی گستاخیوں، بدتمیزیوں کو دوبارہ جھیلنا چاہتی ہیں؟''

''پرانی باتیں رہنے دو، وہ اب ایسی نہیں ہے۔ میں سب بھلا چکی ہوں، تم بھی بھول جاؤ، بھائی صاحب بتا رہے تھے وہ بالکل بدل گئی ہے۔ ایک بہترین و قابل فخر بیٹی بن گئی ہے اور اس کے لئے وہ تمہارے بہت شکر گزار ہیں۔''

''مجھ ناچیز کا کیا شکریہ ادا کرنا۔'' وہ دھیمے سے مسکرایا تھا۔

''دیکھتی ہوں تم کب تک اپنی ضد اور فضول انا کی حفاظت کرتے ہو۔ اب میں نہ کہوں گی مشعل کو لانے کے لئے، نہ بھائی صاحب مشعل پر زور ڈالیں گے۔ اتنا عرصہ ساتھ رہنے کے باوجود تم دونوں ایک دوسرے سے علیحدہ رہ سکتے ہو تو تم دونوں کی مرضی ہے۔'' بے جی اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئیں اور وہ آگے بڑھ کر انہیں روک بھی نہ سکا۔

اس کے اندر اسی دن سے ٹوٹ پھوٹ جاری تھی جب اس نے جہاز میں مشعل کو آزاد رہنے کا سندیسہ سنایا تھا اور جواب میں اس کے چہرے پر چھائی درد بھری حیرانگی، آنکھوں میں اتری شکوہ کناں وحشت اور وجود پر پھیلتے گہرے سناٹوں کی ردا، اس کا گم صم ہو جانا، افسردگی و رنجیدگی کی پرملال کیفیت، وہ بار بار ہونٹ وا کرنا مگر پھر کچھ سوچ کر لفظوں کا اندر ہی گلا گھونٹنا اور گہری سوچوں میں دانتوں سے ہونٹ زخمی کرنا، چپکے چپکے آنسو صاف کرنا کچھ بھی اس کی نگاہوں سے اوجھل نہ تھا۔

بظاہر سونے کی اداکاری کرتے ہوئے کنکھیوں سے وہ اس کا جائزہ لیتا رہا تھا۔ اس وقت اس کے دل کو بڑی تسکین مل رہی تھی۔ اس کی مردانہ انا بڑی مسرور ہو رہی تھی۔ وہ خوش تھا۔ بہت خوش۔

لیکن اب اسے لگ رہا تھا اس کی زندگی میں کوئی خلا پیدا ہو گیا ہے۔ انجانے میں ہی وہ اس کے وجود کا عادی ہو چکا ہے۔ لان، لاؤنج، ڈائننگ روم، کچن اور بیڈروم ہر جگہ وہ ویرانی و اداسی محسوس کر رہا تھا۔ شاید وہ اس کی محبت نہیں، ضرورت تھی۔ اس کی سنگت میں وہ ناز نخرے اٹھوانے کا عادی ہو چکا تھا۔ محبت کے شجر وفا کی کھاد اور چاہت کی برکھا سے نمو پاتے ہیں۔ جن کے تنے کاٹ بھی دیئے جائیں تو ان کی جڑیں اپنا وجود قائم رکھتی ہیں۔ ضرورت محبت سے بالکل متضاد ہے، مفاد ہر طریقے سے حاصل ہو جاتا ہے۔ اس کو ضرورت کو الفت اور الفت کو محبت میں بدلنے کا انتظار تھا۔

□●□

''آپ کہتی تھیں آپی! رب اپنے بندوں کو ان کے حوصلوں سے زیادہ نہیں آزماتا، پھر میرے ساتھ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ میں ہر در سے کیوں ٹھکرائی جا رہی ہوں؟ پہلے مجھ سے خرم جدا ہوئے، ان کے بعد میں نے اپنی زندگی کا مقصد اپنے بچے کو بنا لیا اور اب وہ سہارا بھی مجھ سے چھن گیا، اس بچے کی خاطر میں نے سب کچھ برداشت کیا، وہ مجھے دیکھے بنا، ماں کہے بنا چلا گیا۔'' حرا ایک ہفتے قبل ہسپتال سے گھر آچکی تھی اور ایک بار پھر اس کے آنسو رواں ہو گئے تھے۔

''صبر کرو...... نامعلوم اس میں رب کی کیا مصلحت ہوگی۔''

''میں اجڑ گئی، برباد ہو گئی۔ کیسے صبر کروں؟...... کس طرح صبر کروں؟'' حرا اچھل رہی تھی۔ فرح اسے سمجھا رہی تھیں۔ اسی دم پردے کے پیچھے سے منصور نے انہیں پکارا تھا۔ وہ باہر آئیں تو وہ بے حد غصے میں کھڑے تھے۔

''گھر سے یہ نحوست کب دفع ہوگی؟ یہ میرا گھر ہے اور میں یہاں ہر وقت رونا، پیٹنا برداشت نہیں کر سکتا۔'' وہ سخت غصے میں چیخ رہے تھے۔

''منصور...... منصور، پلیز یہاں سے چلو، یہ کیا کہہ رہے ہو؟ تم جانتے ہو حرا کتنے بڑے دکھ سے گزری ہے۔ وہ سن لے گی تو......''

''سنتی ہے تو سن لے...... یہ میرا گھر ہے، کسی کے باپ کا نہیں۔'' منصور اس وقت بے نیام تلوار بنے ہوئے تھے۔ فرح کبھی ان کی طرف بدحواسی سے دیکھتی کبھی پردے کے اس پار دیکھتی جس طرف حرا موجود تھی جس نے سب سن لیا تھا۔

''کیا ہو گیا ہے آپ کو...... آپ ایسے تو نہ تھے۔''

''تم نے کر دیا ہے ایسا۔ کیا ہو جاتا اگر تم مجھے حرا کے اکاؤنٹ استعمال کرنے کی اجازت دے دیتیں؟ اگر میری جگہ حرا کا بھائی ہوتا تو تم اسے اجازت دے دیتیں۔ اس لئے کہ وہ تمہارا بھائی ہوتا اور میں تمہارا شوہر ہوں۔ مجھ پر تمہیں یقین نہیں ہے۔ ہونہہ، عورتیں شوہروں کے کاروبار کی خاطر نامعلوم کیا کچھ کر ڈالتی ہیں۔ ایک تم ہو جو گھر آئی دولت پر ناگن بن کر بیٹھ گئی ہو۔''

''میں کہتی ہوں خاموش ہو جاؤ...... بات بڑھانے کی کوشش مت کرو۔''

''کیوں خاموش ہو جاؤں...... اس دن تو بڑی ٹرٹر کر رہی تھیں اور میں خاموشی سے سن رہا تھا کہ میرا وقت تھا۔ اور اب تمہارا وقت ہے، تمہیں سننا ہوگا۔ کیا سمجھتی ہو، بولنا صرف تم جانتی ہو؟ زبان صرف تمہارے پاس ہے؟ اور انسان کے پاس زبان ہونا کافی نہیں ہوتا۔ اس کے استعمال کے لئے ذہن اور موقع کی ضرورت ہوتی ہے اور مجھے موقع مل گیا ہے۔''

''ہاں میں جانتی ہو تم کتنے موقع پرست اور گھٹیا انسان ہو بلکہ تمہارے اندر انسانیت کی رمق بھی نہیں ہے۔ تم لالچی اور دوسروں کے مال پر نگاہ رکھنے والے بدنیت مرد ہو۔'' فرح سمجھ گئی تھیں وہ جان بوجھ کر حرا کو سنانے کی خاطر اس کے کمرے کے باہر یہ تماشہ کر رہے تھے۔

ان کا بگڑا لہجہ، خنجر کی طرح لفظ اور تمام مروت و اخلاق کو بالائے طاق رکھتا رویہ فرح کو بھی تاؤ دلا گیا تھا۔ پوری زندگی انہوں نے نہایت صبر و ضبط سے اس جیسے لالچی و خود غرض شخص کی خدمت میں گزاری تھی اور ایک اسی کے حق کی خاطر وہ تمام اخلاقی حدود پھلانگ گئے تھے۔ غصہ، نفرت، بدگمانی اور اشتعال کے سمندر میں وہ ڈوب ڈوب گئیں۔

''مجھے تم جیسی بدگو، زبان دراز اور بدتمیز عورت کی ضرورت نہیں ہے۔ میں جا رہا ہوں اور سزا کے طور پر تمہیں طلاق دے کر نہیں جا رہا۔ ساری زندگی تم میرے نام سے چپکی رہو گی۔ کسی اور کی نہیں ہو سکتیں اور میں دوسری شادی کر کے عیش کروں گا۔ تم اسی طرح سلگتی رہنا۔'' وہ طنزیہ انداز میں فیصلہ سنا کر آگے بڑھنے لگا۔ اسی وقت حرا کمرے سے نکل آئی۔

''بھائی! میں اجازت دے رہی ہوں آپ کو...... اکاؤنٹ آپ استعمال کریں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' اس کا لہجہ کانپ رہا تھا اور چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ منصور نے اس کی آواز سنی نہیں تھی کیونکہ فرح نے آگے بڑھ کر اس کے لبوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا تھا۔

''جانے دو اس شخص کو۔'' ہاتھ ہٹاتے ہوئے فرح نے کہا۔

''آپی آپ میری وجہ سے کیوں اپنا گھر برباد کر رہی ہیں؟ روک لیں بھائی کو۔ نہیں چاہئے مجھے پیسہ۔ مجھے آپ کی خوشیاں چاہئیں۔'' وہ بہن سے لپٹ گئی تھی۔ فرح بہت حوصلے ہمت والی عورت تھی۔

منصور کے بگڑے تیور و چال چلن سے وہ بہت پہلے ہی ان کے ارادے جان گئی تھیں۔ آج ان کے منہ سے دوسری شادی کا اعلان اور کبھی نہ چھوڑنے اور رابطہ بھی نہ رکھنے کی دھونس نے ان پر کوئی اثر نہ کیا تھا۔ وہ حرا کو سہارا دے کر کمرے میں لے آئی تھیں۔

''تمہیں کسی طرح کی کوئی فکر کرنے کی ہرگز ضرورت نہیں ہے۔ میں ہوں تمہارے پاس، تمہارے ساتھ۔ نہ تمہیں کسی کی ضرورت ہے، نہ مجھے خواہش۔ ہم ایک دوسرے کا سہارا ہیں اور ہمیں کسی کی ضرورت نہیں ہے۔''

حرا انہیں دیکھ رہی تھی جو ایسے کٹھن وقت میں عزم و حوصلے کی چٹان بنی ہوئی تھیں۔ چند لمحوں قبل کیسی آندھی آئی اچانک ان کی زندگی میں جو آن کی آن سب کچھ اُڑا کر لے گئی۔

اب باقی کیا بچا تھا، ان کی کھوکھلی ذات، کتنا مضبوط و طاقت ور نظر آنے والا ازدواجی رشتہ کس قدر کمزور اور ناقابل بھروسہ ہوتا ہے اور مرد کی ذات بالکل ہی کمزور وناقابل اعتبار، ساری زندگی ساتھ جینے مرنے، ساتھ نبھانے کی قسمیں کھانے والے بیچ راہ میں دغا کر جاتے ہیں۔

''فضول سوچوں میں ذہن کو مت تھکاؤ، سوجاؤ، کسی بھی قسم کی ٹینشن تمہارے لئے اچھی نہیں ہے۔'' فرح اس پر کمبل ڈالتے ہوئے گویا ہوئیں۔

''اتنا سب کچھ ہو جانے کے بعد آپ مجھے پُرسکون ہونے کی تلقین کر رہی ہیں..... آپ کی پُرسکون زندگی میں میری وجہ سے آگ لگی اور کس طرح سکون حاصل کر سکتی ہوں؟ سچ ہے میری نحوست نے میرے بعد آپ کے گھر کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ آپی ابھی بھی وقت ہے آپ دولہا بھائی کو روک لیں، انا کا مسئلہ مت بنائیں۔ ایسے لڑائی جھگڑے ہر گھر میں ہوتے ہیں اور شوہر اکثر دوسری شادی کی دھمکی دیتے ہیں۔ لیکن اس کا یہ مقصد نہیں کہ وہ ایسا ہی کرتے ہیں یا ان کی ناراضگی کبھی دور نہیں ہوتی، نہیں ایسا نہیں ہوتا۔ یہ سب وقتی غصہ ہوتا ہے۔ جب غصہ اتر جاتا ہے تو غلطی کا احساس ہو جاتا ہے۔ اور جب غصہ ختم ہو گیا، غلطی کا احساس ہو گیا تو بات صاف، لڑائی ختم۔''

''وہ اس طرح کا مرد نہیں ہے، اول تو اپنی غلطی کبھی تسلیم کر ہی نہیں سکتا، پھر معافی مانگنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' وہ بے دم انداز میں اس کے قریب بیٹھتے ہوئے گویا ہوئیں۔ اس وقت اضمحلال و حزن ان کے چہرے پر پھیل گیا تھا۔

''طویل عرصے سے میں اس کی لالچی و مطلب پرست طبیعت کو جھیل رہی ہوں اور کئی بار اس سے چھٹکارا پانے کی خواہش میں مجبوراً ساتھ رہتی آئی ہوں۔'' حرا کے چہرے پر حیرانگی دیکھ کر وہ دکھ سے مسکرائیں۔

''تمہارے ساتھ ہمیشہ خوش و خرم و خوش حال نظر آنے والی یہ بہن اس شخص کی سنگت میں پائی پائی کو ترستی رہی ہے۔ پھر فاقوں اور منصور کے طعنوں سے تنگ آکر میں نے ملازمت کی جس کا آدھے سے زیادہ حصہ اس کی جیب میں جاتا ہے۔ اتنی محنت کے باوجود مجھے وہ تحفظ و اعتماد نہیں ملا جو ایک خاوند اپنی بیوی، اپنی شریک حیات کو دیتا ہے۔ غیر اخلاقی سرگرمیوں میں پڑ کر وہ بزنس سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا ہے۔ خیر مالی سپورٹ اس نے مجھے کبھی نہیں دی اور مجھے اس کا ملال نہیں۔ ہاں اگر چند الفاظ سچے پیار کے میرے دامن میں ڈال دیتا تو میں اسے چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ لیکن وہ ہوس کا پجاری ہے، دولت کا غلام ہے۔ اس کی دنیا، اس کا ایمان سب دولت ہے، صرف دولت...... جس کو حاصل کرنے کے لئے وہ ذلت و کمینگی کی آخری حد تک کراس کر سکتا ہے اور ایسے مرد کے سنگ مزید آگے نہیں چل سکتی۔''

فرح نے جو کہا وہ کر کے دکھایا۔ اس کا وجود حرا کے لئے گھنی چھاؤں بن گیا، وقت کے ہر کڑے موڑ پر وہ اس کی ڈھال تھی۔

وقت گزرتا گیا۔ زخم مندمل ہو گئے۔

وہ دونوں ایک دوسرے کا سہارا بنی زندگی کی ناؤ کو رواں رکھے ہوئے تھیں۔ وقت کی لڑی سے ماہ و سال موتی موتیوں کی طرح یکے بعد دیگرے گرتے چلے گئے اور وہ سب بھولنے میں کامیاب ہوئی بھی نہ تھی کہ آج بائیس سال بعد جب وہ دکھ کے بھنور سے نکل پائی تھی کہ پھر وہی آسیب پیچھے لگ گیا تھا جس نے بائیس سال پہلے اسے کسمپرسی کی حالت میں اپنے گھر سے فرار ہونے پر مجبور کیا تھا اور مرحوم شریک حیات کے آخری دیدار سے بھی محروم رکھا تھا۔

شاپنگ سینٹر میں عرفان کو دیکھ کر حرا بد حواس ہو کر وہاں سے بھاگ لی تھیں اور گھر آکر مارے ڈر کے تمام کھڑکیاں دروازے بند کر کے بیٹھ گئی تھیں۔ مندمل زخموں سے ڈھیروں ٹیسیں اٹھنے لگی تھیں اور عرفان کی صورت نے ماضی کی کتاب کے اوراق پلٹ دیئے تھے جن میں لکھا ایک ایک لفظ اپنی کہانی سنانے لگا تھا اور نا معلوم وہ ان لفظوں کی طلسماتی دنیا میں کب تک کھوئی رہتی اگر ڈور بیل خوب شور نہیں مچاتی۔ وہ گھبرا کر کھڑی ہوئی تھی اور کئی ہول سے دوسری طرف فرح کو دیکھ کر دروازہ وا کر کے تیزی سے ان کے گلے لگ گئی۔

''ارے خیریت تو ہے نا...... کیا ہوا؟'' وہ سخت گھبرا گئی تھیں۔

''وہ...... عرفان......'' ان کے پیچھے کھڑے شاہ ویز کو دیکھ کر وہ خاموشی سے اندر بڑھ گئی۔

شاہ ویز نے اسے پہلی بار غور سے دیکھا تھا۔ اس کے اندر عجیب سے احساسات ابھرے تھے۔ اس سے قبل اس نے وہ چہرہ غور سے نہیں دیکھا تھا جو اب ان پر نگاہ ڈال کر وہ جن احساسات سے دوچار ہوا تھا۔

''آؤ بیٹے!'' حرا اندر آگئی تو انہیں شاہ ویز کی موجودگی کا احساس ہوا۔

''آنٹی! میں نیکسٹ ٹائم آجاؤں گا۔ اس وقت کوئی پرسنل میٹر ہے۔'' حرا کی اُڑی رنگت و پریشان چہرہ دیکھ کر وہ سمجھ گیا تھا کہ ان کی کوئی گھریلو پرابلم ہے اور اس دوران اسے ان کے درمیان نہیں ہونا چاہئے۔

''ارے ایسی کوئی بات نہیں، حرا بہت کمزور دل کی ہے۔ ڈر گئی ہو گی کسی چھپکلی یا کاکروچ سے۔'' فرح اسے سٹنگ روم میں لاتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

''ان چھوٹے چھوٹے کیڑوں سے اکثر خواتین بری طرح خوف زدہ رہتی ہیں۔'' وہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے گویا ہوا تو فرح نے مسکرا کر تائید کی تھی۔

وہ ان کی رقم لے کر آیا تھا جس کو انہوں نے وصول کر کے کچھ کاغذات پر سائن کر دیئے تھے۔ اس کارروائی میں کچھ وقت گزر رہا تھا۔

اتنی دیر میں حرا نے کافی تیار کر لی تھی۔ ان کے فارغ ہوتے ہی لے آئی تھی۔

''آپ بھی ہمارے ساتھ کافی پئیں۔'' وہ کافی سرو کر کے جا رہی تھی جب نا معلوم کس جذبے کے تحت شاہ ویز کے لب میکانکی انداز میں وا ہوئے۔

''میں......؟'' حرا نے استعجابیہ انداز میں شاہ ویز کی طرف دیکھ کر کہا۔ نا معلوم کس جذبے کے تحت وہ کہہ اٹھا تھا۔ قبل اس کے کبھی دل اس طرح انہیں دیکھنے اور دیکھتے رہنے کی خواہش بھی نہ ہوئی تھی۔

''ہاں ہاں حرا! بیٹھ جاؤ۔ شاہ ویز سے کوئی غیریت، کوئی اجنبیت والی بات نہیں ہے۔ اس دور میں جب کہ سچائی کو لوگ داغدار کر چکے ہیں، ایمانداری اور اصولوں کی صورتیں مسخ کی جا چکی ہیں۔ اس خود غرض اور مفاد پرست دور میں انہوں نے ثبوت دیا ہے کہ سچائی اور ایمانداری رہتی دنیا تک قائم و دائم رہے گی۔ ان کے اصولوں نے ہمیں گرویدہ بنا دیا ہے۔''

حرا نے ان کے درمیان بیٹھ کر کافی پی۔ اس دوران باتوں کا سلسلہ چلتا رہا اور شاہ ویز بلا ارادہ ان کے چہرے کا گہرائی سے جائزہ لیتا رہا اور ہر نظر کے بعد اس کے اندر عجیب سی ہلچل مچنے لگی تھی۔

ان دیکھے احساسات اس کے دل پر احاطہ کرنے لگے تھے۔

□●□

کاش تم سے ہم نہ ملے ہوتے
پھر سے ملنے کی نہ خواہش ہوتی
نہ محبت کو انتہا ملتی
اپنی چاہت کو نہ وفا ملتی
آرزوؤں کا خوں نہ ہوتا
نہ وفاؤں کا امتحاں ہوتا
کاش ہم تم جدا نہیں ہوتے
کاش کہنے سے کچھ نہیں ہوتا
اصل میں بات صرف اتنی ہے
تُو سمجھتا اگر وفا کو میری
تو کسی اور کا نہیں ہوتا
کیونکہ اب تک ہمارے اسی دل نے
بعد تیرے کسی کو چاہا نہیں

اس نے کرسی کی بیک سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لی تھیں۔ اترتی شام کی تمام شادابی اس کے دل کش سراپا کا حصہ لگ رہی تھی۔ وہائٹ کاٹن کے سوٹ پر رنگین دھاگوں کی خوب صورت ملتانی کڑھائی تھی۔ دوپٹہ بھی اسی رنگین دھاگوں سے کڑھا ہوا تھا جسے اس نے کھول کر شانوں پر پھیلا رکھا تھا۔ بال بے ترتیب سے آدھے شانے پر آدھے پشت پر بکھرے ہوئے تھے۔ وہ اردگرد اور اپنے آپ سے بیگانہ آنکھیں بند کئے نیم دراز تھی۔ اس کی تمام جامہ زیبی اور فیشن اپنا وجود کھو بیٹھے تھے۔

اس کی تیزی و طراری، پھرتی و چستی کاہلیت کا شکار ہو گئی تھی۔ خیالوں و خوابوں سے دور بھاگنے والی لڑکی یکدم ہی خوابوں کی دنیا کی باسی بن گئی تھی جو ہمہ وقت خیالوں کے سمندر میں غوطہ زن رہتی تھی۔ اسے اپنی پرواہ نہ تھی۔

وہ خود سے روٹھ گئی تھی اور جو خود سے روٹھ جائے اسے پھر کسی کی پرواہ نہیں رہتی اور وہ بھی ایسی ہی ہو گئی تھی۔

رافعہ ہر ممکن کوشش کر کے ہار چکی تھیں اسے راہ راست سے ورغلانے کی۔ جو جو بھی اسے اپنی طرف راغب کرنے میں ناکام رہا تھا۔ ان کے ہر پلان، ہر خواہش کو مشعل کی بے رخی و بے پروائی نے ملیا میٹ کر ڈالا تھا۔ وہ ہر ممکن طریقے سے اسے دام میں لانے کی کوشش کرنے میں اب بھی مصروف تھیں کہ اس کی رضا کا حاصل ہی ان کے لئے امیدوں و خواہشوں کے در وا کرنے کا ذریعہ تھا۔

وہ اسے چارہ بنا کر اپنے بھائی کی تمام دولت وجائیداد کا شکار کرنا چاہتی تھیں جو وہ شروع سے کرتی رہی تھیں۔ خود بھی بڑی فیاضی سے اپنا حق سمجھ کر بھائی کے آگے دست طلب پھیلاتی رہی تھیں اور حیلے بہانوں سے مشعل کے ذریعے بھی سب کچھ حاصل کرتی رہی تھیں۔

ان کا تعلق ہر معاشرے میں بسنے والے ان خود غرض ومفاد پرست لوگوں سے تھا جو جھوٹ، فریب، مکاری، جعل سازی وچالاکی سے فقط حاصل کرنا اپنا حق سمجھتے ہیں۔ ایسے لوگ بہت گھناؤنے اور بے ضمیر ہوتے ہیں جو اپنا مطلب، اپنی غرض حاصل کرنے کے لئے انتہائی پستی میں بھی آسانی سے گر جاتے ہیں۔ جن کی پہلی وآخری چاہ پُرتعیش زندگی ہوتی ہے۔

اس وقت بھی انہوں نے مشعل کو تنہا وگم صم بیٹھا دیکھا تو جھٹ اس کے پاس چلی آئیں اور بڑے دل گداز لہجے میں گویا ہوئیں۔

''سمجھ نہیں آتا کیا ہوتا جارہا ہے تمہیں؟ نا معلوم کس بدنظر کی نظر کھا گئی شوخی وہنسی کو۔ بلبل کی طرح چہکنے والی میری بچی کسی مجسمے کی طرح گم صم ہوگئی ہے۔ کچھ بتاؤ تو سہی میری جان، تمہارے اندر ہی اندر کون سا زہر پھیل رہا ہے...... کیا ہوا ہے آخر؟ ایسی کیا بات ہوئی ہے؟ میری طرف سے شاید آپ کے دل میں نفرت کی جو گرہ پڑی ہے وہ کبھی نہیں کھل سکتی مگر میرا نہیں تو بھائی جان کا خیال کرو، وہ تمہاری حالت دیکھ کر کیسا محسوس کر رہے ہیں۔ وہ خوش نہیں ہیں۔ وہ ازحد پریشان ومتفکر ہیں۔ کچھ لبوں سے بے شک نہ کہیں مگر میں ان کی بہن ہوں۔ ان کی فطرت سے اچھی طرح واقف ہوں کہ وہ بے حد پریشان ہیں۔''

''میں نے پاپا کو پریشان نہیں کیا اور نہ ہی وہ ہیں اور پریشان ہونے بھی کیوں لگیں؟ کیا شادی کے بعد بیٹیاں باپ کے گھر پر رہنے نہیں آتیں؟ کیا سارا حق، ساری محبت، سارے رشتے بیٹی کی وداع کے ساتھ رخصت ہوجاتے ہیں؟'' اس کے لہجے میں استعجاب تھا۔

''یہ میں نے کب کہا میری جان! بیٹی پرائی ہوجانے کے بعد اور زیادہ عزیز وپیاری ہوجاتی ہے۔ اس کی محبت مزید بڑھ جاتی ہے اور رشتے بھی استوار رہتے ہیں مگر بیٹی سسرال سے ہنسی خوشی، مطمئن وخوش وخرم آئے تو۔ لیکن جب سے تم آئی ہو ایسی کوئی بات، ایسی کوئی خوشی دیکھنے کو نہیں ملی۔ شادی کے بعد تو لڑکیاں پھولوں کی طرح مہکنے لگتی ہیں، گلاب کی طرح کھل اٹھتی ہیں، چہروں پر قوس قزح کے رنگ چھائے ہوتے ہیں، آنکھوں میں جگنوؤں کی سی چمک۔ وہ سراپا بہار بن جاتی ہیں۔'' ازحد ملائمت وشفقت سے ایک ایک کرکے گھاؤ وہ اس کے وجود کو لگا رہی تھیں اور وہ خاموشی سے گھائل ہو رہی تھی۔ ایک سسکی تک اس نے لبوں سے خارج ہونے نہیں دی تھی اور خاموشی سے وہاں سے اٹھ گئی تھی۔

مقابل کی زبان سچ سے آشنا کر رہی ہو تو پھر لفظ گویائی کھو بیٹھتے ہیں، زبان گنگ ہوجاتی ہے۔ اس وقت صرف وہ ساتھی ساتھ دیتے ہیں جو خوشی، غم ہر موقع پر ساتھ دیتے ہیں۔ اس وقت بھی پوری شدت سے وہ امڈ رہے تھے جن کو چھپانے کے لئے اسے کمرے میں پناہ لینی پڑی تھی۔ اور دروازہ لاک کرتے ہی اس کا صبر چھلک پڑا تھا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ کھڑکی کی ایک درز سے جھانکتی ہوئی رافعہ کے لبوں پر مدت بعد فاتحانہ مسکراہٹ ابھری تھی۔

□●□

فائیو اسٹار ہوٹل کے ویل ڈیکوریٹڈ روم میں صوفوں پر وہ آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ ان کے درمیان سینٹر ٹیبل پر اعلیٰ نفیس کانچ کے برتنوں میں کافی دھواں اُڑاتی کپوں میں موجود تھی جو کچھ دیر قبل ایک ویٹر تیار کرکے گیا تھا۔ ان کے ہاتھوں میں قیمتی سگار زتھے۔ گرے اور براؤن تھری پیس سوٹ میں ملبوس ان دونوں کی شخصیتیں خاصی پُروقار تھیں۔ خاموشی کے طویل وقفے کے بعد گرے سوٹ والے نے براؤن والے کی جانب ٹیبل سے کافی کا کپ اور ساسر اٹھا کر سرو کرتے ہوئے کہا۔

''میرے پاس صرف چند دن کا ویزا موجود ہے اور ظاہری بات ہے ویزا آؤٹ ہوتے ہی مجھے یہاں سے جانا پڑے گا اور جانے سے قبل میں چاہتا ہوں جو کام کرنا ہے وہ آج بلکہ ابھی ہی کیوں نہ کردیں؟''

''ہاں...... پہلے ہی بہت دیر ہوگئی ہے۔ ہم نے انہیں بری طرح نقصان پہنچایا ہے اور گناہوں کی پاداش میں ایسے پھنسے کہ خود کو بھی ناقابل معافی نقصانات میں پھنسا لیا۔ عرفان صاحب! سنتے تھے مظلوموں کی آہ عرش کا سینہ چیر کر سیدھی اوپر پہنچ جاتی ہے اور عرش الٰہی کو ہلا ڈالتی ہے۔ اور جب اللہ کی لاٹھی چلتی ہے تو آواز نہیں ابھرتی اور گناہ گار اپنے بدترین انجام کو پہنچ جاتا ہے۔'' منصور کے لہجے وانداز میں ندامت، پشیمانی اور بہت کچھ کھو دینے کا احساس جاگزیں تھا اور ایسی ہی دگرگوں حالت عرفان کے سراپا سے عیاں تھی۔ دولت، عزت پالینے کے بعد بھی ناآسودگی ونامرادی کی تحریر ان کے چہرے کے نقوش سے عیاں تھی۔

''ہاں...... اسی امر کو ہم نے اب مانا ہے۔ طاقت کے غرور اور دولت کے حصول کی خاطر میں انسان سے حیوان بن گیا بلکہ حیوانیت کو بھی شرمسار کر ڈالا۔ حرا میری اسٹیپ مدر، میں نے ہر ممکن طریقے سے اسے ختم کرنے کی سعی کی اور جب اس میں کامیاب نہ ہوسکا تو اس کی کو واجاڑ کر میں مطمئن ہوگیا کہ اب دولت بانٹنے والا کوئی نہیں رہا۔ آہ، کتنی گھٹیا اور مجرمانہ سوچ تھی۔ میں یہاں سے انڈیا پہنچا تو میرے لئے ایسی خبر موجود تھی کہ جس نے ایک عرصے تک میرے ہوش وحواس گم رکھے تھے یا یوں کہہ سکتے ہیں اوپر میرے عمل کا احتساب شروع ہوچکا تھا۔'' کچھ توقف کے لئے وہ خاموش ہوگئے اور اپنی آنکھوں میں آئی نمی کو رومال میں جذب کرتے ہوئے گویا ہوئے۔

''وہاں جاتے ہی مجھے خبر ملی کہ ندا میری بہن اپنی فیملی سمیت ایک حادثے میں ہلاک ہوگئی۔ کیونکہ رازداری کے خیال سے میں اپنا ٹھکانہ کسی کو بتا کر نہیں آیا تھا اور نہ ہی کسی کو واپسی کا علم تھا، ندا، اس کے بچوں اور شوہر کو دفنا دیا گیا تھا۔ ندا میں میری جان تھی۔ وہ میری ازحد عزیز بہن تھی۔ اس کی ابدی جدائی اور اپنی بدقسمتی کا احساس مجھے مہینوں افسردہ وبے سکون رکھے ہوئے تھا کہ نہ میں اس کا آخری دیدار کرسکا اور نہ کندھا دے سکا۔ دولت وجائیداد سمیٹنے کا ارادہ ہم دونوں کا تھا مگر وہ تو اپنی بھی گھرداری برت نہ سکی۔ ندا کی جدائی کا زخم مندمل ہوا بھی نہ تھا کہ دادی حضور پر اچانک ہی دیوانگی کے دورے پڑنے لگے جن میں رفتہ رفتہ شدت آتی گئی اور ایک دن یہ نوبت آئی کہ انہیں مینٹل ہسپتال میں ایڈمٹ کرنا پڑا اور مرنے کے بعد ہی ان کو وہاں سے رہائی ملی۔ پھر مجھے اس شہر، اس ملک سے وحشت ہونے لگی۔ خوف محسوس ہونے لگا اور میں اپنی فیملی کو لے کر ساؤتھ افریقہ شفٹ ہوگیا اور آج تک وہیں رہائش پذیر ہوں۔ اتنا کچھ ہونے کے باوجود گناہوں کا عذاب مجھ پر ختم نہیں ہوا۔ میرے پانچ بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں۔ امیر ترین فیملیز سے میری بہوؤں اور دامادوں کا تعلق ہے۔ ان کی شادی کو خاصا عرصہ گزرنے کے باوجود میں آج تک دادا اور نانا بننے کی سعادت سے محروم ہوں۔ وہ ہر طریقے سے فٹ ہیں، ان کی رپورٹس اوکے ہیں اس کے باوجود میرا خاندان اپنے وارثوں سے محروم ہے۔ اب لوگ ہماری طرف تمسخرانہ نگاہوں سے دیکھتے ہیں اور باتیں بناتے ہیں۔ یقیناً ہم نے کوئی ایسا بڑا گناہ کیا ہے جس کی پاداش میں ہم اپنی نسل سے محروم ہیں۔ گناہ میں نے کیا، میرے ساتھ میری اولاد بھی خمیازہ بھگت رہی ہے۔ اب مجھ میں سکت نہیں ہے۔ میں حرا کے قدموں میں گر کر معافی مانگنا چاہتا ہوں۔ ہر وہ طریقہ اپنانا چاہتا ہوں جس سے وہ مجھے معاف کردیں۔''

□●□

جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا، بے جی کی تیاریاں بڑھتی جارہی تھیں۔ پہلے تو وہ سامان وغیرہ کی تیاریوں میں مصروف رہی تھیں۔ احرام کے علاوہ انہوں نے کچھ سوٹ، چادریں اور دیگر اشیاء کی خریداری وتیاری میں وقت گزارا تھا۔ اب ان سے فراغت پاکر عزیزوں، رشتے داروں اور محلے داروں سے ملنے ملانے میں مصروف تھیں۔ اس وجہ سے ان کی لگی بندھی روٹین میں بھی کافی چینج آگیا تھا۔ شاہ ویز کو وہ دانستہ نظر انداز کرنے لگی تھیں۔ کبھی شام کی چائے پر غائب ہوتیں تو کبھی رات کو کھانے پر ساتھ نہ دیتیں یا فارغ اوقات میں دعائیں وغیرہ یاد کرنے میں مصروف نظر آتیں۔ شاہ ویز انہیں ڈسٹرب کرنا ایسے میں مناسب نہیں سمجھتا تھا۔ ویسے بھی اس پر عجیب قنوطیت طاری رہتی تھی۔ مشعل سے علیحدہ رہ کر وہ سمجھتا تھا کہ پُرسکون وطمانیت سے رہے گا۔ اس کی موجودگی میں جو چڑچڑاپن اور بیزاری چھائی رہتی ہے اس سے نجات مل جائے گی، پھر ان رویوں سے نجات بے شک مل گئی مگر احساسات کی دنیا بھی بدل کر رہ گئی تھی۔ جو وہ چاہ رہا تھا وہ دل کو منظور نہ تھا اور جو دل کی لگن تھی وہ اس سے دانستہ نگاہ چرا رہا تھا۔

انا پرست تھا۔

کچھ مردانگی وخودداری کا گھمنڈ حد سے سوا تھا۔

وہ تھکے تھکے انداز میں بیڈ پر لیٹ گیا۔ دل کی بے کلی لاعلاج تھی۔

وہ اپنی ہمت وحوصلے کا امتحان لینے پر کمربستہ تھا۔

''کھانا ابھی لگاؤں یا ٹھہر کر؟'' بے جی نے کمرے میں آکر دریافت کیا۔

''ابھی تو بھوک نہیں لگ رہی ہے۔'' وہ بیٹھتے ہوئے گویا ہوا۔ بے جی قریب ہی بیٹھ گئی تھیں۔

''لوگوں سے ملنے ملانے کا کام باقی ہے ابھی؟''

''چند گھر ہی رہ گئے ہیں لیکن اب دل نہیں چاہ رہا مجبوراً ملنا پڑ رہا ہے۔'' بے جی کے سنجیدہ لہجے پر وہ چونک کر گویا ہوا۔

''کیوں بے جی! کوئی بات ہوگئی ہے؟''

''جن سے بھی ملنے گئی ہوں سب نے یہی کہا ہے کہ اپنے بہو بیٹے کے ساتھ کیوں نہیں جارہی ہو۔ کوئی بات ہی ہوگی جو بہن کے بیٹے بہو کے ساتھ جارہی ہو ورنہ وہ بھی اس لائق ہیں۔''

''بعض لوگوں کو فضول باتیں کرنے کی عادت ہوتی ہے۔ آپ کیوں ایسی باتوں کی پرواہ کرتی ہیں؟ نہ سوچا کریں ایسے تنگ ذہن وتنگ نظر لوگوں کے متعلق جن کا کام ہی ایسی بے سروپا باتیں کرکے گھٹیا ذہنیت کو تسکین دینا ہوتا ہے۔'' اس نے اپنائیت سے ان کے شانے پر بازو رکھتے ہوئے کہا۔

''بیٹا! بات لوگوں کی نہیں ہمارے دل کی ہوتی ہے، احساسات کی ہوتی ہے۔ ہمارے درمیان تعلقات خوشگوار واپنائیت سے لبریز ہوں تو لوگوں کی طرف سے پھینکے گئے کانٹے پھول لگتے ہیں ورنہ پھول بھی کانٹے بن جاتے ہیں۔ بہو گھر میں ہوتی تو لوگوں کی باتیں مجھے کبھی ناگوار نہ محسوس ہوتیں۔''

''بہت جذباتی ہو رہی ہیں آپ بے جی۔''

''ابھی بھی وقت ہے، پکڑ لو ان بھاگتے دوڑتے لمحوں کو۔ کہیں ایسا نہ ہو وقت گزر جائے اور پچھتاوے کی دھول اپنے سر میں ڈالتے نظر آؤ۔'' وہ ناصحانہ لہجے میں کہتی ہوئی کمرے سے نکل گئی تھیں۔

□●□

فضا میں خنکی بڑھ رہی تھی۔
موسم ابر آلود تھا۔ ہوائیں تیز اور یخ بستہ تھیں۔
ماحول پر ہلکا ہلکا سرمئی اُجالا ہر سُو پھیلا ہوا تھا۔ در و دیوار خاموشی کے کہر میں لپٹے ہوئے دلوں کو وحشت زدہ کر رہے تھے۔
''تم نے اسے ٹھیک طرح سے پہچانا کہ وہ سچ مچ عرفان ہی تھا؟''
پچھلے ایک ہفتے سے ان کا یہی موضوع تھا اور ہر بار وہ یہی سوال ضرور کرتیں۔
''جس نے میری زندگی تباہ کر دی میں اس خونی درندے کو کس طرح بھول سکتی ہوں؟''
''اب وہ کیا کرنے آیا ہے؟'' فرح مضطربانہ انداز میں بڑبڑا رہی تھیں۔
''یہی خوف مجھے کھا رہا ہے آپی! مجھے دیکھ رہا تھا بہت غور سے۔ اگر میں وہاں سے بھاگ نہ لیتی تو نا معلوم کیا کرتا۔ میں اسے دیکھتے ہی بھاگ لی تھی مگر مجھے لگ رہا ہے وہ میرا پیچھا کرتا ہوا یہاں تک آیا ہے اور گھر دیکھ گیا ہے اور...... اور ہر گاڑی کی آواز پر مجھے اس کی آمد کا احساس ہوتا ہے اور مجھے خوف ہے کہ وہ یقیناً مجھے مارنے آیا ہے۔'' وہ فرح کی آغوش میں چہرہ چھپائے ہوئے تھی۔
''ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے، میں ہوں تمہارے پاس۔ کوئی تمہارا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔'' انہوں نے اپنے حصار میں اسے مقید کرتے ہوئے اعتماد سے کہا۔
''نہیں آپی! مجھے احساس ہو گیا ہے۔ ہم دو عورتیں کمزور و ناتواں ہیں، ہم کس طرح اپنی حفاظت کر سکتے ہیں؟ جس قدر احساس اب ہو رہا ہے مجھے اپنی کمزوری اور بے بسی کا اس سے قبل کبھی نہ ہوا تھا۔'' وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپاتے ہوئے روتے ہوئے گویا تھی۔
''کاش میرا بیٹا زندہ ہوتا تو آج یہ خوف، بے بسی و لاچاری کا احساس ہمیں اس طرح متوحش نہ کیے ہوتا۔ اس کا خیال، اس کا تصور ہر دم میری سانسوں کی طرح میرے ساتھ رہا ہے مگر ان دنوں اس کی غیر موجودگی کا کرب ایک قیامت بن کر گزر رہا ہے۔ اتنی اذیت اور تکلیف تو مجھے اس کے مردہ ہونے کی خبر سن کر بھی نہ ہوئی تھی۔''
''جب تک ہم رشتوں کے متلاشی رہتے ہیں یا ہمیں یہ احساس و یقین ہو کہ کوئی ہمیں بچا لے گا، مصیبتوں سے چھٹکارا دلا دے گا یا اس کے سہارے ہماری مشکلات حل ہو جائیں گی۔ دراصل سہارے کمزور کرتے ہیں، بزدل بناتے ہیں اور ہمیں ان سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اگر زندگی کو زندگی کی طرح گزارنا ہے تو خود پر بھروسہ کرنا سیکھو۔ اپنی قوت، اپنی ذات پر انحصار کرنا سیکھو، ورنہ غلامی زندگی نہیں ہوتی اور یہ تم نے کس طرح سوچ لیا کہ عورت کمزور ہوتی ہے؟'' اس وقت ان کے خوبصورت پُر وقار چہرے پر بلا کی سنجیدگی اور گمبھیرتا چھائی تھی۔
''عورت کمزور ہوتی ہے اس وقت تک جب تک وہ خود کو کمزور سمجھتی ہے ورنہ تنہا عورت شیروں کے جتھے کو فنا کرنے کی قوت رکھتی ہے۔ جس خالق نے مرد کو بنایا ہے اسی نے عورت کو بھی تخلیق کیا ہے اور اس نے اپنی ہر تخلیق میں بے پناہ صلاحیتیں و خوبیاں رکھی ہیں اور پھر جو اپنی مدد آپ کرے اس کی رہنمائی و امداد قدرت کرتی ہے۔ ہم اس کے شہر سے، اس کے ملک سے اس وقت بھی بخیریت لوٹ آئے تھے جب امید بھی نہ تھی تو اب یہ شہر، یہ ملک ہمارا ہے اور یہاں وہ کچھ نہ کر سکے گا، انشاء اللہ، اللہ پر یقین کامل رکھو۔'' ہر ممکن طریقے سے فرح نے اسے سمجھایا تھا اور کامیاب ہو گئی تھی۔
''گھر کا تمام راشن ختم ہو چکا ہے اور فریج میں بھی ایسا کچھ نہیں ہے جو رات کو پکایا جا سکے۔ میں مارکیٹ جا رہی ہوں۔ تم چل رہی ہو؟ طبیعت بہل جائے گی۔''
''آپ تو جانتی ہیں آپی! مجھے پُر ہجوم جگہوں پر وحشت ہوتی ہے۔ آپ جائیں، میں آپ کی غیر موجودگی میں ڈسٹنگ وغیرہ کر لوں گی۔ ملازمہ کی تو ابھی تک چھٹیاں چل رہی ہیں۔''
''فکر مت کرو، سیلری لینے سے چند روز قبل آ جائے گی، کسی نئی اسٹوری کے ساتھ۔'' فرح ہنستے ہوئے گویا ہوئیں تو وہ دھیمے سے مسکرا اٹھی تھی۔
سیاہ چادر اپنے گرد باوقار طریقے سے لپیٹے وہ پرس سنبھالے خراماں خراماں چل رہی تھیں۔ مارکیٹ گھر سے قریب تھی اس لئے انہوں نے کار کے بجائے پیدل آنے کو ترجیح دی تھی۔
موسم کی ٹھنڈک عروج پر تھی۔ شام کا وقت تھا مگر سڑکوں پر ٹریفک معمول کے مطابق تھا۔ اردگرد لوگوں کا ہجوم بہت کم تھا۔ فرح نے حرا کو کافی تسلی و حوصلے دیئے تھے لیکن عرفان کی یہاں موجودگی اور حرا کے تعاقب نے انہیں بھی ذہنی خلفشار میں مبتلا کر ڈالا تھا۔ وہ سوچ رہی تھیں عرفان اتنے عرصے بعد کیا کرنا چاہتا ہے۔ وہ اپنی سوچوں میں گم یہ محسوس نہ کر پائیں کہ ایک نیلی گاڑی کب سے ان کے تعاقب میں چل رہی ہے۔ ایک سنسان موڑ پر یکدم ہی وہ کار ان کے آگے رکی تھی اور قبل اس کے کہ وہ ہوشیار ہوتیں سائیڈ ڈور کھول کر دو مردانہ ہاتھوں نے انہیں انتہائی سرعت سے اندر گھسیٹ لیا تھا اور کار تیزی سے آگے بڑھ گئی تھی۔

□●□

جوجو نے منہ بنا کر رافعہ کی طرف دیکھا اور دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر بیٹھ گیا جب کہ وہ اسی زور و شور سے رونے میں مصروف تھیں۔
''مما! آخر کب تک آپ کی یہ گریہ وزاری چلے گی؟'' اس نے زچ ہو کر کہا۔
''جب تک میرا دل جلے گا۔''
''اس کو تو شاید اب ساری زندگی جلنا ہے۔''
''ہاں ہاں اُڑا لو مذاق۔ تم سے اب امید کیا رکھی جا سکتی ہے، ہونہہ...... دنیا کی مائیں کس چالاکی سے بیٹوں کو کیش کروا کر اپنی آرزوئیں پوری کر رہی ہیں، ارمان نکال رہی ہیں ایک میں بدنصیب ہوں جوان آسائشوں سے محروم بھائی کے ٹکڑوں پر پڑی ہوں، آہ کل مسز قمر کو دیکھا تھا؟ اوہ کیسی دولت مند بہو لے کر آئی ہے۔ سات بھائیوں کی اکلوتی بہن کیا کچھ نہیں لائی ہے جہیز میں۔ ایسا لگتا ہے دنیا کی تمام اشیاء و دولت اس کی بہو سمیت لائی ہے اور مسز قمر بہو کے میکے کی جانب سے ملنے والے ڈائمنڈ نیکلس سیٹ کو پہن کر کیسی ہواؤں میں اُڑ رہی تھی گویا زمین پر پاؤں رکھنا جانتی ہی نہ ہو۔ اور وہ مسز طلعت کیسے کروفر سے بہو کو جہیز میں ملنے والے ہزار گز کے ویل ڈیکوریٹڈ بنگلے میں شفٹ ہوئی ہے اور ایک میں ہوں، اپنے نصیبوں کو رو رہی ہوں، بیٹے کے ہوتے ہوئے بھی بہو کے ذریعے اٹھائے جانے والے عیش و آرام کو ترس رہی ہوں۔'' تفصیلات بتانے کے دوران تھم جانے والے آنسو دوبارہ رواں ہو گئے تھے۔
''مما! آپ کے قابو میں زبان رہتی ہے نہ جذبات۔ ورنہ مشعل جیسی بہو آپ کی کسی جاننے والی کی نہ ہوتی۔ دولت و جائیداد کے علاوہ وہ ساری زندگی آپ کی تابعدار رہتی اور آپ کے عیش ہی عیش تھے۔''
''ہاں درست کہہ رہے ہو۔ رونا اس بات کا ہے، میں نے خود اپنے نصیب پر کلہاڑی چلائی ہے۔'' پچھتاووں کے بحر میں وہ کافی دیر تک غوطہ زن رہی تھیں۔ جوجو کے وجود پر بھی تاسف و ملال کی کیفیت تھی۔
وہ ان یادوں میں محو تھا جن میں مشعل کی دوستی کے علاوہ مراعات بھی حاصل تھیں اور رافعہ کا مکار ذہن کسی ایسی ترکیب میں الجھا ہوا تھا کہ جس کے ذریعے وہ زیادہ سے زیادہ دولت حاصل کر کے فارن کنٹری کی طرف کوچ کر جائیں، جہاں ان کے شوہر ان کے انتظار میں وقت گزار رہے تھے۔ حسن بیگ سے انہیں استعمال کے لئے وقتاً فوقتاً رقم ملتی رہتی تھی لیکن یہ رقم اس رقم سے بہت کم ہوتی تھی جس کی وہ عادی تھیں اور اب ان کی یہی پلاننگ تھی کہ کسی طرح بھی لمبا ہاتھ ماریں اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس ملک سے نکل جائیں۔
فطرتاً وہ لالچی اور خود غرض عورت تھیں اور دوسروں کی خوش حالی و مسرتوں سے انہیں سخت رنج پہنچتا تھا۔ آج کل تمام تقریبات میں شوق و ذوق سے شرکت کر رہی تھیں جہاں ان کی حریصانہ نگاہیں یہ تاڑتی رہتی تھیں کہ کسی کو کیا گفٹ ملا اور دینے والی جگہوں پر ان کی آنکھیں کام کرنا بند کر دیا کرتی تھیں۔ کل سے ان کی نگاہوں میں مسز قمر کا ہیرے کا سیٹ اور مسز طلعت کی بہو کے جہیز میں ملنے والا ہزار گز کا بنگلہ بسا ہوا تھا۔ اس دکھ کو دور کرنے کے لئے وہ آنسو بہانے کے ساتھ کوئی ایسی ترکیب سوچ رہی تھیں جس کے ذریعے مشعل کو دوبارہ قابو کر سکیں۔
''بھائی جان ایک دن کے لئے کاروبار کے سلسلے میں کراچی سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہئے ہمیں۔'' بالآخر ان کے شیطانی دماغ میں ایک شیطانی ترکیب آ گئی۔
''کیسا فائدہ مما! ہمیں کیا کرنا ہوگا؟'' اس کا انداز سرگوشیانہ تھا۔
''بدھو کے بدھو ہی رہنا تم۔'' رافعہ نے کچھ اس انداز میں کہا کہ جوجو کو ان کا عندیہ جاننے میں دیر نہ لگی۔
''لیکن وہ لفٹ نہیں دیتی۔ میں کس طرح اس کے قریب جا سکتا ہوں؟''
''بس ختم آج سے اس کمبخت کے نخرے...... اب سے وہ وہی کرے گی جو ہم چاہیں گے۔'' وہ جھوم کر کھڑی ہوئی تھیں۔ ان کے لبوں پر ازحد مکروہ و گھناؤنی مسکراہٹ تھی۔
''مما...... مما! ایک بار پھر سوچ لیں۔ اگر ہم کامیاب نہ ہو سکے تو پھر ہمارا انجام کیا ہوگا؟ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔'' وہ تذبذب کا شکار تھا۔
''اسٹوپڈ، مرد ہو، مردانگی کا مظاہرہ کرو۔ ایسی منحوس باتیں کر کے میرا موڈ مت بگاڑو پاگل انسان، ہر کام کامیابی کی امید لے کر کرنا چاہئے اور تم یہ کیوں بھول جاتے ہو کہ مشعل پہلے تمہاری تھی اور تمہارا ابھی اس پر حق ہے اور حق کو حاصل کرنا ہی مردانگی ہے۔ پھر اس طرح سے بھی ہم اسے بلیک میل کر کے وہ سب حاصل کر سکتے ہیں جو چاہتے ہیں۔''
وہ بیٹے کو ایسے گھٹیا فعل کے لئے اکسا رہی تھیں جس کا خیال ہی شریف و دیندار ماں کے قریب نہیں پھٹک سکتا۔

□●□

موسم نے یکدم ہی کروٹ لی تھی۔
سارے دن سے ہوتی سورج اور بادلوں کی آنکھ مچولی اختتام پذیر ہوئی تھی اور سورج کے غروب ہوتے ہی سیاہ بادل ہر سمت چھا گئے تھے اور لمحوں میں ٹپ ٹپ گرتی

بوندوں نے موسلا دھار بارش کا روپ اختیار کر لیا تھا۔ ہوائیں کسی وحشی درندے کی مانند چنگھاڑتی پھر رہی تھیں۔ آسمان کے گرجنے میں بھی زخمی شیروں جیسی غراہٹیں نمایاں تھیں۔

ایک عرصے بعد اس کے چہرے کو جاندار مسکراہٹ نے منور کیا تھا اور از حد آسودگی سے مسکراتا ہوا وہ مشعل کی جانب دیکھ رہا تھا جو اس کے قریب چہرہ جھکائے کھڑی تھی۔

اس کے چہرے پر آنسو بہہ رہے تھے بے تحاشا اور اس وقت اسے وہ چہرہ سرخ گلاب کی مانند لگ رہا تھا جو شبنم کے پاکیزہ اور پُرنور قطروں سے دمک رہا ہو۔

''تمہیں یہی اعتراض تھا کہ میں اس گھر سے بلا اجازت و بغیر اطلاع کے گئی تھی۔ میرے اس احمقانہ اقدام کو تم نے اپنی انا و حمیت کا مسئلہ بنا لیا تھا۔ مجھے احساس ہو گیا ہے انا مرد کی ہو یا عورت کی اگر برقرار رہے تو گھر ٹوٹ جاتے ہیں، آشیانے بکھر جاتے ہیں، کچھ باقی نہیں رہتا۔ یہ انا بہت بری چیز ہے...... بہت بری۔'' افسوس، ندامت، پچھتاوا، خجالت ہر احساس اس کے چہرے سے نمایاں تھا۔

اس نے آگے بڑھ کر بازوؤں کے حلقوں میں قید کر کے بڑی محبت و اپنائیت سے اس کے آنسوؤں کو سمیٹنا چاہا تھا۔

لیکن یہ کیا، مشعل کے چہرے پر اس کے ہاتھ ایسے لہرا کر رہ گئے جیسے وہ ہوا کا وجود رکھتی ہو۔ اس کے بازوؤں کے حلقے سے بھی وہ کسی ہوا کے نرم و سبک جھونکے کی مانند نکل گئی تھی۔ وہ متوحش سا اس کے پیچھے بھاگا تھا اور وہ بھیگے چہرے پر پُرسوز مسکراہٹ سجائے لحہ بہ لحہ اس سے دور ہو رہی تھی، ہواؤں کے دوش پر اُڑتا اس کا وجود گویا جاندار احساس نہ رکھتا تھا۔ دم بہ دم اس کی گرفت سے دور وہ بھاگ رہا تھا۔ بے تحاشہ، پوری قوت سے۔ لیکن وہ ہوا تھی، اس کی دسترس سے دور...... نامعلوم کون سے راستے تھے جو اس کے نیچے آ کر روندرہے تھے اور اس مقام پر جہاں بلند و بالا پہاڑ تھے، نیچے گہری کھائیاں، اس جگہ اس نے اسے پکڑنے کے لئے جیسے ہی بازو بڑھائے تھے مشعل کا دوپٹہ اس کے ہاتھ میں آ گیا تھا اور وہ اس کے سامنے اندھی گہری کھائیوں کی طرف گرتی گئی اور لمحوں میں اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی...... ایسا ہولناک و لرزا دینے والا منظر تھا کہ اس کے لبوں سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھا تھا۔ اس کا ہاتھ ہوا میں اسی طرح معلق تھا جیسے مشعل کا دوپٹہ موجود ہو۔ اس کا سانس بری طرح چل رہا تھا اور ٹھیک ٹھاک سرد موسم میں وہ پسینے میں شرابور تھا اور دل تھا کہ اتنی شدت سے دھڑک رہا تھا گویا سینہ توڑ کر باہر نکل جائے گا۔

'تھینکس گاڈ وہ سب خواب تھا......' وہ بیٹھتا ہوا بڑبڑایا تھا۔ 'لیکن یہ کیسا خواب تھا؟ کچھ حقیقی، کچھ غیر حقیقی...... مشعل نے وہی انداز اپنایا جو مجھے پسند تھا۔ اس نے وہی کیا جو میں اس سے سننا چاہتا تھا پھر وہ کیا تھا؟ اس کا ہوا کے دوش پر اُڑنا، کوشش کے باوجود وہ میری دسترس سے دور رہی تھی۔ پہلی بار میرے دل میں اس کے لئے کوئی امنگ جاگی تھی، پہلی بار بھرپور استحقاق سے میں نے اسے بانہوں میں بھرنا چاہا تھا، اس کے ایک ایک آنسو نے میرے ضمیر کو جھنجھوڑ ڈالا ہے۔ خواب ہمارے احساسات و خواہشات کا عکس ہوتے ہیں۔ میرے اندر کی دبی ہوئی خواہشوں نے کچھ حقیقت کا رنگ بھر اتھا مگر وہ سب کیا تھا؟ مشعل کا دوپٹہ میرے ہاتھ میں رہ جانا اور مشعل کا کھائی میں گر جانا، یہ سب کیا ہے؟ میرے احساسات اتنے منتشر کیوں ہو رہے ہیں؟ میں مانتا ہوں جب تک وہ میرے ساتھ رہی میں اسے نظر انداز کرتا رہا، اس کے جذبات و محبت کا مضحکہ اُڑاتا رہا اور یہ سوچ کر خوش ہوتا رہا کہ اس سے چھٹکارا پا کر بہت خوش و خرم زندگی گزاروں گا...... آہ، مگر......''

''بعض سوچیں، کچھ تدبیریں، کچھ نظریات، انسان کے ساتھ رشتہ تو رکھتے ہیں مگر وقت آنے پر بے وفا و بے مروت دوستوں کی طرح راستہ بدل لیتے ہیں اور آدمی کو تنہا و بے بس کر ڈالتے ہیں۔ میں مشعل سے محبت کا دعویٰ تو نہیں کرتا مگر اعتراف کرتا ہوں کہ میں اس کے بغیر اب رہ نہیں سکتا۔ میں اس کے وجود کا عادی ہو گیا ہوں۔ ایسے ہی جس طرح کوئی نشے کا کہ جان وار سکتے ہیں مگر اس سے چھٹکارا منظور نہیں۔

وہ میری محبت نہیں ضرورت ہے۔

شاید ضرورت کبھی محبت بھی بن جائے۔

دنیا میں حادثے رونما ہوتے رہتے ہیں۔ کبھی نہ کبھی یہ حادثہ ہو جائے گا۔ یہ وقت ممکنات کا وقت ہے، پانی کا مسلسل گرتا قطرہ چٹانوں کے سینے میں شگاف کر سکتا ہے تو انسان تو پھر بہت نرم و نازک ہے۔''

وہ ٹہل رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔

سامنے کھڑکی سے باہر کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ بارش دھواں دھار ہو رہی تھی ساتھ بادلوں کی گرج کے ساتھ بجلی کی چمک نگاہوں کو خیرہ کر رہی تھی۔ اس کے وجیہہ چہرے پر اضطراب و اضطراب کی کیفیت تھی۔ اس کے اندر ہیجان آمیز طوفان بپا تھا۔ اس کی انا و ذات کے گرد کھڑی اجتناب و احتراز کی دیواریں برف کی طرح پگھلنے لگی تھیں۔ وہ احساس، وہ جذبہ، جس سے وہ نا آشنا تھا، لاعلم تھا یا جان بوجھ کر انجان بنا ہوا تھا، اب تمام شدتوں و حقیقتوں کے ساتھ اس کے سامنے تھا۔

شعور و آگہی کے در دھڑا دھڑ وا ہو رہے تھے۔

اس ایک خواب نے اسے ادراک بخشا تھا اور وہ بے کلی و بے چینی کا شکار ہو گیا تھا۔ اس نے کئی گلاس پانی کے پی لئے تھے مگر اضطراب تھا کہ کسی طور بھی کم ہونے کی بجائے بڑھ رہا تھا اور وہ اس بے چینی و گھبراہٹ کو کوئی نام نہ دے پایا تو خطرناک موسم کی پرواہ کئے بغیر کار کی چابی لے کر پارکنگ شیڈ کی طرف بڑھ گیا تھا۔

□●□

اچانک جس طرح ان کو کار میں گھسیٹا گیا تھا اس افتاد پر وہ سنبھلی بھی نہ تھیں کہ گھسیٹنے والے پر ان کی نگاہ اٹھی تو جھلنا بھول گئی۔ کار ڈرائیو کرتے عرفان کو دیکھ کر ان پر سکتے کی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ وہ جو گھبرا رہے تھے، خوفزدہ ہو رہے تھے کہ اس طرح اغواء کرنے پر ان کے شدید ردعمل کو کس طرح فیس کریں گے۔

ان کی یہ گم صم و خاموش کیفیت ان کے لئے سود مند ثابت ہوئی تھی۔ وہ اسی کیفیت میں انہیں ہوٹل کے کمرے میں لے آئے تھے جہاں وہ رہائش پذیر تھے۔ انہیں چھوڑ کر عرفان مصلحتاً کچھ وقت کے لئے اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔ منصور کافی تدبیروں کے بعد فرح کو حواسوں میں لانے میں کامیاب ہوئے تھے۔ فرح نے غصے سے چیخنا شروع کر دیا تھا۔

''ٹیک اٹ ایزی...... ٹیک اٹ ایزی فرح! پلیز غصہ بعد میں ہونا پہلے میری بات سن لو، پھر چاہے مارو گی بھی تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔'' منصور کا دھیما لہجہ خوشامدانہ والتجائیہ تھا۔

''تمہیں ہمت کیسے ہوئی مجھے اس طرح اغواء کر کے لانے کی؟ میں ابھی پولیس کو فون کر کے بلاتی ہوں۔'' وہ شعلہ جوالہ بنی فون کی جانب بڑھی تھیں۔

''پہلے میری بات سن لو، پھر جو چاہے کرتی رہنا۔ حرا کے مفاد کی بات ہے۔'' اسے خونخوار دیکھ کر دانستہ انہوں نے حرا کا نام لیا تھا جس کا ردعمل فوری ہوا تھا۔ ایک جھٹکے سے پلٹ کر گویا ہوئی تھیں۔

''خبردار جو میری مظلوم بہن کا نام اپنی ناپاک زبان سے لیا۔ ہونہہ، اس کے دشمن کو ساتھ لئے گھوم رہے ہو اور بات کرتے ہو اس کے مفاد کی۔''

''پلیز ایک موقع دو مجھے کچھ بتانے کا، ایک راز سے پردہ ہٹانے کا۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں میری نیت، میرے ارادے نیک ہیں۔ میں اللہ کو حاضر و ناظر جان کر کہہ رہا ہوں کہ میرا ایک ایک لفظ سچائی کے قلم سے تحریر ہے۔ اگر ذرا بھی جھوٹ کہوں تو اسی لمحے میری روح پرواز کر جائے۔'' ان کی آنکھوں میں نمی اور لہجے کی لجاجت فرح کو موم کر گئی۔

''جلدی کہو جو کچھ بھی کہنا ہے...... میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔''

''یہ تو تم جانتی ہو مجھے جوئے کی لت کافی پرانی تھی اور ان دنوں جب حرا کی ڈلیوری قریب تھی مجھے کاروبار میں مسلسل نقصان ہو رہا تھا اور ان دنوں مجھ پر ایک پریشر بہت زیادہ تھا، جن سے میں نے ایک سال سے پچاسی لاکھ روپے سود پر حاصل کئے ہوئے تھے، میں کچھ عرصہ ان کو رقم دیتا جا رہا تھا۔ پھر روز بروز ڈوبتے کاروبار اور مسلسل کلب میں ہارنے مجھے اس قدر قلاش کر دیا کہ میرا سکون برباد ہونے لگا اور جو کسر باقی رہ گئی تھی وہ سنڈیکیٹ والوں کی اس دھمکی نے پوری کر دی کہ اگر ان کی رقم فوراً ادا نہ کی گئی تو وہ مجھے مار کر کاروبار پر قبضہ کر لیں گے۔ میں نے تم سے حرا کے اکاؤنٹ استعمال کرنے کا کہا، تم نے سختی سے انکار کر دیا اور مستقل انکار پر ڈٹی رہیں۔ یہاں تمہارا انکار وہاں ان کی دھمکیاں، مجھے اپنی جان بچتی ہوئی نظر نہیں آ رہی تھی اور ایسے میں، میں خود غرض بن گیا بلکہ شیطان مجھ پر حاوی ہو گیا اور میں نے......'' اعتراف جرم کرتے ہوئے ان کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ چہرہ جھک گیا تھا۔

''میں جو کچھ کہہ رہا ہوں تمہیں اپنے جذبات پر قابو رکھ کر سننا ہو گا۔ خواہ بعد میں جو حشر کرنا چاہو، میرا کر سکتی ہو۔ ابھی تو پلیز خاموشی سے سننا۔ میں نے انڈیا میں عرفان سے رابطہ کیا اور اس سے سودے بازی کی، منہ مانگی رقم لے کر میں نے حرا کے متعلق انفارمیشن دے دی اور پھر ہم نے بہت گھناؤنا کھیل کھیلا۔ عرفان پاکستان آ گیا۔ ہم نے ہسپتال کے تمام عملے کو خریدا اور پلان کے مطابق حرا کے نارمل کیس کو میجر کیس میں تبدیل کروایا تاکہ اس کی بے ہوشی کے دوران بچہ آسانی سے تبدیل کیا جا سکے اور جس وقت تم نے ہسپتال میں یہ شبہ ظاہر کیا کہ تمہیں عرفان جاتا ہوا نظر آیا ہے وہ حقیقت تھی۔ مردہ بچہ اوٹی میں پہنچا کر وہ حرا کے زندہ بچے کو لے گیا تھا۔''

''او گاڈ...... او گاڈ...... اتنی بڑی سازش، ایسا بدترین گناہ کرنے کے باوجود تم اپنا گناہگار وجود لئے اسی دھرتی پر موجود ہو؟ ایسے غیر انسانی کام کے باوجود اتنے سکون سے جی رہے ہو؟'' اس انکشاف پر وہ دہل اٹھی تھیں۔ ان کے کانپتے لہجے میں نفرت و حقارت کی چنگاریاں تھیں۔ وہ قہر برساتی نگاہوں سے منصور کو گھور رہی تھیں۔

''ہاں، جی رہا ہوں...... اس لئے کہ یہ زندگی سزا کے طور پر ملی ہے۔ جو گناہ میں نے کئے ان کی لحہ لحہ سزا بھگتی ہے۔ وہ رقم لے کر میں یہاں سے ماسکو فرار ہو گیا تھا۔ مجھے معلوم نہ تھا میرے دشمن میرے تعاقب میں ہیں۔ ایئرپورٹ پر انہوں نے مجھ سے رقم چھین لی اور اتنا تشدد کیا کہ میں اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھا تھا۔ پورے انیس سال جانوروں سے بدتر زندگی گزاری ہے۔ کچھ عرصے قبل عرفان حادثاتی طور پر ٹکرا گیا تھا۔ اس نے میرا علاج معالجہ کروایا، مجھے اس قابل بنایا کہ میں ذاتی طور پر اپنا کوئی بزنس کروں۔ یہ اسی کی مہربانی ہے کہ میں یہاں بیٹھا ہوں ورنہ پاگل خانے میں سر پٹخ پٹخ کر مر چکا ہوتا۔''

''تاسف ہے تمہاری سوچ پر...... اتنا کچھ کرنے کے باوجود زندگی کی مزید خواہش رکھتے ہو تم۔ ذلت کو عزت سمجھنے والے ہو آخر۔''

''تم جو چاہو کہہ سکتی ہو۔ ہر بات، ہر طنز کرنے میں حق بجانب ہو۔ میں حرا کا ہی نہیں تمہارا بھی مجرم ہوں۔ بیوی اور گھر کے سکون و محبت کو چھوڑ کر ٹھوکر مار گیا تھا۔ مجھے وقت کی ٹھوکروں نے آج تک نشانے پر رکھا ہے۔''

''زندگی میں ہی نہیں، مرنے کے بعد بھی تم اسی طرح بے سکونی و عذاب میں مبتلا رہو گے۔ تم نے ایسا گناہ کیا ہے جس کو شاید اللہ بھی معاف نہ کرے۔ میرے اعتماد و محبت

کو تو تم نے دھوکا دیا ہی ہے، اس پر تو میں تمہیں معاف کرتی ہوں، یہ سوچ کر کہ شاید میرے مقدر کا لکھا تھا یہ۔ اور جس گھر کو اور اپنوں کو ٹھوکر مار کر گئے تھے وہ نہ گھر کا سکون و آسودگی حاصل ہوئی نہ اپنوں کی رفاقت و افتخار۔ لیکن حرا کے ساتھ کی گئی اتنی بھیانک زیادتی کبھی نہ معاف کروں گی۔'' وہ سخت لہجے میں بولیں۔

''یہ سراسر میرا جرم ہے سسٹر، آپ مجھے سزا دیں۔'' عرفان اندر داخل ہوتا ہوا عاجزانہ لہجے میں بولا۔

''تم ...... تم مجھے اپنی منحوس صورت نہ دکھاؤ۔ جتنی تمہاری چمڑی سفید ہے دل تمہارا اتنا ہی سیاہ ہے۔ سیاہ پتھر کا ایک ٹکڑا جس میں احساسات و جذبات بالکل پتھر کی مانند جامد ہو چکے ہیں۔ ظالم، بے رحم، فرعون، تو نے میری بہن کو اس کے شریک حیات کے آخری دیدار تک سے محروم رکھا اور پھر بھی تیرے دل کی آگ نہ بجھی تو اسے اس کے بچے کے پہلے اور آخری دیدار سے بھی محروم کر ڈالا۔ منصور کی کوئی اولاد نہیں تھی، وہ بے اولاد تھا، نہیں جانتا تھا کہ اولاد کی محبت کیا ہوتی ہے؟ کوئی اپنی اولاد کی خاطر سب کچھ وارنے کو تیار کیوں ہو جاتا ہے؟ لیکن تم تو اولاد والے تھے، اس درد کو، اس محبت کو جانتے تھے۔ تمہیں تو اللہ نے جھولی بھر کر اولاد دے رکھی تھی۔ پھر تم نے کس طرح ایک ماں کو اور تمہارے ظلم کی شکار بیوہ عورت کو اس کی اولاد سے محروم کر دیا؟'' انہوں نے آگے بڑھ کر عرفان کا گریبان پکڑ کر سخت طیش میں کئی تھپڑ اس کے چہرے پر لگاتے ہوئے کہا۔

عرفان نے کوئی مزاحمت نہ کی تھی۔ نہ ان کے ہاتھوں سے اپنا گریبان آزاد کروایا تھا، نہ ان کے چلتے ہاتھوں کو روکنے کی کوشش کی تھی۔ وہ ہانپتے ہوئے خود ہی دور ہوئی تھیں۔ جب کہ وہ اسی طرح گردن جھکائے کھڑا تھا۔

''کاش یہ تھپڑ مجھے بچپن میں بھی لگ گئے ہوتے تو آج میں قابل فخر انسان ہوتا اور ایسا کچھ نہ ہوتا جس نے کئی زندگیوں کو تباہ کر ڈالا ہے۔'' وہ آہستگی سے گویا ہوئے تھے۔

''اب کیا چاہتے ہو تم لوگ؟ کیا مقصد ہے تمہارا؟ تباہ و برباد تو ہم ہو گئے ہیں۔ اب کیا کسر باقی ہے؟ کون سا پلان تمہیں دوبارہ یہاں لایا ہے؟'' وہ سخت متنفر تھیں۔

''بندہ جیسا کرتا ہے ویسا بھرتا ہے۔ ہم جب گناہ کرتے ہیں تو سمجھتے ہیں ہمیں کوئی نہیں دیکھ رہا، ہمارے کسی غلط عمل پر ہماری گرفت نہ ہو گی۔ ہم سدا یوں ہی من مانی کرتے رہیں گے اور یہ خوش فہمی ہماری ہتھکڑی بن جاتی ہے اور ہم اپنے ہی لگائے گئے گناہوں کے جال میں خود پھنس جاتے ہیں۔ میں نے ایک گود خالی کی تھی۔ قدرت نے مجھے گھر سے تہی دامن رکھا۔ اس کے بعد میرے خاندان میں کسی کی گود آباد ہی نہ ہو سکی۔ میری بہن اپنے خاندان سمیت صفحۂ ہستی سے مٹ گئی اور میرا خاندان بانجھ خاندان مشہور رہے۔ دولت کی لالچ میں نے اور میری بہن نے کی تھی اور سزا میرے ساتھ میرا خاندان پا رہا ہے۔ ہمارے پاس بہت دولت ہے، بے تحاشا جائیداد ہے اور ہم اس اصل جائیداد سے محروم ہیں جس کو اولاد کی نعمت کہتے ہیں۔ میری نسل کو کوئی چلانے والا نہیں ہو گا۔ میرے خاندان کا نام و نشان مٹ جائے گا، فنا ہو جائے گا۔'' عرفان نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

''مجھے ایک بار حرا جی سے ملوا دیں، میں ان سے معافی مانگنا چاہتا ہوں۔ وہ جو چاہیں گی میں وہی کروں گا۔ میں تمام دولت ان کے نام لکھنے کو تیار ہوں۔ وہ مجھے صرف ایک بار معاف کر دیں دل سے، سچی معافی۔ مجھے یقین ہے وہ معاف کر دیں گی تو رب بھی مجھے معاف کر دے گا۔ میرے خزاں رسیدہ صحن میں بہار آ جائے گی۔ میرا خاندان آباد ہو جائے گا۔'' وہ بری طرح گڑگڑا رہا تھا۔

''ایک عورت تو تمہیں معاف کر دے مگر شاید ایک ماں معاف نہ کر سکے۔''

''فرح! تم حرا سے بات کرو، اسے تمام صورت حال بتاؤ، وہ ایک عورت یا ماں بن کر معاف نہ کر سکے تو خرم کی بیوہ ہونے کے ناتے سے ضرور معاف کر دے گی۔ خرم کے حوالے سے تو وہ اس خاندان کی تباہی نہ چاہے گی۔'' منصور نے مشورہ دیا تھا۔

''نہیں ...... اگر حرا ایسا کرنا بھی چاہے گی تو میں کرنے نہیں دوں گی۔''

''کیوں ...... تم اتنی سفاک کب سے بن گئیں؟''

''جب سے میں نے اسے چھپ چھپ کر اپنے بچے کے لیے روتا ہوا دیکھا ہے۔ یہ اچھا انصاف ہے۔ دوسری کی زندگی تباہ و برباد کرنے کے بعد خود بھکاری بن کر آ گئے، مطلب پرست لوگ اسی طرح کینچلی بدل لیتے ہیں۔''

''اگر میں یہ کہوں حرا کا بچہ زندہ ہے تو پھر کیا کہو گی؟''

''کیا، کیا ......؟ ایسے بے ہودہ مذاق کو میں برداشت نہیں کر سکتی۔''

''یہ مذاق نہیں حقیقت ہے۔ ان کا بچہ زندہ ہے اور اسی شہر میں ہے۔'' عرفان کا لہجہ سچا تھا۔ ساتھ منصور نے بھی تائید کی تھی۔

''یہ ...... یہ تمہاری کوئی نئی چال ہے، دھوکا دینے کی نئی سازش۔''

ان پر عجیب سے احساسات نے غلبہ کیا تھا۔ وہ سراسیمہ سی کھڑی ہو کر بولیں۔

''نہیں، یہ جھوٹ، فریب، سازش کچھ نہیں ہے۔ صرف اور صرف حقیقت ہے۔ تم حرا کو راضی کرو، ہم ان سے رابطہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔''

□●□

مرے جانے پرائے جاناں
پریشاں تم نہیں ہونا
کبھی چھپ کر نہیں رونا
جدائی زہر ہوتی ہے
مجھے معلوم ہے لیکن
فراق و ہجر کا موسم
یقیناً بیت جائے گا
یقیناً وصل کے لمحے
دوبارہ لوٹ آئیں گے
وہی شامیں، وہی راتیں
وہی قصے، وہی باتیں
وہی پھر داستاں ہو گی
محبت مہرباں ہو گی
محبت مہرباں ہو گی

زندگی یونہی رواں دواں تھی۔ ہر صبح کے بعد شام اور پھر رات آ جاتی۔ کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا ماسوائے مشعل کے جو اپنی ذات کے خول میں بند ہو کر رہ گئی تھی، کسی حنگی مجسمے کی مانند جو کبھی ایک عالم کو اپنے حسن کی رعنائیوں سے مسحور کیا کرتی تھی۔ اب اپنے وجود کو ہی فراموش کر بیٹھی تھی۔

وہ تھی اور اس کی تنہائیاں جہاں وہ فقط ایک ستمگر و بے وفا محبوب کے تصور میں دنیا کو بھلائے محو رہتی تھی۔

باہر بارش زور و شور سے برس رہی تھی۔

اس کے اندر بھی ایک ساون کب سے رواں تھا۔

جس کا ہر قطرہ، ہر بوند دل میں پیا ملن کی آگ سلگائے ہوئے تھا۔

اس کی دید کی پیاس تھی۔

سماعت اس کی آہٹوں کی منتظر تھی اور دل ہر لمحہ اسے محسوس کرتا تھا۔ وہ نگاہوں سے دور ہوا تھا مگر دل ہر ساعت اس کے تصور سے آباد رہا کرتا تھا۔ اس کی یاد کسک بن کر اس کے دل میں کسی کانٹے کی طرح پیوست تھی جس سے اٹھنے والی ٹیسیں آنسو بن کر اس کے نینوں سے برستی رہتی تھیں۔

اس وقت جل تھل موسم اسے گزرا ہوا وہ وقت یاد دلا رہا تھا جب وہ شاہ ویز کے سنگ تھی۔ اس کی ہزار ہا بے رخی و بے اعتنائیوں کے باوجود وہ اس کے قریب تو تھی۔

کوئی اس کا دروازہ زور زور سے پیٹ رہا تھا۔

اس نے کھڑکی بند کی اور دروازہ کھولا تو سامنے جو جو کھڑا تھا۔

''کیا ہوا؟'' وہ حیرانگی سے گویا ہوئی۔

''میں تم سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

''اس وقت؟ تمہیں معلوم نہیں کیا ٹائم ہو رہا ہے؟'' اس کے لہجے میں ناگواری تھی۔ وہ دروازہ لاک کر کے پلٹنا ہی چاہتی تھی کہ یکدم ہی جو جو نے اسے دھکا دیا تھا اور اس کے راستے سے ہٹتے ہی پھرتی سے اندر آ کر دروازہ لاک کر دیا تھا۔

''یہ کیا بے ہودگی ہے جو جو؟'' وہ پلٹ کر غرائی تھی۔

''یہ بے ہودگی نہیں، پیار ہے۔'' اس کے لہجے میں خباثت تھی۔

''مطلب کیا ہے تمہارا؟ تم کیوں ایسی بکواس کر رہے ہو؟''

''مطلب ادھر قریب آؤ تو سمجھاؤں۔ ایک غیر مرد اس گھر کی دولت اور تمہارے تن کی دولت پر ہاتھ صاف کر گیا اور ہم منہ دیکھتے رہ گئے۔''

''جوجو! زبان بند کرو اپنی۔ تم اتنے گھٹیا اور ذلیل ہو۔ اگر مجھے معلوم ہوتا تو میں تمہیں اس گھر کے آس پاس بھی پھٹکنے نہیں دیتی۔ تمہاری خیریت اسی میں ہے کہ ابھی اسی وقت اپنی یہ مکروہ شکل لے کر ہمیشہ کے لئے دفع ہو جاؤ۔'' جوجو کے اس روپ نے اس کے ذہن و دل کے ٹکڑے کر ڈالے تھے۔ وہ غصے و رنج سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔

''فکر مت کرو جانِ من! ہمیشہ کے لئے چلا جاؤں گا لیکن اپنا حق وصول کرنے کے بعد۔ جن خواہشوں کو عرصے سے سنبھالے گھوم رہا ہوں اب تو ذرا ان کے سیراب ہونے کا وقت آیا ہے۔'' اس کی بھوکی نگاہیں اس کے سراپے کو چھیدنے لگی تھیں۔

''میرے قریب مت آنا۔'' اسے اپنی جانب بڑھتے دیکھ کر وہ ہذیانی انداز میں چیخی تھی۔

''تم گھبرا تو ایسے رہی ہو جیسے پہلی بار کسی مرد سے واسطہ پڑا ہو۔'' چہرے سے مہذب و بے ضرر نظر آنے والا مکمل شیطان کا روپ تھا۔

''گیٹ لاسٹ ...... گیٹ لاسٹ ......'' وہ پوری قوت سے چیخی تھی۔

''نہیں ...... تم مجھ سے نہیں بچ پاؤ گی۔ میں تمہیں حاصل کر کے رہوں گا۔ مجھ سے اب تمہاری دوری برداشت نہیں ہوگی۔'' اس نے آگے بڑھ کر اس کے بازو تھام کر کہا۔

''چٹاخ ...... چٹاخ ...... چٹاخ ......'' اس کا ہاتھ اٹھا تو اٹھتا چلا گیا۔ وہ غصے سے دیوانی ہو رہی تھی۔

''تم نے کیا سمجھا ہے مجھے ...... میں کوئی کال گرل نہیں ہوں جو بخوشی تمہاری ہوس کی ناپاک آگ بجھانے کو تیار ہو جائے۔ میں ایک غیرت مند مرد کی بیوی ہوں اور عزت دار باپ کی بیٹی ہوں اور میری ماں بھی شریف اور نیک چلن تھی۔''

''نیک چلن ماں؟ ...... عزت دار باپ ......؟ ہاہاہا ...... کیا معزز گھرانہ پایا ہے تم نے۔'' اس کے تھپڑوں کو نظر انداز کر کے وہ استہزائیہ قہقہے لگانے لگا تھا۔ ''سنو، کان کھول کر سنو تم کتنی نیک چلن ماں کی اولاد ہو ...... حسن انکل تمہارے باپ نہیں ہیں اور نہ ہی ان کی مرحومہ بیوی سے تمہارا کوئی تعلق ہے۔ تم تو وہ گندگی کا ڈھیر ہو جس کو بد چلن عورتیں رات کی تاریکی میں کوڑے کے ڈھیر پر ڈال جاتی ہیں کہ گندگی کی جگہ گندگی ہی ہوتی ہے۔ لیکن تمہاری قسمت اچھی تھی جو حسن انکل تمہیں کوڑے کے ڈھیر سے اٹھا کر اس محل میں لے آئے اور تمہیں معاشرے میں اپنے نام کی عزت دی یا مقام دیا۔ ورنہ تم خود گناہ کا وجود ہو۔''

''نہیں ...... جھوٹ بول رہے ہو تم ...... جھوٹے ہو ...... میں اپنے پاپا کی بیٹی ہوں۔ میں حسن بیگ کی بیٹی ہوں۔ میری پہچان ہے، میں گم نام نہیں ہوں۔'' اس کے اندر دھماکے ہو رہے تھے۔ یہ کیسا انکشاف تھا کہ جس پر نہ کرنے کے باوجود یقین آ رہا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے جوجو کو گھور رہی تھی۔

''یقین نہیں آ رہا، کل انکل واپس آجائیں گے۔ ان سے معلوم کر لینا۔ وہ کوشش کے باوجود تم سے کچھ نہ چھپا پائیں گے۔ سب بتا دیں گے۔ کم آن، میں نے تمہیں تمہاری حقیقت سے آگاہ کیا ہے۔ اب انعام کے طور پر تم مجھے خوش کر دو۔'' اس نے آگے بڑھ کر اسے اپنی طرف کھینچنا چاہا تھا۔ مشعل نے زوردار دھکا دے کر اسے گرا ڈالا اور دروازہ کھول کر باہر کی جانب سرپٹ بھاگی تھی۔

وہ نادیدہ شعلوں میں جل رہی تھی۔

ملازم کوئی بھی پکارنے پر اس کی مدد کو نہیں آیا تھا۔ رافعہ انہیں پہلے ہی بہانے سے چھٹی دے چکی تھی۔ جوجو اسے وارننگ دیتا ہوا اس کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ وہ اندرونی حصے سے نکل کر لان سے ملحقہ گیٹ کی جانب بڑھ گئی۔

''واچ مین ...... واچ مین ......'' وہ اس کے قریب جا کر پکار رہی تھی۔

''کوئی بھی تمہاری مدد کو نہیں آئے گا۔ ہم نے پہلے ہی تمام راستے بند کر دیئے ہیں۔ چلو شاباش، اندر آجاؤ۔ اس ٹھنڈے موسم میں بارش میں بھیگنا اچھا نہیں ہوتا۔'' جوجو اس سے کچھ فاصلے پر رک کر مسکرا کر بولا۔

''میں اپنی جان دے دوں گی مگر تمہارے عزائم کامیاب نہیں ہونے دوں گی۔''

''جوجو! کوئی کام بھی تم سے ڈھنگ سے نہیں ہو سکتا۔ کیوں باہر آنے دیا اس کو ...... واچ مین آتا ہی ہوگا۔ جلدی کرو، اس کو اندر لے کر جاؤ۔'' رافعہ جو پوشیدہ رہ کر ان کی نگرانی کر رہی تھی، کھیل بگڑتا دیکھ کر باہر نکل آئی تھیں۔

''اوہ ...... تو تم بھی اس گھناؤنی سازش میں شریک ہو ...... کیسی ماں ہو تم۔''

''بکواس مت کرو ...... شرافت سے اندر آجاؤ۔'' وہ جھلا کر بولی تھیں۔

''شرافت کا لفظ تم جیسے گھٹیا لوگوں کے منہ پر جچتا نہیں ہے۔ میں اندر نہیں باہر کر کے آؤں گی۔'' اس کا لہجہ ہر قسم کے خوف و ڈر سے مبرا تھا۔

''جوجو! منہ کیا دیکھ رہے ہو، اس کو پکڑ کر اندر لاؤ۔ واچ مین آ رہا ہوگا۔''

وہ دانت پیس کر خود بھی اس کی جانب بڑھی تھیں۔ ان دونوں کو اپنی جانب بڑھتے دیکھ کر مشعل گیٹ کی جانب بڑھی تھی اور لاک کھول کر باہر کی جانب اندھا دھند بھاگ لی تھی۔

اسے فکر اپنی جان کی نہیں، اپنی عزت کی تھی۔ ان ماں اور بیٹے کی آنکھوں میں ناچتے شیطان کو وہ بخوبی دیکھ چکی تھی۔

شدت سے برستی بارش اور ایسی گرج و چمک میں وہ کبھی کمرے سے نکلنے کا تصور بھی نہ کر سکتی تھی جو اب عصمت کی خاطر وہ بے تحاشہ بھاگ رہی تھی۔ وہ دونوں بھی اس کے پیچھے آ رہے تھے۔ وہ پوری قوت سے بھاگ رہی تھی اور سامنے سے اچانک آنے والی کار بھی فل اسپیڈ سے آ رہی تھی۔ رکتے رکتے بھی کار اس سے ٹکرائی تھی اور وہ کار سے ٹکرا کر نیچے سڑک پر بے ہوش ہو کر گری تھی۔

شاہ ویز بے اختیاری طور پر اس سمت چلا آیا تھا اور اس سمت کا ٹرن کرتے وقت اس نے ایک لڑکی کو بے تحاشا بھاگتے ہوئے اسی سمت آتے دیکھا تو کار کو بریک لگایا تھا اور فل اسپیڈ میں ہونے کے باعث ٹائر بری طرح کراہ رہے تھے اور بریک لگتے لگتے بھی لڑکی کار سے ٹکرا کر گر پڑی تھی۔

وہ گھبرا کر باہر نکلا تو سامنے سے بھاگتے ہوئے آتے جوجو اور رافعہ بیگم کو دیکھ کر اس کا ماتھا ٹھنکا تھا۔ وہ بھی جو قریب آئے تو شاہ ویز کو پہچان کر الٹی دوڑ لگا دی تھی۔ اس نے جھک کر اسے سیدھا کیا تھا۔

مشعل پر نظر پڑتے ہی وہ بے اوسان ہو گیا اور اس کے بھیگے وجود کو اٹھا کر کار کی عقبی سیٹ پر ڈالا تھا۔ لمحوں کی اس کارروائی میں وہ بھی بارش کے پانی میں شرابور ہو گیا تھا جس کی اسے کوئی پرواہ بھی نہ تھی۔

کار فل اسپیڈ سے دوڑاتا ہوا وہ ہسپتال کی جانب گامزن تھا۔ کار کی اسپیڈ سے زیادہ اس کے ذہن میں دھماکے ہو رہے تھے۔ جس صورت حال سے اس کا واسطہ پڑا تھا وہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔

اس کی سمجھ نہیں آ رہا تھا یہ سب کیا ہے؟ ایسی برستی بارش میں مشعل کا اس طرح رات کے اس پہر بھاگنا اور اس کے پیچھے رافعہ اور جوجو کا بھاگ کر آنا اسے پریشانی و تفکرات میں مبتلا کر گیا تھا۔

□●□

حرا کے بچے کے زندہ ہونے کی خبر نے فرح کو اتنا مسرور کر دیا تھا کہ وہ ان دونوں سے وعدہ کر آئی تھی کہ حرا کو تمام صورت حال بتا کر راضی کریں گی کہ وہ عرفان کو معاف کر دیں۔ عرفان ان کے اس حوصلہ افزا رویئے کے بڑے مشکور تھے۔

گھر آ کر تمام معمولات سے فراغت حاصل کرنے کے بعد انہوں نے حرا کو ان باتوں سے آگاہ کیا تھا جو انہیں عرفان اور منصور سے معلوم ہوئی تھیں۔

حرا پہلے بے یقینی سے ان کی جانب کافی دیر تک دیکھتی رہی تھیں۔ اس دوران ان کے چہرے نے کئی رنگ بدلے تھے۔ پھر وہ فرطِ جذبات سے مغلوب ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

''آپی ...... آپی ...... کیا یہ سچ ہے کہ میرا بچہ زندہ ہے؟ آپی! آپ کو یقین ہے، انہوں نے جو کہا وہ سچ ہے؟ کیا اتنے عرصے جس بچے کو میں مردہ تصور کر کے روتی رہی، وہ زندہ ہے، ہنستا مسکراتا سانس لیتا ہوا۔'' ان کے انداز میں دیوانگی در آئی تھی۔

''ہاں ...... ہاں ...... تمہارا بچہ زندہ ہے، سلامت ہے۔''

''نہیں ...... وہ جھوٹ بول رہے ہوں گے۔''

''مجھے چہروں کی شناخت ہے ...... جھوٹ و سچ میں جان سکتی ہوں اور مجھے یقین ہے وہ سچ کہہ رہے ہیں، تمہارا بچہ زندہ ہے اور اسی شہر میں ہے۔''

''وہ زندہ ہے، اسی شہر میں ہے تو مجھے لے چلو اس کے پاس۔ میں دیکھنا چاہتی ہوں، چھو کر یقین کرنا چاہتی ہوں کہ وہ ہے، زندہ ہے، میرا ہے، میرے لئے ہے۔ چلو آپی ابھی اور اسی وقت۔ مجھے اب صبر نہیں آئے گا۔ اتنے سال اس سے بچھڑ کر زندہ تھی۔ اب ایک لمحے کی اس کی جدائی مجھے مار ڈالے گی۔''

فرح نے دزدیدہ نگاہوں سے بہن کی جانب دیکھا تھا جس کی حالت بن جل مچھلی کی مانند تھی۔ وہ سینے پر ہاتھ رکھے بے قراری سے ٹہل رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ممتا جاگ اٹھی تھی۔

''حرا!'' انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر صوفے پر بٹھاتے ہوئے نرمی سے کہا۔ ''میں نے عرفان کو فون کر دیا ہے۔ وہ کہہ رہا ہے کہ کچھ ٹائم لگے گا۔ دراصل جس کے پاس تمہاری بے بی ہے، ان سے انہیں رابطہ کرنے میں دشواری پیش ہو رہی ہے۔ ان سے کنٹیکٹ ہوتے ہی وہ ہمیں وہاں لے چلیں گے۔''

''میری بے بی ...... کیا مطلب آپی؟ کیا بیٹا نہیں، بیٹی ہے میری؟'' اس کی حیرانگی میں مسرت کے رنگ چمک رہے تھے۔

''ہاں، عرفان نے یہی بتایا ہے اور کل میں اس ڈاکٹر سے بھی ملی تھی جس نے تمہارا اسٹرز کیا تھا۔ اس نے بھی تصدیق کی تھی کہ تمہاری بیٹی ہوئی تھی اور بہت ایمرجنسی میں اس نے تمہارا کیس آپریٹ کیا تھا۔ اسی رات کی فلائٹ سے وہ مزید اسٹڈی کے لئے یورپ چلی گئی تھی۔ اس کی لاعلمی میں اسٹاف نے یہ گیم کھیلا تھا۔''

''پھر وہ بچہ کس کا تھا؟'' حرا کی نگاہوں میں سفید رنگت والا وہ معصوم پیارا بچہ گھومنے لگا جس کی بند آنکھوں کو اس نے کئی بار چوما تھا، جس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کی سرد بند مٹھیوں کو اپنی برستی آنکھوں سے لگایا تھا۔ اس کی تدفین منصور نے اپنے چند عزیزوں اور دوستوں کے ساتھ مل کر کی تھی اور تب سے آج تک وہ اسے اپنے تصور میں

اسی طرح دیکھتی آئی تھی۔

سفید چہرہ

بند آنکھیں

بند مٹھیاں

اور برف جیسے سرد جسم والے بچے کو وہ اپنا بچہ سمجھتی آئی تھی۔ اس لئے کہ اسے یہی باور کروایا گیا تھا وہ اس کا بچہ ہے جو مردہ پیدا ہوا ہے۔

''وہ تھی کوئی بدنصیب عورت جو مردہ جڑواں بچوں کو جنم دے کر مر گئی تھی اور نرس نے مکاری سے ایک بچے کو تمہارے پہلو میں لٹا کر تمہارا بچہ ظاہر کر دیا تھا۔ تم دونوں ایک ہی تھیٹر میں تھیں اس لئے نہ تمہیں شبہ ہوا اور نہ اس عورت کے لواحقین کو۔''

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا آپی میں خوش ہوں یا اداس۔ خرم کی خواہش تھی کہ ان کی بیٹی ہو جو میرا رنگ روپ لے کر پیدا ہو۔ ایک مرتبہ عرس کے موقع پر خرم اجمیر شریف گئے تھے اور وہاں یہ دعا مانگ کر آئے تھے کہ ان کو بیٹی کی خوش خبری ملے اور وہ یہ بھول گئے تھے کہ جب بیٹی کی پیدائش کی دعا مانگی جاتی ہے تو اس سے بھی قبل اس کے خوش بخت ہونے کی دعا بھی مانگی جاتی ہے۔ بیٹیاں تو اندھیروں میں اجالا بکھیرتے چراغوں کی مانند ہوتی ہیں۔ خوف بیٹیوں کا نہیں ان کے نصیبوں کا ہوتا ہے۔'' وہ بہتے آنسوؤں کے درمیان کہتی جا رہی تھیں۔ فرح کی آنکھیں بھی خشک نہ رہ سکی تھیں اور ابھی اس کی بات جاری تھی کہ فون کی بیل بجنے لگی۔

فرح نے فون اٹھایا تو دوسری طرف عرفان تھا جس نے یہ اطلاع دی کہ وہ اس شخص تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکے ہیں اور شام تک وہ ان سے ملاقات کرنے کا اپائنٹمنٹ لے چکے ہیں لیکن وہ وہاں جانے سے قبل حرا سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ لاؤڈ ر آن ہونے کی وجہ سے حرا تمام گفتگو سن چکی تھی۔ بات مکمل کرنے کے بعد ان کے درمیان نگاہوں کا تبادلہ ہوا تھا۔

''ہیلو، حرا اسپیکنگ۔'' اس نے ریسیور پکڑ کر سپاٹ لہجے میں کہا۔

''میں...... میں عرفان بول رہا ہوں۔'' عرفان کے لہجے میں شرمساری و ندامتوں کی کپکپاہٹ تھی۔ وہ لہجے کا جاہ و جلال و رعب و دبدبہ راکھ ہو چکا تھا۔ وہ جوانی کا گھمنڈ اور طاقت و غرور ڈھلتی شام کی طرح ڈھل چکا تھا۔ یہ آواز تو کسی ایسے بے بس، لاچار و مایوس کن عمر رسیدہ شخص کی تھی جس کی حیات کی ناؤ دھیرے دھیرے موت کے ساحل کی طرف رواں دواں ہو اور وہ بے بسی سے لمحہ بہ لمحہ قریب آنے والی موت کو دیکھ رہا ہو۔

''میں آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ بلکہ...... بلکہ معافی مانگنا چاہتا ہوں۔ میں نے جو کیا وہ قابل معافی ہرگز نہیں ہے۔ مگر مجھے یقین ہے آپ مجھے......'' الفاظ اس کا ساتھ دینے سے کترا رہے تھے۔ اٹک اٹک کر از حد شرمندگی سے وہ مجرمانہ لہجے میں گویا اپنے جرم کا اعتراف کر چکا تھا اور ساتھ ہی اس سے معافی کا بھی خواستگار تھا۔ حرا نے اس کی بات قطع کر کے کہا۔

''تمہاری آواز سن کر میرے دل پر لگے زخموں کے ٹانکے پھر سے ادھڑ گئے ہیں۔ جن تکلیف دہ یادوں کو ذہن سے کھرچنے میں اب ایک طویل عرصے بعد کامیاب ہوئی تھی، وہ زخم زخم یادیں از سر نو ابھر آئی ہیں۔ ستم کر کے معافی مانگ لینا بہت سہل ہے مگر ستم سہہ کر معاف کر دینا اعلیٰ ظرفوں کا کام ہوتا ہے اور شاید فرح آپی جیسی اعلیٰ ظرف و بے غرض بہن کی سنگت میں رہنے کے باعث میں بھی اسی کا کچھ مظاہرہ کر دیتی اگر بیٹی کی بجائے بیٹے کے ساتھ تم نے یہ سلوک کیا ہوتا۔ کیونکہ بیٹے تو کیچڑ کے ڈھیر پر پل کر بھی باعصمت و باکردار رہتے ہیں مگر بیٹی کے کردار پر کیچڑ کی ایک چھینٹ، گندگی کی ایک بوند، غلاظت کا معمولی سا دھبہ بھی اس کی عصمت کی چادر کو داغدار کر دیتا ہے۔ اگر میری بیٹی کسی ایسے ویسے خاندان کی فرد بنی تو؟ یاد رکھنا میں نے تمہیں آج تک بددعا نہیں دی مگر پھر تم میری بددعا سے نہیں بچ سکو گے۔ تا حیات میں تمہیں معاف نہیں کروں گی۔'' اس کی آواز میں جوش و غضب تھا، منفی سوچوں نے اس پر دھاوا بول دیا تھا۔ جب کہ دوسری طرف وہ بالکل خاموش و ساکت تھا، صرف سانسوں کی آواز تھی۔

''تم نے جو اس سے قبل میرے ساتھ کیا میں اس کو دہرانا نہیں چاہتی، تمہارے ساتھ جو بھی کچھ ہوا یا جو اب تمہاری فیملی کے ساتھ ہو رہا ہے اس میں میری کسی آہ یا بددعا کا کوئی دخل نہیں ہے کیونکہ میں دکھ اور پھر دکھوں کے سلسلوں میں اس طرح جکڑی تھی کہ کسی کو دعا یا بددعا دینے کا نہ وقت ملا نہ یاد، تمہارے ساتھ جو بھی کچھ ہوا اسے مکافات عمل کہتے ہیں۔ کیونکہ ہمارا صبر و استقلال مفاہمت و استطاعت کا پھل وہاں سے ملتا ہے جو سب کو انصاف دینے والا ہے۔ بے سہاروں و بے کسوں کا انتقام لینے والا ہے۔ اس کی عدالت سے سب کو انصاف ملتا ہے۔ وہ سچا منصف ہے۔ پھر بھی تمہارے دل کی تسلی کے لئے سچے دل سے کہہ رہی ہوں تم نے جو کچھ میرے ساتھ کیا وہ میں تمہیں اللہ کے واسطے معاف کرتی ہوں۔ اگر تم میری وجہ سے کسی بھی آزار میں مبتلا ہو تو میری دعا ہے اللہ تمہیں اس سے آزاد فرمائے مگر اپنی بیٹی کے متعلق کسی بری خبر پر تم مجھ سے کسی معافی کی امید مت رکھنا۔'' اس نے اتنا کہہ کر ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا۔

□●□

مشعل کے سر پر گہری چوٹ آئی تھی۔

زخم کی ڈریسنگ کر دی گئی تھی۔ نیند آور انجکشن کے زیر اثر وہ بے خبر سو رہی تھی اور وہ اس کے نزدیک کرسی پر بیٹھے ہوئے بہت غور سے اس کے چہرے کے تیکھے نقوش کو دیکھ رہا تھا۔ بے جی زرینہ کے ہمراہ لاہور گئی ہوئی تھیں جہاں زرینہ کی تینوں بیٹیوں کے سسرالوں کے علاوہ قریبی رشتے دار بھی رہائش پذیر تھے جن سے حج پر جانے سے قبل وہ ملاقات کے لئے گئی تھیں۔ اب وہاں سے ان کی واپسی دو یا تین ہفتوں میں ممکن نہ تھی۔ ان کی طرف سے وہ مطمئن تھا۔

کبھی کبھی مجھ جیسا مضبوط اعصاب کا مالک انسان بھی جذبات کے بہکاوے پر انحصار کر کے اپنے دل کے ہاتھوں ٹھوکر کھا کر خوار ہو جاتا ہے اور اس بری طرح زمین بوس ہوتا ہے کہ پھر اٹھ بھی نہیں سکتا اور اگر اٹھ جائے تو چلنے کی سکت نہیں پاتا اور وہیں ٹھہر جاتا ہے...... وہیں کا ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہ سنگین معاملہ میرے ساتھ ہوا ہے۔ میں اس سے چھٹکارا پانا چاہتا تھا، اس کا ساتھ اس کی رفاقت مجھے منظور نہ تھی اور اب سب کچھ پلٹ گیا ہے۔ میرے دل نے مجھ سے بغاوت کی، میرے احساسات باغی ہو گئے۔ میں، میں نہ رہا۔ نہ معلوم کس گھڑی کون سی ساعت، کون سا لمحہ مجھ سے بھی بغاوت کر گیا اور میں اس وجود کا شیدائی بن گیا جس سے سخت کبیدہ و متنفر اور از حد بے زار تھا۔

اس کے وجیہہ چہرے پر بلا کی سنجیدگی تھی۔ سوچوں کے بھنور میں ڈوبتے ابھرتے اسے بہت سارا وقت بیت گیا تھا۔ نرس مشعل کے ہاتھ میں لگی ڈرپ چیک کرنے آئی تو وہ حواسوں میں لوٹا تھا۔ ڈرپ ختم ہو چکی تھی۔ نرس دوسری ڈرپ لگانے کی تیاری کر رہی تھی، جب اسے خیال آیا کہ گھر پر کال کر کے معلوم کرے کہ کون ہے وہاں۔ انکل تو کاروباری سلسلے میں ایک دو دن کے لئے کراچی سے باہر گئے ہوئے تھے۔ یہ خیال آتے ہی وہ نرس کو وہاں اپنی واپسی تک موجود رہنے کا کہہ کر باہر نکل آیا تھا۔

کوریڈور میں خاموشی کا راج تھا۔ وہ طویل کوریڈور عبور کر کے باہر نکل آیا۔ بھیگے بھیگے لان میں سرد ہوا کے جھونکے نے بڑھ کر گرم جوشی سے استقبال کیا تھا۔ جوابا وہ معمولی سا سمٹتا ہوا سامنے کینٹین کی طرف بڑھ گیا جہاں نائٹ ڈیوٹی پر آئے ڈاکٹرز، نرسیں اور دیگر عملے کے کچھ افراد چائے کافی سپ کرنے میں مصروف تھے۔

اس نے کافی کا آرڈر دیا اور خود موبائل پر مشعل پیلس کے نمبرز پش کرتا ہوا تنہا گوشے میں بیٹھ گیا تھا۔

دوسری طرف مسلسل بیلز جا رہی تھیں مگر کوئی کال ریسیو نہیں کر رہا تھا۔ دس منٹ گزر چکے تھے۔ کافی سپ کرتے ہوئے اس کی کشادہ پیشانی پر بے شمار متفکرانہ شکنیں نمودار ہو چکی تھیں۔ آخر کار چھٹی کوشش پر دوسری جانب سے کال ریسیو کر لی گئی تھی۔ وہ چوکیدار تھا۔

''اتنی دیر سے کال ریسیو کیوں کی ہے؟'' وہ سرد مہری سے گویا ہوا۔

''صاب! بیگم صاحبہ نے کہا تھا کوئی اندر نہیں جائے گا۔ ام فون کا بار بار آواز سن کر ڈرتا ڈرتا اندر آیا ہے۔'' چوکیدار کی خوفزدہ آواز ابھری۔

''کہاں ہیں بیگم صاحبہ؟''

''وہ گیا صاب......''

''کب...... کہاں......؟'' اس نے کافی کا مگ پٹختے ہوئے کہا۔

''کافی دیر ہو گیا صاب جی۔ وہ بہت گھبرایا ہوا تھا۔ ساتھ جو جو صاب بھی بہت پریشان تھا۔ ام نے پوچھا کہ وہ کہاں جاتا ہے تو بیگم صاب بولا کہ احمد صاب کا حالت خراب ہے، وہ اس سے ملنے اسپتال جاتا ہے۔'' چوکیدار کی اطلاع نے اسے پریشان کر ڈالا تھا۔ وہ حواس باختہ سا کافی چھوڑ کر باہر لان میں نکل آیا جہاں جگہ جگہ مرکری بلب روشن ہونے کی وجہ سے خاصا اجالا پھیلا ہوا تھا۔ بارش بند ہو گئی تھی۔ مگر گہرا ابر ابھی بھی موجود تھا۔ درختوں اور پودوں کے پتوں اور پھولوں سے بارش کا پانی قطروں کی صورت میں نیچے گر رہا تھا۔ بھیگی ہوا کے جھونکے بوجھل تھے۔ ماحول میں عجیب سی بھیگی بھیگی پتوں و پھولوں سے پھوٹتی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ وہ ان سب سے لاپرواہ موبائل کان سے لگائے محو گفتگو تھا۔

''تم نے انہیں جانے کیوں دیا...... کیا لے کر گئے ہیں وہ لوگ؟''

''میں کیسے روک سکتا تھا ان کو۔ وہ بڑے صاب کا بہن ہیں۔ اور سامان تو اپنے ساتھ کافی لے کر گیا ہے۔'' اس بار چوکیدار کا لہجہ بھی الجھا ہوا پریشان تھا۔

''مشعل بی بی کہاں ہیں؟''

''وہ اپنی کسی دوست کی طرف گیا ہے۔ کل تک آئے گا۔''

''یہ تمہیں بیگم صاحبہ نے بتایا ہوگا؟'' اس کا شبہ صحیح ثابت ہوا تھا۔

''جی صاب۔''

''تم ڈیوٹی چھوڑ کر کہاں گئے تھے؟''

''آ...... آ...... آپ کو کیسے معلوم ہوا صاب! ام گیا تھا؟'' چوکیدار بری طرح گھبرایا ہوا تھا جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو۔

''سوال مت کرو، صرف جواب دو۔ کہاں گئے تھے تم ڈیوٹی چھوڑ کر جب کہ تمہیں معلوم ہے کہ صاحب گھر پر نہیں ہیں اور تمہیں سختی سے تاکید کر کے گئے تھے کہ لمحہ بھر بھی

اپنی ڈیوٹی سے غافل مت ہونا پھر تم کس کی اجازت سے اور کہاں گئے تھے؟'' اس کے تحت ترین لہجے نے چوکیدار کو حواس باختہ کر ڈالا تھا۔ اپنی نوکری جانے کے خیال نے اسے رونے پر مجبور کر ڈالا تھا۔

''صاب! بیگم صاحب نے کہا تھا وہ کسی کو معلوم نہیں ہونے دے گا، اس نے کچھ سامان منگوانے کے لئے بھیجا تھا، ام نہیں جا رہا تھا مگر بیگم صاحب نے کہا ام سامان نہیں لا کر دے گا تو وہ بڑے صاب سے شکایت کر کے ام کو نوکری سے نکلوا دے گا۔ ام بہت مجبور ہو کر گیا صاب۔ ام کو معاف کر دو صاب، آئندہ ایسا غلطی نہیں ہو گا۔'' چوکیدار فون پر بھی گھگیانا شروع ہو گیا تھا۔

''اچھا..... اچھا..... ٹھیک ہے۔ مگر آئندہ ایسا ہوا تو نہ صرف تمہیں نوکری سے نکالا جائے گا بلکہ سزا بھی ملے گی۔ پوری کوٹھی لاک کر دو اور خود ہوشیاری سے رہو۔ بڑے صاحب کے آنے پر ہی گیٹ کھولنا۔'' اس نے موبائل جیب میں رکھتے ہوئے اندر کی جانب قدم بڑھا دیئے۔

ہوا بند ہو گئی تھی اور بارش دوبارہ سے شروع ہو چکی تھی۔ مشعل بدستور گہری نیند سو رہی تھی۔ نرس اس کے آنے کے بعد جا چکی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر اس کی پیشانی کو چھو کر بخار کی حدت چیک کی جواب قدرے بہتر محسوس ہوئی۔ وہ اس کا کمبل ٹھیک کر کے سامنے رکھے صوفے پر دراز ہو گیا۔ اس کا ذہن الجھنوں کا شکار تھا۔

رافعہ اور جوجو کی گھٹیا ذہنیت کو وہ بہ خوبی جانتا تھا۔ وہ اپنا مفاد حاصل کرنے کی خاطر کس حد تک جا سکتے ہیں۔ گزشتہ کئی روز سے حسن صاحب بھی اسے بتا رہے تھے کہ رافعہ ان سے بار بار ایک بڑی رقم کا مطالبہ کر رہی ہے لیکن وہ ابھی افورڈ نہیں کر سکتے کیونکہ کاروبار شدید ترین لاس کے بعد اب دھیرے دھیرے بحران سے نکلنا شروع ہوا ہے اور دوسری بات یہ تھی کہ وہ ان کے اعتماد کے سرکل سے باہر نکل چکی تھیں یا شاید وہ ان کی نیت کے کھوٹ سے واقف ہو گئے تھے۔ وہ کاروباری اور گھریلو ہر بات سے شاہ ویز کو آگاہ کرتے تھے، ہر مسائل ڈسکس کرتے تھے۔ حقیقی معنوں میں اسے بیٹے کا درجہ دیتے تھے مگر وہ اب بھی ان سے اتنا ہی تکلف برتتا تھا جتنا پہلے۔ ان کے مشورے پر بھی اس نے غیر جانبداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا تھا۔ آپ دیکھ لیں سر! انہوں نے رقم نہیں دی تھی۔

چوکیدار کی معلومات کے مطابق رافعہ اور جوجو اپنا سامان لے کر جا چکے تھے۔ یقیناً وہ کسی خوف کے باعث اس طرح گئے ہیں۔ چوکیدار کو سامان کے بہانے وہاں سے بھیجنا پھر تمام ملازمین کو ایک ساتھ چھٹی پر روانہ کرنا اور اس خطرناک موسم میں ان دونوں کا مشعل کا بھاگ کر تعاقب کرنا یہ تمام کڑیاں بکھری ہوئی تھیں جنہیں جوڑنے میں اس کا ذہن تیزی سے متحرک تھا۔

رات نصف گزر چکی تھی جب وہ ان کڑیوں کو جوڑ پایا اور دل و دماغ میں جیسے آتش فشاں سا پھٹ گیا تھا۔ صورت حال کے ادراک نے اس کی حمیت، اس کی غیرت کو جھنجھوڑ ڈالا تھا۔ اس کی رگ رگ میں لاوا خون بن کر دوڑنے لگا۔ شدید اضطرابی لہر اس کے سراپے میں دوڑ گئی تھی۔ گھٹن و حبس کے بے پایاں احساس نے اسے اس سرد موسم میں کھڑکی کھول کر کھڑے ہونے پر مجبور کر ڈالا تھا۔

باہر چھاجوں مینہ برس رہا تھا۔

وہ مٹھیاں بھینچے اندر کے طوفان سے نبرد آزما تھا۔ اسی اثناء میں اس نے مشعل کے معمولی سے کراہنے کی آواز سنی تھی۔ وہ برق رفتاری سے پلٹا تھا۔ مشعل نے آنکھیں کھولی تھیں اور استعجابیہ نظروں سے وہ سب طرف دیکھ رہی تھی اور اپنی طرف بڑھتے شاہ ویز کو دیکھ کر اس کی نگاہیں ٹھہر گئی تھیں۔

حیرانی

بے یقینی

استعجاب

کیا کچھ نہ تھا اس کی آنکھوں میں۔

''ہیلو کیسی ہو؟'' وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے اپنائیت سے گویا ہوا تھا۔

وہ جو یک ٹک اس کی صورت تک رہی تھی دیکھتے دیکھتے اس کی آنکھیں دھندلانے لگیں اور آنکھوں میں بڑھتی ہوئی نمی نے آنسوؤں کی صورت اختیار کر لی۔ پھر وہ بے آواز رونے لگی۔ گزرے لمحوں کا جانگسل احساس ازسرِ نو جاگزیں ہو گیا تھا۔ وہ دونوں ماں بیٹے ذلت کی اتھاہ گہرائیوں میں دفن ہوئے سو ہوئے مگر ساتھ اسے بھی ایسی حقیقت سے روشناس کرا گئے تھے جس کو جان کر وہ خود کو عریاں محسوس کر رہی تھی۔ یہ بات اسے ایام سمجھداری سے ہی متجسس کئے ہوئے تھی کہ آخر وہ ایسی کیا بات ہے، کیا راز ہے، ایسا کیا بھید ہے جس کو رافعہ اکثر غصے میں بے قابو ہو کر افشا کرنے کی سعی کرتی ہیں اور ہر بار پاپا کا جارحانہ انداز انہیں وہ راز کھولنے نہیں دیتا اور وہ یہ بھی سمجھتی تھی کہ وہ بات اس کی ذات سے تعلق رکھتی ہے لیکن جو انکشاف ہوا تھا اس نے اس کے احساسات کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ یہ احساس ہی کس قدر تکلیف دہ تھا کہ وہ اپنے پاپا کی بیٹی نہ تھی، ایک گناہ کا وجود تھی، گندگی کا ڈھیر تھی، اس کا وجود ایک گالی تھا۔ وہ دہرے عذاب میں مبتلا تھی۔ مستزاد سامنے بیٹھے شخص کی قربت۔ وہ بہت بدلا بدلا لگ رہا تھا۔ چہرے پر پھیلی نرم مسکراہٹ نے اس کے تمام نقوش کو روشن کر دیا تھا۔ اس کا ہاتھ تھامے از حد اپنائیت و توجہ سے وہ اس سے مخاطب تھا۔ اس کا تمام غصہ، جھلاہٹ، لاتعلقی و تنفر مفقود تھا۔

اس کے انداز سے بے حد اپنائیت و محبت جھلک رہی تھی۔ وہ ان احساسات میں مبتلا نہ ہوتی تو شاہ ویز کی اس وارفتگی و چاہت کو دیکھ کر شاید خوشی سے مر جاتی یا حواس کھو بیٹھتی مگر اس وقت وہ جن کانٹوں بھرے راستوں پر دوڑ رہی تھی وہاں ان مسرتوں و شادمانیوں کو محسوس کرنے کی حسیات تمام ہو چکی تھیں۔ اس وقت وہ جن احساسات سے دوچار تھی وہ بیان سے باہر تھے۔ شاہ ویز اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھامے دوسرے ہاتھ سے آہستگی سے سہلا رہا تھا اور خاموشی سے اسے پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اس نے اسے چپ کروانے کی کوشش نہ کی۔ یہ سوچ کر کہ جن حالات سے وہ گزر کر آئی ہے، وہ تمام ذرہ خوف غم و غصہ کے ذریعے بہہ جائے تو اچھا ہے تاکہ وہ ذہنی طور پر پُرسکون ہو سکے۔

یہی ہوا تھا۔ خاصی دیر گریہ وزاری کے بعد وہ خاموش ہو گئی تھی۔ شاہ ویز نے اسے پانی پلایا اور حالات دریافت کئے تو وہ سب کچھ بتاتی چلی گئی۔ ماسوائے اپنی ذات کے انکشاف کے علاوہ دلی احساس کے دباؤ کے باعث وہ بتاتے بتاتے رک گئی تھی۔ دل میں یہ خیال جاگزیں ہوا تھا، حقیقت حال جان کر اس نے اسے ٹھکرا دیا تو؟ وہ آشیانہ جو ابھی تام نہیں ہوا ہے آباد ہونے سے قبل ہی اجڑ جائے گا۔ یہ وہ کبھی برداشت نہ کر پائے گی۔

کیا وہ مجھ جیسی لڑکی سے رشتہ استوار رکھ سکے گا؟

وہ اتنا روشن خیال ہو سکتا ہے، سب کچھ جاننے کے باوجود تعلق برقرار رکھے؟

اگر میں اس سے چھپا لیتی ہوں تو جب تک چھپائے رکھ سکتی ہوں؟

وہ وسوسوں کی شکار سی نگاہیں جھکا کر بیٹھی تھی۔

''جو ہوا اسے کسی ڈراؤنے خواب کی مانند بھول جاؤ۔ زندگی میں ایسے نشیب و فراز آتے رہتے ہیں۔ شکر ہے تم ان لوگوں کی ناپاک خواہشات کا ذریعہ نہ بنیں۔ یہ کامیابی سب سے بڑی کامیابی ہے۔'' وہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے طمانیت بھرے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ اسی دم نرس اندر چلی آئی تھی۔ وہ اس کے بالوں سے ہاتھ ہٹا کر سیدھا ہو بیٹھا۔

نرس نے مکمل ہونے والی ڈرپ ہٹا کر اسٹینڈ کو کونے میں کھسکا دیا تھا۔ اب اسے میڈیسن دے رہی تھی۔

شاہ ویز کمرے سے باہر آ گیا۔ اس نے موبائل پر حسن بیگ سے رابطہ کیا تھا کیونکہ رات گزر چکی تھی۔ دھیمی دھیمی پڑنے والی بوندوں میں صبح کا ذب کا دلنواز اجالا بکھرا ہوا تھا۔ ہوا بھی فرحت بخش تھی۔

حسب توقع حسن بیگ نے فوراً ہی کال ریسیو کر لی تھی۔ اس نے مختصراً انہیں تمام حالات بتا کر واپس آنے کو کہا تھا۔

اسے یقین تھا وہ کروڑوں کے نقصان کو بھی خاطر میں نہ لا کر جلد از جلد یہاں پہنچ جائیں گے۔ مشعل سے ان کی محبت کچھ ایسی شدید تھی۔

''سر! آپ کی مسز کا بی پی بہت ہائی ہے۔ میں نے ایک بار پھر انہیں نیند کا انجکشن لگا دیا ہے تاکہ بی پی کا لیول مزید نہ بڑھے۔'' وہ کمرے میں داخل ہوا تو نرس نے اطلاع دی تھی اور چلی گئی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر مشعل کے چہرے کو غور سے دیکھا تھا جو بے خبر سو رہی تھی۔

وہ سوچ رہا تھا جس کرائسس سے وہ گزری ہے اس نے اس کے ذہن کو ڈسٹرب کر دیا ہے۔ اسی وجہ سے وہ ذہنی خلفشار کا شکار ہے۔

ساری رات کی بے خوابی و بے آرامی سے اس کی طبیعت بھی کسلمندی کا شکار ہو گئی تھی۔ اپنے ذہن کو فریش کرنے کے لئے وہ کچھ دیر آرام کی خاطر صوفے کی طرف بڑھ گیا۔

□●□

حسن بیگ صاحب فرسٹ فلائٹ سے واپس آ گئے تھے۔

مشعل ان کی آمد سے کچھ دیر قبل ہی ناشتے سے فارغ ہو کر بیٹھی تھی۔ شاہ ویز نے بھی اس کے ساتھ ناشتہ کیا۔ سنڈے کی وجہ سے آفس کی چھٹی تھی۔ ناشتے سے قبل اور دوران ان کی رسمی سی بات چیت ہوئی تھی۔

اس کے بعد مشعل چپ سادھ گئی تھی اور وہ اخبار لے کر بیٹھ گیا تھا۔ معاً تیز اٹھتے بھاری قدموں کی آوازیں باہر سے ابھری تھیں۔ دروازے کا ہینڈل گھوما تھا اور دوسرے لمحے متفکر چہرہ لئے حسن بیگ اندر داخل ہوئے اور مشعل کے بیڈ کی طرف بڑھے تھے۔ دوسرے پل مشعل ان کے سینے سے لگی زار و قطار رو رہی تھی۔ بہت مضبوطی سے اس نے انہیں تھام رکھا تھا۔

''پاپا! آپ میرے پاپا ہیں نا؟ ریئلی میرے اپنے۔ آپ کی محبت، آپ کا یہ پیار ثابت کرتا ہے کہ آپ ہی میرے پاپا ہیں، سگے باپ۔ بھلا کوئی غیر آدمی اس طرح کسی کی اولاد کو بلکہ گندگی کے وجود کو اس طرح پیار دے سکتا ہے؟ اپنی محبت و جان لٹا سکتا ہے؟ نہیں..... نہیں نا پاپا، غیر، لاوارث بچوں پر ترس تو کھایا جا سکتا ہے۔ خدا ترسی کے طور پر مالی امداد کی جا سکتی ہے مگر اس طرح اپنی زندگی سے بڑھ کر ایسے بچوں کو سینے سے نہیں لگایا جا سکتا۔ رافعہ آنٹی نے جھوٹ بولا ہے، چال چلی ہے آپ کے اور میرے

درمیان دوری پیدا کرنے کے لئے۔ ہمیں ایک دوسرے سے جدا کرنے کے لئے۔ اوہ، میں کتنی بے وقوف ہوں جو ان کی باتوں میں آ گئی۔'' وہ ان کے سینے سے لگی سوچ سوچ کر رو رہی تھی۔ پھر ایک دم آنے والے خیال سے وہ چونکی تھی۔

''چپ ہو جاؤ میری بچی۔ تمہارے یہ آنسو مجھے گھائل کر رہے ہیں۔ مجھے معلوم ہوتا کہ رافعہ اتنی گھٹیا و رذیل حرکت کرے گی تو میں کسی قیمت پر آپ کو چھوڑ کر نہیں جاتا، ساتھ لے کر جاتا۔'' ان کے لہجے میں بہن کی طرف سے اعتماد و اعتبار کے کئے جانے والے قتل کی تکلیف اور مشعل کے لئے محبت و اپنائیت کی مہک تھی۔

شاہ ویز انہیں سلام کر کے ایک جانب خاموش بیٹھا تھا۔

''میری اپنی بہن آستین کا سانپ نکلی۔ اس نے ہی مجھے ڈسنا چاہا، میرے اعتماد کا خون کر کے اس نے اپنوں کی اپنائیت و سچائی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے میرا اعتبار ختم کر دیا۔'' وہ مشعل کو سینے سے متاع حیات کی طرح لگائے شکستہ لہجے میں کہہ رہے تھے۔ ان کا لہجہ نم تھا۔

کافی دیر تک وہ باپ بیٹی اردگرد سے بیگانہ رہے تھے۔ حسن بیگ کے موبائل پر ہونے والی بیل نے ماحول کے سکوت میں ارتعاش پیدا کر دیا تھا۔

''یس، حسن بیگ ہی بات کر رہا ہوں۔'' انہوں نے موبائل کان سے لگا کر کہا۔

''آپ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں فوری طور پر...... لیکن کیوں؟ میں آپ سے واقف نہیں ہوں اور نہ ہی کام کی نوعیت جانتا ہوں کہ آپ کو کیا کام ہے مجھ سے؟'' حسن بیگ کے لہجے میں خاصی الجھن تھی۔ شاہ ویز اٹھ کر ان کے قریب آ گیا تھا۔

''او کے...... او کے...... آپ روبرو ملاقات کرنا چاہتے ہیں تو شام کو میری کوٹھی پر تشریف لے آئیں۔ میں آپ کا انتظار کروں گا۔''

''پاپا! آپ بھی ہر کسی سے ملاقات کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔'' مشعل کے اعتراض پر وہ پہلی بار مسکرائے تھے۔

''مائی سویٹ ڈاٹر! وہ ساؤتھ افریقہ کی چند معزز و معتبر شخصیات میں سے ایک ہیں۔ روبرو ملاقات کبھی نہیں ہوئی ان سے مگر ان کے نام سے میں بہ خوبی واقف ہوں۔ ان سے ملنے کے لئے لوگوں کو ہفتوں قبل وقت لینا پڑتا ہے۔ نامعلوم کیا مجبوری ہے ان کی جو وہ اس طرح ملنے کے لئے اصرار کر رہے ہیں۔'' وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے شفقت سے گویا تھے۔

''سر! یہ منصور خرم کل سے کالز کر رہے ہیں اور آپ سے ملنے کے شدید آرزومند دکھائی دیتے ہیں۔ میں نے ان سے یہی کہا تھا کہ آپ کی واپسی پر فوراً کنٹیکٹ کروا دوں گا۔ مگر لگتا ہے انہوں نے کل سے اب تک کا وقت بڑی بے قراری سے گزارا ہے جو انہوں نے بغیر انتظار کے کال کی ہے۔''

''کیا خیال ہے آپ کا، انہیں ایسا ضروری کیا کام ہو سکتا ہے جس کے لئے وہ اتنی بے قراری بلکہ بے صبری کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔'' وہ شاہ ویز سے مخاطب ہوئے۔

''آئی ڈونٹ نو سر! میرا قیاس یہ کہتا ہے یہ بزنس افیئر نہیں، پرسنل افیئر ہے کوئی۔ کیونکہ بزنس ڈیلنگ تو ٹاک کا پروسیجر دوسرا ہوتا ہے۔''

''ہوں...... یہ گتھی ان سے ملاقات کے بعد ہی سلجھے گی۔ خاصا سسپنس کری ایٹ کر دیا ہے منصور اور خرم صاحب نے۔ بہرکیف شام کو ملاقات ہو رہی ہے ان سے۔ میں ڈاکٹر سے مشعل کو ڈسچارج کرنے کی بات کرتا ہوں۔ بیٹا! آپ کیسا فیل کر رہی ہو؟ اگر تکلیف محسوس ہو رہی ہے تو ہم مزید رک جائیں؟'' شاہ ویز کے بعد وہ مشعل سے مخاطب ہوئے تھے۔

''میں گھر جانا چاہتی ہوں پاپا۔ ڈریسنگ تو وہاں بھی ہو جائے گی۔''

''او کے۔'' وہ کمرے سے نکل گئے۔ اب کمرے میں وہ تھے اور ان کے درمیان خاموشی حائل تھی۔ وہ پھر سے بیگانگی کے خول میں بند ہو گئے تھے۔ حسن بیگ کی آمد سے قبل مشعل خود کو غیر محفوظ سمجھ رہی تھی۔ شاہ ویز کا سہارا اس کے لئے تقویت و طمانیت کا باعث تھا۔ اس لئے وہ اسے بغیر کسی احساس کے خود سے قریب پا رہی تھی اور پاپا کو دیکھتے ہی اسے بھول گئی تھی۔

شاہ ویز بھی وہ گرمجوشی و جذبات سرد کر بیٹھا تھا جو اس کے اندر طوفان لائے ہوئے تھی۔ وہ ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھے ایک دوسرے کے پہل کرنے کے انتظار میں تھے۔ اسی دوران مشعل کی ڈریسنگ چینج کر دی گئی تھی اور اس کا بی پی لیول بھی نارمل تھا۔

''شاہ ویز! آپ بھی گھر چلیں۔'' ہسپتال سے باہر نکل کر حسن بیگ شاہ ویز کے اجازت مانگنے پر گویا ہوئے۔

''میں گھر جا کر سونا چاہتا ہوں۔''

''وہاں بھی آپ سو سکتے ہیں۔ کوئی ڈسٹرب نہیں کرے گا آپ کو وہاں۔ تنہا گھر میں رہ کر کیا کریں گے؟ بھن جی تو لاہور گئی ہوئی ہیں۔ پھر شام میں منصور خرم سے ملاقات کے دوران میں چاہتا ہوں آپ میرے ساتھ ہوں۔ بس میں کوئی عذر قبول نہیں کروں گا۔ آپ کو ہمارے ساتھ گھر چلنا ہے۔'' ان کے لہجے میں پیار بھرا حکم تھا۔

اس نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی تھی۔ برابر میں حسن صاحب براجمان تھے۔ پچھلی سیٹ پر مشعل بیٹھی تھی، سیٹ کی بیک سے ٹیک لگائے۔ اس کے انداز میں بلا کی افسردگی و خاموشی تھی۔

شاہ ویز نے مشعل جلدی جانے کے لئے نسبتاً طویل دوسرا راستہ چنا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ انہی راستوں سے گزر کر وہ ان تکلیف دہ لمحات کو یاد کر کے ملول ہو کیونکہ اب حساسیت کی انتہا پر کھڑی تھی۔ راستہ حسن بیگ کی گفتگو میں جلد گزر گیا تھا مگر گیٹ سے کار اندر داخل ہوتے ہی اس کے چہرے پر سراسیمگی کے آثار پیدا ہوئے تھے۔ وہ اس کی ایک ایک جنبش پر نظر رکھے ہوئے تھا۔

''پاپا...... پاپا......'' وہ بے اختیار ان سے لپٹ گئی تھی۔

''یس...... یس پاپا کی جان۔'' انہوں نے محبت سے اسے لپٹاتے ہوئے کہا اور اسی طرح مشعل کو اندر لے آئے تھے۔ شاہ ویز ان کے پیچھے تھا۔

''پاپا! میں کل یہاں سے بھاگی تھی۔ میرے پیچھے جوجو تھا اور جوجو کے پیچھے آنٹی بھی مجھے پکڑنے کے لئے بھاگی تھیں۔''

''بھول جاؤ...... بھول جاؤ ان باتوں کو جو تکلیف دیتی ہیں۔ آئندہ کبھی ان کا نام کوئی نہیں لے گا۔ میں نے ان سے تمام تعلقات ہمیشہ کے لئے توڑ دیئے ہیں اور مجھے یقین ہے جو ذلیل حرکت انہوں نے کی ہے اس کے بعد وہ خود کوئی رابطہ نہیں رکھیں گے۔ آپ بھی سب بھول جاؤ۔'' وہ اسے دلاسہ دے رہے تھے۔ سمجھا رہے تھے اور وہ ان گزرے لمحوں کو ذہن سے کھرچنے کی سعی کر رہی تھی جو قدم رکھتے ہی کسی فلم کی طرح متحرک ہو گئے تھے۔

ملازمین تمام واپس آ گئے تھے اور اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ سب نے اس کے سر پر بندھی پٹی کے بارے میں استفسار کیا تھا اور حسن بیگ نے یہ جواب دیا تھا کہ وہ گرنے کی وجہ سے زخمی ہو گئی ہے۔

دوپہر کو کھانے کے بعد حسن بیگ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے تھے اور ان دونوں کے لئے انہوں نے دوسرا بیڈ روم کھلوا دیا تھا۔

وہ نہیں چاہتے تھے کہ اپنے کمرے میں جا کر وہ پھر کسی ڈپریشن کا شکار ہو جائے۔ شاہ ویز بیڈ پر دراز ہو کر جلد گہری نیند سو گیا تھا۔ مشعل نے ان دونوں کے بیڈ رومز میں جانے کے بعد سیف کا جائزہ لیا تو اس کا خدشہ درست ثابت ہوا۔ وہاں رکھی ڈیڑھ لاکھ کی رقم اور زیورات غائب تھے۔ زیورات زیادہ مالیت کے نہیں تھے۔ ہلکی پھلکی جیولری تھی جو وہ شادی سے قبل استعمال کرتی تھی اور رقم بھی گھر کے خرچے کے لئے رکھی گئی تھی۔ حسن بیگ تمام رقم بینک میں رکھنے کے عادی تھے۔ وہ ان کے کمرے میں چلی آئی۔

''مجھے معلوم تھا آپ سوئے نہیں ہوں گے۔'' انہیں سنڈے میگزین کا مطالعہ کرتے دیکھ کر وہ گویا ہوئی۔

''جب میری بیٹی جاگ رہی ہو تو میں کیسے سو سکتا ہوں؟'' آگے کھسک کر انہوں نے اس کے لئے جگہ بنائی۔

''پاپا! آنٹی لاکر صاف کر گئی ہیں۔''

''مجھے معلوم ہے۔ میں نے پہلے ہی چیک کر لیا تھا۔''

''وہ کہاں گئی ہوں گی؟''

''وہ دونوں یہاں سے دوبئی بھاگ گئے ہیں اور ایسا ہمیں ڈاج دینے کے لئے کیا گیا ہے۔ وہ اس طرح کئی ممالک کی فلائٹس کے ذریعے کسی دور دراز علاقے کی طرف جائے گی تاکہ ہم اسے ڈھونڈ نہ سکیں۔''

''آپ نے کس طرح معلوم کیا؟'' اس نے استعجاب سے دریافت کیا۔

''میں جانتا تھا وہ اب یہاں ایک لمحہ نہ گزارے گی۔ ایئر پورٹ ریکارڈ سے میں نے معلوم کیا تو کل پہلی فلائٹ سے جانے والوں میں ان کا نام شامل تھا۔ وہ ماں بیٹا فوراً ہی فرار ہو گئے ہیں۔''

''جاتے جاتے بھی ڈھائی تین لاکھ کی چپت لگا گئے ہیں۔''

''کوئی فکر کی بات نہیں، وہ سب آپ کا صدقہ گیا۔'' انہوں نے اس کی پیشانی چومی۔

''اگر تم چاہو تو انہیں گرفتار کر کے لایا جا سکتا ہے۔ خواہ وہ دنیا کے کسی بھی کونے میں چھپ گئے ہوں۔''

''نہیں پاپا خواہ مخواہ اسکینڈلز بن جائیں گے اور ہم پریس میں آ جائیں گے۔ نامعلوم کیسی کیسی کہانیاں بنیں گی۔ بہتان تراشے جائیں گے۔ میں آپ کی بے عزتی اور خاندان کی بدنامی کسی صورت برداشت نہیں کر سکتی۔''

''اسی احساس نے مجھے باندھ دیا بیٹا ورنہ رافعہ اپنے اس ناہنجار بیٹے کو لے کر پاکستان کی سرحد عبور نہیں کر سکتی تھی۔''

شام تک وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ شاہ ویز بھی اٹھ کر آ گیا تھا۔ وہ لاؤنج میں آ کر بیٹھ گئے تھے۔

کھڑکیوں کے شیشوں سے باہر سرسبز لان کا دلکش نظارہ صاف نظر آ رہا تھا، بادل چھٹ گئے تھے۔ بارش بند ہو چکی تھی۔ موسم سرما کی نرم نرم دھوپ کی سنہری شعاعیں روپ کا سونا لٹا رہی تھیں۔

شاہ ویز حسن بیگ کے ساتھ کاروباری معاملے ڈسکس کر رہا تھا۔ وہ خاموش بیٹھی ان کی گفتگو سن رہی تھی۔ کسی طور وہ خود کو بہلانے میں کامیاب ہوئی تو تھی مگر پوری طرح خود کو مطمئن نہ کر پائی تھی۔ رافعہ بیگم طنزیہ انداز اور سچائی اگلتے لہجے کے ہمراہ اس کے سامنے آجاتیں اور تضحیک بھرے لہجے میں کہتیں۔

”تم بھائی کی اولاد نہیں ہو، تم ایک ناجائز وجود ہو۔ ایسا سیاہ وجود جس کو رات کی تاریکی میں اس کی ماں کچرے کے ڈھیر پر ڈال گئی تھی۔ تم ہمارا خون نہیں ہو، تم بھائی جان کی بیٹی نہیں ہو...... نہیں ہو ان کی بیٹی۔“ رافعہ کی آواز سرگوشی بن کر ابھرنے لگتی تو وہ بے کل ہو اٹھتی۔ کبھی خود کو جھٹلاتی تو کبھی رافعہ بیگم کو جھوٹا قرار دینے لگتی۔ اس کا سکون و قرار فنا ہو چکا تھا۔ اس وقت بھی جسمانی طور پر وہاں موجود ہونے کے باوجود وہ ذہنی طور پر غائب تھی۔

”ہیلو، کیا سوچ رہی ہو؟ کوئی ٹینشن ہے؟“ شاہ ویز کی آواز نے اسے چونکایا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا، وہ اس کے قریبی صوفے پر بیٹھا استفہامیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔ اس نے سامنے دیکھا، صوفہ خالی تھا۔ پاپا نہ معلوم کس وقت وہاں سے جا چکے تھے۔ کمرے میں ان دونوں کے علاوہ کوئی نہ تھا۔

”پاپا کہاں گئے؟“

”سٹنگ روم میں گئے ہیں اور تم اتنی غائب الذہنی سے بیٹھی ہو کہ تمہیں محسوس ہی نہ ہوا کہ ملازم نے کب اطلاع دی مہمانوں کی آمد کی اور کب پاپا گئے۔ پلیز بتاؤ کیا پرابلم ہے؟“

”کوئی بات نہیں...... شاید دواؤں کے اثر میں ایسا ہوا ہو۔“

”سر میں تکلیف زیادہ ہو رہی ہے؟“

”نہیں، میں ٹھیک ہوں۔“ وہ خواہش کے باوجود مسکرا نہ سکی۔

”آرام کرو، میں سٹنگ روم میں جا رہا ہوں۔“ چند لمحے اسے بغور دیکھنے کے بعد وہ اٹھ کھڑا ہوا تو وہ بھی اٹھ کر کچن میں چلی آئی جہاں ملازمہ اختری کچن صاف کرنے میں مصروف تھی۔

”تیز تیز ہاتھ چلاؤ، چائے کے ساتھ اہتمام کرنا ہے۔ پاپا کے گیسٹ آئے ہیں۔“ وہ فریج کی جانب بڑھتی ہوئی بولی۔

◘●◘

کمرے میں چھ نفوس براجمان تھے۔

ہر سو دبیز خاموشی تہہ در تہہ چھائی ہوئی تھی۔ وہ جیتے جاگتے وجود اگر سانس کی آمد و رفت سے آزاد ہوتے تو یقیناً کسی مصور کے اعلیٰ شاہکار تسلیم کئے جاتے۔ اس وقت ان میں اور مجسموں میں سانس کا امتیاز تھا۔ سب ہی حیرانی، تعجب و اشتیاق کے مراحل سے نبرد آزما تھے۔ عرفان خرم خود کو حشر کے میدان میں کھڑا محسوس کر رہے تھے جہاں اپنے اچھے اور برے اعمال کی لسٹ خود اپنے منہ سے پڑھ کر سنانی تھی۔ کس قدر کٹھن ہوتا ہے اپنی چالاکیوں، لالچ اور خود غرضی کی داستان سنانا۔ اپنے تعارف کے بعد وہ شرمندگی سے، خجالت سے اٹک اٹک کر اپنی آمد کا، اپنی غرض کا مدعا بیان کیا تھا۔

عرقِ ندامت میں تر وہ اب خاموش بیٹھے تھے۔ ساتھ ان کے منصور، فرح اور حرا موجود تھیں۔ ان سب میں حسن بیگ کی حالت ازحد دگرگوں و ناگفتہ بہ تھی۔

مشعل کو انہوں نے جس طرح چاہا، پرورش کی وہ عام آدمی کے بس کی بات نہ تھی۔ انہوں نے کبھی یہ سوچا ہی نہیں کہ وہ ان کی اپنی اولاد نہیں ہے۔ زندگی کے ان ماہ و سال کے کسی لمحے میں انہیں یہ احساس ہوا ہی نہیں کہ وہ مشعل کے باپ نہیں ہیں۔ ہمیشہ وہ انہیں عزیز سے عزیز ترین محسوس ہوئی۔ پھر یہ کیسی آندھی اٹھی تھی جس نے لمحوں میں سب کچھ تہس نہس کر کے رکھ دیا تھا۔

رشتے کانچ کی طرح ٹوٹ گئے تھے۔

محبت کے بادبان غائب تھے۔

اپنائیت سراب ثابت ہوئی تھی۔

جس وجود کو ہمیشہ اپنی ملکیت سمجھا تھا، دل و جان جس پر نچھاور کئے تھے وہ یکدم پرائی و بیگانی ثابت ہوئی تھی۔

کل تک جو انجانے تھے وہ آج شناسا نکلے تھے اور جو شناخت رکھتے تھے وہ بے شناخت و لاتعلق بنا دیئے تھے۔

ان کی تو دنیا ہی تباہ ہو گئی تھی۔ بہت سا نمکین پانی ان کی آنکھوں میں جمع ہو رہا تھا جس کو بڑے کڑے ضبط سے وہ برداشت کئے ہوئے تھے۔

شک و شبے کی گنجائش نہ تھی۔

عرفان خرم نے ان کی ہر بات کا جواب بالکل درست دیا تھا اور یہ بھی بتایا تھا کہ جب وہ بچی کو کچرے کے ڈھیر پر ڈال رہے تھے تو انہوں نے دور سے آتی کار کی ہیڈ لائٹس دیکھ لی تھیں۔ ان کے پاس اتنا موقع نہیں تھا کہ بھاگ کر وہاں سے جا سکتے تھے اور سامنے آنے کا رسک بھی نہیں لے سکتے تھے۔ اس لئے وہ وہاں رکھے بڑے بڑے کچرے کے ڈرمز کے پیچھے چھپ گئے اور حسن بیگ صاحب کے آنے، مشعل کو اٹھا کر لے جانے کی کارروائی تک وہ وہیں روپوش رہے تھے۔ اور پھر ان کی کار اوجھل ہونے کے بعد وہ وہاں سے نکل آئے تھے اور وہاں انہیں حسن بیگ صاحب کا والٹ ملا تھا جو ان کی جیب سے گر گیا تھا جس میں رقم کے علاوہ ان کا وزیٹنگ کارڈ موجود تھا اور اس طرح وہ ان سے واقف ہو گئے کہ حسن بیگ بزنس ورلڈ میں ایک معتبر و قابل احترام نام تھا اور جب سے وہ انہیں جانتے تھے وہ وزیٹنگ کارڈ انہوں نے سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ لیکن اس سے قبل انہوں نے یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ وہ بچی ان کے پاس ہے یا نہیں۔ یا انہوں نے اس بچی کا کیا، کیا۔

حسن بیگ صاحب بہت اچھے انسان و اچھے میزبان تھے۔ لوگ ان کی مہمان نوازی کے گرویدہ تھے۔ آج وہ چاہتے تھے اتنے بد اخلاق و بے مروت بن جائیں۔ اس بلا کے بدلحاظ کہ سامنے بیٹھے ان مہمانوں کو (جو ان کے دل کا خون کرنے آئے تھے) دھکے دے کر یہاں سے نکلوا دیں اور ہمیشہ کے لئے ان کے اس گھر میں داخلے پر پابندی لگوا دیں۔

ان کی یہ سوچیں صرف دماغ تک محدود تھیں۔ ورنہ درحقیقت وہ ایسا کرنا بھی چاہتے تو نہیں کر سکتے تھے۔ اس فعل کی اجازت ان کا ضمیر ہرگز نہیں دیتا کہ اخلاقیات کی پاسداری ان کے وجود کا اثاثہ تھی۔ جھٹلا اس لئے نہیں سکتے تھے کہ صورت مشعل سے ازحد مشابہ تھی۔ فرق صرف عمروں کے تضاد کا پیدا کردہ تھا۔ ان خاتون کے چہرے پر گزرے وقت نے سنجیدگی، تمکنت و وقار اور اضمحلال کی کیفیت پیدا کر دی تھی جس میں اس وقت شوق و اشتیاق شدید کی کیفیت طاری تھی اور وہ بے قراری سے بار بار دروازے کی جانب دیکھ رہی تھیں۔

”حسن صاحب! کیا سوچ رہے ہیں آپ؟ میں دست دراز کئے آپ کے سامنے بیٹھا ہوں۔“ عرفان کی بھاری آواز نے کمرے کے سکوت میں ارتعاش پیدا کیا۔

”میں کیا کہوں...... میری سمجھ میں نہیں آ رہا، جس تکلیف سے میں گزر رہا ہوں وہ کیفیت لفظوں کے اظہار سے باہر ہے۔ دراصل میری ٹریجڈی اس بدنصیب سوداگر کی سی ہے جو تمام عمر کی کمائی لمحے بھر میں گنوا ڈالے بلکہ میرا دکھ اس دکھ سے بھی بڑا ہے۔ مشعل کو میں نے اپنی بیٹی کی طرح ہی سمجھا اور کسی لحہ مجھے یہ خیال تک نہ آیا کہ کبھی نہ کبھی وہ مجھے اس طرح اجنبی کر کے چلی جائے گی۔ میں نے اس کی شادی کی، اس وقت بھی مجھے ایسا محسوس نہ ہوا کہ وہ مجھے چھوڑ کر چلی گئی ہے، میرے لئے پرائی ہو گئی ہے۔ کیونکہ شاہ ویز کی شریک حیات ہونے کے بعد بھی وہ میری بیٹی تھی۔ میری اس سے شناخت ختم نہیں ہوئی تھی۔ لیکن اب تو سب رشتے، شناخت، تعلق سب اپنا وجود کھو بیٹھے ہیں۔ آپ کو مجھے کچھ وقت دینا ہوگا، یہ یقین کرنے کے لئے کہ مشعل میری بیٹی نہیں ہے۔“ شدتِ جذبات سے ان کی آواز بھیگ رہی تھی۔ خود پر قابو پانے کی جستجو میں وہ دھیرے دھیرے کانپ رہے تھے۔

”ابھی میں خود شاکڈ ہوں تو بھلا مشعل کو کس طرح یقین دلاؤں گا۔ آپ کو مجھے کچھ وقت دینا ہوگا۔ اتنی جلدی کچھ ممکن نہیں ہے۔“

”میری آج رات کی فلائٹ ہے۔ میں واپس ساؤتھ افریقہ جا رہا ہوں۔ اگر ویزے کا پرابلم نہ ہوتا تو میں مزید قیام کرتا اور ضرور کرتا مگر میری مجبوری ہے۔ مجھے جانا ہوگا۔ لیکن مجھے یقین ہے آپ جیسا باضمیر و روشن خیال شخص کسی کی حق تلفی یا دل شکنی نہیں کر سکتا۔ حقدار کو اس کا حق ضرور دیں گے۔ مشعل کا تعلق آپ سے نہیں ٹوٹ سکتا۔ وہ آپ کی بیٹی ہے اور آپ ہی کی بیٹی رہے گی۔ ہمارے بزرگ کہتے ہیں پیدا کرنے والے سے زیادہ حق پالنے والے کا ہوتا ہے۔ میں اس امر پر بھی اپنے رب کا ازحد ممنون ہوں کہ اس نے مشعل کو غلط ہاتھوں میں جانے سے محفوظ رکھا ورنہ میں خود کو کبھی معاف نہ کرتا۔“ عرفان پر بھی مسرت و رنج کے احساسات سے رقت طاری تھی۔

”آپی! میں انتظار نہیں کر سکتی۔ خدا کے لئے میری بیٹی کو بلوائیں، مجھ سے اب صبر نہیں ہو رہا۔“ حرا نے مضطربانہ لہجے میں فرح کا ہاتھ پکڑ کر سرگوشی کی۔

”ششش...... کول ڈاؤن، جتنی تڑپ تمہیں ہے، اتنی ہی بے چین میں بھی ہوں اس سے ملنے کے لئے۔ مگر کچھ کنٹرول کرو خود پر، سنبھالو اپنے آپ کو۔ ہم آہستہ آہستہ حسن بیگ صاحب کو ٹریک پر لائیں گے، اس وقت ان کے محسوسات سمجھنے کی کوشش کرو۔ تم پانے کی خوشی میں مبتلا ہو تو وہ کھونے کے دکھ سے نڈھال۔ جس شخص نے تمہاری بیٹی کو اپنی بیٹی سمجھ کر پالا، اس کی اتنی اعلیٰ تربیت و پرورش کی کیا تم ان کے احترام میں کچھ ضبط و برداشت سے کام نہیں لے سکتیں؟“ فرح نے آہستگی سے سمجھایا۔ وہ ہونٹ کاٹ کر خاموش ہو گئیں۔ اسی اثناء میں باہر سے چیخ کی آواز ابھری تھی۔

وہ سب چونک گئے تھے۔ سب سے پہلے حسن بیگ اور شاہ ویز باہر کی طرف لپکے تھے۔ ان کے پیچھے پیچھے عرفان اور منصور اور فرح اور حرا تھیں۔

لاؤنج میں پہنچے تو سامنے کا منظر دیکھ کر حسن بیگ چکرا کر رہ گئے۔ شاہ ویز بڑھ کر انہیں تھام نہ لیتا تو وہ گر چکے ہوتے۔

نیچے قالین پر مشعل بے ترتیب انداز میں گری ہوئی تھی۔ اختری اس کے قریب بیٹھی ہوئی اسے سیدھا کرنے کی کوشش کر رہی تھی اور اسے گرتے ہوئے دیکھ کر اس کے منہ سے چیخ خارج ہوئی تھی۔

◘●◘

یاس کے رنگ بکھرتے ہوئے دیکھوں نہ کبھی
ہر گھڑی خواب کی تعبیر مقدر ٹھہرے
معجزہ یہ غمِ دوراں نے دکھایا ہے مجھے

عرفان خرم اپنے ضمیر کا بوجھ اتار کر جا چکا تھا۔

منصور کی رہائش بدستور ہوٹل میں تھی۔ وہ ہوٹل روانہ ہو گیا تھا۔ فرح اور حرا مشعل پیلس میں رک گئی تھیں۔

حرا، مشعل کو چھوڑ کر جانے پر کسی طرح راضی نہ تھی۔ وہ اس کے قریب بیٹھی بالکل دیوانوں کی طرح اسے دیکھتی۔ کبھی اس کے بال چومنے لگتی کبھی چہرہ اور کبھی ہاتھوں کو آنکھوں سے لگا کر رونے لگتی۔ مشعل ان کی ممتا بھری دیوانگی سے بے خبر نیند آور انجکشن کے زیر اثر سو رہی تھی۔

اس نے اختری کے ساتھ مل کر چائے اور دیگر لوازمات تیار کیے تھے اس خیال سے کہ آنے والے مہمان پاپا کے خصوصی مہمان ہیں۔

سامان ٹرالی میں سیٹ کر کے اس نے ملازمہ اختری کے ساتھ سٹنگ روم میں پہنچایا تھا اور خود اپنا حلیہ درست کرنے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی۔ حلیہ درست کر کے اس نے سٹنگ روم کی طرف قدم بڑھائے تو کھڑکیوں کے ذریعے آتی آوازوں پر اس کے قدم رک گئے۔

اندر انکشافات ہو رہے تھے اور باہر اس کے ذہن میں دھماکے...... بالآخر وہ قاتل سچ سامنے آ ہی گیا تھا، جس نے اس کی ذات کو شش و پنج میں مبتلا کر رکھا تھا، جس سے اس کی شخصیت مسخ ہو گئی تھی۔

وہ بھنور میں ڈوبنے ابھرنے لگی تھی۔ اس کی نگاہوں میں پاپا کا چہرہ تھا۔ ان کی رقت آمیز آواز وہ برداشت نہ کر سکی تھی اور بے آواز بے ہوش ہو کر گر گئی تھی۔ اندر بیٹھے لوگوں کو ذرا محسوس نہ ہوا تھا۔ کافی دیر بعد اختری برتن لے جانے کی نیت سے وہاں آئی تو اسے بے ہوش گرے دیکھ کر وہ زور سے چیخی تھی۔

''آپی! آپ دیکھ رہی ہیں نا، یہ ہو بہو میری کاپی ہے۔ خرم کہتے تھے، میری خواہش ہے ہمارے ہاں بیٹی ہو اور بالکل تمہاری شبیہہ لے کر پیدا ہو۔ ان کی خواہش پوری ہوئی بھی تو کس انداز میں جب وہ دیکھنے کو موجود ہی نہیں ہیں۔'' حرا مشعل کے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے آزردگی سے گویا ہوئی۔

''اب تم رونے مت بیٹھ جانا، جو باتیں ہماری سمجھ سے باہر ہوں ہم انہیں اللہ کی رضا جان کر صبر کر لیتے ہیں۔ یہ خوشی کا موقع ہے، تمہاری سالوں قبل ڈوبی ہوئی ناؤ بخیر و خوبی کنارے لگ گئی ہے۔ اس موقع پر اللہ کا شکر ادا کرو نہ کہ اس سے شکوے شکایت کر کے شکر گزاری کی بجائے ناشکرا پن کرو۔'' فرح نے اس کی بھیگی آنکھیں دیکھ کر جھڑکا تھا۔

''میں رو نہیں رہی آپی، یہ خوشی کے آنسو ہیں۔ احسان مندی و شکر کے آنسو ہیں اور مر جانے والے خوشی و غم ہر موقعوں پر یاد آتے ہیں۔'' کسی بچے کی طرح ہتھیلیوں سے آنکھیں رگڑ کر وہ گویا ہوئیں۔

دروازہ ناک کر کے شاہ ویز اندر آیا تھا۔

''آپ لوگوں کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو آپ بلا تکلف انٹر کام پر کہہ کر منگوا سکتی ہیں۔'' وہ مسکرا کر گویا ہوا۔

''یہاں کے ملازم بھی میزبان کی طرح بہت اچھے ہیں۔ انہیں کچھ کہنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ خود ہی سمجھ جاتے ہیں۔ آپ بیٹھو بیٹا۔'' وہ صوفے پر جگہ بناتی ہوئی گویا ہوئیں۔

شاہ ویز کو ان کے اصرار پر بیٹھنا پڑا۔

اس کی نگاہیں بیڈ پر بھٹک رہی تھیں جہاں وہ مشعل کی دھیرے دھیرے لرزتی پلکوں کو دیکھ کر سمجھ چکا تھا وہ جاگ رہی ہے۔ شاید اسی پل اس کی بے خودی ٹوٹی تھی اور جان کر بھی انجان بن کر اچانک در آنے والے واقعات کو فیس کرنے کی استطاعت سے سمجھوتہ نہ کر پا رہی تھی۔

اس کے احساسات سے وہ اس وقت مکمل طور پر ہم آہنگ تھا کہ مرد ہو کر وہ ان انکشافات سے فوری طور پر سمجھوتہ نہ کر پایا تھا پھر مشعل تو بے حد کول، حساس و نازک جذبات کی ناتواں لڑکی تھی اور اس کی محبت کی ابتداء و انتہا حسن بیگ صاحب کی ذات تھی جنہوں نے اسے اتنا پیار و اپنائیت دی کہ وہ ان کو پانے کے لئے ہر جذبے کو فراموش کر سکتی تھی۔

یہی وجہ تھی جو وہ اپنی ماں کی موجودگی کو کوئی اہمیت و وقعت دینے کی بجائے احساسات سے عاری پڑی تھی۔

''حرا! کتنی خوش نصیب ہو تم۔ دیکھو اللہ نے تمہیں بیٹی کے ساتھ ایک ہونہار فرمانبردار بیٹا بھی دیا ہے۔ کبھی کبھی بالکل اجنبی اور غیر بھی اتنے قریبی تعلق دار نکل آتے ہیں کہ گمان سے باہر ہوتا ہے۔''

''جی اتفاق سے زندگی انہی رشتوں کا نام ہے۔'' شاہ ویز آہستگی سے گویا ہوا۔

''خوشیوں کی میں سدا سے متلاشی رہی ہوں لیکن یہ جب بھی میرے پاس آئی ہیں بہت عجلت میں آ کر لوٹ گئی ہیں۔ میرا دامن ان کو سمیٹنے کے لئے پھیلا ہی رہا ہے۔ مگر آج پہلی بار اتنا نوازی گئی ہوں کہ اپنا دامن اور آنچل کم لگنے لگا ہے۔'' حرا کی مدھم آواز مسرتوں سے لبریز تھی۔ ان کے ہمیشہ اداس و غمزدہ نظر آنے والے چہرے پر اس وقت طمانیت بھری مسکراہٹ تھی۔

ممتا کے رنگوں نے ان کو پُر وقار جلا بخشی تھی۔

''آپی! بالکل درست کہہ رہی ہیں۔ میں سچ مچ از حد خوش قسمت ہوں جو مجھے بیٹی کے ساتھ ساتھ بیٹے کی محبت بھی ملی ہے۔ دراصل داماد بھی تو بیٹا ہی ہوتا ہے۔''

جواباً شاہ ویز نے کچھ کہا نہیں مگر اس کے لبوں پر پُر خلوص مسکراہٹ تھی۔ حرا تو مسلسل مشعل کے نزدیک ہی بیٹھی رہی تھی۔ فرح خاصی دیر تک اس کے ساتھ مختلف موضوعات پر گفتگو کرتی رہی تھیں۔ معاً حرا گویا ہوئی تھیں۔

''بیٹا! کیا آپ کو شادی سے قبل حسن بیگ صاحب نے مشعل کے بارے میں سچائی بتائی تھی کہ مشعل ان کی سگی بیٹی نہیں ہے؟''

''جی ہاں، مجھ سے اور بے جی سے انہوں نے کوئی بات نہ چھپائی تھی۔ وہ صاف گو اور صاف نیت انسان ہیں۔ انہوں نے سچائی بتانے کے بعد کہا تھا کہ یہ حقیقت کبھی بھی مشعل کو معلوم نہ ہو۔ وہ یہ سوچ ہی نہیں سکتے تھے کہ مشعل اس حقیقت سے آگاہ بھی ہو سکتی ہے مگر جو ہونا ہوتا ہے اسے کون ٹال سکتا ہے۔''

''جو ہوا بہت اچھا ہوا۔ میری بیٹی کو میری آغوش نہیں ملی تو کوئی بات نہیں لیکن اس کے وجود پر چڑھا گندگی و گمراہی کی نشانی کا خول تو ٹوٹ گیا۔ اب اس کا وجود گالی تو نہیں کہلائے گا اور کہلائے بھی کیوں؟ وہ شریف ماں باپ کی جائز اولاد ہے، جس کو ناجائز بتانے والوں کی بربادی بھی اسی دم سے شروع ہو چکی تھی، جن کو سرخروئی و طمانیت اسی وجود کی وجہ سے ملی۔

''تمہاری بیٹی تمہیں مل گئی۔ اب بھول جاؤ تمام دکھوں کو۔ سچ کبھی کمزور نہیں پڑتا، اپنا آپ منواتا ہے۔ خواہ اسے بہت وقت لگے۔ آج تو آپ کی سنز پر ہماری ہمشیرہ قبضہ جما کر بیٹھی ہوئی ہیں۔ کیا پرمیشن دیں گے یہاں رات......''

''وائے ناٹ، میں تو بس یوں ہی چلا آیا تھا۔'' شاہ ویز ان کی بات قطع کر کے جھجکا سا اٹھ کھڑا ہوا۔

''ارے بیٹھو تو سہی، فوراً ہی کھڑے ہو گئے۔'' فرح کے لبوں پر شرارت بھری مسکراہٹ تھی۔

''انشاء اللہ صبح ملاقات ہو گی۔ آپ لوگ آرام کریں۔'' وہ رکا نہیں تھا، لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے نکل گیا تھا۔

''آپی! آپ بھی بعض اوقات تو حد کرتی ہیں۔ بھلا کیا ضرورت تھی اس طرح کہنے کی؟''

''مجھے معلوم ہوتا تمہارا داماد اتنا شرمیلا ہے تو بخدا نہ کہتی۔'' سچی خوشی و اطمینان انسان کو شوخ و شنگ بنا دیتا ہے۔ فرح کا چہرہ بھی اس کی اندرونی خوشیوں کا غماز تھا۔

ویسے بھی وہ ان بہنوں میں سے نہیں جن کی خوشیوں و تمناؤں کا مرکز چھوٹی بہنوں کی خوشیوں سے وابستہ ہوتے ہیں۔

وہ بے اولاد تھیں۔

حرا کو انہوں نے ایک نہیں کئی رشتوں سے چاہا تھا۔

بیٹی، بہن، سہیلی۔ ہر رشتہ ان کے لئے عزیز و معتبر تھا۔ پھر جو دل کے قریب ہوتے ہیں ان کے دکھ اور غم سب اپنے ذاتی محسوس ہوتے ہیں۔ حرا بھی بہن کے روشن چہرے کو دیکھ کر دگنی خوشی محسوس کر رہی تھی۔ مشعل آنکھیں بند کیے ان کی باتیں سنتی ہوئی ایک کرب سے گزر رہی تھی۔ اس پر انکشاف در انکشاف کے در وا ہوئے تھے۔

جہاں وہ اس دکھ سے آشنا ہوئی تھی کہ وہ حسن بیگ صاحب کی سگی بیٹی نہیں ہے وہیں وہ خود پر لگے ذلت آمیز الزام سے چھٹکارا پانے پر عجیب سی راحت محسوس کر رہی تھی۔ اور کچھ دیر قبل جو شاہ ویز نے انکشاف کیا تھا کہ وہ اس کو حقیقت جان کر قبول کیے ہوئے تھا نہ صرف وہ بلکہ بے جی بھی تو تہہ دل سے ان کی اعلیٰ ظرفی و اعلیٰ انسانیت کی قائل ہو گئی تھیں۔

''کیا...... کیا...... وہ مجھ سے سچ مچ محبت تو نہیں کرنے لگا ہے؟ بعض لوگوں کے محبت کرنے کے انداز بالکل منفرد ہوتے ہیں۔ بظاہر بے نیاز و بے حس بنے رہتے ہیں۔ گھمنڈی اور لاپروا نظر آتے ہیں مگر ان کے اندر محبتوں کے چشمے پھوٹ رہے ہوتے ہیں، چاہت کے پھولوں سے چمن مہک رہا ہوتا ہے۔ آہ میں کتنی بے وقوف و انجان تھی، جو جو نے کبھی مجھ سے محبت نہیں کی، ہمیشہ اس نے مجھے بینک اکاؤنٹ کے طور پر استعمال کیا، جس کی خود غرضیوں کو میں چاہت کی عنایتیں سمجھتی رہی وہ مطلب پرستی کی گھٹیا چالیں تھیں۔

آنٹی نے جو جو سے اس لئے میری منگنی ختم کی تھی کہ ان کی نظر میں، میں ناجائز اولاد تھی اور شاہ ویز نے سب جان کر بھی مجھے اپنایا۔ اوہ، کتنے احسانات ہیں اس کے مجھ پر...... مجھے نام دیا، پاپا کے ڈاؤن بزنس کو سہارا دیا، اتنا کچھ کرنے کے باوجود کبھی حرف شکایت اس کی زبان پر میرے خلاف نہیں آیا۔ میں یہی سمجھتی رہی وہ دولت کے لالچ میں مبتلا ہو کر سب کر رہا ہے۔ کس کس طرح میں نے اس کی تضحیک نہیں کی، کس کس طرح اس کی زندگی اجیرن کی، اب ذرا اس نے بے التفاتی و بیگانگی دکھائی تو ہزاروں شکووں و شکایتوں کا جہاں مجھ میں آباد ہے۔''

آنسو روانی سے اس کی بند آنکھوں سے بہنے لگے تھے اور وہ ان پر اختیار رکھو بیٹھی تھی۔ ان آنسوؤں نے حرا کو چونکا یا تھا۔

''روؤ نہیں، آنکھیں کھولو میری جان۔ تمہاری ماں کب سے بلکہ ایک مدت سے تمہاری منتظر ہے۔ اب مجھے مزید مت تڑپاؤ۔'' انگلیوں کے پوروں سے اس کے آنسو

صاف کرتی وہ جذباتی انداز میں بولی تھیں۔

ان کی ہر جنبش میں ممتا کا مہکا مہکا لمس تھا۔ ان کے قریب سے وہی مہک آ رہی تھی جو اسے اپنے وجود سے آتی تھی۔ وہ اٹھی تھی اور ان کے سینے سے لگ کر رونے لگی تھی۔ حرا کی آنکھیں پہلے ہی اشکبار تھیں، بڑی محبت سے وہ اسے بازوؤں میں سمیٹے ہوئے تھیں۔

فرح بھی بھیگی آنکھوں اور مسکراتے لبوں سے ان کا ملن دیکھ رہی تھیں۔ جہاں لفظ ساتھ چھوڑ جائیں وہاں آنسو بات کرتے ہیں اور یہ آنسو ملن کے آنسو تھے، مسرتوں کے آنسو تھے۔

''پاپا میں آپ کی بیٹی ہوں اور آپ کی بیٹی رہوں گی۔ آپ مجھے کبھی خود سے دور محسوس نہیں کریں گے۔'' فجر کی نماز کے بعد وہ ان کے کمرے میں چلی آئی تھی۔ ان کی سرخ آنکھیں اور الجھے بال اس بات کے غماز تھے کہ وہ ساری رات بے چین رہے ہیں۔

''ہاں مجھے معلوم ہے، میری بیٹی بدل نہیں سکتی۔ رشتے خون کے ہوں یا دل کے، بڑی حیثیت رکھتے ہیں۔ میرا تم سے خون کا رشتہ نہیں۔''

''پلیز...... پلیز پاپا! آپ ایسا کبھی نہیں بولیں گے۔ میرا ہر تعلق، ہر رشتہ آپ سے وابستہ ہے اور وابستہ رہے گا۔ آپ کبھی ایسا نہیں بولیں گے ورنہ میں مر جاؤں گی۔'' وہ ان سے لپٹ کر سسک پڑی۔

''رو نہیں...... مجھے بے حد تکلیف ہو رہی ہے۔ جانتی ہو نا میں تمہاری آنکھ میں ایک آنسو برداشت نہیں کر سکتا۔'' وہ اس کے آنسو صاف کر کے گویا ہوئے۔

''اور آپ جو رات بھر روتے رہے ہیں پاپا کیا سمجھ رہے تھے میں آپ کو چھوڑ کر اپنی ماں کے ساتھ چلی جاؤں گی؟''

''نہیں مجھے معلوم تھا میری بیٹی مجھے چھوڑ کر جا نہیں سکتی۔'' وہ اسے لے کر صوفے پر بیٹھ گئے تھے۔

''حالانکہ پاپا آپ نے اپنی بیٹی کو بہت پہلے چھوڑ دیا ہے۔''

''ہوں...... یہ بات تو ہے۔ لیکن کیا کریں، بیٹی پرائی ہی ہوتی ہے اور داماد اگر شاہ ویز جیسا قیمتی ہیرا ہو تو یہ پرایا پن رہتا نہیں ہے۔ اس معاملے میں تو آپ میری چوائس کو داد دیں گی نا، بیٹے جو ہمارے مصائب میں ہمارا ساتھ نبھاتے ہیں وہی ہمارے سچے خیر خواہ ہوتے ہیں۔ اس نے اس وقت میرا ساتھ دیا جب اپنے بھی منہ چھپا کر بھاگ گئے تھے۔ میری ہر مشکل، ہر پریشانی کو شیئر کیا اور کبھی بھی یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ میں مشکلات کی ان کٹھن گھڑیوں میں تنہا ہوں۔ آج تک وہ میرا بازو بنا ہوا ہے، میرا حوصلہ، میرا سہارا، میرا یقین ہے وہ۔ اتنا فرمانبردار، اتنا مخلص میرا اپنا ہوتا تو وہ بھی نہیں دے سکتا تھا جتنا شاہ ویز نے مجھے دیا ہے۔'' ہمیشہ کی طرح وہ اس کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا رہے تھے۔

ایک وقت تھا جب وہ اس کی تعریف و توصیف سے خار کھاتی تھی۔

ان کی شاہ ویز پر نوازشوں سے چڑتی تھی لیکن اب وقت بدل گیا تھا۔ حالات بھی تبدیل ہو چکے تھے۔

سب سے اہم تبدیلی یہ تھی کہ مشعل، مشعل نہ رہی تھی۔

اس کا غرور، طنطنہ، اکڑ اور نخوت سب بدل گیا تھا۔ وہ سراپا بدل گئی تھی۔ اس کے احساسات، جذبات سب بدل گئے تھے۔

پاپا کی تعریف سے اسے ایسی ہی خوشی ہو رہی تھی جیسے وہ شاہ ویز کی نہیں اس کی تعریف کر رہے ہوں۔

''میں گزشتہ کئی دنوں سے محسوس کر رہا ہوں آپ میں اور شاہ ویز میں کشیدگی چل رہی ہے، شاید کسی غلط فہمی کی بناء پر۔ کیا بات ہے یہ میں نہیں جانتا صرف آپ سے ایک ریکویسٹ ہے میری، شاہ ویز جیسے بیسٹ انسان کو کبھی کھونا مت۔ کھونے والے لوگ بہت کم لوگوں کو دوبارہ مل پاتے ہیں۔ غلطی کسی کی بھی ہو، پہل آپ کر لینا بیٹا، یہ چھوٹی موٹی ناراضگی ازدواجی رشتوں کا حصہ ہوتی ہے۔ اگر انہیں خوامخواہ طول دیا جائے تو کچھ باقی نہیں بچتا۔''

□●□

شاہ ویز کو اچانک بزنس کے کسی مسئلے کے باعث پیرس جانا پڑ گیا اور اس عجلت میں وہ گیا تھا کہ مشعل سے اس کی کوئی بات نہ ہو پائی تھی۔ ادھر مشعل کے شب و روز بدل کر رہ گئے تھے۔

وہ دو حصوں میں تقسیم ہو کر رہ گئی تھی۔ حرا اسے چھوڑنے پر راضی نہ تھیں اور روز ڈرائیور بھیج کر اسے گھر پر بلوا لیا کرتیں۔ وہ دوپہر ان کے ہمراہ گزارتی، شام میں گھر لوٹتی تو حسن بیگ صاحب کو اپنا منتظر پاتی تھی۔

حرا کی محبتوں کا کوئی کنارہ نہیں تھا تو حسن بیگ کی شفقتوں و پیار کی وسعتیں لامحدود تھیں وہ کویا بٹ کر رہ گئی تھی۔

شاہ ویز کو گئے ایک ہفتہ ہو چکا تھا اور اس نے اس دوران کئی مرتبہ کال کی تھی۔ بہت عام سے لہجے میں اس کی خیریت دریافت کرتا، حرا، فرح، حسن بیگ سب سے گفتگو کرتا۔ اس کا عام انداز و معتبر انداز و رویہ اس کے تمام حوصلوں کو پست کر ڈالتا۔ وہ جو اس سے کچھ ''خاص'' سننے کی تمنائی تھی کچھ حال زار سنانے کو بے قرار تھی اس کی آواز سنتے ہی دل کی دھڑکنیں خاص انداز میں مچلنے لگتی تھیں۔

انگ انگ عجیب کیفیت سے دوچار ہونے لگتا تھا۔ مگر دوسری جانب کی بے حسی تمام جذبوں کو سرد کر ڈالتی تھی۔

اس پر جھنجلاہٹ و بے زاری حملہ آور ہوتی جا رہی تھی۔ حرا بیگم کے ہاں، نہ حسن بیگ کے ساتھ اس کا دل لگ رہا تھا۔ دو دن سے وہ زیادہ تر اپنے کمرے میں بند رہی تھی۔ حسن صاحب سے بھی کھانے پر سرسری سی ملاقات ہو رہی تھی۔ حسن بیگ اس کے مزاج کے تمام موسموں سے آگاہ تھے سو وہ سمجھ گئے تھے وہ آج کل تنہائی چاہ رہی ہے اور حسب عادت انہوں نے اس کی تنہائی میں مداخلت نہ کی تھی۔

حرا جو اس کی عادت و مزاج سے ناآشنا تھیں اس کی دو دن کی غیر حاضری پر وہ بوکھلائی، گھبرائی، پریشان سی وہیں چلی آئیں۔

''السلام علیکم بیگ صاحب!'' ان کی پہلی مڈبھیڑ لاؤنج میں بیٹھے حسن صاحب سے ہوئی تو انہوں نے خاصے تکلف زدہ انداز میں سلام کیا۔

''وعلیکم السلام، آیئے بیٹھیں۔'' وہ احتراماً کھڑے ہو کر گویا ہوئے۔

''مشعل کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟ میں دو دن سے ڈرائیو کو بھیج رہی ہوں تو وہ اسے بھی واپس بھیج رہی ہیں اور نہ کال اٹینڈ کر رہی ہیں۔ میں نے سوچا دیکھ کر آؤں کیا بات ہے۔'' ان کے انداز میں از حد فکر مندی تھی۔

''الحمدللہ، وہ بالکل خیریت سے ہے۔ آپ پریشان مت ہوں۔ آج کل اس کا موڈ تنہائی چاہ رہا ہے اور جب ایسا ہوتا ہے تو میں بھی بالکل ڈسٹرب نہیں کرتا اسے جب تک اس کا موڈ بحال نہ ہو جائے۔''

''لیکن ایسا کیوں ہوتا ہے...... یہ تو نارمل روٹین نہیں ہے۔''

''وہ بچپن سے کچھ ایب نارمیلٹی کا شکار رہی ہے۔ شادی سے قبل وہ بہت زیادہ ایسی حرکتیں کرتی تھی۔ اس کے مزاج میں غصہ، ضد، ہٹ دھرمی اور خود سری بہت زیادہ تھی۔ وہ کسی کو کوئی ویلیو دینے کو تیار نہ تھی۔ اب شادی کے کئی ماہ بعد اس کا موڈ خراب ہوا ہے۔''

''کوئی وجہ تو ہوگی؟ آپ نے معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی؟ آپ کو معلوم کرنا چاہیے تھا۔''

''میں نے کبھی بھی اس کے معاملات میں مداخلت نہیں کی ہے۔ ہمیشہ اسے اس کی مرضی کرنے دی ہے۔ شاید اب میری مداخلت وہ برداشت نہ کر پائے۔ میں سب کچھ برداشت کر سکتا ہوں مگر اس کی ناراضگی برداشت نہیں ہوتی اور اسی خوف سے میں نے اسے اس کی مرضی پر چھوڑا ہے۔''

''خرم ہوتے تو وہ بھی اسی طرح اپنی بیٹی پر جان لٹاتے، بیٹی کی خوشی ان کی خوشی ہوتی، دکھ اس کے وہ سارے لے لیتے۔ میری بیٹی خوش نصیب ہے، باپ نہیں ملا مگر محبتیں، شفقتیں اسی انداز میں ملی ہیں۔'' حسن بیگ گفتگو میں مصروف تھے اور حرا کا ذہن سوچوں کی پروازیں بھر رہا تھا۔

''میں مشعل کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتی ہوں کچھ عرصے کے لئے شہر سے باہر کسی پرفضا مقام پر اگر آپ کی اجازت ہے تو۔''

''آپ لے جا سکتی ہیں۔ شاہ ویز کو آنے میں ایک ماہ کا عرصہ باقی ہے اور تب تک میں چاہتا ہوں، آپ اس کے ساتھ وقت گزار سکتی ہیں۔ پھر شاہ ویز آ جائیں گے تو وہ اپنی میرا مطلب ہے ان کے ساتھ چلی جائے گی۔ پھر شاید وہ مجھے یا آپ کو اتنا ٹائم نہ دے پائے۔''

ملازمہ کو کافی لانے کا آرڈر دے کر حسن بیگ صاحب محو گفتگو تھے۔

''اوہ، واقعی مجھے تو یہ یاد ہی نہیں ہے کہ مشعل شادی شدہ ہیں بلکہ ان کے کسی عمل سے ظاہر بھی نہیں ہوتا کہ وہ شادی شدہ ہیں۔ عجیب غیروں جیسا، اجنبیت بھرا ان کا رویہ ہوتا ہے۔ کئی بار میری موجودگی میں مشعل نے شاہ ویز کی کالز اٹینڈ کی ہیں اور ان کی گفتگو اتنی مختصر و تکلف زدہ ہوتی ہے کہ میں سمجھتی ہوں اس گفتگو سے بہتر گفتگو اجنبی لوگ آپس میں کر لیتے ہیں۔ معاملہ کیا ہے، مجھے سمجھ نہیں آتا۔''

ان کی گفتگو میں ممتا کی مخصوص تڑپ، پریشانی، فکر مندی موجود تھی۔ حسن بیگ مبہم سا مسکرا کر رہ گئے۔

''پہلے میں نے سوچا تھا شاید مشعل اس شادی سے خوش نہیں ہے لیکن اس خیال کو ذہن سے رد کر دیا تھا۔ شاہ ویز جیسا خوبرو اور بہترین جیون ساتھی پا کر کون لڑکی ہوگی جو خوش نہیں ہوگی۔ شاید ان کے درمیان تکلف کی دیوار ابھی حائل ہے یا پھر ایسی کوئی بات، ایسا کوئی جواز ضرور ہے جس نے انہیں تکلف کے رشتوں میں مقید کر رکھا ہے۔''

''مجھے بار بار اس امر کا شدت سے احساس ہوا ہے۔ میں ہر ممکن کوشش کے باوجود ماں کا فرض یا ماں جیسی تربیت مشی کو نہ دے سکا۔ یہ سب اسی کمزوری کا رزلٹ ہے۔'' انہوں نے حسب عادت فراخدلی سے اپنی غلطی کا اعتراف کیا تھا حالانکہ اس معاملے میں وہ بے قصور تھے۔

''یہاں آپ کی کوئی غلطی نہیں ہے اور نہ ہی کوئی کوتاہی ہوئی ہے۔ اس کی پرورش آپ نے جس طرح کی ہے وہ قابل ستائش ہے۔ ہر کوئی آپ جیسا نہیں ہو سکتا۔ یہ میری بیٹی کی خوش بختی ہے۔'' ملازمہ کی آمد پر وہ خاموش ہو گئی تھیں۔

□●□

سردیوں کی شام بڑی اُداس ہوتی ہے، کسی غریب نوعمر بیوہ کی مانند کیسی عجیب سونی سونی رت پھیل رہی تھی۔

وہ لان میں گم صم، اداس بیٹھی ہوئی تھی۔ طبیعت میں ازحد اضطراب پھیلتا جا رہا تھا۔ ہر شے سے وہ اکتاتی جا رہی تھی۔

کچھ دن حرا کے پاس اور کچھ دن حسن بیگ کے ہاں گزارتے ہوئے اسے اس روٹین سے سخت وحشت و بوریت محسوس ہونے لگی تھی۔

شاہ ویز کا ایک ماہ کا ٹور تین ماہ گزرنے کے باوجود مکمل نہیں ہو رہا تھا۔ ہر ہفتے وہ کسی شہر یا ملک سے کال کرتا تھا۔

کالز اس کی برابر آ رہی تھیں مگر اس نے کبھی یہ بتانے کی زحمت گوارا نہ کی تھی کہ اس کی واپسی کب تک متوقع ہے؟ اور وہ ہر بار یہ سوال کرتے کرتے رک جاتی۔ ایک جھجک، ایک حیا اس کا دامن گویا تھام لیتی تھی اور وہ اسی انتظار میں رہتی کہ وہ اب حال دل سنانے والا ہے کہ ''میں اب تمہاری جدائی کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اپنے ساتھ تمہیں بھی بہت سزا دے چکا ہوں۔ میں آ رہا ہوں، مزید جدائیوں کے پل عبور کرنے کی سکت باقی نہیں رہی۔'' لیکن یہ خیال صرف خیال ہی رہتا تھا۔ خیر خیریت سے بات آگے نہ بڑھتی۔ اب اس کا انتظار، اشتعال بن چکا تھا۔

جب انتظار کی طنابیں ٹوٹ جائیں اور ضبط کے حوصلے اپنا توازن کھو بیٹھیں تو انتظار، انتظار نہیں رہتا، تمام امنگیں، حسرتیں، شوق، دید، وصال، صنم ریزہ ریزہ ہو کر

آگ بن جاتا ہے

نفرت بن جاتا ہے

غصہ بن جاتا ہے

وہ بھی تنفر و اشتعال کی آگ میں بھسم ہو رہی تھی۔

''بیٹا! اتنی ٹھنڈ میں بغیر سویٹر اور شال کے بیٹھی ہیں آپ۔ اس طرح ٹھنڈ لگ جائے گی آپ کو اور بیمار ہو جاؤ گی۔'' فرح اس پر گرم شال ڈالتے ہوئے ملامت سے گویا ہوئیں۔

''میں..... میں آگ میں جل رہی ہوں..... اس آگ میں برف بھی پانی بن کر بہہ جائے۔''

''کیا ہوا؟..... کیا سوچ رہی ہو..... کوئی پرابلم ہے؟'' وہ اس کے قریب بیٹھ کر اس کا مخروطی سفید و سرد ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبا کر بولیں۔

''کوئی پرابلم نہیں ہے، میں ٹھیک ہوں۔'' اس نے جبراً لب کشائی کی۔

''ٹھیک ہو نہیں، لگنے کی کوشش کر رہی ہو۔''

جواباً وہ خاموشی سے سر جھکا کر بیٹھ گئی۔

''کیا ہو گیا ہے جان؟'' انہوں نے ہاتھ پھیلا کر اسے سینے سے لگا لیا۔ ''بالکل مردہ دل ہو گئی ہو..... ذرا اپنی شکل دیکھو آئینے میں آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے ہیں، رنگ زرد اور چہرہ مرجھا کر رہ گیا ہے۔ اس عمر میں آپ کا یہ حلیہ ہے جب ماں ہو گی تو پھر کیا ہو گا؟''

''میں بالکل ٹھیک ہوں..... ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' اس کی آواز کی بے دلی لفظوں کا ساتھ نہ دے رہی تھی۔

''شاہ ویز کب آ رہے ہیں؟'' انہوں نے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے استفسار کیا۔

''مجھے نہیں معلوم۔''

''کیوں..... آپ کو معلوم ہونا چاہئے۔ آپ ان کی بیوی ہو۔''

''انہوں نے بتایا نہیں؟''

''آپ معلوم کر لیتیں۔''

''میں کیوں معلوم کر لیتی؟'' وہ ان سے علیحدہ ہو کر بیٹھ گئی۔

''تم واقف ہو شاہ ویز کی، حق ہے آپ کو معلوم کرنے کا۔''

''ان کا حق نہیں ہے بتانے کا؟ کیا سارے حقوق، سارے فرائض صرف اور صرف بیوی کے ذمے آتے ہیں؟'' وہ بری طرح چڑ گئی تھی۔

''نہیں، میاں اور بیوی دونوں ففٹی ففٹی کے پارٹنرز ہوتے ہیں۔ کچھ فرائض بیوی کی ذمہ داری ہوتے ہیں تو کچھ حقوق ادا کرنے کی ذمہ داری میاں یعنی مرد پر بھی لاگو ہوتی ہے۔ دونوں کی باہمی محبت اور انڈر اسٹینڈنگ سے میرڈ لائف بیلنس رہتی ہے۔ آپس میں جتنی محبت و خلوص ہو گا، رشتہ اتنا ہی مضبوط، پائیدار ہوتا ہے۔ اس رشتے میں دونوں فریق مساوی حیثیت رکھتے ہیں۔'' حرا اور فرح جو کئی دنوں سے اس کی وجہ سے پریشان تھیں روز بروز اس کی گرتی صحت و خاموشی سے اور دوسری طرف شاہ ویز کا عجیب و بے معنی رویہ انہیں الجھائے ہوئے تھا۔ اکثر کالز پر باتیں کرتے ہوئے غیر محسوس انداز میں انہوں نے اسے بھی ٹٹولنے کرید نے کی بھرپور کوشش کی تھی اور اندازہ لگایا تھا ان کے درمیان کوئی بات، کوئی رنجش، کوئی اختلاف ہے ضرور۔ شاید ان کا کوئی مسئلہ ہے اور دونوں ان مسئلوں کو چھپائے اس طرح بن باس کاٹ رہے ہیں۔

اب اس الجھن کی گرہیں ہلکی ہلکی ڈھیلی پڑنا شروع ہوئی تھیں اور فرح اس الجھی ڈوری کے اصل سرے کو تھامنے کا ارادہ کر چکی تھیں۔

''پلیز آنٹی! مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں..... میں نہ معلوم کیا اول فول بک چکی ہوں، جو ہو رہا ہے میرا نصیب ہے۔ اس میں کسی کا کوئی دوش نہیں ہے۔'' اس کے انداز میں اضطراب ہی اضطراب تھا جو بے دھیانی میں منہ سے نکل چکا تھا اسی پر نادم تھی وہ۔

''کتنی افسوس کی بات ہے..... بلکہ شدید دکھ کی، ہم آپ کو اپنے آپ میں سے ایک سمجھتے رہے اور آپ نے ہمیں آن واحد میں عرش سے فرش پر لا پٹخا۔ کتنی اجنبیت، کس قدر رکھائی ہے آپ کے لہجے میں۔ ہم سے اپنی پرابلم شیئر کرنے کے بجائے آپ دامن بچا رہی ہیں۔ اس طرح جیسے ہم آپ کے کچھ لگتے ہی نہیں ہیں۔'' حرا نے کہا جو نہ معلوم کس وقت ان کے پیچھے آ کھڑی ہوئی تھیں۔ مشعل کے بیگانہ رویے پر تڑپ کر گویا ہوئیں۔ وہ دونوں میں چونک کر پلٹی تھیں۔

''مما! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ کیوں ایسی باتوں کو اہمیت دے رہی ہیں؟ خدا کے لئے آپ برا مت مانیں۔'' وہ بے اختیار آگے بڑھ کر ان سے لپٹ گئی۔ اس کے انداز میں اتنی بے ساختگی و اپنائیت تھی کہ حرا کے اندر طمانیت تہہ در تہہ اترنے لگی۔

''میں اور آپی آپ کے لئے ایک جذب، ایک احساس رکھتے ہیں۔ آئندہ ہم سے کچھ چھپانے کی کوشش مت کیجئے گا۔ ہاں اب بتاؤ کیا مسئلہ ہے؟ آپ کے اور شاہ ویز کے درمیان بیگانگی اول روز سے ہی نظر آ گئی تھی جو گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ مزید واضح ہوتی گئی اور آپ کے بن بتائے ہی ہم بہت کچھ سمجھ چکے ہیں۔ بہر حال اندازے، اندازے ہی ہوتے ہیں ضروری نہیں حقیقت سے ہمیشہ قریب تر ہوں، بعض اوقات ایسا ہوتا ہے آنکھیں جو دیکھتی ہیں وہ صرف دکھاوا ہوتا ہے۔ شاہ ویز ہمیں عزیز سہی مگر داماد اس وقت تک عزیز و قابل احترام رہتے ہیں جب تک بیٹیوں کی مسرتیں و محبتیں ان سے وابستہ رہتی ہیں ورنہ ان میں اور کھوٹے سکوں میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ آپ بلا کسی جھجک و خوف کے بتاؤ کہ اصل معاملہ کیا ہے؟''

ان دونوں نے مل کر اس کی ہمت بندھائی، اسے حوصلہ و سہارا دیا تو وہ کچھ بھی نہ چھپا سکی۔ شاہ ویز سے پہلی ملاقات سے آخر تک سب بتاتی چلی گئی۔ اور وہ دونوں دم بخود سی سن رہی تھیں۔

''مجھے اعتراف ہے اپنی ہر غلطی، ہر لغزش کا۔ میں نے اسے بہت بے عزت کیا، الزامات لگائے، برا بھلا کہا۔ اس کی زندگی ایک عرصے تک جہنم بنا کر رکھی لیکن یہ سب اس وقت ہوا جب مجھے اچھے برے، دوست دشمن کی پہچان نہیں تھی۔ میرے شعور نے آگہی کے در وا نہیں کئے تھے، دانش مندی اور سمجھ بوجھ مقفل تھی۔ میں نے جو کچھ کیا وہ نادانستگی و بے وقوفی میں کیا تھا۔ اور جب میرا شعور بیدار ہوا، ادراک نے بند قفل توڑے تو میں نے اپنی غلطی ماننے میں کوئی لمحہ نہ لگایا، پوری صداقت و کشادہ دلی سے اپنی غلطیوں کا اعتراف کیا۔ لڑکی ہونے کے باوجود اظہار محبت میں خود پہل کی۔ ہر وہ فعل چھوڑا جس سے اسے نفرت تھی۔ ہر وہ عمل اپنایا جس کو وہ پسند کرتا تھا، سراہتا تھا۔ اس کی خاطر میں نے خود کو سرتاپا بدل لیا۔

اپنی انا، خودداری، نسوانیت کو جھکا ڈالا، ریزہ ریزہ کر دیا اور خود کو مٹا کر کیا پایا؟

انتظار، انتظار، انتظار..... جس کی اذیت سے دم گھٹنے لگا ہے۔''

''کیا تم شاہ ویز سے دستبرداری قبول کر لو گی؟'' فرح کا سوال تھا یا خنجر جو سیدھا دل میں پیوست ہوا تھا اور وہ درد سے بلبلا اٹھی تھی۔

''میری اتنی کٹھن ریاضتوں کا یہ صلہ ہے؟''

''جہاں تم نے اتنی اذیتیں سہی ہیں وہاں ایک اور سہی۔ شاہ ویز کو کہو وہ واپس آ جائے۔'' حرا کا لہجہ مصالحت آمیز تھا۔

''پھر وہی بات؟ ہر بار میں ہی کیوں جھکوں؟''

''اس لئے کہ محبت اور انا ایک ساتھ نہیں رہ سکتیں۔''

''مما! میں اب اسے اس کی مرضی پر چھوڑ دینا چاہتی ہوں۔''

''نہیں..... آپ اسے کہو گی جلد واپس آنے کا، اسے سامنے بٹھا کر معاملہ سلجھایا جائے گا۔ آخر ہر کام، ہر بات کی ایک حد ہوتی ہے۔ شادی کو دس ماہ ہو چکے ہیں اور یہاں وہی پہلا کا پہلا دن ہے۔'' حرا کا انداز حتمی تھا۔

رات کو شاہ ویز کا فون آیا تو وہ اس وقت تک مشعل کے سر پر سوار رہیں جب تک اس نے اسے واپس آنے کا کہا نہیں۔

''کیا کہا..... ذرا دوبارہ دہرانا؟'' دوسری جانب سے التجائیہ انداز میں اصرار ہوا۔

''آ..... آپ..... واپس..... آ جائیں۔'' وہ مزید بوکھلا گئی تھی۔ جواباً اس سے کچھ کہا ہی نہیں گیا۔ وہ حرا کو ریسیور پکڑا کر چلی گئی۔

□●□

''مشعل! شاہ ویز کو واپسی میں ٹائم لگے گا۔ کام تو کمپلیٹ ہو چکا ہے، وہ کچھ تفریح کی خاطر وہاں رک گئے ہیں۔ بے جی سے کل رابطہ ہوا تھا۔ وہ کہہ رہی تھیں انہیں واپسی میں دو ہفتے لگیں گے۔ حج کے بعد وہ اپنے کسی عزیز کے ہاں ریاض چلے گئے ہیں اور میں چاہتا ہوں آپ ان کی آمد سے قبل وہاں جا کر گھر کی صفائی وغیرہ کروا آئیں بلکہ پورے گھر کی سیٹنگ ہی چینج کر دیں۔ ایک سال سے زائد عرصہ ہو گیا ہے، انہوں نے گھر میں کوئی تبدیلی نہیں کی ہے۔ ان کی آمد سے قبل چینجنگ ہو جائے تو بہتر ہے۔''

وہ رات حرا کے ہاں سے گھر آ گئی تھی۔ صبح ناشتے کے بعد حسن بیگ نے اس گھر کی چابی دیتے ہوئے اسے سمجھایا تھا۔

''او کے پاپا!'' اس نے چابی تھامتے ہوئے کہا۔

''چلیں، میں آپ کو وہاں ڈراپ کرتا ہوا جاؤں گا اور آفس جا کر ڈرائیور کو واپس بھیج دوں گا۔ جو لانا چاہو شاپنگ کر لینا۔''

گھر میں قدم رکھتے ہی ماضی کی اذیتیں ایک ایک کر کے کچوکے لگانے لگی تھیں۔ وہ شدید بوجھل پن و پژمردگی محسوس کرنے لگی تھی۔

یادیں خوشگوار ہوں تو طبیعت کو از سر نو تازہ و سرور کر دیتی ہیں۔ چوکیدار اپنی فیملی کے ساتھ وہاں رہ رہا تھا اور باقی ملازم چھٹی پر تھے۔ وہ لاؤنج میں آ کر صوفے پر بیٹھ گئی اور بیک سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔ رفتہ رفتہ اس کے اندر ایک احساس اترنے لگا۔

سکون، سرور، راحت کا احساس بے خود کیے ہوئے تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا اپنا گھر کیا ہوتا ہے؟

خود کی شناخت کیسا اعتماد و توقیر بخشتی ہے۔ وہ کئی ماہ پہلے اپنی شناخت کھو بیٹھی تھی۔ ایک بھٹکتی ہوئی روح بن گئی تھی۔ ایک ایسے پنچھی کی طرح جو اپنے آشیانے کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ اس کی تمام رنجیدگی، خاموشی و بیزاریت کسی گرد کی طرح صاف ہو گئی تھی۔ وہ خود کو بالکل ہلکا پھلکا، معطر معطر محسوس کر رہی تھی۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور بھرپور انگڑائی لے کر کھڑی ہو گئی۔

''یہ معمولی سے فرنیچر اور عام سے در و دیوار والے گھر نے مجھ پر کیا سحر پھونکا ہے...... میں جو گزشتہ کئی دنوں سے خود کو بالکل مردہ محسوس کر رہی تھی یکدم ہی گویا نئی روح میرے اندر پھونک دی گئی ہے۔ کیا وہ یہاں آنے کے لئے بے قرار و پریشان تھا جو یہاں لمحوں میں میرے اندر توانائی و مسرتوں کے آبشار بہنے لگے ہیں۔ پاپا کے عالیشان گھر، مما کی خوبصورت سنگت میں کہیں بھی ایسی طمانیت و مسرت محسوس نہ ہوتی تھی جیسے انوکھے احساسات سے یہاں آ کر دوچار ہوئی ہوں۔ میرا لاشعور بہت پہلے نامعلوم کب اس تعلق کو قبول کر چکا تھا جس کا احساس مجھے یہاں آ کر ہوا ہے۔'' وہ ہر چیز کا جائزہ لیتی ہوئی حیرانی سے سوچ رہی تھی۔ اس دوران چوکیدار کی بیوی گل رخ سلام کر گئی تھی۔

کمروں کے قالین، پردے سب میلے ہو رہے تھے۔ بعض کمروں کی کلر اسکیم چینج کرنے کی ضرورت تھی۔ پھر اس نے طویل لسٹ بنالی تھی۔ کلر اسکیم ایک ہفتے میں چینج ہو گئی تھی۔ لان کو نئے سرے سے سنوارا گیا تھا۔ تمام پرانی چیزیں ملازموں میں اس نے بانٹ دی تھیں۔ پھر اس نے پردوں، قالین، کراکری اور دوسرے آرائشی سامان کی خریداری شروع کر دی۔ یہاں حسن بیگ نے اس کا بھرپور ساتھ دیا تھا۔ اسے رقم بغیر مانگے مل جاتی تھی۔ ڈرائیور اور چوکیدار کی بیوی کے ہمراہ وہ خرید و فروخت میں مصروف تھی اور تیزی سے گھر کی حالت بدلتی جا رہی تھی۔ وہ عام سا گھر اس کی محنت اور زبردست جمالیاتی حس کے باعث اب شاندار محل نظر آنے لگا تھا۔ سب جگہ کی آرائش و زیبائش اس نے از حد اہتمام و احتیاط سے کروائی تھی اور خصوصاً بے جی اور شاہ ویز کے بیڈ رومز کے اہتمام میں از حد احتیاط برتی تھی۔

بے جی کے بیڈ روم کی کلر اسکیم آف وائٹ میں کروائی تھی اور اس کی مناسبت سے فرنیچر رکھا تھا اور آرائش کروائی تھی۔ ان کے فرنیچر میں ایک خوبصورت چوکی کا اضافہ تھا جس پر اس نے بھاری سرخ مخمل کی جائے نماز بچھائی تھی۔ جائے نماز پر خانہ کعبہ کی پُرنور تصویر آویزاں تھی۔ سب سے زیادہ محنت اس نے شاہ ویز کے بیڈ روم پر کی تھی اور ہلکے رنگوں کا استعمال کیا تھا جو شاہ ویز کی طبیعت سے میچ کرتے تھے۔ ڈرائنگ روم اور لاؤنج میں شوخ رنگوں کا استعمال کیا تھا اور اسی نسبت سے ڈیکوریشن بھی کی گئی تھی۔

سارا گھر سنور گیا تھا۔ فرش سے چھت تک ہر چیز چم چم کر رہی تھی۔ ہر کمرے میں خوبصورت پھول گلدانوں میں مسکرا رہے تھے۔

سردی شدید ہو گئی تھی۔

وہ اب تھک گئی تھی۔ دس دنوں میں اس نے دن رات محنت کی تھی۔ ایک ولولہ، ایک عزم اسے ہمہ وقت تر و تازہ رکھتا تھا۔ تھکن اس کے قریب بھی نہ پھٹکی تھی۔

اب جبکہ وہ اپنی خواہشوں کو عملی شکل دے چکی تھی، اس کی محنت اور کوششیں بارآور ثابت ہوئیں تو ایک دم سے تھکن و سستی اس پر سوار ہو چکی تھی۔ ڈرائیور کو اس نے واپس بھیج دیا تھا۔ اس کا آج یہیں رکنے کا ارادہ تھا۔

سردیوں کی شامیں بوجھل ہوتی ہیں۔ اندھیرا جلد اتر آتا ہے۔

اس روز بھی موسم ابر آلود تھا۔ سرِ شام ہی رات کا گمان ہو رہا تھا۔ اس نے تمام کھڑکیوں، دروازوں کو لاک کیا اور کھانا کھا کر شاہ ویز کے بیڈ روم میں چلی آئی۔ ہیٹر آن کر کے بیڈ پر دراز ہو گئی۔

رات

سردی

تنہائی

اس کے اندر کوئی ہولے ہولے سسکنے لگا۔

مما نے کہا تھا تم اسے لوٹ آنے کا کہو وہ لوٹ آئے گا اور اس کے دل میں بھی تو یہی خوش فہمی جاگزیں تھی مگر خوش فہمی محض خوش فہمی رہی تھی۔ اس ستم گر کی یاد موتیوں کی صورت آنکھوں کے گوشوں سے نکل کر دائیں بائیں بکھرنے لگی تھی۔ اس کے لبوں سے آہ نکلی تھی۔

تیری الفت میں صنم

دل نے بہت درد سہے اور ہم چپ ہی رہے

بہت عرصے قبل ریڈیو پر سنا ہوا گیت اسے اپنے حسب حال ہی لگا تھا اور وہ پوری طرح افسردہ ہو گئی تھی۔

غم ہمیں لوٹ گیا، ہائے دل ٹوٹ گیا

پھر بھی آنسو نہ بہے اور ہم چپ ہی رہے

وہ بے چین ہو کر اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔

تیری الفت میں صنم دل نے بہت درد سہے

تیری الفت میں صنم دل نے بہت درد سہے

وہ اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگی۔

کمرے کی ایک ایک چیز گویا اس کے ساتھ اشک بار ہو رہی تھی۔ ہر ایک گوشے سے تنہائی و اداسی ٹپک رہی تھی اور وہ سوچ رہی تھی کہ اس نے یہاں ٹھہرنے کا ارادہ غلط کیا ہے۔ یہاں کی تنہائی، خاموشی کسی آسیب کی طرح اس پر حاوی ہو رہی تھی۔

ہر گزرتا لمحہ اسے وحشت زدہ کر رہا تھا اور وہ سوچ رہی تھی وہ پہلی مرتبہ تو اس طرح تنہا نہیں رہی ہے۔ اکثر و بیشتر پاپا کے بزنس ٹورز کے باعث وہ پاپا کے ہاں کئی ہفتوں تنہا رہی تھی اور کبھی بھی تنہائی یا وحشت کا شکار نہ ہوتی تھی جس کا سامنا اسے یہاں پڑا تھا۔ شاید وہ پاپا کا گھر تھا اور یہ ''پیا'' کا۔ وہاں وہ ہر طریقے سے رہنے کی عادی تھی اور یہاں وہ جتنا عرصہ بھی رہی تھی شاہ ویز ساتھ تھا۔ گو کہ ان کے درمیان خوشگوار دوستانہ تعلقات ہر گز نہ تھے مگر پھر بھی شاہ ویز نے ایک ہی بیڈ روم میں سونے کو ترجیح دی تھی۔ اور لاشعوری طور پر وہ اس کے وجود کی عادی ہو چکی تھی۔ اب اس کمرے میں وہ از حد بے چینی و بے کلی محسوس کر رہی تھی اور اس نے سوچا زیادہ وقت نہیں ہوا ہے، وہ واپس پاپا کے ہاں چلی جائے۔ وہاں کم از کم تنہائی کا جان لیوا احساس تو نہ ہوگا۔ ویسے بھی روزانہ صبح آتی تھی اور کام کروا کر رات تک لوٹ جاتی تھی۔ نہ معلوم آج کیا ہوا تھا اسے جو وہ یہاں رکنے کی بیوقوفی کر بیٹھی تھی۔

ابھی وہ اپنی سوچ کو عملی جامہ پہنا بھی نہ پائی تھی کہ ایک دم لائٹ چلی گئی اور ہر سو گھپ اندھیرا اچھل گیا۔

وہ جہاں تھی وہیں تھم گئی۔ کچھ دیر تک لائٹ نہ آئی تو اٹھ کر موم بتی تلاش کرنے لگی۔ کام کی مصروفیت کے باعث ٹارچ بھی چارج نہ کر سکی تھی جو اس وقت فیل تھی۔

موم بتی اور لائٹر اسے دراز سے مل گئے تھے۔ اس نے کارنر پر آویزاں کینڈل اسٹینڈ پر ایک ساتھ کئی موم بتیاں جلا کر رکھ دیں۔ دیواروں پر موم بتیوں کے سائے لرزاں تھے۔ اندھیرا اور روشنی ایک دوسرے کے سنگ محو رقص تھے۔ تنہائی پہلے ہی اسے بکھل کیے ہوئے تھی، اب یہ نئی افتاد اسے سراسیمہ کیے ہوئے تھی۔ موم بتی کا پورا پیکٹ جلانے کے باوجود روشنی ناکافی لگ رہی تھی اور اس کی پرچھائی کے ساتھ کمرے کی ہر شے کی پرچھائیاں نمایاں ہو کر دیواروں پر ڈراؤنی شکلیں بنا رہی تھیں۔

خوف سے اس کا نازک دل دھڑک دھڑک جا رہا تھا۔ کافی دیر بعد جب خوف میں کمی واقع ہوئی تو اس نے کینڈل اسٹینڈ سے ایک موم بتی نکالی اور ٹیبل پر شاہ ویز کا نام لکھنے لگی۔

کانچ کی ٹیبل کی شفاف سطح پر سرخ موم سے جگہ جگہ ایک ہی نام لکھا تھا۔

شاہ ویز

شاہ ویز

شاہ ویز

اس نے شفاف ہتھیلی پھیلائی اور اس پر بھی لکھ دیا۔ اُف گرم گرم قطرہ اس کی نازک ہتھیلی پر گرا تو جان ہی نکل گئی۔

لیکن اس اذیت میں بھی ایک انوکھی لذت پنہاں تھی۔

وہ جنونی انداز میں ہتھیلی جلاتی گئی، جلاتی رہی۔ جب اچانک ...... بالکل اچانک دروازہ کھلا اور موم بتی سمیت لرز کر چونک اٹھی تو اس کے ہاتھ میں کانپی اور وہ اس طرح کھڑی ہوگئی جیسے اس نے دروازے میں کوئی بھوت کھڑا دیکھ لیا ہو۔

ایک بار

دو بار

تین بار

اس نے استعجابیہ انداز میں پلکیں جھپکائی تھیں۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں ہو رہا تھا۔ وہ ٹکٹکی باندھے ادھر دیکھ رہی تھی۔

دروازے پر شاہ ویز کھڑا تھا۔

ہاں، شاہ ویز...... وہی شاہ ویز جو اس کی دھڑکنوں میں بسا تھا جس کو اس نے ہتھیلی پر جمایا تھا، خیالوں میں سجایا تھا۔ اس کو اپنی بصارت پر دھوکے کا گمان ہو رہا تھا۔

''ممکن ہے، یہ فریب ہو، خیال ہو، دھوکا ہو، خواب ہو، کوئی اور ہو۔ مگر نہیں، وہ شاہ ویز ہی تھا جو دروازے کے بیچوں بیچ کھڑا والہانہ انداز میں اسے دیکھ رہا تھا۔ براؤن کوٹ سوٹ میں وہ پہلے سے بھی زیادہ صحت مند اور چاق و چوبند نظر آ رہا تھا۔ آنکھوں میں چمک تھی، چہرے پر سرخی تھی۔ رنگ کھل کر اور صاف ہو گیا تھا۔ ہونٹوں پر دلآویز مسکان تھی۔ وہ ایک دوسرے کی جانب سحر زدہ انداز میں دیکھ رہے تھے۔ شاہ ویز کی آنکھوں میں انوکھی چمک تھی۔

مشعل کی آنکھوں میں وحشت تھی، خواب سے بیدار ہو جانے کی سراسیمگی تھی۔ ہاتھ میں موم بتی تھرتھرا رہی تھی۔

جلتا موم اس کی ہتھیلی میں جمع ہونے لگا تھا۔ دوپٹہ کندھوں سے ڈھلک کر کلائی پر گر گیا تھا۔ وہ ابھی تک یقین و بے یقینی کے دوراہے پر کھڑی تھی جب موم بتی ختم ہوگئی، پگھلا موم ایک شعلے کی طرح بھڑکا اور شعلے نے اس کے دوپٹے کو لپیٹ میں لے لیا جو ہتھیلی پر سرک آیا تھا۔

''ارے...... ارے...... آپ نے دوپٹہ جلا لیا۔'' وہ چیختا ہوا اس کی طرف لپکا اور دوپٹہ کھینچ کر نیچے پھینکا پھر اپنے بھاری بوٹ مار مار کر دوپٹے کی آگ بجھائی تھی۔

دوپٹے کی آگ تمہیں نظر آ گئی۔ میں جو تن من جلائے بیٹھی ہوں، میری حسرتیں، میری خواہشیں، میری انا، میرا وقار جس میں سب جل کر خاکستر ہو گیا، وہ کچھ تمہیں نظر نہیں آیا......؟

''اوہ...... ہو...... یہ کیا ہو گیا ہے...... یہ گرم گرم موم ہاتھ جلا رہا ہے۔''

شاہ ویز نے دوپٹے کی آگ بجھا کر اس کی طرف دیکھا پھر قریب آ کر اس کا لرزتا ہاتھ تھام لیا۔ اسی وقت لائٹ آ گئی۔ تمام روشنیاں جل اٹھیں۔ کمرہ جگمگانے لگا۔ ہر طرف چکا چوند ہو گئی۔

اس نے ان موم بتیوں کی جانب دیکھا جو لائٹ آنے کے باعث ہوا کی زد میں پھڑپھڑا رہی تھیں اور بہت حقیر لگ رہی تھیں۔ بے تحاشہ روشنیوں نے ان کی حیثیت زیرو کر دی تھی۔ اس وقت وہ بھی تو ان موم بتیوں کی طرح شاہ ویز کے سامنے بالکل حقیر و کمزور لگ رہی تھی۔ شاہ ویز نے اس کا ہاتھ تھاما ہوا تھا جس کی ہتھیلی پر چھالوں کی صورت میں شاہ ویز لکھا ہوا تھا۔

اس کی نگاہ ہتھیلی سے ہٹ کر ٹیبل کے شیشے پر پڑی تھی جہاں سرخ مومی قطرے جگہ جگہ اس کے نام میں ڈھلے ہوئے تھے۔ اس کی نگاہ پلٹ کر آئی تو مشعل کے چہرے پر ٹھہر گئی۔ اس کا چہرہ کھلی کتاب کی مانند تھا جس کا ہر لفظ محبت کی روشنائی سے تحریر تھا۔ اس کے چہرے پر سچ تھا۔

اس نے بھی اپنی سلگتی آنکھیں اس کی آنکھوں میں الجھا دیں۔ وہ اب کوئی حجاب، کوئی ملال درمیان میں رکھنا نہ چاہتی تھی...... مگر ابھی شاید اس کی مناجات قبولیت کے درجے پر فائز نہ ہوئی تھیں جو اسی دم دروازہ ناک کر کے شاہ ویز کا چہیتا کولیگ اندر آ گیا۔

''سر! میں جا رہا ہوں...... آپ کا سامان ملازم سے اندر رکھوا دیا ہے۔''

مشعل کو سلام کر کے وہ اس سے مخاطب ہوا تھا۔ سہیل کو دیکھتے ہی شاہ ویز نے مشعل کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا اور قدرے پرے ہٹ گیا تھا۔

''آپ صبح شام یہاں فون کر کے میرا دماغ کھاتے ہیں اور یہ اطلاع مجھ سے کیوں چھپائی۔ میں ڈنر کا اہتمام تو کر لیتی۔ میں نے دوپہر کے بچے ہوئے کھانے سے ڈنر کیا تھا۔ اب کچھ تیار بھی نہیں ہے۔'' وہ سہیل پر اپنی جھال اتارنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

''آئی ایم سو سوری میڈم! اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ کچھ دیر قبل سر نے موبائل کے ذریعے اطلاع دی کہ یہ ایئرپورٹ پر موجود ہیں، جا کر ریسیو کروں۔ سو میں جا کر انہیں لے آیا۔ سارا حساب کتاب انہی سے دریافت کریں۔'' وہ مسکراتا ہوا چلا گیا۔

''اگر میں بتا کر آتا تو تم میرا اتنا شاندار استقبال کس طرح کرتیں؟'' اس کی آنکھوں میں اترتی شکایت دیکھ کر وہ مسکرا کر بولا۔ ''میں ان لمحوں میں بہت بڑی خوشی سے فیض یاب ہوا ہوں۔''

مشعل کی شکایت از خود رفع ہو گئی تھی۔ وہ اس سے نگاہ چرا کر آگے بڑھ گئی۔

''ڈنر کی فکر مت کرو...... میں کر کے آیا ہوں۔ ہاں اگر کافی مل جائے تو عنایت ہوگی۔'' اس کا انداز شگفتہ و شوخ تھا۔

وہ اثبات میں سر ہلاتی ہوئی کچن میں چلی آئی اور بڑی چاہ سے اس کے لئے کافی بنانے لگی تھی۔

اس کے لب خود بخود مسکرانے لگے تھے۔

روم روم سرشاری و سرمستی کی کیفیت میں جھومنے لگا تھا۔

دل سرگوشیاں کر رہا تھا۔

وہ آ گیا ہے

تیرے من کا میت!

تیرے خوابوں کی تعبیر

تیرے من کی مراد

وہ من ہی من میں مسرت سے جھومتی ہوئی چھوٹی ٹرے میں دو مگ کافی کے لے کر وہاں چلی آئی۔ سارا کمرہ اس کے پرفیوم کی دلفریب مہک سے مہکا ہوا تھا۔ وہ بیڈ پر ملکیوں کے سہارے دراز تھا۔

اس نے کوٹ اتار دیا تھا۔ آف وہائٹ شرٹ کے چند اوپری بٹن کھلے تھے۔ گریبان کی اوٹ سے سیاہ بال نظر آ رہے تھے۔ آنکھیں ہلکی سرخ ہو رہی تھیں۔ بال کچھ بکھر گئے اور ان بکھرے بالوں میں وہ بہت اچھا لگ رہا تھا، ہمیشہ سے زیادہ اچھا لگ رہا تھا۔

اس کا خوشی سے لرزتا دل اپنے بخت پر نازاں و فرحاں تھا۔ اس نے چپکے سے ایک نظر اپنے کپڑوں پر ڈالی۔ گلابی اور سیاہ کاٹن کے کروشیے کے دیدہ زیب ورک والے سوٹ میں وہ بالکل عام حلیے میں تھی۔

چہرہ ہر آرائش سے مبرا مرجھایا ہوا۔

بال سمیٹ کر جوڑے کی شکل میں لپیٹے ہوئے تھے جن سے کئی لٹیں نکل کر اس کے چہرے پر ناگنوں کی طرح لہرا رہی تھیں۔

اس کی غیر موجودگی میں وہ بننا سنورنا بھول چکی تھی اور گھر کی سیٹنگ کی تیاریوں کے دوران تو وہ خود سے زیادہ غافل ہو گئی تھی۔

کافی پینے کے دوران ان کے درمیان مکمل خاموشی رہی تھی۔

وہ اپنے خیالوں میں گم تھا۔

وہ اپنی سوچوں میں مست۔

وہ خالی مگ لے کر کچن میں آئی تو کچھ صفائی کرنے میں ٹائم لگ گیا تھا اور وہ کمرے میں گئی تھی۔ وہ اسی طرح نیم دراز سو رہا تھا۔ پاؤں میں بوٹ اسی طرح تھے اور چہرہ دروازے کی سمت گویا وہ اس کا انتظار کرتے کرتے نیند کی آغوش میں پہنچ چکا تھا۔ وہ دبے قدموں سے چلتی ہوئی اس کی سمت چلی آئی اور پیاسی نگاہوں سے اس کی جانب دیکھنے لگی۔

''تمہاری ہونے کے لئے میں نے ہر قربانی دی ہے اور دیکھو...... آج تمہارے نام سے میرے اردگرد کتنے ستارے روشن ہو گئے ہیں۔ تم کتنے مختلف ہو عام مردوں سے۔ بالکل منفرد منفرد اور ظالم بھی۔ تمہارے جیسے مرد کو ظالم ہونا بھی چاہئے۔

جو شخص اپنے آپ پر ظلم کر سکتا ہے، اپنے نفس پر جبر کر سکتا ہے، تمہارا یہ ظلم...... ظلم نہیں مہربانی ہوگی مجھ پر......

میں کل پتھر تھی...... آج ہیرا ہوں۔

وہ جھک کر بوٹ کے اسٹرپ کھولنے لگی۔

''ارے، یہ کیا کر رہی ہو؟'' وہ فوراً ہی بیدار ہو گیا تھا۔

''میں جوتے اتار رہی ہوں، آپ تھک گئے ہیں۔ آرام سے سو جائیں۔''

''تھینکس۔ میں اٹھ ہی رہا تھا۔ دراصل کئی راتوں سے سویا نہیں ہوں ٹھیک طرح سے اس لئے ذرا سا آرام ملتے ہی نیند نے غلبہ پا لیا۔'' اس نے اٹھ کر جوتے اور جرابیں اتاریں اور باتھ روم کی طرف بڑھ گیا۔ مشعل مستعدی سے اس دوران نائٹ سوٹ وہاں لٹکا آئی تھی۔ وہ ڈریس چینج کر کے آیا تو سیدھا بیڈ کی طرف بڑھتے ہوئے گویا ہوا۔

''میں سو رہا ہوں ...... صبح جب تک خود نہ اٹھوں مجھے جگائیے گا نہیں۔ بہت دن بعد سکون کی نیند آرہی ہے۔'' اس نے بیڈ پر لیٹ کر کمبل اوڑھتے ہوئے کہا اور چہرے تک لپیٹ کر کروٹ لے لی تھی۔ مشعل نے اٹھ کر لائٹس آف کر دیں اور نائٹ بلب جلا کر باہر نکل آئی۔ کچھ دیر قبل وہ جتنی ہشاش بشاش تھی، ایک دم ہی اداس و دلگیر نظر آنے لگی تھی۔ پہلی بار اس کا والہانہ انداز اور محبت و چاہت چھلکاتی نگاہوں میں اپنا عکس دیکھا تھا۔

اپنا آپ دیکھا تھا اور سمجھی تھی اس کی خطائیں معاف ہو چکی ہیں، اس کی سزا ختم کی جا چکی ہے۔ وہ صرف اس کی خاطر آیا ہے، اس کے لئے آیا ہے۔ لیکن وہ سب محض دل کی خوش فہمیاں و من کے بہلاوے ثابت ہوئے تھے۔ ہجر و فراق اس کے لئے بے معنی تھے۔

وہ مسافر کی مانند آیا تھا اور گھر کو سرائے سمجھ کر بے خبر سو گیا تھا۔

''شاید تو جیتے جی اس کٹھور کا پیار نہ پا سکے گی۔ اسی طرح تڑپتی ہوئی، سلگتی ہوئی مر جائے گی اور اس سنگدل کو تیری قبر پر پھول رکھنے کی بھی توفیق نہ ہو گی۔'' اس نے آزردگی سے سوچا اور اس کا لایا ہوا سامان اسٹور روم میں رکھنے لگی۔

□●□

حرا نے خاموش نگاہوں سے فرح کی جانب دیکھا جن کے چہرے پر غصہ و تناؤ سرخی بن کر چھایا ہوا تھا۔ پیشانی پر شکنیں اور بگڑے تیوروں نے ان کی نرم و نازک شخصیت کو خاصا بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔

درمیانی صوفے پر منصور براجمان تھے اور ان کا انداز ایسا ہی تھا جیسے کسی پھانسی پانے والے مجرم کا ہوتا ہے۔ اداس، دلگرفتہ و افسردہ۔

''تم ...... مجھے معاف کرنے پر بالکل تیار نہیں ہو؟'' ان کی دھیمی آواز بے جان تھی۔

''خطاؤں کو، جفاؤں کو بار بار معاف کرنے والی فرح اسی وقت مر گئی تھی جب تم مجھے اپنی غرض پوری نہ ہونے پر دھتکار کے گئے تھے۔ مشکل سے ہی سہی، میں نے خود کو بدل لیا ہے۔ پہلے میں خود کو کمزور سمجھتی تھی اب میری بہادری پر لوگوں کو رشک آتا ہے۔ پہلے میں سہاروں کی محتاج تھی اب خود سہارا ہوں، محافظ ہوں، چٹان ہوں۔ اب مجھ سے بیوی کے نام پر کسی کی غلامی نہیں ہو سکتی، نہ کسی کی کنیز بن سکتی ہوں نہ آیا۔''

''پلیز گزشتہ باتوں کو بھول جاؤ۔ اب تمہیں مجھ سے کوئی شکایت نہ ہو گی۔ مجھے میری زیادتیوں کی سزا مل چکی ہے۔ میں تمہیں ٹھکرا کر گیا تھا اور جواباً قدرت نے مجھے ایسی ٹھوکر ماری، ایک ہی ٹھوکر نے مجھے اوقات یاد دلا دی۔'' منصور کی دھیمی التجائیہ آواز میں پچھتاووں کی لرزش تھی۔

''جو مرد ناحق عورت کو آزمائش میں ڈالتے ہیں وہ قدرت کی طرف سے خود آزمائے جاتے ہیں۔ تم مرد لوگ کیا سمجھتے ہو اللہ صرف تمہارا ہے؟ وہ صرف تمہارا ہی ساتھ دے گا؟ جائز و ناجائز ہر کام میں اس کی رضا تمہیں حاصل رہے گی۔ تم جب چاہو گے ٹھکرا دو گے، جب چاہو گے اپنا لو گے اور عورت ......''

''پلیز آپی! چھوڑیں، بات ختم کریں۔ دولہا بھائی کو اپنی غلطیوں کا احساس ہے۔ وہ معافی بھی مانگ رہے ہیں۔ اب آپ کو ناراضگی ختم کر دینی چاہئے۔'' حرا کو مداخلت کرنی پڑی تھی۔ لیکن فرح کسی طوفان کی طرح بپھری ہوئی تھیں جنہیں قابو کرنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔

''نہیں کر سکتی میں معاف ...... کس طرح معاف کر دوں؟ زندگی شدید غم و خوف میں گزار کر اب جینے کا حوصلہ ہوا ہے تو پھر کمزور ہونے کا وقت آ گیا؟ میں سب کچھ کر سکتی ہوں مگر اپنی ذات کی نفی ہرگز گوارا نہیں۔''

وہ اٹھ کر تیز تیز قدموں سے باہر نکل گئیں۔

''میں آخری سانس تک منتظر رہوں گا۔ فرح کو باور کرا دینا۔'' منصور مضبوط لہجے میں کہتے ہوئے چلے گئے تھے۔

''آپ کو اپنا رویہ بدلنا ہو گا آپی! رنجشیں ہر رشتے میں ہو جاتی ہیں۔ لوگ جیتے جی ایک دوسرے کو مردہ تصور کر کے تعلقات توڑ دیتے ہیں، کیا کچھ نہیں ہوتا ناراضگیوں کے دوران مگر پھر جب غلط فہمیاں دور ہو جاتی ہیں، رنجشیں محبت میں، ناراضگیاں قربتوں میں بدل جاتی ہیں تو سب ایک ہو جاتے ہیں اور ایک ہونا بھی پڑتا ہے۔ معاشرے میں وہی لوگ عزت و تحفظ پاتے ہیں جو مضبوط رشتے اور معتبر شجرہ رکھتے ہوں۔'' منصور کے جانے کے بعد وہ فرح کے کمرے میں چلی آئی تھی۔

''حرا ...... حرا! تم نہیں جانتیں کسی کو معاف کر دینا اتنا آسان نہیں ہوتا۔''

''اوہو ...... یہ کیا آپ مجھ سے کہہ رہی ہیں۔'' وہ دکھ بھرے انداز میں مسکرائی۔

''اوہ ...... سوری ...... سوری حرا! میری جان۔'' انہوں نے بڑھ کر اسے لپٹاتے ہوئے شرمندگی سے کہا۔

''اس شخص نے آ کر میرا دماغ گھما دیا ہے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا بک رہی ہوں۔''

''آپ نے مجھ سے کہا تھا معاف کر دینے والا، بدلہ لینے والے سے زیادہ افضل ہوتا ہے آپی، آپ بھی انہیں معاف کر دیں۔ آپ کا بدلہ تو خود اللہ میاں نے لے لیا۔ جاتے وقت کتنا طنطنہ، غرور، گھمنڈ تھا ان میں۔ اب واپسی میں تمام کشتیاں جلا کر آئے ہیں۔ پہلے انہوں نے آپ کو نوکرانی بنا کر رکھا تھا، اب مہارانی بنا کر رکھیں گے یہ میرا دعویٰ ہے۔ آپ کو انہیں معاف کرنا ہی ہو گا۔ میری خاطر ہی سہی۔'' حرا کے لہجے میں اپنائیت کا مان و فخر تھا۔

''منصور نے میرے ساتھ ہی نہیں تمہارے ساتھ بھی بہت زیادتی کی ہے ...... کیا تم معاف کر سکتی ہو اس کو؟'' ان کے دل کی بات لبوں پر آ گئی تھی۔

''انہوں نے مجھ سے معافی مانگ لی تھی اور میں نے تہہ دل سے انہیں معاف بھی کر دیا تھا اور کیسے نہ کرتی۔ جو کچھ ہوا اس میں میرے نصیب کا دوش تھا۔ پھر ان کا رویہ میرے ساتھ ہمیشہ بڑے بھائیوں جیسا رہا ہے۔ میرے دل میں ان کے لئے کل بھی احترام تھا آج بھی میں ان کی از حد عزت کرتی ہوں۔''

''کل شاہ ویز سے ملنے چل رہی ہو نا؟'' انہوں نے سرعت سے موضوع چینج کیا تھا۔

''ہاں ضرور چلیں گے۔ لیکن ہم نے زیادتی نہیں کی مشعل سے ان کی آمد کا چھپا کر حالانکہ ہم سب ہی واقف تھے۔ مشعل کو معلوم ہو گا تو وہ خفا ہو گی۔''

''جو خوشی اسے شاہ ویز کو دیکھ کر ہوئی ہو گی وہ کنفرم ہونے کے بعد تھوڑی ہوتی۔ حسن صاحب تو راضی نہ تھے، بڑی مشکل سے راضی کیا تھا میں نے انہیں مشعل کو کچھ نہ بتانے اور وہاں چھوڑنے پر۔'' ان کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔

''شاہ ویز کی والدہ فرائی ڈے کو آ رہی ہیں۔ ان کے لئے بھی شاپنگ کرنی ہے۔ شادی میں ہماری طرف سے انہیں کچھ نہیں ملا تھا۔ مگر اب ہم کوئی کسر نہ چھوڑیں گے۔ شاہ ویز اور مشعل کے لئے شاپنگ مکمل ہو گئی۔ فرائی ڈے سے قبل ان کی شاپنگ بھی مکمل کرنا ہے۔''

''جی میڈم! مجھے سب یاد ہے اور آپ چالاکی سے موضوع بدلنے کی کوشش نہ کریں۔ میں منصور بھائی کو فون کرنے جا رہی ہوں کہ آ جائیں، گھر کے دروازے تو پہلے ہی وا تھے اب دل کے دروازے بھی کھل گئے ہیں۔'' حرا نے ہنستے ہوئے فون اسٹینڈ کی طرف قدم بڑھایا تھا۔

''حرا بات سنو۔ بات سنو، ابھی نہیں، رکو۔'' فرح نے بوکھلا کر اسے روکنا چاہا تھا۔ حرا نے پھرتی سے نمبر پش کر ڈالے تھے۔

□●□

سامان رکھنے کے بعد وہ کمرے میں نہیں گئی۔ لاؤنج میں بچھے سرمئی کارپٹ پر رکھے کشنز کے سہارے بیٹھ گئی۔ آنکھوں سے نیند غائب تھی تو دل سے سکون و قرار بھی رخصت ہو چکا تھا۔ سوچوں کا اژدھام تھا جو اسے بے دم کئے دے رہا تھا اور وہ ان سوچوں سے پیچھا چھڑانا چاہتی تھی جس نے اس کے نرم و نازک دل پر خراشیں ڈال دی تھیں، خواہشوں اور تمناؤں کو لہولہان کر ڈالا تھا اور اس کی روح کو سلگنے پر مجبور کر ڈالا تھا۔

سوچوں سے دامن نہ چھڑا پائی تھی کہ آنسو بن بلائے مہمانوں کی طرح وارد ہونے لگے تھے۔ وہ رونا نہیں چاہتی تھی، سوچنا نہیں چاہتی تھی لیکن کسی پر بھی اس کا اختیار نہ رہا تھا۔ جب دل پر بھی بس نہ چلتا تھا تو پھر ہر جذبہ خود سر ہوتا چلا گیا تھا۔ نہ معلوم کتنی دیر یہ پروگرام چلتا کہ دروازے پر آہٹ ہوئی تھی۔ سامنے سینے پر ہاتھ باندھے نائٹ سوٹ میں بال بکھرائے شاہ ویز کھڑا سنجیدگی سے اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔

''آپ ...... کسی چیز کی ضرورت ہے؟'' وہ خفیف سی اٹھ کھڑی ہوئی۔

''ہاں ...... تمہاری۔''

''کک ...... کیا مطلب؟'' اس کے اندر ہلچل ہوئی تھی

''تم نے پانی نہیں رکھا تھا۔ مجھے عادت ہے پانی پینے کی۔'' اس کی آنکھیں کچھ اور کہہ رہی تھیں، لہجہ کچھ اور۔ اس کی نگاہوں کی زبان پر اسے اعتبار نہیں تھا۔ وہ دوپٹے سے چہرہ صاف کرتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔

''تم نے کہا تھا واپس آ جاؤ اور میں واپس آ گیا۔ تم مجھے وہاں چھوڑ کر یہاں میرے آنے کا سوگ منا رہی ہو۔ میں خوش تھا کہ میری منتوں کی دریدری نے کام تو دکھایا۔ میرے نصیبوں پر جمی برف پگھل گئی ہے۔ میری زندگی میں بھی کیف و نشاط کی بہاریں در آئی ہیں مگر لگتا ہے تم ابھی تک مجھے قبول نہ کر پائی ہو اور مجھے محبت کا احساس کھینچ کر لایا ہے۔ جذبۂ دل سے مجبور ہو کر میں آیا ہوں۔ اس سے بڑھ کر اور کیا حیثیت ہو سکتی ہے۔ میں اپنے پیچھے سب دروازے بند کر کے آیا ہوں۔ صرف وفا کا دروازہ کھلا ہے۔ چاہت کا نگر آباد کرنے کی خاطر، محبت کا جہاں بسانے کی خاطر، میں بہت تھک گیا ہوں۔ آج آخری بار اپنی انا، خودداری و خودسری کو ریزہ ریزہ کر کے ان کرچیوں پر چل کر آیا ہوں۔'' وہ کہہ رہا تھا۔ اقرارِ وفا، اظہارِ محبت کر رہا تھا۔

اس کے لہجے میں سچائی تھی، اس کی آنکھوں میں سچائی تھی، اس کی باتوں میں سچائی تھی۔ وہ سراپا سچائی بنا ہوا تھا۔

''مجھے اس طرح بے یقین نظروں سے نہیں دیکھو۔'' وہ اس کے قریب چلا آیا تھا۔ اس کے ساکت و صامت کھڑے وجود کو بڑے استحقاق سے بازوؤں میں لیتے ہوئے دوبارہ گویا ہوا تھا۔ ''مجھے اندازہ نہیں تھا مجھ جیسے فولادی حوصلے اور چٹانی جذبات رکھنے والے شخص کو تم یوں موم کی طرح پگھلا دو گی۔ تم سے دور رہ کر یہ جانا کہ تمہاری قربت کے بغیر زندگی ممکن نہیں ہے۔ میرے پاس نہ ہوتے ہوئے بھی تم میرے پاس ہوتی تھیں ...... ہاں، میں ہوتے ہوئے بھی موجود نہ تھا۔ تم مجھے مجھ سے چرا کر لے

گئیں۔میرے پاس کچھ نہ چھوڑا۔ مجھے دل کی بے ایمانی اور اپنی دیوانگی کا احساس ہوا تو پہلے تو یقین نہیں آیا کہ میں ایک پاگل سی، نٹ کھٹ، بدتمیز لڑکی کے عشق میں گرفتار ہو سکتا ہوں جس کی پرچھائیں سے بھی چڑتھی اس کا اسیر ہو سکتا ہوں۔ خود کو آزمانے کے لئے اپنے جذبوں کی آزمائش کے لئے میں ازخود اتنا نام لگا کر آگیا۔

جب مجھے اپنے جذبوں کی صداقت پر یقین کامل ہو گیا تو احساس ہوا میں نے تمہارے ساتھ بہت زیادتیاں کی ہیں، قدم قدم پر تمہاری خودداری، انا، نسوانیت کی توہین کی ہے۔ تم نے خود کو بدل لیا، اس سانچے میں ڈھل گئیں میں نے جس میں ڈھالنا چاہا۔ یہ ثبوت تھا تمہاری محبت کا، بے لوث، بے غرض، بے انتہا چاہت کا جس نے مجھ جیسے گھمنڈی، خودپسند، بلکہ ٹیڑھے مرد کو جھکنے پر مجبور کر ڈالا۔" وہ دھیمے سے ہنسا تھا۔ کتنی خوبصورت تھی اس کی ہنسی طنز و تمسخر سے پاک، معطر و نکھری ہوئی۔ مشعل کے ہر سو رنگ، روشنی اور خوشبوؤں کی بارش ہونے لگی۔ کچھ دیر قبل اس کے سرد و بیگانے رویوں پر رو رہی تھی اور اب اس کے مہکتے بازوؤں کے حصار میں اسے ڈھیروں شرم آ رہی تھی۔

"مجھے یقین نہیں آتا آپ بدل سکتے ہیں۔ شاید یہ بھی کوئی ستانے کا نیا انداز ہو آپ کا اور بعد میں مجھ پر ہنسنے اور مضحکہ اڑانے کا موقع مل جائے۔" مشعل کے ذہن میں برق رفتاری سے خیال آیا تھا اور وہ کسمسا کر اس کے بازوؤں سے نکل آئی تھی۔

"تمہاری محبت نے مجھے بدل دیا ہے۔ میں تمہارے بغیر کچھ نہیں ہوں۔ اگر تم مجھے فون پر واپس لوٹ آنے کا نہ کہتیں تو میرا بھرم ٹوٹ جاتا، میرا مان بکھر جاتا اور خواہ عمر تمام ہو جاتی میں لوٹ کر آنے والا نہیں تھا۔ تمہارے بلاوے کو، تمہاری محبت کے اظہار سے مشروط سمجھا تھا۔ تم نہ بلاتیں تو مطلب تمہاری نفرت کا اظہار تھا، تمہارے بلاوے نے تمام راہیں ہموار کر ڈالی ہیں۔"

"مجھے یقین نہیں آتا...... آپ اور مجھ سے محبت...... یہ ناممکن بات ہے۔"

"مجھے معلوم تھا تم اتنی آسانی سے مجھ پر یقین نہیں کرو گی۔" وہ صوفے پر بیٹھ گیا تھا اور اسے بھی کھینچ کر اپنے قریب زبردستی بٹھایا تھا۔

"محبتوں میں خطائیں تو ہو ہی جاتی ہیں
محبتوں کا تقاضا ہے درگزر کرنا"

وہ شوخی سے گنگنایا تھا۔

"تم نے رو کر حال زار کہا اور میں ہنس ہنس کر تمہیں روداد عشق سناؤں گا۔ میں یہ نہیں کہوں گا تم مجھے پہلی نظر میں اچھی لگیں اور میں تم پر فدا ہو بیٹھا۔ نہیں، ہرگز نہیں۔ یہ پہلی نظر کا معاملہ ہرگز نہ تھا۔ تم تو دھیرے دھیرے، آہستہ آہستہ اس نشے کی مانند میرے رگ و پے میں اترتی گئیں جس سے چھٹکارا تا حیات ناممکن ہوتا ہے۔ انسان زندگی کو داؤ پر لگانے کو تیار رہتا ہے مگر اس سے برطرفی ممکن نہیں ہوتی۔ میرا اور تمہارا تعلق بھی کچھ ایسا ہی ہے۔" اس کی آواز سرگوشی بن گئی تھی۔ چہرے پر نئی و دلکش روشنی تھی۔ اس کی قربت سے اس کی الفت سے وہ جھجک رہی تھی، سمٹ رہی تھی۔ وہ حاوی ہوتا جا رہا تھا۔

"تمہارے ساتھ ساتھ میں بھی ہر گھڑی ہر ساعت بڑی کٹھن آزمائشوں سے گزرا ہوں۔ اپنے آپ کو بڑی مشکلوں سے قابو کیا ہے۔ کئی مرتبہ تمہارے حسن کی تجلیوں نے میرا صبر و قرار ڈانواں ڈول کیا ہے مگر ہر بار اپنے لازوال جذبے کی سچائی کو دیکھنے کے لئے خود پر جبر و ستم کرتا رہا۔ یہ محسوس کرنے کے لئے کہ دونوں طرف محبت کا رنگ ایک سا ہے یا نہیں۔ اگر محبت ضرورت یا ہوس بن جائے تو اس میں پاکیزگی نہیں رہتی۔ محبت ہمیشہ قائم رہنے والی چیز ہے۔ یہ سمندر نہیں جو چڑھے اور اتر جائے نہ ہی پھول ہے جو صبح کھلے اور شام کو مرجھا جائے۔ یہ وقت کے ساتھ ساتھ شدید سے شدید تر ہو جانے والا جذبہ ہے۔

میں تمہیں ہمیشہ اپنے دل کے قریب دیکھنا چاہتا ہوں تا حیات، آخری سانس تک۔ یہ تمہاری قربانیوں کا صلہ ہے جو آج ہم ایک ہیں۔ میں تمہیں اسی صورت میں دیکھ رہا ہوں جس میں دیکھنے کا خواہشمند تھا۔ اب تم پہلے سے زیادہ خوبصورت اور دلکش ہو گئی ہو۔ اتنی کہ دل کہتا ہے، سنو کہ اب گلاب دیں گے گلاب لیں گے، محبتوں میں کوئی خسارہ نہیں چلے گا۔" وہ اس کے کانپتے ہاتھ کو اپنی آنکھوں سے لگا کر جذباتی لہجے میں بولا۔

مشعل کی آنکھوں سے پھر آنسو لڑھکنے لگے تھے مگر یہ آنسو درد کے نہیں تھے، تڑپ کے نہیں تھے، دکھ کے نہیں تھے۔

یہ آنسو مسرت و کامرانی کے آنسو تھے۔

فتح مندی و تشکر کے آنسو تھے۔

"بس...... بہت قیمتی آنسو ضائع کر چکی ہو۔ اب کبھی یہ خزانہ لٹاتے نہ دیکھوں۔" اس نے بڑے پریم سے اس کے آنسو صاف کئے تھے۔

"فرائی ڈے کو بے جی، خالہ زرینہ، اصغر اور فریحہ بھابھی واپس آ رہی ہیں ان کے آنے کے کچھ عرصے بعد ہم ورلڈ ٹور پر چلیں گے، ایک ایک پل، ایک ایک ساعت، ایک ایک لمحے سے مسرت و زندگی کشید کریں گے۔ جتنی بے رخی و بے اعتنائی کی اذیت تمہیں دی ہے سب کا ازالہ کر دوں گا۔" اس کا انداز پوری شدت لئے ہوئے تھا۔

وہ کسمسا کر اس کے بازوؤں سے نکل آئی اور دور ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔

اس کے اس انداز پر شاہ ویز کے مسرت سے چمکتے چہرے پر یکدم ہی تاریک سایہ لہرا گیا تھا۔ وہ پریشانی سے اسے دیکھنے لگا۔

"کیا تم نے مجھے معاف نہیں کیا؟" کچھ توقف کے بعد وہ گویا ہوا۔

"یہ بات نہیں ہے...... مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ بہت عرصے قبل میں ایسی تکلیف دہ باتوں کو بھول چکی تھی۔ ایک مسئلہ ہے جس نے مجھے ازحد فکرمند و پریشان کر رکھا ہے۔"

"کیا ہوا ہے...... جو بھی پرابلم ہے مجھ سے شیئر کر سکتی ہو۔"

"پہلے مجھے پاپا کی تنہائی کی فکر تھی۔ اب میں دو حصوں میں تقسیم ہو گئی ہوں، پاپا اور مما۔ پاپا تنہا ہیں اور مما بھی فی الحال تو فرح آنٹی کی موجودگی کی وجہ سے تنہا تو نہیں ہیں مگر کل وہ بھی تنہا ہو جائیں گی۔ کیونکہ منصور انکل ساؤتھ افریقہ میں سیٹل ہو چکے ہیں۔ ان کا بزنس وہاں کامیابی سے چل رہا ہے۔ وہ یہاں صرف فرح آنٹی کو منانے کی وجہ سے رکے ہوئے ہیں۔ ان کی کالز اکثر آتی رہتی ہیں۔ گو کہ ابھی آنٹی کی ناراضگی دور نہیں ہوئی ہے لیکن کب تک؟ بہت جلد ان کو ہتھیار ڈالنے ہوں گے۔ عورت مرد سے رشتہ توڑ سکتی ہے مگر بیوی خاوند کو نہیں چھوڑ سکتی۔ ان کی منزل وہی ہیں۔ پھر وہ ان کے ساتھ چلی جائیں گی اور ساتھ مما کو بھی لے کر جانا چاہیں گی کیونکہ تنہا وہ کسی صورت انہیں نہیں چھوڑ کر جائیں گی اور میں مما کی طبیعت کو اچھی طرح جان چکی ہوں۔ وہ جس قدر ریکوٹ ہیں اتنی ہی خوددار و غیور ہیں۔ وہ ان کے ساتھ کبھی نہیں جائیں گی اور نہ ہی اس بات پر راضی ہوں گی کہ ہمارے ساتھ رہنے لگیں اور اس طرح رشتوں میں توازن نہیں رہے گا اور بہت سوچنے کے بعد میں نے یہ ترکیب سوچی ہے۔"

وہ کچھ جھجک کر چپ ہو گئی تھی۔

"ہاں، ہاں...... کہو، رک کیوں گئیں؟" وہ ہمہ تن گوش تھا۔

"میں نے سوچا ہے کہ پاپا بھی تنہا ہیں اور مما بھی تنہا ہیں کیوں نہ انہیں...... میرا مطلب ہے ان کی میرج ہو جائے تو ان کی تنہائی دور ہو جائے گی۔ دونوں کو ایک دوسرے کا سہارا مل جائے گا۔ آنٹی بھی سکون سے منصور انکل کے ساتھ رہ سکیں گی۔ اور سب سے بہتر یہ ہوگا کہ میں بے فکر ہو جاؤں گی۔ ورنہ ان دونوں کا خیال مجھے مسرتوں میں رنجیدہ رکھے گا۔ اور میں چاہنے کے باوجود خوش نہ رہ پاؤں گی۔" اپنی بات کہہ کر وہ خاموش ہو گئی تھی۔

"گڈ، ویری گڈ، فنٹاسٹک آئیڈیا ہے۔ پھر وہ دونوں ہی اوور ایج نہیں لگتے۔ ان کا کپل سوبر اور ونڈرفل ہوگا۔" اس نے کھلے دل سے اس کی تجویز کو سراہا تو اس کے چہرے پر بڑی انوکھی روشنی پھیل گئی تھی۔ وہ تیزی سے اس کے قریب آ کر پرجوش لہجے میں چہکی۔

"میرا آئیڈیا اچھا ہے نا...... اس طرح ہم سب کے مسائل حل ہو جائیں گے۔ ہمارا خاندان ایک ہو جائے گا۔"

"یہ پرپوزل لے کر کون جائے گا؟"

"میں پاپا کو راضی کر لوں گی۔ مجھے یقین ہے وہ کچھ ٹائم لیں گے مگر میں اپنے طریقے سے انہیں رضامند کر کے ہی رہوں گی اور آپ آنٹی کو پہلے ساتھ ملائیں، پھر دونوں مل کر مما کو راضی کریں۔ یہ کام مشکل تو ہے مگر ناممکن نہیں ہے۔" وہ ازحد خوش تھی۔

"اوکے...... سمجھو یہ کام ہو گیا۔ تمہارا میکہ ایک گھر میں سمٹ گیا ہے۔ ان کی تنہائیاں قربتوں میں بدل جائیں گی۔ اب مجھ غریب کی تنہائی کا بھی خیال کرو۔ تمہیں سب کی فکر ہے، مجھ پر تمہاری نگاہ نہیں جاتی؟ مجھ پر رحم نہیں آتا؟"

اس نے شوخی سے کہتے ہوئے مشعل کی طرف قدم بڑھائے تھے۔ اس نے شرما کر گردن جھکا دی تھی۔

(ختم شد)